جدید فقہی مباحث

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت
بینک انٹرسٹ وسودی لین دین

ترتیب

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ

تغیر پذیر حالات میں اجتماعی اجتہاد کی ضرورت

از حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم

تاثرات	مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ العالی شیخ الاسلام حضرت مولانا جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی ،ظلہ العالی

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ

34965877

جملہ حقوق محفوظ ہیں

islamic Fiqh Academy (India) مجمع الفقہ الاسلامی (الہند)

اجازت نامہ سلسلہ مطبوعات اسلامی فقہ اکیڈمی

محترمی نعیم اشرف نور و فہیم اشرف نور سلمہم اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دعا ہے عافیت ہوں، اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی دینی و علمی خدمات کو قبول فرمائے اور دینی و دنیاوی ترقیات سے نوازیں آمین۔ اسلامی فقہ اکیڈمی کی جملہ مطبوعات کی پاکستان میں اشاعت و طباعت و تقسیم کے لیے آپ کے ادارے "ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ" کو اجازت دی جاتی ہے اور پاکستان میں یہ حق صرف آپ کے ادارے کو حاصل رہے گا۔ تمام پاکستانی احباب کو سلام پہنچائیں۔

والسلام مجاہد الاسلام قاسمی

صدر اسلامی فقہ اکیڈمی

باہتمام: نعیم اشرف نور

ناشر: ادارۃ القرآن گلشن اقبال

کراچی، فون 021-34965877

اشاعت: ۲۰۰۹ء

ڈسٹری بیوٹرز

مکتبۃ القرآن بنوری ٹاؤن کراچی 021-34856701

مرکز القرآن اردو بازار کراچی 021-32624608

ملنے کے پتے

[illegible] 021 32631861

[illegible] 042 37353255

[illegible] 021 32630744

[illegible]

[illegible] 021 35032020

[illegible] 042-37334228

[illegible] 021 35031566

[illegible] 2608687

[illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت، بینک انٹرسٹ وسودی لین دین

مسائل: (۲) پہلا مسئلہ کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت

دوسرا مسئلہ: بینک انٹرسٹ وسودی لین دین

مباحثات

چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

''اسلامک فقہ اکیڈمی ہند'' ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں ...... بالخصوص علماء اور دینی غیرت وفکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری وفکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ وصحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں''۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ العالی

صدر دارالعلوم کراچی

''مجھے بے انتہا مسرت بھی ہے اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علماء کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے۔ اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانہ پر یہ کام شروع نہیں کر سکے ...... فقہ اکیڈمی نے بڑا اہم قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا''۔

چند تاثرات

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جدہ

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے۔ لیکن میں ان کو ایک فقیہ ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالی نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء، اور علم وفضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالی اپنے فضل وکرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض ومقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض ومقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد معجم طبرانی میں ایک روایت ہے جسے علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

"اذا جاء نا امر ليس فيه امر و لا نهى فما ذا تامرنا فيه"

یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آ جائے، ایسا قضیہ سامنے آ جائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہئے۔ حضرت نبی کریم سرور عالم نے ارشاد فرمایا:

"شاوروا الفقهاء العابدين و لا تمضوا فيه براى خاص"

کہ ایسے موقع پر فقہاء، عابدین سے مشورہ کرو، اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتوی کو، محض انفرادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء، عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجہ میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کا حکم سمجھو، یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم سرور عالم ﷺ نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نت نئے مسائل کا حل ہمارے لئے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہو گیا ہے اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء، عابدین کو جمع کیا ہے۔ مگر اس میں نبی کریم ﷺ نے دو صفتیں بیان فرمائی۔ ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں۔ دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج ومذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگا دی کہ وہ فقہاء محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو، تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لئے کہ دین، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنا لے، اس کے حکم بیان کر دے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے۔ بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ اِستقبالیہ

از ——— ڈاکٹر محمد منظور عالم چیرمین انسٹیٹوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی

محترم حضرات علماء!

مجھے آپ کو دوسری بار خوش آمدید کہتے ہوئے اتنی مسرت ہو رہی ہے کہ الفاظ کے پیکر اسے ادا نہیں کر سکتے۔ خوشی کے جذبات سے سرشار ہوں اور ہم لوگ اسی مبارک موقع و مناسبت سے دوسری بار یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی اسی ہال میں پگڑی و پیوند کاری ضبطِ تولید کے مسائل پر غور و فکر کے لئے جمع ہو چکے ہیں، اس موقع پر جس وسعتِ نظر، وتوسع اور تحمل وتدبر سے آپ حضرات نے قابلِ بحث نکات پر اپنی توجہ مرکوز رکھی وہ ہر پہلو سے قابلِ تحسین و قابلِ ستائش ہے۔

اور اس بار بھی ہندوستان میں سودی لین دین اور سودی قرضے اور نوٹ، کی شرعی حیثیت کے مسائل پر علمی توجہ دینے کے لئے یہ مبارک اجتماع منعقد ہوا ہے۔

یہ بڑی سعادت و فضل کی بات ہے کہ آپ دینی احکام کی تطبیق اور ملکی حالات وضروریات کے تناظر میں غور و فکر کے لئے مجمع الفقہ الاسلامی (الہند) کی دعوت پر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اس سے بڑی خوش بختی کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ جیسے جلیل القدر علماء وصاحب نظر اصحاب افتاء وفقہاء میں اس خالص فقہی وعلمی مجلس کے انعقاد وشرکت اور مثبت رخ پر اسے لے جانے کی آمادگی پیدا فرمائی۔

خداوند آپ کی نیک تمناؤں کو شرمندۂ تعبیر اور مثبت کوششوں کو کامرانی سے ہم کنار کرے۔

اس ملک کے مسلمانوں کو آپ کی علمی رہنمائی اور قیادت کی ضرورت ہے۔ گذشتہ دنوں ملک کی اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ انسانیت کے نام پر ایک دھبہ ہے۔ دوسری طرف مختلف نوع کی عصبیتوں جارحانہ طبقاتی، علاقائی، ولسانی کشمکشوں، مذہبی وثقافتی منافرتوں نے مسائل کی سنگینی اور اس کی شدت نے جو حالات پیدا کر دیئے ہیں ان سے مسلمانوں کے مسائل میں اضافہ ہو گیا ہے اس پر گہری تشویش ہے، اور افسوس ابھی، ان حالات میں آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ ملت کے سماجی، اقتصادی، ثقافتی، فلاح وبہبود، بقاء وتحفظ کے متعلق بھی غور وفکر وقت کا تقاضا ہے۔

ملک کا بگڑتا ہوا اقتصادی ڈھانچہ، قرضوں کا بوجھ، غربت وافلاس، معاشی بدحالی کے کے ہولناک اثرات، مسلمانوں پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہو رہے ہیں۔ لیکن منظم سازشی منصوبوں کے ذریعہ ان کے تجارتی مراکز کو ختم کرنے اور ان کی صنعت وحرفت کو نقصان پہونچانے کا سلسلہ زیادہ خطرناک اور اقتصادی دیوالیہ کی واضح نشانی ہے۔

جان ومال کا نقصان اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو جدید معاشی نظام کے زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

محترم فقہاء!

دوسرا اہم یا قابل توجہ مسئلہ ملت اور خود ملی کام کرنے والوں کے درمیان باہمی عدم اتحاد کا فقدان ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کو باہمی انتشار وافتراق سے بچانے اور ان میں اتحاد واتفاق کی روح پھونکنے میں آپ تاریخ میں بڑا کردار ادا کرتے رہے ہیں اور ایک بار پھر ایک نئے انداز سے جد وجہد کی ضرورت آپڑی ہے۔ اتحاد اور باہم اشتراک وتعاون طاقت وقوت میں تاثیر کے لئے بنیادی شرط ہے۔ اتحاد کی راہیں ہموار کرنا اور متنوع جہتوں میں فکری وعملی سطح پر دوریوں کے خاتمہ کے لئے ایثار وقربانی وعمل کے ساتھ تبادلۂ خیالات کے ذریعہ آگے بڑھنے کی اشد ضرورت ہے۔

محترم علما!

ملک کے اقتصادی وسماجی ڈھانچہ نے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی جدوجہد کی راہ میں بڑی روکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں، تاجروں، صنعت کاروں کے لئے ہر سطح پر مجبوریاں ہیں خواہ وہ برضا ورغبت ہو یا بجبر واکراہ سرمایہ کاری میں مختلف قسم کے ٹیکسوں سے بچاؤ کے لئے بے شمار نامناسب طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں، جس سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، اور مسلم تاجر وصنعت کاروں میں صنعتی ومعاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کا احساس فزوں تر ہوتا جارہا ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی (IFA) کا اقتصادی مسائل پر فقہی نقطہ نظر سے غور وفکر کرنا ایک مسرت افزا اقدام ہے، جس سے ہندوستانی مسلمانوں اور اہل فکر ونظر میں انبساط کی ایک لہر دوڑ گئی ہے، اور آپ حضرات علماء سے ملت بہت پر امید ہے۔

آئی او ایس اپنے وسیع ومختلف النوع مقاصد کے مطابق علمی وتحقیقاتی کاموں سے زیادہ دلچسپی وتعلق رکھتا ہے اور ابتدا ہی سے وہ سماجی علوم، تاریخ، معاشیات، سماجیات نیز سماجی وتعلیمی مسائل وغیرہ پر سنجیدہ وٹھوس اقدامات کرتا رہا ہے۔ اس اعتبار سے ان تمام مسائل جن کو اپنا (IFA) آئندہ غور وفکر کا موضوع قرار دے گی۔

الحمد للہ آئی او ایس ان پر گہرائی کے ساتھ غور وفکر کرتی رہی ہے۔ اور اسے ماہرین کا تعاون بھی حاصل ہے۔ ادارہ ایسے تمام منصوبوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتا ہے بلکہ ان میں تعاون دینا اپنا اخلاقی فریضہ تصور کرتا ہے۔

آئی او ایس کی یہ تمنا ہے کہ ملت اسلامیہ ہندیہ میں اور اس کے قیادت کرنے والے علماء میں زیادہ سے زیادہ اتحاد واتفاق رونما ہو، اس سے مشترکہ جدوجہد اور منصوبہ بندی نیز دینی رہنمائی میں آسانی ہی نہیں تاثیری روح بھی پیدا ہوگی۔

مجھے امید ہے کہ ہندوستان کے تمام مکاتب فکر کے صاحب نظر فقہاء وعلماء اس نو تشکیل شدہ ادارہ (IFA) کے تحت قدم سے قدم ملا کر تاریخ ساز کردار ادا کریں گے۔ اللہ کرے یہ علمی کارواں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ داعی

(از) ـــــــــ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی سکریٹری جنرل اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

● قاضی شریعت امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، پھلواری شریف پٹنہ ●

بموقع دوسرا فقہی سمینار۔ ہمدرد کنونشن سینٹر، ہمدرد نگر، تغلق آباد۔ نئی دہلی

منعقدہ ۸/۹/۱۰/۱۱/ دسمبر ۱۹۸۹ عیسوی

حضرات ! ہندوستان کی علمی، تحقیقی اور فقہی تاریخ میں ۱۹۸۹ء کے اپریل کی پہلی، دوسری اور تیسری تاریخیں یاد رکھی جائیں گی جبکہ اسی نظر افروز اور فرحت بخش مقام پر کثیر تعداد میں ہمارے بزرگ اور اکابرِ دین وملت، مثلاً: علماء، بالغ نظر فقہاء و اہلِ افتاء، حوصلہ مند اور باصلاحیت نوجوان فضلاء، اور دین دوست وعلماء نواز دانشور ومفکرین ایک خاص جذبہ و ولولہ اور ذوق و شوق کے ساتھ ملک کے گوشے گوشے سے کھنچ کر جمع ہوئے تھے۔ ان کے جمع ہونے میں خلوص تھا اور جماعتی، مسلکی اور ہم عصری کی بنیادوں پر اٹھنے والی کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔ جو اس دور میں بہرحال نیک فال اور قابلِ ذکر چیز ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وقت گذرنے کے لئے ہے اور وہ دبے پاؤں گذر ہی جاتا ہے مگر اپنے ساتھ خوشگوار یادوں کا ایک تسلسل چھوڑ جاتا ہے ہم سب کے لئے یہ بات حد درجہ مسرت کی ہے کہ اس گذرے ہوئے وقت نے ہمارے لئے یادوں کا جو سلسلہ چھوڑا ہے وہ نہایت خوشگوار ہے اس وقت کی علمی چہل پہل اور تحقیقی سرگرمیاں یقیناً ہماری طرح آپ کی نظروں میں بھی ہوں گی۔ اس یادِ مجلسِ رفتہ کے ساتھ اقبال کا یہ معنی خیز شعر بھی یاد آیا ؎

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی، میرے استقبال کی تفسیر ہے

پہلا فقہی سمینار (جس کی یاد ابھی تازہ کی گئی) کے بعد آج ہم جب آپ کو دوسرے فقہی سمینار میں اسی مقام پر اسی جذبہ و حوصلہ کے ساتھ اپنے درمیان پا رہے ہیں تو حقیقی معنوں میں خوشی دو بالا ہو رہی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس چمکتی، دمکتی، دل لبھاتی دنیا میں تسکین کے بہت سارے سہارے اور جاذبیت و کشش کی ہزارہا چیزیں ہیں۔ مگر میرے خیال میں کسی صاحب علم و تحقیق کے لئے کسی علمی مسئلہ کی تلاش و جستجو میں جو لطف و مزہ اور کشش و جاذبیت ہے۔ وہ دنیا کی کسی چیز میں نہیں۔

ملک اور بیرون ملک کے مختلف گوشوں اور اداروں سے سفر کی دقتوں اور کلفتوں کو اٹھاتے ہوئے آنے والے رہ روان علم و تحقیق اور اصحاب فقہ و افتا کی خدمت میں ہم ان الفاظ کے ساتھ ہدیۂ سپاس و تشکر پیش کرتے ہیں۔ اور دل کی پوری گہرائی کے ساتھ اس تاریخی شہر کے اس علمی ماحول اور تحقیقی فضا میں ان کا استقبال کرتے ہوئے خوش آمدید کہتے ہیں ؎

اے آمدنت باعث خوش بختیٔ ما۔

محترم علماء و فضلاء!

اس حقیقت کو آپ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے کہ جس دین متین سے ہماری اور آپ کی وابستگی ہے۔ وہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر دائمی۔ ابدی اور آفاقی ہے۔ اسے دربار خداوندی سے "رضیت لکم الاسلام دینا" کا پروانہ عطا کیا جا چکا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ انتباہ بھی دیا گیا ہے کہ "ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ" اس دین فطرت کی بنیادی کتاب "قرآن حکیم" ہے۔ جسے خالق انسان و کائنات نے اپنے آخری نبی محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر انسانی ہدایت کے لئے نازل فرمایا۔ آپ کا ۲۳ سالہ مدار دور نبوت اسی آخری دین کی دعوت اور اس کی تشریح و توضیح اور کتاب ہدایت (قرآن) کی تفسیر و تبیین میں گذرا۔ ہم اور آپ جسے "حدیث" کہتے ہیں وہ آپؐ کے ہی اقوال۔ افعال اور احوال کا مجموعہ ہے۔ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) نے آپ سے براہ راست فیض حاصل کیا اور منشا، نبوت اور مزاج شریعت کو خوب جانا اور سمجھا۔ ان کو دین کی حقیقت اور علم کی روح اور اس کا مغز حاصل تھا۔ اس لئے وہ اپنے دین و علم دین کی خصوصیات میں قیامت تک ممتاز ہیں۔ ان کے اس امتیاز کے لئے سیدنا حضرت عبد اللہ بن مسعود کے الفاظ سے زیادہ گہرے اور سچے الفاظ نہیں مل سکتے۔ ان الفاظ میں علماء برادری کے لئے بھی اہم سبق اور پیغام ہے فرماتے ہیں۔

اولئك اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابرالناس قلوبا واعمقہم علما واقلہم تکلفا۔	صحابہ (رضی اللہ عنہم) لوگوں میں سب سے زیادہ دل کے سچے، علم کے گہرے اور تکلف سے دور تھے۔

قرآن کی آیات، احادیث کا ذخیرہ اور صحابۂ کرام کے آثار۔ دین اسلام کو سمجھنے کے لئے بنیادی ماخذ اور مصادر کا درجہ رکھتے ہیں۔ پھر اخبار امت کا اجماع ہے۔ مدالحین فی العلم کا قیاس ہے۔ ائمہ کبار اور علماء واسلاف کا اپنے زمانے اور حالات کے اعتبار سے مسائل کا استخراج واستنباط ہے۔ جس کی مفصل اور وسیع تاریخ ایسی مثال ہے کہ جس کی نظیر دنیا کے موجودہ مذاہب میں سے کسی مذہب میں نہیں مل سکتی۔ ایسی تاریخ اور ایسا ریکارڈ رکھتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی دور اور کسی زمانہ کے علماء دین اپنے دور اور اپنے زمانہ کے تقاضوں کی حقیقی تکمیل اور پیش آمدہ مسائل کے صحیح حل میں ہمت ہار جائیں۔ غفلت کی چادر اوڑھ کر سو جائیں۔ اور جمود ان پر طاری ہو جائے؟ ـــــ جب پچھلے دور میں ایسا نہیں ہوا (اور کسی ابدی دین کے ساتھ ایسا معاملہ پیش بھی نہیں آسکتا) اور ہر زمانہ کے علماء اپنے زمانہ کے حالات اور مسائل سے واقف ہو کر رہبری اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے تو اس زمانہ کے علماء کو بھی اپنے زمانہ کی ضرورتوں سے واقف ہونا پڑے گا۔ اور آج کی سائنسی ایجادات، طبی تحقیقات، معاشی ترقیات، مختلف سماجی وجغرافیائی حالات، حمل ونقل کے جدید ذرائع اور ترسیل وابلاغ کے نئے آلات نے نت نئے فقہی وشرعی مسائل جو پیدا کئے ہیں ان کا حل پیش کرنا ہوگا۔ حساس علماء نے اپنے وقت کے علماء کی توجہ اس طرف ہمیشہ مبذول کرائی ہے۔ نابغۂ روزگار عالم دین مولانا سید سلیمان ندوی اپنی وفات سے چند ماہ بیشتر جب پاکستان سے ہندوستان تشریف لائے تو بار بار فرماتے کہ۔

"اس وقت نئے نئے مسائل سامنے آرہے ہیں اور ایسے علماء کی ضرورت ہے جو ان مسائل کا تشفی بخش جواب دے سکیں۔ اس لئے فقہ کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ کرنا چاہیئے" ـــــ (مطالعہ سلیمانی ص ۱۳۸)

خوشی کی بات ہے کہ عالم اسلام کے علماء فقہاء اس طرف متوجہ ہیں اور مختلف ممالک میں فقہی اکیڈمیاں قائم ہیں۔ جہاں مختلف انداز سے ان مسائل پر کام ہو رہا ہے۔ ماضی قریب کے ہندوستانی علماء میں مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب مولانا اشرف علی تھانوی صاحب۔ اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اس سلسلہ میں جو کوششیں کی ہیں وہ نہ صرف لائق تحسین بلکہ قابل تقلید بھی ہیں۔ اور ان کے

کام کو آگے بڑھانا۔ اور پھر اس طرح کے کام کو باہم مربوط کرنا اور مسلک و مشرب اور تنظیم و ادارہ کے اختلاف سے بالاتر ہوکر فریق کے بجائے "رفیق" کے احساس کے ساتھ اجتماعی شکل میں ان مسائل پر غور کرنا بلاشبہ وقت کا اہم تقاضا ہے۔

آج سے چند سال پیشتر مرکز البحث العلمی کا قیام جو عمل میں آیا۔ اس میں دراصل یہی احساس اور جذبہ کارفرما تھا کہ ہندوستان جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ایک خاص نظام اور دستور کے مطابق زندگی گذار رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے سماجی، معاشرتی، اور معاشی سطح پر یہاں جو بعض نئے مسائل مسلمانوں کے لئے پیدا ہو رہے ہیں وہ بالکل الگ نوعیت کے ہیں۔ اور ان مسائل سے دوسرے ممالک اور خطوں میں رہنے والے مسلمان دوچار نہیں ہیں۔ گویا ہندوستانی مسلمانوں کے مخصوص حالات نے ان کے لئے ہندوستان میں بعض مخصوص فقہی مسائل پیدا کر دئے ہیں۔ جن پر غور و خوض کر کے مناسب حل یہاں کے علماء و فقہاء کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

ان جذبات اور احساسات کے پس منظر میں "مرکز البحث العلمی" کے تحت پہلے ایک علمی، فقہی، تحقیقی اور دستاویزی نوعیت کا مجلہ "بحث و نظر" کے نام سے نکالنا شروع کیا گیا۔ جسے اہل علم و تحقیق نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ اور ایسا محسوس ہوا کہ یہ ان کے دل کی آواز ہے۔

اس رسالہ سے جب حوصلہ و ہمت کو تقویت ملی اور اس نئے اور اہم کام کے لئے راہیں ہموار نظر آئیں تو "پہلا فقہی سمینار" اسی مقام پر منعقد کیا گیا، جس میں مباحث کے لئے جو تین عنوانات مقرر کئے گئے تھے وہ یہ تھے۔

(۱) پگڑی کا مسئلہ
(۲) اعضاء کی پیوندکاری
(۳) ضبط تولید کا مسئلہ

بفضل خدا یہ پہلا سمینار توقع سے زیادہ کامیاب ہوا۔ اور جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا کہ بہت بڑی تعداد میں ممتاز علماء اور اصحاب فقہ و افتاء نے شرکت کی خصوصیت کے ساتھ حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی مدظلہ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے افتتاحی خطبہ۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب دامت برکاتہم صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا خطبۂ صدارت: مشہور فاضل ڈاکٹر طہ جابر فیاض العلوانی صدر المعہد العالمی للفکر اسلامی واشنگٹن۔ امریکہ کے خصوصی خطاب اور حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب (جلال آباد) مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی مدظلہ اور

مولانا مفتی نظام الدین صاحب مدظلہ (دیوبند) کے تائیدی کلمات نے اس سیمینار کو بڑی تازگی اور قدرت بخشی اور ایک خاص قسم کی روح اور جان ڈالدی۔ اس سیمینار کی مفصل روداد جس میں موضوع سے متعلق مقالات اور مباحث شامل ہیں "بحث ونظر" کے خصوصی شمارہ "فقہی سیمینار نمبر" (صفحات ۴۰۸) میں ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اس نمبر کو اہل علم وتحقیق نے شوق کے ہاتھوں لیا اور قدر کی نگاہوں سے پڑھا۔

آپ کے علم واطلاع کے لئے اس موقع پر یہ بات بھی عرض کرتا چلوں مرکز البحث العلمی کی ایک نشست ۱۰ ستمبر ۱۹۸۹ء کو پھلواری شریف پٹنہ میں منعقد ہوئی جس میں طے کیا گیا کہ ان علمی وفقہی کاوشوں کو منظم کرنے کے لئے وسیع تر دائرہ میں ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا جائے چنانچہ کام کی نوعیت اور موضوع کی مناسبت سے مرکز البحث العلمی کی "تشکیل جدید" مجمع الفقہ الاسلامی (الہند) کے نام سے عمل میں آئی۔ اس سلسلہ میں اکابر علماء سے اس کی خواہش کی گئی کہ وہ اس کی سرپرستی اور رکنیت قبول فرمائیں۔ یہ ہم سب کے لئے خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ ہمارے بزرگ علماء میں امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی مدظلہ اور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ نے سرپرستی قبول فرمائی ہے۔ اور دوسرے بزرگوں سے اس کی امید ہے۔

اس سلسلہ کا دوسرا فقہی سیمینار جس میں آپ شرکت کے لئے تشریف لائے ہیں اس کے دو خاص موضوع ہیں۔

(۱) نوٹ کی شرعی حیثیت۔ کرنسی پر افراط زر کے اثرات اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے فقہی سوالات۔

(۲) سود کا مسئلہ خاص کر ہندوستان جیسے ملک میں سرکاری سودی قرضوں کا حکم

ہمیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ یہ سیمینار بھی پہلے سیمینار کی طرح انشاء اللہ کامیاب ہوگا۔ اور اس میں پڑھے گئے مقالات اور کئے گئے مباحث علمی اور سنجیدہ ہوں گے۔ جن سے ان مسائل کے حل اور فیصلے میں آسانی ہوگی۔ خدا نے توفیق دی اور آپ حضرات کا مخلصانہ تعاون شامل رہا تو انشاء اللہ یہ روداد مجمع الفقہ الاسلامی کی طرف سے دستاویزی شکل میں شائع کی جائے گی۔

میں اس موقع پر اپنے اس احساس کو چھپا نہیں سکتا کہ ان دونوں سیمینار کے لئے طلب کئے گئے مقالات سے اندازہ ہوا کہ ہمارے علماء میں اب بھی علم وتحقیق کا مزاج اور تلاش و جستجو کا ذوق ہے۔ ان کے اندر نئے مسائل پر نئے انداز سے سوچنے، لکھنے اور قدیم و جدید

فقہی کتابوں کے ذخیرے سے استفادہ کی بھرپور صلاحیت موجود ہے ۔ اس سیمینار نے انہیں نیا حوصلہ اور نیا اعتماد بخشا ہے ۔ مطالعہ کی قوت کو نکھارا اور استخراج و استنباط کی صلاحیت کو ابھارا ہے ۔

اسی طرح اس سیمینار سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ دینی علوم اور عصری علوم کے ماہرین ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیال کرنے میں خوشی اور مسرت محسوس کر رہے ہیں ، اور یہ دونوں دور کے جو مصنوعی خول میں بند تھے اس خول کو اتار رہے ہیں ۔ اور آپسی خلیج کو پاٹ کر فاصلہ کو قربت میں بدل رہے ہیں خصوصیت کے ساتھ ان دونوں طبقات کے نوجوانوں کی جو صلاحیتیں ادھر سامنے آرہی ہیں ۔ انہیں دیکھ کر بلا ساختہ زبان پر آتا ہے ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

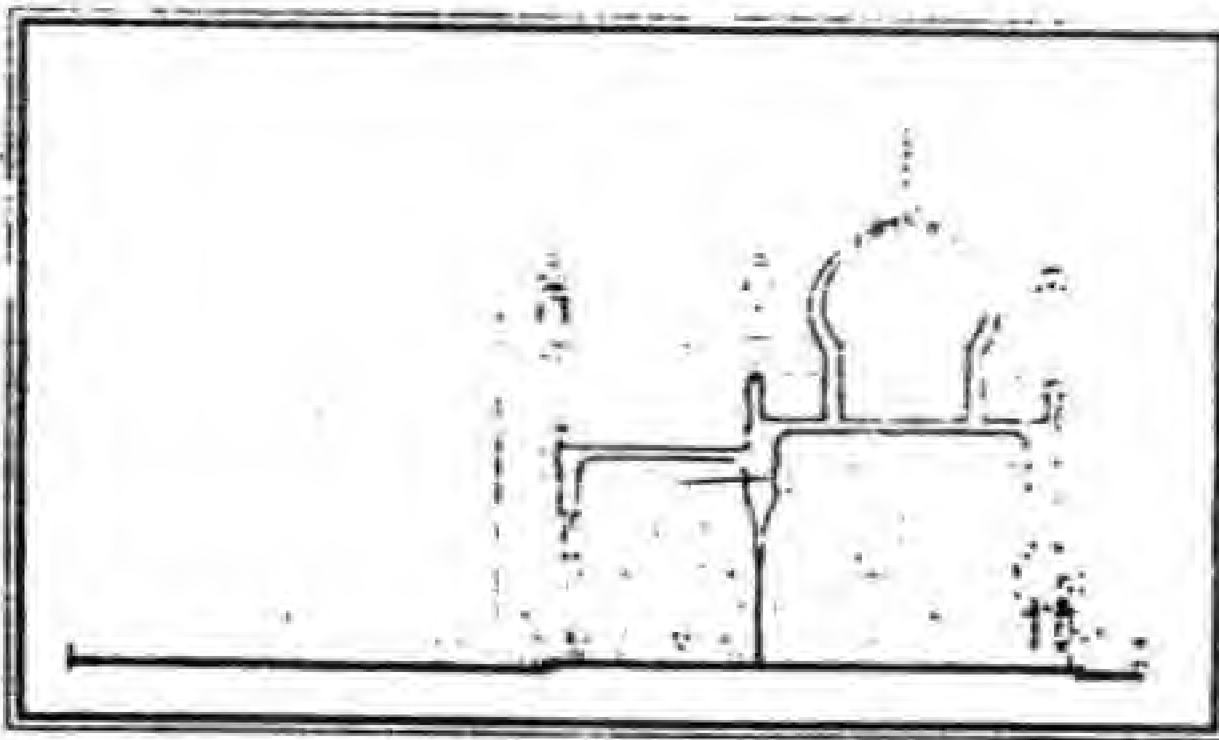
آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہمارے اس دوسرے فقہی سیمینار میں عالم اسلام کے بلند پایہ فاضل اور بالغ نظر دانشور ڈاکٹر جمال الدین عطیہ ۔ قاہرہ سے تشریف لائے ہیں ۔ دوسرے مہمان خصوصی جو اس وقت ہماری مجلس میں تشریف فرما ہیں وہ ہیں حضرت مولانا رفیع احمد عثمانی مدظلہ ۔ اہل علم جانتے ہیں کہ آپ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے خلف الرشید مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم کراچی کے مہتمم اور مفتی اور بہت سارے علمی کمالات اور اخلاقی محاسن کے حامل ہیں ۔ اس موقع پر ہم ان دونوں مہمان گرامی کا بطور خاص شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کے وجود نے اس سیمینار میں خاص قسم کی رونق اور گرمی پیدا کی ۔ جزاهما الله احسن الجزاء ۔

"عرض داعی" کی آخری سطروں میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کے صدر ڈاکٹر محمد منظور عالم صاحب کا نام زبان قلم پر آرہا ہے ۔ اگرچہ ابتدائی سطروں ہی میں ان کا نام آنا چاہئے تھا کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقائے کار کی خصوصی دلچسپی اور میزبانی سے پہلے کی طرح اس دوسرے سیمینار کے انعقاد میں بھی سہولت ہوئی ۔ ہم اس کے لئے ڈاکٹر صاحب ، ان کے ادارہ اور ان کے رفقاء کے تہ دل سے شکر گذار ہیں ۔

یہ داعی اپنی معروضات اس سیمینار کے پس منظر میں ایک سبق آموز واقعہ کو نقل کرکے ختم کرتا ہے اس واقعہ کا تعلق امام ابوحنیفہؒ کے لائق شاگرد امام محمد سے ہے ۔ ان کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ امام محمدؒ راتوں میں کتابوں کے مطالعہ کے عادی تھے موسم گرما میں یہ حال ہوتا کہ کتاب کھلی ہوئی ہے ۔ بدن کا کرتا اترا ہوا ہے اور پانی سے بھرا طشت سامنے ہے ۔ جب نیند کا غلبہ ہوتا ہے

توطشت سے پانی لے کر آنکھوں پر چھینٹے دیتے تاکہ یہ غلبہ ختم ہو اور پوری بیداری اور تیقظ کے ساتھ اپنا مطالعہ جاری رکھیں، اور نئے نئے مسائل کا اخراج و استنباط کریں۔ رات کے اس مسلسل عمل نے ان کی صحت پر جب مضر اثرات ڈالے تو ایک رات ان کے چند رفقاء ان کی خدمت میں آئے اور کہا کہ آپ یوں مسلسل نہ جاگیں۔ اور سویا بھی کریں ورنہ آپ کی صحت خراب ہوجائے گی رفقاء کی بظاہر اس ہمدردانہ بات کو سننے کے بعد امام محمد نے جو جواب دیا۔ کاش اس جواب کی تہ تک آج ہم سب پہونچ سکتے۔ اور اس میں چھپے ہوئے پیغام پر غور کر سکتے۔ فرمایا۔

"لوگ تو اس بھروسہ پر سو رہے ہیں کہ کوئی نیا مسئلہ ہمارے سامنے آئے گا تو محمد کے پاس جائیں گے۔ محمد بھی اگر سوجائے تو لوگ پھر کہاں جائیں گے؟





بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ افتتاحیہ

از ــــــــــــــ ڈاکٹر جمال الدین عطیہ، ایڈیٹر "المسلم المعاصر" قاہرہ (مصر)

نوٹ: دکتور جمال الدین عطیہ اصول فقہ کے ماہر شمار کئے جاتے ہیں، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، موصوف کا اصل خطبہ عربی زبان میں تھا جس کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ. وأصلی وأسلم علی سیدنا محمد رسول الھدی الی البشریۃ الذی نجتمع الیوم لاقتضاء خطاہ والبحث عن حلول لمشاکلنا المعاصرۃ فی ضوء الشریعۃ السمحۃ التی جاء بھا

میرے لئے شرف کی بات ہے کہ آج میں آپ لوگوں کے درمیان "المعھد العالمی للفکر الاسلامی" اور اس کے صدر جناب ڈاکٹر طہ جابر علوانی کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ جن کی خواہش تھی کہ وہ خود تشریف لائیں۔ لیکن بعض ناگزیر حالات اور گوناگوں مصروفیات کی بنا پر وہ تشریف نہیں لاسکے۔

یہ پہلا موقع ہے کہ میں ہندوستان کی زیارت سے مشرف ہوا۔ گرچہ اس سے قبل سری لنکا اور پاکستان کی زیارت کرچکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری یہ زیارت دائمی اور مفید تعلقات کا آغاز ثابت ہو۔

اور اسی طرح یہ پہلا موقع ہے کہ میرے لئے آپ کے اس مؤقر اسلامک فقہ اکیڈمی کے [illegible] کا شرف حاصل ہوا۔ جس نے برصغیر میں اجتہاد، افتا، علمی تحقیقات اور تجدید دین کا [illegible] دیا ہے۔

میرے [illegible] مزید باعث شرف و عزت ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذمہ داروں نے مجھ سے خطبہ افتتاحیہ [illegible] فرمائش کی۔

قبل اس [illegible] کہ میں آپ کے سامنے اپنے افکار و خیالات کا اظہار کروں۔ ضروری ہے کہ میں اولاً اس کے فکری، اصولی، اور تاریخی ڈھانچے آپ کے سامنے پیش کردوں۔

معززسامعین!

ہمارے سامنے اس سیمنار کے ایجنڈے میں دو اہم مسئلے زیرغور ہیں پہلا نوٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق ہے۔ اور دوسرا مسئلہ سودی بینکنگ سسٹم سے متعلق ہے۔ ان دونوں مسئلوں کا تعلق ان اہم اقتصادی مسائل سے ہے جس نے علماء اسلام کے ذہن و دماغ کو پچھلی صدی عیسوی سے اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔

یہ دونوں مسئلے ——— اور اسی طرح کے اور بھی متعدد نئے مسائل ہیں جو سلف صالحین کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اور یہ ایک فطری امر ہے۔ کیونکہ سماجی تغیرات اور زندگی کی نت نئی پیچیدگیاں ان نئے مسائل کے پیدا ہونے کے سبب ہیں۔ اور کائنات میں ان تبدیلیوں کا ظہور پذیر ہونا اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہے کہ تبدیلیوں کو وجود میں لاتی ہے اور خود نہیں بدلتی۔

اور یہ بات مسلم ہے کہ اسلام بنی نوع انسان کے لئے خدا کا آخری پیغام ہے۔ اور اس کا حال سابقہ آسمانی شریعتوں سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ پہلے جب بھی کوئی نئی شریعت آتی تو وہ پچھلی شریعتوں کے بنیادی اور اساسی اصول و قوانین کو باقی رکھتے ہوئے ان مسائل کو اپنا مرکز توجہ بناتی جو یا تو نئے ہوتے یا پچھلی شریعتوں میں اس درجہ وضاحت کے ساتھ موجود نہ ہوتے۔

اور ان دونوں امور (حالات زندگی میں مسلسل تبدیلی، اور اسلام کے آخری دین ہونے) کی بنیاد پر ضرورت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ زندگی میں رونما ہونے والے ان نئے مسائل سے متعلق شریعت کا حکم بیان کرنے کے لئے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے۔

محترم سامعین!

فقہ کی کتابوں میں کاغذی نوٹ اور بینکنگ سسٹم سے متعلق ہمیں کوئی مستقل بات نہیں ملتی کیونکہ یہ نئے نظام اس وقت رونما ہوئے جب فقہ اسلامی اپنی نشوونما اور جدت سے رک گیا۔ اور یہ وہ چیز ہے جسے باب اجتہاد کے بند ہو جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور بعض علماء کرام (اپنی تقلیدی رجحانات کی وجہ سے) ان مسائل کا حکم شرعی براہ راست کتاب و سنت سے اخذ کرنے کے بجائے ان جیسے دوسرے مسائل میں فقہاء کرام کی مستنبط کی ہوئی آراء پر قیاس کے ذریعہ متعین کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ جبکہ یہ ایک بنیادی غلطی ہے جس نے ہماری فقہی زندگی

کے دائرہ کار کو تنگ کر دیا ہے۔

کیونکہ قیاس کا اصول (جیسا کہ فقہ اسلامی کا ہر اسکالر جانتا ہے) یہ ہے کہ قیاس ہمیشہ ان واقعات و مسائل پر ہوتا ہے جن کے احکام کتاب وسنت میں منصوص ہیں ـــــ لیکن اہل اصول میں سے کوئی اس بات کا قائل نہیں کہ جدید مسائل کو ایسے مسائل پر قیاس کیا جائے جو خود مجتہد فیہ ہوں۔ اور یہ وہ جامد طریقہ کار ہے جس کے اندر نہ تو کسی اختلاف کو ختم کرنے کی صلاحیت ہے اور نہ ہی ایسا مرجع و معیار بننے کی جس سے خطا و صواب کے درمیان امتیاز ہو سکے۔ خطا و صواب کے درمیان امتیاز کا اصل معیار کتاب وسنت ہے۔

لیکن اس کا مطالبہ یہ ہرگز نہیں کہ ہم فقہاء کرام کی ان آراء سے بھی صرف نظر کریں جو ان نئے مسائل کے سلسلے میں نہیں ہیں لیکن وہ ہماری فقہ کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں جن سے ہمیں ان امور میں رہنمائی ملتی ہے جن پر حالات اور زمان و مکان کی تبدیلی اثر انداز نہیں ہوتی۔

یہ امر ہمیں اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ دور حاضر میں مسئلہ اجتہاد سے متعلق دو اہم بنیادی مسائل پر اظہار خیال کریں۔

(۱) ـــــ پہلے مسئلہ کا تعلق جزئی اجتہاد کی طرف توجہ مبذول کرنے سے ہے۔ کیونکہ دور حاضر میں علوم و معارف کی کثرت و تنوع کی وجہ سے اجتہاد مطلق کے شرائط کا تحقق مشکل ہے۔ اور کسی خاص علم و فن میں تخصص و مہارت اس دور کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور تمام علوم و فنون پر بصیرت رکھنے والے علماء کا وجود سلف صالحین کی طرح شاذ و نادر ہے۔ اب اس کی متبادل صورت یہ ہے کہ اجتہاد میں اس طرح تخصص کیا جائے کہ علم کی مختلف شاخوں میں سے ہر شاخ کے ماہرین تیار ہوں۔ مثلاً اقتصادیات۔ سماجیات۔ بین الاقوامی تعلقات وغیرہ۔

اور کسی مجتہد کو اجتہاد کی اجازت صرف اس شکل میں ہو جبکہ وہ اجتہاد میں مطلوب شرائط کا حامل ہو۔ اور اپنے تخصص کئے ہوئے علم سے متعلق علوم شرعیہ کا بھی ماہر ہو۔ اور عصری علوم کے مطالعہ کے ذریعہ اسے حقیقت حال کا بھی علم ہو۔

(۲) ـــــ دوسرے مسئلے کا تعلق انفرادی اجتہاد کے بجائے اجتماعی اجتہاد کی طرف توجہ مبذول کرنے سے ہے۔ تاکہ اجتماعی اجتہاد کے نتیجہ میں مجتہدین جس رائے پر متفق ہوں، وہ انفرادی اجتہاد کے مقابلہ میں اقرب الی الصواب ہو۔ تاکہ کار اجتہاد ایک منظم ادارے کی صورت میں تبدیل ہو جائے۔ جس کی رکنیت کے شرائط۔ اور طریقہ کار کا تعین ہو۔ اور اس جیسے دوسرے اداروں

کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت معلوم ہو۔ اور اس طرح اسے ملک میں پائے جانے والے مختلف نظاموں کے درمیان صحیح مقام مل سکے۔ اور اس کے ساتھ وہ دوسرے اسلامی ممالک میں پائے جانے والے اپنے جیسے اداروں کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کر سکے۔ اس سلسلہ میں میں آپ کے اس اہم اسلامک فقہ اکیڈمی کے سامنے یہ تجویز رکھتا ہوں کہ اس کی نظر عالم اسلام کی دوسری فقہ اکیڈمیوں میں ہونے والی تحقیقات۔ اور تجاویز وقرار دادیں پر رہے۔ اگر ان کے فیصلوں سے آپ متفق ہوں تو اسی پر اکتفا کیا جائے۔ اور آپ کی کوششیں ان امور کی طرف مبذول ہوں جو ابتک موضوع بحث نہ بنے ہوں۔ خاص طور پر وہ امور جن کا تعلق ہندوستانی معاشرہ سے ہے اور جن کی طرف توجہ دینا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کے لئے میں ذیل میں دو مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔ اور مجھے مسرت ہوگی کہ یہ دونوں موضوعات تیسرے فقہی سمینار کے ایجنڈے میں شامل ہوں۔

(۱) —— پہلے مسئلہ کا تعلق اقلیتوں کی مخصوص فقہ سے ہے چونکہ ہندوستانی معاشرہ مختلف نسلوں، زبانوں، تہذیبوں، اور مذاہب کا گہوارہ رہا ہے۔ اور مسلمان اس معاشرہ کی ایک اہم اقلیت ہیں ان کی ایک تاریخ ہے۔ اور ان کے دوررس اثرات ہیں، اسی کے ساتھ ان کے کچھ مسائل اور مشکلات اور خصوصیات ہیں۔

پس مذکورہ صورت حال میں نہ تو اس پر دارالاسلام کے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ اور نہ دارالحرب کے اور نہ ہی دارالعہد کے۔ اور اس سلسلے میں ہندوستان تنہا نہیں ہے بلکہ اس جیسے اور بھی بہت سارے ممالک ہیں جن میں مسلم اقلیتیں آباد ہیں جن پر دستوری اور بین الاقوامی ترقی کی بنا پر دار کے مذکورہ اقسام کے احکام منطبق نہیں ہوتے۔ اور اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ان حالات پر غور وفکر کیا جاتے اور ان کے مناسب فقہی احکام تلاش کئے جائیں۔ اسی کو میں نے پہلے "فقہ الاقلیات" سے تعبیر کیا تھا۔ اور ان حالات کا صحیح اندازہ اور اس سے متعلق اجتہاد وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس سے دوچار ہیں اور جہاں تک آپ کے سعودی، پاکستانی، اور مصری بھائیوں کا تعلق ہے تو انھیں آپ کی طرح ان حالات کا علم نہیں ہے۔ اس لئے ان مسائل کی طرف توجہ دینا ان لوگوں کا اولین فریضہ ہے جن میں ان کے حل کرنے کی صلاحیت ہے۔ مذکورہ بالا مسائل کا تعلق تو فقہی احکام سے ہے۔

جہاں تک ایسے معاشرہ میں دین اسلام کی تبلیغ کا تعلق ہے تو ہمارا خیال ہے کہ موجودہ صورت حال میں تبلیغ دین کا سب سے موثر طریقہ اسوہ حسنہ اور اسلامی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانا ہے۔

اور یہ شہادت علی الناس کا بہترین طریقہ ہے۔

(۲) ـــــــ دوسرے مسئلے کا تعلق علوم شرعیہ کی تعلیم وتعلم اور اس کے فروغ دینے سے ہے۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ علماء ہند کو اسلامی علوم کے اہتمام اور اس کے قیمتی سرمایہ کی حفاظت اور اس کی تحقیق واشاعت میں ید طولی حاصل ہے۔

لیکن وقت آن پڑا ہے کہ اپنے ماضی کا جائزہ لیں اور سوچیں اور مستقبل کے لئے ایسا لائحۂ عمل تیار کریں جو اگلے مرحلے کے لئے نقطۂ آغاز ہو۔ اور دور حاضر کے تقاضوں کو اچھی طرح پورا کر سکے۔ مثلاً علم العقیدہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم عقیدے کے ان عناصر کو نمایاں کریں جن کا ذکر قرآن وحدیث میں قطعی دلائل کے ساتھ آیا ہے۔ ساتھ ہی عقائد پر استدلال کے سلسلے میں قرآن وحدیث کے قطعی دلائل کے علاوہ عصری علوم اور ان کی ترقیات سے بھی استفادہ کریں۔

اور علم کلام کے ان پیچیدہ مسائل سے صرف نظر کریں جنہوں نے اپنے خاص دور میں اس وقت کے شکوک وشبہات کے ازالہ میں اپنا تاریخی کردار ادا کیا۔ اور اب ہماری توجہات کا مرکز ان شکوک وشبہات کا ازالہ ہو جو دور حاضر کی پیداوار ہیں۔

اور قرآن کریم ہم سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ اس کتاب کے فہم وادراک اور اس کے احکام وفرائض پر عمل پیرا ہونے اور اسے اپنی زندگی کے لئے لائحہ عمل بنانے کے سلسلے میں اس کے ساتھ ہمارے تعلق کی کیفیت کیا ہو۔

قرآن عظیم کے سلسلے میں اتنی بات کافی نہیں کہ ہم اس کے صرف تشریعی پہلو کو اجاگر کریں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم عقیدہ وسلوک، اخلاق واعمال، تاریخ اور خدا کی تکوینی سنت کو بھی مرکز توجہ بنائیں۔ اور قرآن کریم کی تفسیر میں لغوی، فقہی، کلامی، اور مسائل تصوف کے علاوہ قرآن کی ان اساسی تعلیمات کو پیش نظر رکھیں جن کا تعلق انسان کی سیرت وکردار کی اصلاح وتعمیر سے ہے۔ تاکہ قرآن کریم سے ہم اپنی موجودہ زندگی کو مربوط کر سکیں۔

اسی طرح سنت وسیرت نبوی ہم سے اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان کی ایسی جامع خدمت کریں کہ اس کی ہر روایت کی تحقیق محدثین کے طریقے پر کر سکیں، اور پھر اسے انسائیکلوپیڈیا کی صورت میں مرتب کر سکیں۔ یہاں تک کہ سنت کے ہر اسکالر کے لئے ان کے شہ پاروں کی طرف رجوع کرنا آسان ہو سکے اور سنت وسیرت کے ساتھ انہیں اپنے تعلق کی کیفیت معلوم ہو سکے۔ اور وہ قرآن کی روشنی میں کامل طریقے پر اس کا فہم وادراک کر سکیں اور نقد سند کے

ساتھ نقد متن کا بھی اہتمام کریں اور علماء کی ایسی جماعت تیار کریں جو کہ مذکورہ بالا امور کو انجام دے سکیں یہاں تک کہ امت کا تعلق نئے سرے سے اس کی تہذیب و ثقافت اور ہدایت کے سرچشمے سے قائم ہو۔

اور فقہ اسلامی ہم سے اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم ان مثالوں کی بنیاد پر گفتگو کرنے کی بجائے جن کی موجودہ زندگی میں کوئی ضرورت باقی نہیں رہی ہے ایسی مثالیں پیش کریں جن کا تعلق ہماری عملی زندگی سے ہے۔ (مثلاً غلامی سے متعلق جزئیات) تاکہ ہم فقہ اسلامی کا ربط عملی زندگی سے قائم کر سکیں۔ اور ساتھ ہی ایسے نئے ابواب کا اضافہ بھی کریں جن کا تعلق دور حاضر کے مسائل سے ہے۔ مثلاً کاغذی نوٹ کی شرعی حیثیت۔ اور بینکنگ سسٹم اور انشورنس کے مختلف مسائل وغیرہ۔

اور ہم اسلام کے مختلف فقہی مذاہب کا تقابلی مطالعہ ان کے شرعی دلائل اور شریعت کے اغراض و مقاصد کی روشنی میں کریں تاکہ ہماری زندگی شریعت کے مصادر کا عملی نمونہ بن جائے جیسا کہ ائمہ عظام کے زمانے میں تھی۔ کہ جب وہ اپنے زمانے کے کسی مسئلے کے سلسلے میں کوئی حکم شرعی دیتے تو اس کے تمام پہلوؤں پر ان کی گہری نظر ہوتی۔

اصول فقہ

جہاں تک اصول فقہ کا تعلق ہے تو یہ وہ عظیم الشان علم ہے جس کے عناصر ترکیبی کو ترقی اور فروغ دینا ہمارا فریضہ ہے جس کی وجہ سے نہ صرف علم فقہ منضبط ہو سکا بلکہ اس کی افادیت موجودہ انسانی علوم اور سماجی علوم کو بھی شامل ہو۔ جیسے علم الاقتصاد، سماجیات، نفسیات وغیرہ۔ یہ وہ جدید علوم ہیں جن کی نشوونما انسانی افکار و تجربات کی روشنی میں وحی سے دور رہ کر ہوئی ہے۔ پس ضرورت اس کی متقاضی ہے کہ ہم ان علوم کا رشتہ وحی الہی سے جوڑیں اور وحی کی روشنی میں ان پر نظر ثانی کریں۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ ان علمی حقائق اور تکوینی سنتوں کے درمیان اور اخلاقی اقدار و روایات اور تشریعی احکام جو بذریعہ وحی معلوم ہوئے ہیں ان کے درمیان، اور ان جدید سائنسی حقائق کے درمیان ربط و تعلق قائم کریں جن تک جدید علوم کی رسائی ہو سکی ہے۔

اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں کہ ہم ان علوم کے عناصر ترکیبی کو اس طرح فروغ دیں جو اس طریقہ کار کے مناسب ہو۔ تاکہ علم اصول فقہ اور دوسرے اسلامی علوم انسانی علوم کے درمیان اپنا

صحیح وزن قائم کر سکیں۔ اور تاکہ ہم اس طرح اس خلیج کو پاٹ سکیں جو اسلامی تہذیب اور عصری تہذیب کے درمیان حائل ہے اور اس طرح یہ سارے انسانی علوم وحی کی برکات سے بہرہ ور ہو سکیں جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس وحی سے انہیں فیضیاب کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور میں اپنی بات ختم کرنے سے قبل دو باتیں خاص طور پر عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) ـــــــــ پہلی بات کا تعلق کاغذی نوٹ کی شرعی حیثیت سے ہے۔ ماضی میں سونے اور چاندی کے سکوں کا خاص مقصد تھا جس کی تکمیل اس کے ذریعہ ہو رہی تھی اور اسی بنا پر زکوٰۃ، صدقات، ربوا اور دوسرے دنیاوی معاملات سے متعلق شرعی احکام ان پر مرتب ہوتے تھے اور جب یہ سکے اس دور میں بتدریج بازار سے ہٹائے گئے اور ان کی جگہ کاغذی نوٹوں نے لے لی جبکہ ان کاغذی نوٹوں کا اعتماد کلی یا جزوی طور پر سونے اور چاندی کے ان سکوں پر ہی رہا پھر رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہو تا گیا۔ اور ان کاغذی نوٹوں کا دارومدار ان سکوں پر کسی بھی شکل میں باقی نہیں رہا جس کی وجہ سے بازار میں ایک شدید بحران پیدا ہوا جس نے ماہرین اقتصادیات کو تشویش و پیچ میں ڈال دیا کہ وہ کس طرح اس مسئلہ کا حل تلاش کریں یہاں تک کہ بعض ماہرین اقتصادیات اس بات پر مصر ہیں کہ ان کاغذی نوٹوں کا مدار سونے پر رکھا جائے۔

اور شرعی نقطۂ نظر سے جو چیز ہمارے لئے اہم ہے وہ یہ کہ فقہی احکام ہمیشہ کچھ مخصوص مقاصد کے ساتھ مربوط رہے ہیں پھر جب وہ مقاصد ختم ہو گئے تو فقہی احکام بھی بدل گئے۔

اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ علماء اسلام جب کبھی اس مسئلہ پر باہم تبادلۂ خیال کرتے ہیں تو ان کا ایک طبقہ ان کاغذی نوٹوں کو علی الاطلاق اصلی سکہ قرار دیتا ہے جبکہ دوسری جماعت اسے نقد (سکہ) تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہر دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو علی الاطلاق قبول کرنے کے نتیجہ میں جو صورت حال پیدا ہوئی اس نے کسی کو راضی کیا اور کسی کو ناراض۔ اور بحث و مباحثہ کا میدان گرم ہی رہا۔ اگر ہم اس بات پر دھیان رکھیں کہ احکام کا تعلق ہمیشہ مقاصد سے رہا ہے تو کاغذی نوٹوں کی حیثیت کا تعین کرتے وقت ان مقاصد کو پیش نظر رکھیں گے جو ان اوراق نقدیہ کا اصل فریضہ ہیں۔ یعنی ان کا ذریعہ تبادلہ ہونا۔ اور ہم ان احکام پر نظر ثانی کر سکیں گے جن کا تعلق ان فرائض سے ہے جنھیں کاغذی نوٹ اب سرے سے پورا نہیں کر رہے ہیں۔ یعنی ان کا قیمت اور قدر کے تعین کے لئے معیار اور مخزن (STORE OF VALUE) ہونا۔

اور یہ بات ہمارے پیش نظر رہے کہ کاغذی نوٹوں کے سلسلہ میں اصل پریشانی ان نوٹوں کا

اپنی ذاتی قیمت کا کھو دینا ہے جس کی وجہ سے اس کا قیمتوں کے لئے میعار ہونا فوت ہوگیا۔ بلکہ اس کے برعکس مختلف سامان کاغذی نوٹوں کی قیمت کی تعیین کے لئے میعار بن گئے۔ یعنی ایک بدلنے والی چیز ناقابل تغیر ہوگئی اور جس میں تغیر و تبدل کی صلاحیت نہیں تھی وہ بدل گئی۔ پھر ان نوٹوں کا اپنی ذاتی قیمت کھو دینے کے ساتھ افراط زر کا پیدا ہونا جس کی وجہ سے اس کا قیمتوں کے لئے مخزن ہونا ختم ہوگیا۔ اور جس نے مہارفین کو اموال کے حصول کی طرف متوجہ کردیا جو زیادہ پائیدار رہنے والے ہیں۔

یہ بات بھی ہمارے پیش نظر ہے کہ جب حکومت بازار کو ان کاغذی نوٹوں سے بھر دیتی ہے تو ان کی قیمت سامانوں کے مقابلے میں کم ہو جاتی ہے۔ جس پر قرآنی نہی "ولا تبخسوا الناس اشیاءهم" (اور تم لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دو) منطبق ہوتی ہے۔

اسی طرح ہم اس بات کو بھی مدنظر رکھیں کہ کاغذی نوٹوں کی قیمت گھٹ جانے کا اثر ان طویل المیعاد قرضوں پر پڑتا ہے مثلاً مہر موجل۔ اور اس کا اثر نوٹ کی قدر و قیمت میں تیزی کے ساتھ تبدیلی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جیسا کہ ترکی اور لبنان میں خاص طور پر اس کے اثرات محسوس کئے جا سکتے ہیں اور شاید کہ اس مسئلہ کا حل اس بات میں پوشیدہ ہو کہ ہم احکام کو قیمتوں کے ساتھ مربوط کریں۔ نہ کہ ظاہری صورت کے ساتھ۔

(۲) ۔ ——— دوسری بات کا تعلق بینکنگ سسٹم سے ہے تو بینکنگ سسٹم کے بعض معاملات خاص طور پر ایسے معاملات جو انسانی خدمت سے متعلق ہیں۔ اور جن کا تعلق نوٹوں کے ادھار کاروبار سے نہیں ہے تو ایسے معاملات کا حکم حلت ہے اور اس کے اوپر وہ احکام مرتب ہوتے ہیں جسے فقہ اسلامی میں اجارہ اور صرف کہا جاتا ہے۔

اور دوسرے بعض معاملات ایسے ہیں جن کی حرمت اور ان میں ربا کا تحقق واضح ہے جیسے کہ بینک کی امانتوں کی مختلف شکلیں۔

اور بعض معاملات وہ ہیں جن میں احکام خلط ملط ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ دونوں قسموں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جیسے کہ اعتمادات مستندیہ جو بعض لحاظ سے انسان کی خدمت ہے اور بعض لحاظ سے سودی قرض ہے۔

ہم صرف شریعت اسلامیہ سے متصادم بینکنگ معاملات کی حرمت کے قائل نہیں بلکہ ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ایسا متبادل انتظام کیا جائے۔ جو شرعاً قابل قبول ہو۔ اور اس سے وہ نتیجے حاصل ہو سکیں جو ان معاملات کا اصل مقصود ہیں۔ اور اسلامی بینکنگ سسٹم ایک کامیاب تجربہ ہے

ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ دوسرے تجربات کی طرح اس میں بھی غلطیوں کا امکان ہے جسے اسلام دشمن طاقتیں اسلام کے خلاف استعمال کر رہی ہیں۔ اور کافی زور و شور کے ساتھ اس کا مطالبہ کر رہی ہیں کہ اسلام میں زندگی کے معاملات کو منظم کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اور اس بنا پر وہ اس کا مطالبہ کرتی ہیں کہ اسلام کو محض عقائد، عبادات، اخلاقیات تک ہی محدود رہنا چاہئے۔ زندگی کے دوسرے معاملات میں اسے مداخلت کا حق نہیں ہے۔

اور سیکولر ذہنیت کے حاملین اسے مختلف طریقوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس بنا پر ہماری فقہی اکیڈمیوں اور تحقیقاتی اداروں کی ذمہ داری زیادہ اہم ہوجاتی ہے۔

ہم اللہ رب العزت سے دست بدعا ہیں کہ وہ ان کی مدد فرمائے۔ اور ان کے ذمہ داروں اور کام کرنے والوں کی رہنمائی کرے۔ اور انھیں اجر جزیل عطا کرے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین



حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب
صدر دارالعلوم کراچی

خطبہ صدارت

تغیر پذیر حالات میں اجتماعی اجتہاد کی ضرورت

جدید فقہی مسائل پر اجتماعی غور و خوض کی ضرورت:

خطبہ مسنونہ کے بعد!

اس اجتماع کا جو سب سے بڑا فائدہ ہے وہ یہ ہے کہ یہاں قدیم اور جدید علوم کے ماہرین کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے' اس زمانہ میں سیاسی' تمدنی' اقتصادی' طبی وغیرہ مسائل اتنے پھیل گئے اور اتنے گوناگوں ہوگئے ہیں کہ ان کے متعلق قرآن و سنت کی روشنی میں احکام شرعیہ کو مرتب اور مستنبط کرنا صرف اسی شخص کے بس کا کام ہو سکتا تھا' جو مجتہد مطلق کہلانے کا اہل ہوتا۔ لیکن مجتہد مطلق کا جو مقام ہے جو شرائط ہیں آپ حضرات جانتے ہیں ان کے پیش نظر آج دور دور تک کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو اجتہاد مطلق کا دعویٰ کر سکے' لیکن حالات سیاسی میدان میں' اقتصادی میدان میں' معاشرتی میدان میں اور مختلف شعبہ ہائے حیات میں اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں' اور اتنے بڑے پیمانے پر ان میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے کہ نت نئے فقہی مسائل پیدا ہو رہے ہیں جن میں امت کی رہنمائی کا فریضہ بہرحال علماء امت ہی پر عائد ہوتا ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ قرآن کو جو کچھ بیان کرنا تھا وہ بیان کر چکا' سرکار دو عالم ﷺ کو اپنی بعثت کے بعد تئیس سالہ زندگی میں قرآن کریم کی جو تشریح فرمانی تھی وہ فرما دی' اسلاف امت نے ان دونوں چیزوں کی حفاظت کی' نظم قرآن کی بھی اور معانی قرآن کی بھی'

ہمارا دعویٰ اور عقیدہ ہے کہ اب کوئی نئی شریعت آنے والی نہیں ہے' کسی اور نبی کے آنے کا امکان نہیں ہے' اللہ نے اپنے دین کی تکمیل کر دی اور اللہ نے ہمیں ایسی امت بنایا جو آخری امت ہے اور قیامت تک تمام مسائل کا سامنا اسی امت کو کرنا ہے' ان حالات میں جب کہ تبدیلیاں تو معاشرہ میں اتنی تیزی سے آرہی ہیں اتنے بڑے پیمانے پر آرہی ہیں کہ ہمارا فقہی ذخیرہ جس میں بلاشبہ ان تمام چیزوں کا حل اصولی طور پر ضرور موجود ہے مگر جزوی طور پر اور جزئیات کی صورت میں وہ پوری طرح کفالت نہیں کر رہا ہے۔

علماء امت کی ذمہ داری:

زندگی رواں دواں ہے' زندگی کا یہ قافلہ کسی کا انتظار نہیں کرتا یہ مسائل جو روز بروز پیدا ہو رہے ہیں ان کے بارے میں امت مسلمہ کی نظریں علماء امت ہی کی طرف اٹھ رہی ہیں' اقتصادی میدان میں آپ کیا کہتے ہیں؟ طبی مسائل جو پیدا ہو رہے ہیں ان میں آپ کی رہنمائی کیا ہے؟ معاشرت اور سیاست کے میدان میں جو نت نئے نظریات' مسائل اور رسوم جڑیں پکڑ رہے ہیں ان میں اسلام کی ہدایت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں نظریں علماء کرام ہی کی طرف اٹھ رہی ہیں' اور اس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی اس مسئولیت کو پورا کرنے کے لئے وہ جدوجہد اختیار کریں جو ہمارے اسلاف کا وطیرہ رہی ہے' کیونکہ ابھی امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول آپ سن چکے ہیں کہ ""اگر محمد بھی سو گیا تو یہ پوچھنے والے کس سے پوچھیں گے""

جو ذمہ داری اس وقت ائمہ مجتہدین پر اور ایک ایک امام پر آرہی تھی اب جب کوئی شخص ان کی جگہ لینے والا نہیں ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ وہ ذمہ داری جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے کندھوں پر تھی آج وہ ہم میں سے کسی ایک کے کندھے پر تو نہیں' لیکن ہمارے مجموعہ کے اوپر یہ ذمہ داری موجود ہے جس کا تقاضا ہے کہ تحقیق مسائل کیلئے راتوں کو جاگا کریں "مَنْ طَلَبَ الْعُلٰی سَہِرَ اللَّیَالِی"

مجھے والد محترم کا بیان کردہ ایک واقعہ یاد آرہا ہے وہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ سے روایت کرتے تھے' علامہ عثمانی "فرماتے تھے کہ علامہ انور شاہ کشمیری" جب مرض الموت میں تھے' ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ کسی وقت بھی وفات کی خبر آجائے گی' ایک رات تہجد کے وقت دیوبند میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ علامہ کشمیری" کی وفات ہوگئی ہے' علامہ شبیر احمد عثمانی "فرماتے ہیں کہ میں اس وقت بیتاب ہوکر جلد محلہ خانقاہ کی طرف حضرت کو دیکھنے کیلئے چلا' حضرت" کے کمرہ پر پہنچا تو دیکھا کہ لالٹین جل رہی ہے۔اس زمانہ میں بجلی نہیں تھی۔اجازت لیکر حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب دوزانو بیٹھے ہیں' کتاب ""شامی"" ہاتھ میں لئے لالٹین پر جھکے ہوئے ""شامی"" کے مطالعہ میں غرق ہیں بہت سخت

علالت اور ضعیف کا زمانہ تھا حضرت علامہ شبیر احمد ؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بطور شکایت عرض کیا کہ :-

> ''حضرت ؒ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ کہ شامی میں کونسا ایسا مسئلہ ہے جس کو آپ نے پہلے سے نہ دیکھا ہو' اور جو آپ کا دیکھا ہوا ہوتا ہے 'وہ آپ کو یاد بھی ہوتا ہے اور اگر کوئی مسئلہ ایسا تھا کہ جو آپ نے دیکھا نہیں تھا اور آپ کو یاد بھی نہیں تھا...... تو ہم آپ کے غلام کہاں مرگئے تھے 'ہم میں سے کسی کو حکم دیتے وہ مسئلہ نکال کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا 'اس تکلیف میں آپ اتنی مشقت اٹھا رہے ہیں''۔

علامہ عثمانی ؒ فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب ؒ مجھے دیکھنے لگے اور فرمایا کہ ''بھئی! یہ بھی ایک بیماری ہے'' تو حضرات! اگر تحقیق و جستجو اور مطالعہ کی عادت ایک بیماری ہے تو اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ یہ بیماری ہم سب کو لگا دے 'سچی بات یہ ہے کہ ہماری یہ بیماری چھوٹ گئی اور ہم صحت یاب ہو گئے یہ سارا زوال اسی کی نحوست سے ہے 'یہ بیماری ہمارے بزرگوں کو تھی راتوں کو جاگ کر انہوں نے امت مسلمہ کی رہنمائی کی ہے 'دوستو اور بزرگو بہت بھاری ذمہ داری ہم پر ہے۔

جزوی مسائل میں جزوی اجتہاد:

اب وقت نہیں رہا کہ صدیوں سال پہلے ہمارے اسلاف نے بہت عرق ریزی کے ساتھ جو کتابیں اور فتاویٰ مرتب کئے تھے محض ان کو دیکھ کر اور گرد و پیش سے آنکھ بند کر کے فتویٰ دیتے چلے جائیں.......... کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ بہت سے مسائل عرف 'مقام اور حالات زمانہ پر مبنی ہوتے ہیں.......... والد صاحب ؒ بکثرت فرمایا کرتے تھے کہ فقہاء کرام کا مشہور قاعدہ ہے:

"مَنْ لَمْ یعْرِف اَھْلَ زَمانِه فَھُوَ جَاھِل." حالات زمانہ پر جب تک نظر نہ ہو امت کی رہنمائی نہیں کی جاسکتی 'فتویٰ اور تفقہ کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ ان حالات میں ہماری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ قویٰ میں انحطاط ہے 'حالات میں ناسازگاری ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہے 'علمی صلاحیتیں بھی دن بدن کم ہوتی جا رہی ہیں۔ دوسری طرف مسائل بڑھتے جا رہے ہیں اور نئے نئے علوم سامنے آرہے ہیں 'ان حالات میں اس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے کہ جزوی مسائل میں جزوی اجتہاد کے راستے کو رواں دواں رکھا جائے 'جزوی مسائل میں اجتہاد فی المسائل میں ہمارے تمام فقہاء اور اکابر الحمدللہ بڑے بڑے کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی ''امداد الفتاویٰ'' ایک ایسی چیز ہے جو ان کے اجتہادی کارناموں کا واضح ثبوت ہے اور ساتھ ہی حسین یادگار بھی ہے۔

کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہے؟

یہ تصور ہمارے بہت سے حلقوں میں اب بھی موجود ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ والد

ماجد ؒ فرمایا کرتے تھے کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا، آج بھی بند نہیں ہے اور آئندہ بھی بند نہیں ہو گا، ہاں اس دروازے میں داخل ہونے کے لئے کچھ شرائط ہیں۔ اس زمانہ میں وہ شرائط افراد میں موجود نہیں رہے، اسی واسطے سمجھا جا رہا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا، بھلا قرآن وسنت کا بھی دروازہ بند ہو گا؟ ہمارے اکابر نئے مسائل میں مسلسل اجتہاد کرتے رہے ہیں۔ "امداد الفتاویٰ" کو اٹھا کر آپ دیکھیں خاص طور سے کتاب البیوع اور معاملات کے جو مسائل ہیں، ان کے اندر اجتہادی المسائل آپ کو جگہ جگہ ملے گا، ان میں صرف یہی کام نہیں کیا گیا کہ یہ بتا دیا جائے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز ہے، میں نے اپنے والد ماجد ؒ سے بار بار سنا وہ ہمیں تلقین فرمایا کرتے تھے کہ "معاملات بیوع وشراء سے متعلق، لین دین سے متعلق جب مسائل آئیں تو مفتی کے لئے یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ یہ معاملہ ناجائز ہے، بلکہ وہ یہ بھی بتلائے کہ جائز راستہ کیا ہے؟ یہ بتانا بھی مفتی کی ذمہ داری ہے ورنہ خطرہ ہے کہ بہت سے لوگ دین سے مایوس ہو کر اس طرح مرتد ہو جائیں گے کہ ان کو بھی خبر نہیں ہوگی کہ وہ مرتد ہو گئے ہیں"۔

جدید مسائل کے حل میں فقہاء امت اور علوم جدیدہ کے ماہرین میں تعاون کی ضرورت

ان حالات میں کسی ایک فرد کے بس کا کام یہ نہیں رہا کہ وہ اجتہادی المسائل کس خاص میدان میں تنہا کر سکے، مثلاً معاملات ہی کے باب میں اجتہادی المسائل تنہا کوئی شخص کر سکے، اور سارے مسائل کو حل کر دے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حالات زمانہ نے اور پچھلے دو سو سال کے سیاسی حالات نے جدید وقدیم علوم کے درمیان ایسی خلیج حائل کر دی کہ جن مسائل کا ہمیں حکم معلوم کرنا ہے ان مسائل کی صحیح صورت حال ہمیں نہیں معلوم اور جن حضرات کے سامنے صورت مسئلہ ہے انہیں جواب معلوم کرنے کا راستہ نہیں معلوم۔

میں مبارکباد پیش کرتا ہوں اسلامک فقہ اکیڈمی کے کارکنان حضرات کو خاص طور سے جناب مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کو کہ انہوں نے اس مشکل مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اسلامی فقہ اکیڈمی قائم کی، جس کے اندر انہوں نے قدیم وجدید دونوں کو ملا دیا اور اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی ہے جو برسوں سے ہمارے درمیان حائل چلی آ رہی ہے۔ واقعہ یہ کہ ان مسائل میں جتنی احتیاج علماء اور فقہاء اور مفتی صاحبان کی ہے کم وبیش اس کے قریب قریب ہی احتیاج ہمیں ان جدید علوم کے ماہرین کی ہے جن علوم کے بارے میں ہم شرعی احکام کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جدید علوم کے ماہرین سے ہمیں صورت حال معلوم ہوگی یعنی صورت مسئلہ یہ بتائیں گے اور جواب آپ دیں گے۔ اور صورت مسئلہ معین کرنا بھی آسان کام نہیں ہوتا کیونکہ مشہور مقولہ ہے کہ "السوال نصف العلم"، تو نصف العلم

جدید علوم کے ماہرین سے حاصل ہوگا اور باقی نصف العلم فقہاء کرام سے 'مجھے امید ہے کہ یہ اکیڈمی اس سلسلہ میں موثر کردار ادا کرے گی' اور اجتماعی اجتہاد کا میدان ہموار کرے گی۔

اجتماعی اجتہاد و قیاس کی نظیریں:

یہ اجتماعی اجتہاد و قیاس اس امت میں نئی چیز نہیں ہے غور کیا جائے تو پورے تسلسل کے ساتھ اس کی نظیریں ہمیں پچھلے چودہ سو سال کے اندر ملتی ہیں اور خود عہد رسالت ﷺ کے اندر ملتی ہیں' اساریٰ بدر (بدر کے قیدیوں) کے واقعہ میں سرور کائنات ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ حضرات علماء کرام کو معلوم ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ ہوا' اس میں خطا ہوئی اور اس پر عتاب بھی ہوا' یہ اجتماعی اجتہاد تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی ایسی ایک مجلس بنائی تھی' ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں کہ جو بھی نئے مسائل امت کو پیش آتے' خلفائے راشدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے ان سے دریافت کرتے کہ آپ نے کوئی حدیث اس سلسلہ میں حضور ﷺ سے سنی ہو تو بتائیں' اگر حدیث مل جاتی تو فیصلہ ہو جاتا ورنہ اجتہاد و قیاس سے فیصلہ کیا جاتا تھا۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگردوں کے ساتھ بحث و مذاکرہ کا سلسلہ قائم فرمایا اور تقریباً چالیس عظیم المرتبت تلامذہ کے ساتھ اجتماعی اجتہاد و قیاس کا سلسلہ جاری رکھا۔ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ عالمگیریہ مرتب کرنے کیلئے علماء کو جمع کیا' اس زمانہ میں حالات بدلے ہوئے تھے' نئے مسائل پیدا ہوتے تھے' انہیں حل کرنے کی ضرورت تھی اسی لئے فتاویٰ عالمگیریہ مرتب ہوا۔ اس زمانہ کے فقہاء کی جلیل القدر جماعت مقرر کی گئی "مجلۃ الاحکام العدلیہ" خلافت عثمانیہ ترکی میں مرتب ہوا' یہ بھی علماء کرام ہی کی ایک عظیم جماعت نے مرتب کیا۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ نے ستم رسیدہ عورتوں کی مشکلات کا فقہی حل تلاش کرنے کے لئے متعدد حضرات کو "الحیلۃ الناجزہ" کی ترتیب کے لئے مقرر فرمایا' میرے والد ماجد' اور مولانا مفتی عبد الکریم گمتھلوی' ان میں شامل تھے اس میں کئی مسائل میں فقہ مالکی پر فتویٰ دیا گیا ہے' لیکن اس فتویٰ کو شائع نہیں کیا جب تک کہ ہندوستان کے تمام ارباب افتاء سے مراجعت نہیں ہوگئی' اور اصحاب افتاء کی آراء اور تنقیدیں حاصل نہیں ہوگئیں' حرمین شریفین کے فقہاء سے خط و کتابت ہوئی' ان تمام مراحل کے بعد اس کو کتابی شکل میں شائع کرایا۔

اجتماعی مسائل میں انفرادی فتاویٰ سے احتراز:

میرے والد محترم' فرماتے تھے' ایسے اجتماعی مسائل جو پوری امت کو درپیش ہیں یا ملک کے تمام مسلمانوں کو درپیش ہیں ان میں انفرادی فتاویٰ نہ دیئے جائیں ان میں باہمی مشورہ نہایت ضروری ہے۔ ہمارے تمام بزرگوں کا یہی طریقہ رہا ہے۔ چنانچہ پاکستان میں بھی حضرت والد ماجد' اور حضرت مولانا محمد

یوسف بنوری ؒ نے ایک مجلس قائم کر رکھی تھی جو آج بھی "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کے نام سے موجود ہے۔ اس مجلس کی طرف سے کئی رسائل شائع ہوئے' ایک ایک مسئلہ پر بعض اوقات دو دو سال تک تحقیق ہوتی رہی۔

اپنے خیالات پر تنقید سننے میں وسیع الظرفی:

میں عرض کروں گا کہ اپنے بزرگوں نے ہمیں یہ طریقہ بھی بتلایا ہے کہ مسائل کی تحقیق اور اپنے خیالات پر تنقید سننے کے معاملہ میں کتنا وسیع الظرف ہونا چاہئے' میں اور میرے بھائی مولانا محمد تقی عثمانی اس زمانہ میں جب یہ مجلس اعضاء انسانی کی پیوند کاری کے مسئلہ پر' اور پراویڈنٹ فنڈ (P.F.) اور دوسرے مسائل پر تحقیق کر رہی تھی' درجہ تخصص فی الافتاء میں زیر تربیت تھے' آپ جانتے ہیں کہ وہ آدمی جو ابھی درس نظامی سے فارغ ہوا ہو اور درجہ تخصص فی الافتاء میں تربیت حاصل کر رہا ہو اس جیسی مجلس میں وہ کیا مشورے دے سکتا ہے' کیا مدد پہنچا سکتا ہے' لیکن ہم دونوں بھائیوں کو اور تخصص فی الافتاء کے دیگر طلبہ کو اس مجلس میں والد صاحب ؒ علماء کے ساتھ حکماً بٹھاتے اور ہم سب کو بحث وتحقیق میں شریک کرتے تھے' اس میں انہوں نے ہمیں اتنا جری بنا دیا تھا کہ جہاں مفتی اعظم پاکستان اور مولانا محمد یوسف بنوری جیسے جلیل القدر علماء گفتگو کر رہے ہوں' مسائل پر اجتہادی بحث کر رہے ہوں وہاں ہم لوگ صبح سے شام تک نہ جانے کتنی بار ان کی بات پر اعتراض کرتے' اور ان سے سوالات کرتے تھے۔ ان دونوں حضرات کو میں نے دیکھا کہ ہماری طالب علمانہ آراء کو وہ ایسے ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے جیسے کسی پیاسے کے سامنے پانی آگیا ہو' ظاہر ہے کہ اس کی یہ وجہ نہیں کہ ہمارے پاس دلائل زیادہ وزنی تھے' بلکہ وہ ہماری تربیت کر رہے تھے' ہمیں یہ بتلا رہے تھے کہ فقہی مسائل میں جہاں یہ ضروری ہے کہ ہم پورا پورا وقت دیں اور صلاحیتیں صرف کریں یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ دوسروں کے نقطہ نظر کو پوری توجہ اور حق پسندی کے ساتھ سنیں' اس کے بغیر کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ ہم انشاء اللہ اسی جذبہ کے ساتھ اس سیمینار کے تمام مباحث میں حصہ لیں گے کہ ہم ہر ایک کی بات اسی توجہ کے ساتھ سنیں گے جیسے کوئی طالب علم اپنے استاد کی بات سنتا ہے' اس طرح ہم لوگ بہت سارے نتائج تک پہنچ سکیں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انشاء اللہ مدد ہوگی۔

ہمارے بزرگوں کا ایک خاص امتیاز:

ہمارے بزرگوں کا ایک طغری امتیاز ہے بلکہ پوری امت کے علماء اہل سنت والجماعت کے تمام فقہاء کا یہ طغری امتیاز رہا ہے کہ انہوں نے اپنی بات کی پچ نہیں کی' یہ حضرات علمی غرور' انانیت' اور بات کی پچ سے بہت دور تھے۔ ہمارے فقہاء کرام اور اپنے تمام بزرگ' اور جن بزرگوں کو ہم نے دیکھا

اور جن کی جوتیاں سیدھی کیں ان کو بھی ہم نے اسی اعلیٰ ظرفی کا حامل پایا کہ ایک ادنیٰ طالب علم ان کی کسی بات پر کوئی اعتراض کر دے تو نہ صرف یہ کہ اس کو توجہ کے ساتھ سنتے تھے بلکہ اگر سمجھ میں آجائے تو فوراً قبول فرما لیتے تھے اور اپنی بات سے رجوع بھی کر لیتے تھے۔

چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب علیہ الرحمہ نے "امداد الفتاویٰ" میں حوادث الفتاویٰ کے ساتھ ساتھ ترجیح الراجح کا بھی ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا، چنانچہ اگر کسی عالم نے کسی مسئلہ میں ان کی کسی غلطی کی طرف توجہ دلائی اور حضرت کی رائے تبدیل ہوگئی تو صرف یہی نہیں کہ ان کو خط لکھ دیا کہ میں نے رجوع کر لیا ہے بلکہ اس کو "ترجیح الراجح" میں شائع کیا جاتا تھا کہ میں نے پہلے اس مسئلہ کا جواب یہ لکھ دیا تھا، فلاں صاحب کے توجہ دلانے یا بعض حضرات کے توجہ دلانے سے اب میری رائے یوں ہوگئی ہے، اور میں پچھلے قول سے رجوع کرتا ہوں، اب میرا فتویٰ یہ ہے ....
اس میں کبھی ان حضرات نے نہ کوئی شرم محسوس کی اور نہ ہی کسی دوسرے نے ان کے درجہ میں کمی محسوس کی بلکہ ان کے اس اعتراف نے ان کی عظمت میں اضافہ کیا ہے۔ ہمارے والد ماجد" کے فتاویٰ کا مجموعہ امداد المفتیین کے نام سے شائع ہوا (جو دراصل اس کا تھوڑا سا حصہ ہے اگر مکمل شائع ہو جائے تو بیس پچیس جلدیں ہوں گی) اس میں بھی حضرت نے ایک مستقل باب قائم کیا تھا۔ "اختیار الصواب لمختلف الابواب" اگر کسی مسئلہ میں ان کی رائے تبدیل ہو جاتی تو رجوع فرما کر اس باب میں شائع فرما دیتے تھے۔ اس بات کو میں اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ اس زمانہ میں ہمارے بزرگوں کی یہ سنت مردہ ہوتی جارہی ہے۔ کسی ایک مفتی کے قلم سے اگر ایک فتویٰ نکل گیا تو اب یہ بہت کم رہ گیا ہے کہ توجہ دلانے اور خطا ظاہر ہونے پر رجوع کر لیں۔ اب بھی الحمد للہ ایسے حضرات علماء حق موجود ہیں جن کے سامنے اگر دلائل ان کے معارض آجائیں تو رجوع بھی کرنے میں ان کو تامل نہ ہوگا، لیکن اب ایسے حضرات بہت شاذ و نادر ہیں، ورنہ ہر ایک اس کوشش میں رہتا ہے کہ میرے قلم سے جو بات نکلی ہے، اس کو منوایا جائے۔

اعضاء انسانی کی پیوند کاری:

ہم نے اپنے بزرگوں کو الحمد للہ دیکھا ہے، ان سے سیکھا ہے، اعضاء انسانی کی پیوند کاری کے مسئلہ میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ میں تقریباً دو سال تک بحث ہوتی رہی ہے، بے شمار سوالات آئے ہوئے تھے، ان سب کو روکا گیا تھا اور پوچھنے والوں کو لکھ دیا گیا تھا کہ اس مسئلہ پر تحقیق ہو رہی ہے، وقت لگے گا، جب تحقیق ہو جائے گی تو آپ کو جواب دیا جائے گا۔ سوال یہ تھا کہ ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے جسم میں منتقل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز ایک انسان کا عضو تناسل کاٹ کر دوسرے انسان کو لگانا اگر ممکن ہو جائے تو اس کا کیا اثر پڑے گا، ثبوت نسب سمیت حلال و حرام کے بہت سارے مسائل پیدا ہوں

گے' اس بناء پر سوالات کی تحقیق شروع ہوئی اور جواب لکھا گیا' اس جواب کا حاصل یہ تھا کہ انسانی اعضاء سے پیوند کاری تو جائز نہیں' البتہ ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے بدن میں داخل کرنا حالت ضرورت میں جائز ہے' فروخت کرنا جائز نہیں' کوئی شخص اگر پیسوں کے بغیر نہیں دیتا تو قیمت دینے والا اگر مجبور ہے تو گنہگار نہیں ہوگا' قیمت لینے والا گنہگار ہوگا' یہ حاصل تھا اس جواب کا'..........

حضرت والد صاحب ﷺ کی وفات کے بعد اعضاء انسانی کے متعلق عالم اسلام کے دیگر دار الافتاؤں سے کچھ فتاوی جاری ہوئے جو ہماری نظروں سے گذرے اور بھی کچھ حضرات علماء کرام نے اس سلسلے میں جو کام کیا تھا اس میں کچھ نئے دلائل ایسے مسائل آئے جن سے اس بات کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے کہ اس مسئلہ پر از سر نو غور کیا جائے بہت ممکن ہے کہ جو فتوی عدم جواز کا دیا گیا تھا اور پاکستان میں شائع ہوا تھا ان دلائل پر غور و مشورے کے بعد اس فتوی سے رجوع کیا جائے۔ اس فتوی پر دستخط کرنے والے جو حضرات موجود ہیں وہ رجوع کرلیں گے اور جو حضرات اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں ہمیں امید ہے کہ ان کی روحوں کو اس سے تسکین ہوگی۔

معروضات کا خلاصہ:

میری معروضات کا خلاصہ دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ اپنی بات کی پچ اور اپنی بات کو ہر قیمت پر منوانے کی کوشش' یہ ہر تحقیق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس سے بہر حال بچنا چاہئے اور دوسرے یہ کہ اجتماعی مسائل میں باہمی مشورہ کے بغیر انفرادی فتاوی جاری کرنے سے حتی الامکان گریز کرنا چاہئے اجتماعی اجتہاد و قیاس کا جو کام اسلامی فقہ اکیڈمی نے اپنے سر لیا ہے' وہ عظیم کام ہے مشکل ہے' کٹھن ہے' لیکن وقت کی سب سے بڑی پکار ہے۔

جدید فقہی مسائل کے بارے میں علماء پاکستان کی کوششیں:

پاکستان میں بھی الحمد للہ اس سلسلہ میں خاصی پیش رفت اور خاصا کام ہوا ہے' چونکہ مجھ سے خاص طور پر فرمائش کی گئی ہے کہ اس سلسلہ میں بھی کچھ عرض کروں' اس لئے چند منٹ اس موضوع پر بھی لوں گا۔ نجی طور پر تو وہاں بھی اسی طرح کام چل رہا تھا جیسا کہ یہاں ہندوستان میں بھی الحمد للہ جگہ جگہ ہو رہا ہے' پاکستان میں بھی بعض علماء کرام نے بعض مجالس قائم کی ہیں جیسے "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" لیکن بڑے پیمانے پر کام کی ضرورت تھی جس میں' تمام مکاتب فکر کے علماء' علماء دیوبند' علماء بریلی' اہل حدیث' سب حضرات جمع ہوں اور ان مسائل کا حل تلاش کریں' اس سلسلہ میں سرکاری سطح پر افسوس ہے کہ ۱۹۷۷ء سے پہلے کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوئی' ۱۹۷۷ء میں پاکستان میں ایسے حالات پیش آئے کہ جنرل محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم کو زمام اقتدار سنبھالنی پڑی' جب وہ آئے تو ہم

سب لرزہ براندام تھے کہ ایک فوجی جرنل آگیا ہے' پتہ نہیں کسی مزاج و مذاق کا انسان ہو گا' کس راستہ پر چلے گا' لیکن جب اس کو قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ الحمدللہ یہ علماء کرام اور بزرگوں کا عقیدت مند ہے' حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے انہیں خاص عقیدت تھی۔ان کے بہنوئی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے' انہوں نے الحمدللہ کئی بڑے کام کئے جن میں سے صرف بعض کا تذکرہ مختصر وقت میں کر سکوں گا۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی خدمات:

ایک ''اسلامی نظریاتی کونسل'' جو دستور کی رو سے پہلے سے ضروری تھے اور پہلے سے موجود تھی' لیکن اس میں علماء کو نہیں رکھا گیا تھا' اس میں انہوں نے یہ کیا کہ اچھے اچھے ماہر علماء کو اسلامی نظریاتی کونسل میں شامل کیا۔حضرت مولانا محمد یوسف بنوری حضرت مولانا شمس الحق افغانی' مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اور بڑے بڑے علماء کرام کو اس میں شامل کیا اور ان سے کہہ دیا کہ اس کام میں جن وسائل کی ضرورت ہوگی وہ سب آپ کو فراہم کئے جائیں گے پس جو کام آپ حضرات اسلامی فقہ اکیڈمی سے کر رہے ہیں الحمدللہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل نے کئی سال بڑی تیز رفتاری کے ساتھ کیا' اور جو مسائل درپیش تھے ان کو حل کیا لیکن ان کا کام زیادہ تر قانون سازی سے متعلق تھا کہ ان میں کیا کیا تبدیلیاں لائی جائیں' اگرچہ وہ بھی بہت بڑا کام تھا' کونسل کے ذمہ داروں سے جنرل ضیاء الحق صاحب نے کہا کہ آپ لوگ بینکنگ کو بلکہ پورے مالیاتی نظام کو سود سے پاک کرنے کے لئے تجاویز دیں۔اسلامی نظریاتی کونسل نے ایک پینل مقرر کیا' جس میں متبحر علماء بھی تھے بینکنگ کے ماہرین بھی اور جدید اقتصادیات کے ماہرین بھی۔پینل نے شب و روز محنت کر کے اسلامی بینک کاری اور بلاسود بینک کاری پر ایک مفصل اور جامع رپورٹ تیار کی' یہ تو آپ حضرات کو معلوم ہو گا کہ الحمدللہ پورے عالم اسلام میں بلکہ صرف مسلم ممالک ہی میں نہیں دیگر ممالک میں بھی جہاں مسلمان آباد ہیں' اب یہ جذبہ قوت سے پیدا ہو رہا ہے کہ سودی نظام جس کو اللہ رب العالمین نے اعلان جنگ قرار دیا ہے اس سے جس طرح بھی ممکن ہو جان چھڑائی جائے' مختلف ملکوں میں اسلامی بینک کاری اور بلاسود بینک کاری پر کام ہوئے اور ہو رہے ہیں' لیکن مجھے یہ بتاتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل نے جو رپورٹ تیار کی ہے وہ اسلامی اور بلاسود بینک کاری کے بارے میں اس وقت تک جتنی رپورٹیں عالم اسلام میں تیار ہوئی تھیں' ان میں سب سے زیادہ جامع اور بہتر رپورٹ ہے' صدر صاحب مرحوم نے وزارت خزانہ کو حکم دیا کہ اس رپورٹ کے مطابق عمل درآمد کیا جائے' اور ہمارا پورا مالیاتی نظام سود سے پاک کیا جائے' لیکن یہ ہماری شامت اعمال ہے کہ وزارتوں' مالیات کے محکموں' اور ان جیسے اداروں کے حضرات سودی نظام کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ ان کو ادنیٰ قسم کی بھی کوئی کراہت اس میں نظر نہیں آتی بلکہ وہ

اس درجہ عادی ہو چکے ہیں کہ اس کو چھوڑنے کو ان کا دل 'اگر کوئی معقول عذر نہ ہو تب بھی نہیں چاہتا' الاماشاء اللہ وہ رپورٹ وزارت خزانہ میں گئی 'وہاں سے اسٹیٹ بینک کے پاس پہنچی تو اسٹیٹ بینک نے بینکنگ اور سرمایہ کاری کے بارہ طریقے وہی مقرر کئے جو اسلامی نظریاتی کونسل نے تجویز کئے تھے لیکن ان سب بارہ کے بارہ طریقوں کو ایسا تحریف زدہ کیا کہ نام تو ہوا بلا سود بینک کاری کا 'مگر سود اور ناجائز معاملات جوں کے توں برقرار رہے ۔اس کی شکایت علماء کرام نے کی 'ہم نے بھی بار بار ضیاء الحق صاحب سے عرض کیا کہ آپ یہ کام نہ کریں کہ غیر سودی بینک کاری کے نام سے سودی بینک کاری کی جائے ' اس صورت میں لوگ حلال سمجھ کر حرام کھائیں گے 'توبہ اور استغفار کی توفیق سے بھی محروم رہیں گے ' اس کی اصلاح کی جائے 'انہوں نے وعدہ کیا کہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے علماء کو اور وزارت خزانہ کے لوگوں کو پھر جوڑ کر بٹھاؤں گا 'لیکن شاید موقع میسر نہ آسکا یہاں تک کہ مسلم لیگ کی حکومت قائم ہوگئی اور وہ انتظام حکومت سے الگ ہوگئے ۔صدر ضیاء الحق بحیثیت صدر برقرار رہے لیکن انتظام حکومت جمہوری حکومت کے پاس آگیا ۔پھر ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو پچھلے سال جب انہوں نے اسمبلی اور مسلم لیگی حکومت کو برطرف کر دیا تو انہوں نے نفاذ شریعت آرڈی ننس نافذ کیا اور اس کے تحت انہوں نے جہاں ہائی کورٹوں کو موجودہ غیر اسلامی قوانین کو کالعدم قرار دینے کے اختیارات دیئے اسی کے ساتھ انہوں نے دو کمیشن قائم کئے 'ایک اسلامی اقتصادی کمیشن 'ایک اسلامی تعلیمی کمیشن ۔

اسلامی اقتصادی کمیشن پاکستان کی خدمات:

اسلامی اقتصادی کمیشن کو انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل سے زیادہ طاقت ور بنایا تھا 'اس معنی کے لحاظ سے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے ذمہ تو صرف اتنا کام تھا کہ وہ سفارشات پیش کر سکے 'اس کمیشن کو یہ اختیار بھی دیا کہ مالیاتی ادارے جن میں اسٹیٹ بینک اور پاکستان کے تمام بینک شامل تھے ۔ان تمام اداروں کی اس طرح نگرانی بھی کرے کہ عدم تعمیل کے واقعات حکومت کے علم میں لائے ۔یہ اقتصادی کمیشن صرف پانچ ارکان پر مشتمل تھا 'جن میں مجھ ناکارہ کا نام بھی شامل تھا اور خاص طور سے اسٹیٹ بینک کے گورنر کو بھی اس کا رکن مقرر کیا گیا تاکہ کمیشن کی رپورٹ پر عمل درآمد آسان ہو ۔میں نے ان سے عرض بھی کیا کہ آپ نے مجھے اس کا رکن بنا تو دیا ہے مگر مجھے انگریزی نہیں آتی 'متعلقہ سارا لٹریچر انگریزی میں ہے 'میں نے بعض دیگر علماء کے نام پیش کئے اور صدر صاحب سے کہا کہ یہ حضرات انگریزی بھی جانتے ہیں اقتصادیات پر بھی ان کی نظر ہے ان میں سے کسی کو لے لیں 'انہوں نے ناموں کا وہ پرچہ لیکر مجھ سے کہا کہ آپ تو رہیں 'مزید کسی کی ضرورت ہوگی تو کمیشن میں ان کو بھی شامل کر لیا جائے گا ۔ہم آپ کو تکلیف نہیں ہونے دیں گے 'ہم آپ کو ایسا اسسٹنٹ دیں گے جو آپ کی ہدایت کے مطابق ہر چیز جمع کر کے اور ترجمہ کر کے آپ کو پیش کیا کرے گا ۔

یہ واقعہ صدر ضیاء الحق صاحب کے شہید ہونے سے تقریباً دس دن پہلے کا ہے' یہ ان سے ہماری آخری ملاقات تھی۔ اس روز انہوں نے کمیشن کا پہلا اجلاس اپنی معیت میں بلایا تھا۔ اس میں انہوں نے دل کھول کر رکھ دیا' انہوں نے کہا کہ میں ہر قیمت پر مالی نظام کو سود سے پاک کرنا چاہتا ہوں اور یہ ذمہ داری آپ کے سپرد کر رہا ہوں کہ آپ سفارشات پیش کریں گے اور میں اس کا نفاذ کروں گا میں ہر مہینے میں کم از کم ایک بار آپ حضرات کے ساتھ پورے پورے دن بیٹھوں گا۔ پھر کہنے لگے وقت کافی نہیں ہے نومبر میں انتخابات ہونے ہیں' پھر جب مجلس برخواست ہوگئی تو مجھ سے پوچھا آپ اسلام آباد میں ایک دو روز ٹھہریں گے؟ میں نے کہا کہ مجھے تو یہاں (ایوان صدر) سے سیدھا ایئر پورٹ جانا ہوگا' لیکن اگر ضرورت ہو تو میں رک جاؤں گا۔ اتنے میں کمیشن کے دیگر اراکین بھی آگئے۔ ہم سب سے پھر کہنے لگے کل تو فوج کے ساتھ مشغول ہوں' پرسوں ملاقات ہو سکے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ساتھ بیٹھوں اور اس مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو ہو۔ تاکہ ہم سب اس مسئلہ کو جلد آگے بڑھا سکیں۔ پھر کہنے لگے "لیکن اس طرح آپ حضرات کا کل کا دن بیکار جائے گا۔ اچھا آپ حضرات کو چند روز میں پھر زحمت دوں گا" ۔ پھر ۱۷ اگست کو اللہ تعالیٰ نے ان کو تو شہادت کے مرتبہ پر سرفراز فرما دیا۔ مگر کمیشن وجود میں آچکا تھا' الحمد للہ کمیشن نے کام جاری رکھا اور اس میں چونکہ گورنر اسٹیٹ بینک خود موجود تھے اس لئے اسٹیٹ بینک کی طرف سے کسی اعتراض اور رکاوٹ کا راستہ نہیں رہا' الحمد للہ اس کمیشن نے آٹھ مہینہ میں ایک جامع اور مفصل رپورٹ بلاسود بینکاری کی تیار کی' اس رپورٹ کی تیاری کیلئے ہم نے اپنی ایک ذیلی کمیٹی بنائی تھی' جس میں کمیشن سے باہر کے ماہرین بینکاری اور دار العلوم کراچی کے دیگر کئی علماء کرام سے بھی استفادہ کیا گیا' خصوصاً بینکنگ کونسل کے سابق چیئرمین جناب حاجی عبد الجبار صاحب' اور میرے برادر عزیز مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے تو اس میں اول سے آخر تک بنیادی حصہ لیا' اس کمیٹی کے اجلاسات دار العلوم کراچی میں صبح سے رات تک جاری رہتے تھے' دار العلوم کراچی کے تخصص فی الافتاء میں زیر تربیت طلبہ کو بھی مسائل وجزئیات کی تلاش وجستجو میں شریک کیا گیا۔

الحمد للہ اس مربوط کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ماہرین بینکاری کے سامنے جو عملی مشکلات تھیں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہ سب حل ہوگئیں۔ اور ایک جامع رپورٹ تیار ہوگئی۔ پھر یہ اہتمام کیا گیا کہ یہ رپورٹ بنکوں اور مالیاتی اداروں کے سربراہوں کو بھی غور و فکر کیلئے پیش کی گئی' ان حضرات نے کچھ نئی عملی مشکلات پیش کیں' ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے حل کرا دیا۔ اس کے بعد کارخانہ داروں' صنعت کاروں اور بڑے تاجروں کے ساتھ مشورہ ہوا' ان کے سامنے جو عملی الجھنیں تھیں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہ بھی دور ہوگئیں۔ اس طرح بلاسود بینکاری کی یہ رپورٹ ہر طرح قابل عمل ہونے کے ساتھ شرعی اعتبار سے بھی اطمینان بخش صورت میں تیار ہوگئی۔

اس رپورٹ کے تیار ہوتے ہی کمیشن کا اجلاس طلب کیا گیا' تاکہ کمیشن اس کا آخری جائزہ لیکر اسے حتمی شکل دیدے اور حکومت کو پیش کر دے۔

ہم بجا طور پر سمجھ رہے تھے کہ اس رپورٹ پر اگلے بجٹ سے عمل درآمد شروع ہو جائے گا' اور اس طرح ہماری زندگیوں کی قیمت وصول ہو جائے گی' کیونکہ اس رپورٹ کا حاصل یہ تھا کہ پورے ملک میں سارے بینکوں کا نظام سود سے بالکلیہ پاک ہو جاتا' اور اب اس میں کوئی فنی یا عملی مشکل بھی باقی نہیں رہی تھی۔ بینکار' صنعت کار اور تجار سب متفقہ طور پر اس رپورٹ کو ہر اعتبار سے قابل عمل مفید اور مناسب قرار دے چکے تھے۔

لیکن جس روز کمیشن کا یہ اجلاس ہونے والا تھا' اس سے ایک روز قبل اسلام آباد سے اچانک فون آیا کہ اس "اسلامی اقتصادی کمیشن" کا وجود قانونی طور پر ختم ہو چکا ہے' کیونکہ اسے صدر ضیاء الحق مرحوم نے "نفاذ شریعت آرڈی ننس کے تحت قائم کیا تھا' صدارتی آرڈی ننس کی توثیق اگر اسمبلی نہ کرے تو وہ آرڈی ننس چار مہینے میں خود بخود ختم ہو جاتا ہے' البتہ صدر چاہے تو مزید چار ماہ کیلئے اس کی تجدید کر سکتا ہے' چنانچہ جب چار مہینے پورے ہوئے تو پاکستان کے موجودہ صدر جناب غلام اسحاق صاحب نے اس آرڈی ننس کی مزید چار ماہ کیلئے تجدید بھی کر دی تھی' اس طرح کمیشن کو اپنا کام کرنے کیلئے کل آٹھ ماہ مل گئے' لیکن جب یہ آٹھ مہینے مکمل ہوئے تو ملک میں اسمبلی وجود میں آچکی تھی' جس نے "نفاذ شریعت آرڈی ننس" کی توثیق نہیں کی' بلکہ اسمبلی میں اس کو زیر بحث ہی نہیں لایا گیا' اس طرح "نفاذ شریعت آرڈی ننس" کے ساتھ یہ کمیشن بھی ختم ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

تاہم کمیشن کی ذیلی کمیٹی کی تیار کردہ یہ رپورٹ ایک اہم علمی دستاویز ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو پاکستان کی کوئی بھی حکومت استفادہ کر سکتی ہے۔

باہمی ربط کی ضرورت:

بہر حال مجھے اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ الحمدللہ یہ اجتماعی اجتہاد و قیاس کا کام پاکستان میں بھی چل رہا ہے' ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کام یہاں ہو رہا ہے اور جو کام وہاں ہو رہا ہے ان دونوں کے مابین ربط ہو اور ایک دوسرے کی معلومات اور تحقیق سے ہم استفادہ کریں' اللہ تعالیٰ ہماری ان تمام مشکلات اور مسائل میں مدد فرمائے' رہنمائی فرمائے اور ہمیں اپنے اسلاف کی راہ راست پر چلتے ہوئے ان مسائل پر پوری توانائیاں خرچ کرنے کی توفیق کامل عطا فرمائے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

سوالنامہ

نوٹ کی شرعی حیثیت کے بارے میں سوالات

(از) ——— مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

عہد قدیم میں اشیاء کا تبادلہ اشیاء سے ہوا کرتا تھا۔ مختلف معاشی وجوہ سے سونے چاندی کو ذریعہ تبادلہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا اور اس کے سکے بازار میں جاری ہو گئے اور ان کے ذریعہ اشیاء کی خرید و فروخت جاری ہوئی۔ ضرورت پڑی کہ ایسے چھوٹے سکے بھی ہوں جن سے چھوٹی چھوٹی چیزیں حاصل کی جائیں تو دوسری کم قیمت دھاتوں کے سکے بھی رواج پذیر ہوئے۔ یہاں تک کہ کسی زمانہ میں لوہے کے چھوٹے ٹکڑے اور کوڑی بھی ذریعہ تبادلہ کی حیثیت سے رواج پذیر رہے۔

مختلف معاشی اسباب کی وجہ سے آہستہ آہستہ سونے چاندی کی کرنسی (CURRENCY) کا رواج ختم ہو گیا اور دوسری دھاتوں کی کرنسی کا بھی رواج کم سے کم تر ہو گیا۔ اور ان کی جگہ کاغذی نوٹ جاری ہو گیا۔ شروع میں ایسا سمجھا جاتا تھا کہ ان کاغذی نوٹوں کا رشتہ سونے چاندی کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور حکومتیں اتنا ہی نوٹ جاری کرتی ہیں جتنی مقدار میں تبادل صورت میں ان کے پاس سونا یا چاندی موجود ہوتی ہے، آہستہ آہستہ یہ رشتہ بھی کمزور ہوتا گیا۔ اور نوٹوں پر لکھی ہوئی یہ عبارت کہ "حکومت اس نوٹ کے حامل کو اس کی مقدار میں دینار، درہم، ڈالر، پونڈ، ین، ریال یا روپیہ ادا کرنے کی ذمہ دار ہے" بے کار سی ہو کر رہ گئی۔ اب کوئی بھی حکومت اس نوٹ کے عوض سونے یا چاندی کے اصل سکے ادا کرنے یا سونے یا چاندی کی اس مقدار کو ادا کرنے کو تیار نہیں ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ

اگر حکومت کسی نوٹ کو کالعدم قرار دیتی ہے تو وہ ایک مخصوص اعلان شدہ مدت کے دوران اس کے عوض نیا جاری شدہ نوٹ اسی قیمت کا ادا کر دیتی ہے۔ غرض یہ کہ تجربہ اور مشاہدہ کی بات یہی ہے کہ حکومتوں کی طرف سے جاری کئے گئے نوٹ اب سونے اور چاندی کے ساتھ ہم رشتہ نہیں رہے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ سونے چاندی یا کسی دھات کا سکہ اگر اس کی کرنسی کی حیثیت ختم ہو جائے تب بھی ایک دھات ہونے کی حیثیت سے اس کی مالیت برقرار رہتی ہے بخلاف نوٹوں کے کہ اگر ان کی قانونی حیثیت ختم ہو جائے تو یہ کاغذ کا بے قیمت پرزہ بن کر رہ جاتے ہیں جن کی کوئی مالیت نہیں ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نوٹ کا جب رواج شروع ہوا تو اس کی قانونی اور رواجی حیثیت سند اور حوالہ کی تھی۔ اسی لئے علماء سلف جن کے سامنے یہ مسئلہ آیا انھوں نے اسے سند اور حوالہ قرار دیا۔ لیکن جیسے جیسے سونا یا چاندی کی کرنسی بازار سے اٹھتی چلی گئی اور نوٹ بے دھڑک بازار میں استعمال کیا جانے لگا۔ اور حکومتوں نے جمع سونے اور چاندی کی مقدار کو نظر انداز کر کے نوٹ چھاپنے شروع کئے۔ رواجا اور عرفا اس کی حیثیت بجائے سند اور حوالہ کے خود مستقل ثمن کی ہو گئی اب یہ بات طے کی جانی چاہئے کہ موجودہ عہد میں شرعا اسے محض سند اور حوالہ تسلیم کیا جائے یا اسے ثمن قرار دیا جائے۔ یا کیا ایسا بھی سوچا جا سکتا ہے کہ نوٹ جو اصلاً سند و حوالہ تھا اور اب یہ رواجاً ثمن ہے اس میں دونوں جانب کی مشابہتیں ہیں۔ تو کیا فقہاء غور و فکر کے بعد نوٹ کی ہر دو حیثیتوں کو سامنے رکھ کر نوٹ کے شرعی احکام مقرر کر سکتے ہیں۔ اگر ہاں تو کیا؟

اس ذیل میں یہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ اگر نوٹ کو محض سند اور حوالہ تسلیم کیا جائے تو ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کی ادائے گی نوٹ کے ذریعہ اس وقت تک نہ ہو سکے گی جب تک زکوٰۃ لینے والا اس سے کسی شئی کا تبادلہ نہ کر لے۔ اسی طرح قرض کی صورت میں جتنے نوٹ بطور قرض دیئے گئے ہیں اتنے نوٹ کی واپسی نہ ہو گی بلکہ سونے اور چاندی کی جتنی مقدار کے لئے اس نوٹ کو سند تسلیم کیا جائے گا۔ اتنی مقدار سونے یا چاندی کی قیمت کے ادا کرنے ہوں گے۔

اسی طرح سند اور حوالہ ہونے کی صورت میں بین الاقوامی مارکیٹ میں ایک ملک

کے نوٹ کو دوسرے ملک کے نوٹ سے تبدیل کرتے وقت ایسے دو نوٹ جو سونے کے سکوں کی سند ہیں یا ایسے دو نوٹ جو چاندی کے سکوں کی سند ہیں ہر دو نوٹ کے تبادلہ میں معتبر قدر زر کے درمیان مساوات اور فوری قبضہ ضروری ہوگا۔ پس یہ اور اس طرح کے کئی مسائل صرف سند ماننے کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔

اس ذیل میں ایک امر یہ قابل لحاظ ہے کہ سونا اور چاندی کو فقہاء ثمن خلقی کہتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض ذریعہ تبادلہ نہیں بلکہ ایک حد تک اشیاء کی قدر و قیمت کی حفاظت اور دیون (موخر مطالبے) کی ادائے گی کا میار بھی ہے۔ اسی لئے اگرچہ سونے چاندی کے سکّے کی قانونی حیثیت ختم ہو جائے پھر بھی وہ سکہ اپنی قدر و قیمت کو برقرار رکھتا ہے اس لئے مثلاً اگر سو دینار مہر مقرر کیا جائے اور ہر دینار ایک تولہ سونے کا تسلیم کیا جائے تو اگر وہ سکہ قانونی حیثیت کھو دے تو بھی سو تولہ سونا ادا کرنا ہوگا۔ اسی طرح مہر مقرر کرتے وقت جو قدر ملحوظ تھی وقت گذرنے کے بعد بھی وہ قدر باقی رہتی ہے۔ نوٹ کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اگر اسے محض ثمن تسلیم کر لیا جائے تو پچاس برس گذرنے کے بعد بھی وہی نوٹ یا متبادل نوٹ جو اسی مالیت کا جاری کیا گیا ہو۔ ادا کرنا ہوگا۔ چاہے اس نوٹ سے حاصل ہونے والے سونے چاندی کی مقدار میں کتنا ہی فرق پڑ گیا ہو۔

علماء معاشیات کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ اشاریہ (INDEX) کے ذریعہ نوٹ کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے اور اس متعین قدر کی ادائے گی واجب قرار دی جائے، مثلاً آج اگر روپیہ کی قدر بارہ پیسوں کے برابر ہے تو آگے چل کر مہر یا کسی دین کی ادائے گی کا وقت آئے تو روپیہ کی قدر گھٹ کر چھ پیسے ہو گئی تو ادائے گی سو روپیہ دین کی دو سو روپیہ کے نوٹ سے ہوگی، یا روپیہ کی قدر بڑھ کر ۲۴ پیسے ہو گئی تو سو روپیے کی ادائے گی پچاس روپیے کے نوٹ سے ہو جائے گی، علماء و فقہاء کے لئے یہ بات قابل غور ہے رائج کرنسی کے قدر کے گھٹنے اور بڑھنے (غلا اور رخص) اور قوت خرید کے کم اور زیادہ ہو جانے کی صورت میں اور خاص کر اس وجہ سے کہ افراط زر تیز رفتار کے ساتھ روپیہ کی قدر گھٹتا جا رہا ہے یا صفر سے بھی نیچا چلا جاتا ہے، مثلاً ایک عورت کا مہر ۱۹۵۰ء میں پانچ سو روپیے مقرر ہوا تھا جس کے عوض میں ڈھائی سو تولے چاندی ملتی تھی اب ۱۹۸۳ء میں ادائے گی کے وقت اگر ہم اسے پانچ سو روپیے دلواتے ہیں تو اس پانچ سو روپے میں صرف سوا چھ تولہ

چاندی آتی ہے۔ پس یہ اہم سوال ہے کہ شریعت نے جو عدل ملحوظ رکھا ہے اس طرح کی ادائیگی اس عدل کو پورا کرتی ہے یا نہیں؟

براہ کرم مندرجہ بالا تمہید کو پیش نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تحریر فرمائیں۔

(۱) ــــ کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(۲) ــــ زر حقیقی یعنی سونے چاندی کے دینار و درہم اور زر اصطلاحی یعنی کاغذی نوٹ کے شرعی احکام یکساں ہوں گے یا ان میں کوئی فرق ہو گا؟

(۳) ــــ کرنسی نوٹوں کا نصاب زکوٰۃ کس اعتبار سے مقرر کیا جائے گا؟ یعنی بعض کرنسی ابتدائی زمانہ میں سونے کی رائج تھی مثلاً دینار اور اس کے متبادل کے طور پر نوٹ جاری کیا گیا۔ بعض کرنسی چاندی کی رائج تھی اس کے متبادل نوٹ جاری کیا گیا تو آج کے کرنسی نوٹوں میں نصاب زکوٰۃ مقرر کرتے وقت سونے کا اعتبار کیا جائے گا یا چاندی کا؟

(۴) ــــ کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے۔ کیا اس صورت حال کی وجہ سے شرعاً یہ صحیح ہو گا کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کر دیا جائے اور کیا ایسے کسی اشاریہ کی ترتیب اور اس کے ذریعہ ادائیگیوں میں انضباط ممکن بھی ہے اور کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ عامۃ الناس کے درمیان ادائیگیوں کے لئے ایسے معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو، باہمی مستقل تنازعہ کا موجب ہو گا۔ نیز یہ کہ اس طرح سو روپیے کے بدلے پانچ سو روپیے کی ادائیگی باب ربوٰا کو کھولنے کا ذریعہ بنے گی۔؟

(۵) ــــ کیا یہ جائز ہو گا کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الادا نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کریں اور بوقت ادائیگی اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ طے کریں؟

کرنسی نوٹ ایک تعارف

(ز) —— ڈاکٹر عبد الحسیب سابق ڈائریکٹر ریزرو بینک آف انڈیا

کرنسی نوٹوں کا شریعت میں مقام اور شرعی نقطۂ نظر سے کرنسی نوٹوں کی قدر و قیمت میں تبدیلی

(۱) ہندوستان میں کرنسی کے اجرا کی اصل نوعیت یہ ہے کہ فی الوقت بازار میں گردش کر رہے چالیس ہزار کروڑ روپوں میں سے بجز ایک چھوٹے سے حصے کے، بقیہ رقم سرکاری ضمانتوں کے عوض محفوظ ہے۔ ایک انتہائی مختصر رقم کی پشت پر سونا یا سونے کے ذخائر ہیں۔ لہٰذا مندرجہ ذیل سوالات پر غور و خوض ہونا چاہیے۔

الف: چونکہ سرکاری سیکورٹیاں جو کرنسی نوٹوں کی پشت پناہی کرتی ہیں سود کماتی ہیں تو کیا کرنسی نوٹ جو بازار میں گردش کرتے ہیں ان میں بھی سود کا عنصر شامل ہوتا ہے؟ پھر یہ معلوم ہے کہ کرنسی نوٹ حکومت ہند اور ریزرو بنک آف انڈیا کی LIABILITY ہوتی ہے مگر LIABILITY پر سود کی شرح صفر ہوتی ہے۔

ب: کرنسی نوٹ صرف ایک تبادلہ کا ذریعہ MEDIUM OF EXCHANGE ہی نہیں بلکہ بچت کا طریقہ بھی ہیں۔ دیگر کئی ذرائع بھی مثلاً "چیک، پرامیسری نوٹ، اور پے آرڈر بھی کرنسی کا متبادل ہوسکتے ہیں۔ ان تمام کے سلسلے میں سود شامل ہوتا ہے۔ ان ذرائع کو استعمال کرنے میں شریعت کی طرف واپس نہیں ہوسکتے۔ پھر یہ نقطہ ذہن میں رہے کہ پیسہ "MONEY" کا نظریہ کرنسی نوٹوں سے زیادہ وسیع ہے۔

ج: یہ شاید مفید ہوگا کہ ہم یہ کھوج کریں کہ آیا شریعت کے مطابق چل رہے کسی نظام میں بھی کرنسی نوٹ رائج تھے۔ مگر جس قسم کے پیسے بھی استعمال میں رہے ہوں گے۔ ان کی قدر و قیمت

یں بازاری قیمتوں کے آتار چڑھاؤ سے تبدیلی ہوتی رہی ہوگی۔ قیمتوں کے آتار چڑھاؤ پر کافی تاریخی مواد موجود ہے۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ قیمتوں میں ٹھہراؤ اور استقامت اس معنیٰ میں کہ عمومی بازاری قیمتوں کی سطح میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہو ایک انتہائی نایاب یا کمیاب واقعہ گردانا جاسکتا ہے۔ ایک پورے کے پورے GOLD STANDARD SYSTEM کے دوران بھی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ خود سونے کی قیمتیں ایک جیسی نہیں رہی ہیں اور ان میں بڑے پیمانے پر اتار چڑھاؤ واقع ہوا ہے۔ اب ان حالات میں خود یہ کہنا کہ کرنسی نوٹوں کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کے شرعی موقف کا جائزہ لیا جائے غور طلب مسئلہ ہے۔ بلکہ شاید یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ افراط زر کو کیسے قابو میں لایا جائے۔

(۲) ہندوستان میں سود کا مسئلہ:

(۳) بینکوں سے حاصل شدہ یا ادا کردہ سود کے سلسلے میں شرعی موقف اور حاصل شدہ سود کا مناسب استعمال:

میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں سوالات ایک ساتھ تبصرے کے لئے پیش کئے جاسکتے ہیں اور اس سلسلے میں ضروری سوالات پہلے ہی تیار کرلئے گئے ہوں گے۔ کیونکہ اس سے متعلق کئی موضوعات مختلف سیناروں اور لٹریچر میں مباحثے کا موضوع بن چکے ہیں اس لئے میں صرف ایک عمومی سوال کو بحث کے لئے موضوع بنانا چاہوں گا۔

ہمیں اس مسئلے میں بحث کرنے والوں اور قرض خواہوں کے زاویے سے غور کرنا چاہیئے ہندوستان میں بحث کرنے والوں کے سامنے جو متبادل ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) کرنسی نوٹ۔
(۲) بینکوں میں رقم جمع کرنا۔
(۳) وہ رقم جو بینکوں میں نہیں جمع کی جاتی۔
(۴) لائف انشورنس۔
(۵) پروویڈنٹ فنڈ اور پنشن فنڈ۔
(۶) CLAIMS ON GOVERNMENT
(۷) حصص اور ڈبنچر۔
(۸) یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کے یونٹ
(۹) تجارتی قرض (TRADE DEBT)

سیمینار میں ہم ان مختلف اقسام کی بچت پر شرعی زاویے سے غور کرسکتے ہیں۔ خصوصاً لائف اور جنرل انشورنس کے نقطۂ نگاہ سے بچت پر غور کرنا ضروری ہے۔ اسی طریقے سے شاید اس پر بھی اتفاق کیا جائے گا کہ یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کے یونٹ کی شکل میں بچت کرنے بھی مذہبی نقطۂ نگاہ سے جائز ہے۔ ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ اگر ان تمام قسم کی بچتیں مذہبی نقطۂ نگاہ سے جائز نہیں تو پھر ہمارے سامنے متبادل کیا ہے ؟ اس وقت ہم ہندوستانی قانون کے مطابق ایک متبادل بینکنگ سسٹم کی بات کرسکتے ہیں۔ اس سوال پر غور کرنے سے قبل میں قرض خواہوں کے نقطۂ نظر سے چند سوالات اٹھاؤں گا۔

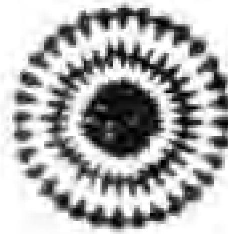
ہندوستان میں بلاسودی سوسائیٹیوں کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا ادارہ ہو جو سود کے بغیر قرض فراہم کرتا ہو۔ البتہ شیر بازار ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہم حصص یا ڈبنچر فروخت کر کے سرمایہ حاصل کرسکتے ہیں۔ مگر ڈبنچر شریعت کے نقطۂ نگاہ سے جائز نہیں کیونکہ ان پر سود کی ایک مقررہ مقدار واپس ملتی ہے اور شیر بھی بازار میں صرف انھیں کمپنیوں کے ذریعہ فروخت کئے جاسکتے ہیں جن کو کنٹرول آف کیپٹل ایشو اجازت دے۔ لہٰذا کیپٹل مارکیٹ ان تمام لوگوں کے لئے دستیاب نہیں جو چھوٹے یا معمولی قرض خواہ ہوں جن کی تعداد مسلمانوں کے درمیان اکثریت میں ہے۔ لہٰذا سیمینار میں مختلف قسم کے قرضہ جات پر بحث ہوسکتی ہے جو افراد یا کمپنیاں حاصل کرسکتے ہوں۔

اس سے واضح ہے کہ ان سوالات کے جواب کے طور پر ہمیں متبادل بنکاری پر بحث کرنی ہوگی جن میں نہ تو سود لیا جاتا ہے اور نہ دیا جاتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آیا یہ سیمینار ان سوالات پر مکمل بحث کرے گا یا نہیں۔ البتہ اگر بلاسودی بنکاری پر بحث کی جاتی ہے تو دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوگا۔ اس میں سے اول یہ کہ ہمیں بچت کاروں کے مفاد کی حفاظت کرنی ہوگی۔ میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ میں بچت کاروں کے ڈیپازٹ پر سود دیے جانے کے حق میں ہوں بلکہ اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ نظام اس طرح کا ہو کہ بچت کاروں کی رقوم کو انتہائی دانشمندانہ انداز سے اور انتہائی سوجھ بوجھ کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ اس سے بچت کاروں کے مفاد کی حفاظت ہوگی۔ اس سے متعلقہ سوال جو میرے ذہن میں اٹھتا ہے وہ یہ کہ ہم ہندوستان میں بلاسودی سوسائیٹیوں کے نظام کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ یہ سوسائٹیاں کس طرح سے مزید سوجھ بوجھ کے ساتھ چلائی جاسکتی ہیں۔ تقریباً تمام ممالک میں ملک کا مرکزی بینک پورے بنکاری نظام کو مختلف درجوں میں ریگولیٹ کرتا ہے۔ ہندوستان میں ہمارے پاس ایک ایسا نظام ہے جس کے ذریعے

سے ہم کمزور یونٹوں کی شناخت کر سکتے ہیں۔ شاید علما، اور دیگر ماہرین جو اس سیمینار کے شرکا، ہوں گے اس بات پر بھی غور کریں گے کہ کیا ریزرو بینک آف انڈیا کو ان بلا سودی سوسائٹیوں کی نگرانی کی ذمہ داری سونپیں یا پھر مسلمان ایک متبادل ادارہ قائم کریں جو اس ذمہ داری کو انجام دے سکے۔ اس ادارے کی ذمہ داریوں میں غیر سودی بینکوں کا معائنہ، آڈٹ اور حسابات کا منظم طریقے سے اندراج ہو اور بالکل چھوٹی سطح سے ہی پیشہ وارانہ اکاؤنٹنگ سسٹم کا نفاذ کیا جا سکے۔

٦۔ مختلف سرکاری روایتی ترضیحات کی اسکیموں سے کس طرح استفادہ کیا جائے جس میں سود کا ادا کرنا شامل ہو۔

میرے خیال میں یہ ہندوستان کے ماحول میں ایک اہم سوال ہے۔ مسلمان بھی ٹیکس دیتے ہیں اور ملک میں کمزور طبقات کے لئے حکومتی امدادی اسکیمیں انھیں ٹیکس کے پیسوں سے چلائی جاتی ہیں۔ اگر مسلمان ان سہولتوں سے فائدہ نہ اٹھائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود حکومت کے دیئے گئے اپنے سرمائے کو واپس لینے سے انکار کر رہے ہیں۔ پھر اس بات کا بھی اعتراف کیا جانا چاہیئے کہ اس میں بہت بڑی رقوم شامل ہیں۔ کوئی دوسرا متبادل ادارہ اتنی بڑی رقوم حاصل نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی کوئی اور نظام اتنے وسیع پیمانے پر رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ لہذا سیمینار کو یہ غور کرنا چاہیئے کہ مسلمانوں سے افلاس کو دور کرنے کے معاملے میں ہم مختلف سرکاری اسکیموں سے کس طرح استفادہ کریں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ خط جسے کافی مختصر ہونا چاہیئے تھا ایک کافی لمبا نوٹ بن گیا ہے۔ شاید آپ اس طویل خط کو میری مختصر شرعی معلومات اور سیمینار میں زیر غور آنے والی ترجیحات سے لاعلمی سے منسوب کریں گے۔



نوٹ کا شرعی حکم

(از) ——— مولانا عتیق احمد بستوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جواب سوال ۱۔ کرنسی نوٹوں کی تاریخ اور ان کے تدریجی مراحل کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات منقح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ابتدائی مراحل میں کاغذی نوٹوں کی حیثیت بلاشبہ سند اور وثیقہ کی تھی لیکن زمانۂ دراز سے کاغذی نوٹ مستقل ثمن کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ عصر حاضر میں پوری دنیا میں باہمی لین دین کاغذی نوٹوں ہی کے ذریعہ انجام پاتے ہیں، یہی نوٹ سوفی صد اشیاء کے درمیان ذریعۂ تبادلہ ہیں، سونے چاندی کے سکوں کو بے دخل کر کے کاغذی نوٹوں نے ان کی جگہ لے لی ہے کاغذی نوٹوں کے آغاز کے بعد عرصہ دراز تک نوٹ جاری کرنے والے بینک اس کے پابند تھے کہ مالک نوٹ کے مطالبہ کرنے پر سونے یا چاندی کا سکہ ادا کر دیں اسی دور کی یادگار نوٹ پر لکھی ہوئی وہ عبارت ہے جس سے نوٹ کے سند اور وثیقہ ہونے کا شبہہ ہوتا ہے لیکن نصف صدی سے زیادہ ہوا جب سے یہ سلسلہ موقوف ہے، اب نہ تو نوٹ چھاپنے والے بینک اور حکومتیں اس کی پابند ہیں کہ نوٹ کے بدلے میں سونا یا چاندی حوالہ کریں نہ اس بات کی پابند ہیں کہ جتنے نوٹ چھاپیں اسی کے بقدر سونا یا چاندی اپنے خزانہ میں محفوظ رکھیں۔ ۱۹۷۱ء تک حکومتیں اس بات کی پابند تھیں کہ ایک ملک دوسرے ملک کو ادائیگی کاغذی نوٹوں کے بجائے سونے کی شکل میں کرے لیکن اگست ۱۹۷۱ء سے بین الممالک سطح پر بھی سونے کے ذریعہ ادائیگی موقوف ہو گئی اور کاغذی نوٹوں کا رشتہ سونے چاندی سے مکمل طور پر ختم ہو گیا۔ لہٰذا عصر حاضر میں کاغذی نوٹوں کا ثمن (ذریعہ تبادلہ) بن جانا بدیہی حقیقت بن گیا۔ ان نوٹوں کی ذاتی حیثیت کاغذ کے پرزوں سے زیادہ نہیں لیکن انسانی معاشرے میں انھیں ذریعہ تبادلہ اور قوت خرید کا حامل تسلیم کر لئے جانے کی وجہ سے ان کی حیثیت ثمن کی ہو گئی۔ موجودہ صورت حال میں نوٹ کو ثمن عرفی قرار دینے کے سوا کوئی صورت

نہیں نہ تو اسے سند کہا جا سکتا ہے نہ مالِ تجارت ۔

جواب سوال ۲ ۔ سونے چاندی کے درہم و دینار اور زر کاغذی کے احکام شرعیہ تمام امور میں یکساں نہیں ہوں گے۔ کاغذی نوٹوں میں دو طرح کی مشابہتیں ہیں ایک اعتبار سے نوٹوں کو سونے چاندی کے ساتھ مشابہت ہے کیونکہ ذریعہ تبادلہ ہونے میں نوٹوں نے کامل طور پر سونے چاندی کی کرنسی کی جگہ لے لی ہے دوسری طرف نوٹوں کو مختلف دھاتوں کے پیسوں کے ساتھ مشابہت ہے کیونکہ نوٹ خلقی طور پر ثمن نہیں ہیں بلکہ ان کی ثمنیت پیتل، تانبے وغیرہ کے سکوں کی طرح عرفی اور رواجی ہے، جب تک مارکٹ میں کاغذی نوٹوں کا چلن ہے وہ ثمن ہیں لیکن حکومت کے کسی نوٹ کو کینسل کرنے اور سماج میں ان کا چلن بند ہونے کے بعد ان کی قدر و قیمت کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ نہیں ان دو مشابہتوں کی وجہ سے کاغذی نوٹ بعض احکام میں سونے چاندی کے مثل ہوں گے اور بعض احکام میں رائج الوقت سکوں کے مثل ۔ میرے نزدیک نوٹوں پر ربوا کے احکام تو جاری ہوں گے لیکن بیع صرف کے تمام احکام تقابض وغیرہ جاری نہیں ہوں گے ۔

جواب سوال ۳ ۔ ابتداءً کوئی کرنسی نوٹ خواہ دینار کی جگہ رائج کیا گیا ہو یا درہم کی جگہ، جب یہ واقعہ ہے کہ کرنسی نوٹوں کا رشتہ موجودہ دور میں سونے اور چاندی سے مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے تو اب اس کا حکم مختلف دھاتوں کے سکوں کی طرح ہوگا یعنی چاندی کے نصاب کا حساب لگا کر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

جواب سوال ۴ ۔ یہ مسئلہ اسی لئے پیدا ہوا ہے کہ کاغذی نوٹ سونے چاندی کے تمام وظائف انجام نہیں دے پا رہے ہیں. کاغذی نوٹ ذریعہ تبادلہ ہونے میں تو سونے چاندی کی پوری جانشینی کر رہے ہیں، کسی حد تک اشیاء کی قیمتوں کا معیار بھی ہیں لیکن مخزن ثروت اور موخر مطالبات کا معیار و پیمانہ بننے کا کام صحیح طور پر انجام نہیں دے پا رہے ہیں اس دور میں اصحاب ثروت اپنی دولت و ثروت کا نوٹوں کی شکل میں خزانہ کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان نوٹوں کی قدر و قیمت روز بروز گھٹتی رہے گی۔ حتیٰ کہ نوٹوں کی شکل میں جمع شدہ یہ دولت نمک کی طرح خود بخود گھل گھل کر ختم ہو جائے گی۔ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ جائداد زمین، مکان، دوکان یا تجارتی سامانوں کی شکل میں اپنی ثروت کا خزانہ کریں اسی طرح طویل المیعاد معاملات آج کل کا انسان مجبوراً نوٹوں کے ذریعہ کرتا ہے کیونکہ کاغذی

نوٹوں کے علاوہ کوئی دوسری کرنسی جو پائیدار ہو دورِ حاضر میں مروج نہیں ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے کوئی چارہ نہیں کہ سونا چاندی کے سکوں اور کاغذی نوٹوں میں اس اعتبار سے زمین آسمان کا فرق ہے کہ سونے چاندی کی قدر و قیمت سماج میں ذریعۂ تبادلہ بننے پر موقوف نہیں بلکہ کرنسی کی حیثیت سے ان دونوں کا رواج ختم ہونے کے باوجود ان کی قدر وقیمت برقرار اور روز افزوں ہوتی ہے اس کے برخلاف کاغذی نوٹوں کی ساری قدر وقیمت ذریعہ تبادلہ بننے پر موقوف ہے ان کی ذاتی کوئی قدر وقیمت نہیں۔ اسی لئے اگر حکومت کسی کاغذی نوٹ کو کینسل کر دیتی ہے تو اس کی حیثیت کاغذ کے سادہ ٹکڑے کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ کاغذی نوٹ کی حقیقت اس کی ظاہری شکل وصورت نہیں بلکہ اس کی قوتِ خرید ہے اور نوٹوں کی قوتِ خرید میں عدم توازن کا پایا جانا ایک بدیہی حقیقت ہے جس سے نہ چشم پوشی کی جاسکتی ہے نہ احکامِ شرعیہ میں اسے کمل طور پر نظر انداز کیا جاسکتا ہے کیونکہ اسے نظر انداز کرنا دراصل قیامِ عدل کو پس پشت ڈال کر اصحابِ حقوق پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہوگی۔

موجودہ دور میں افراطِ زر، اقتصادی عدمِ استحکام کی وجہ سے کرنسی نوٹوں کی قوتِ خرید اور قدر میں جو اتار چڑھاؤ تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے اس کا احکامِ شرعیہ میں اعتبار کرنا مقاصدِ شریعت سے ہم آہنگ ہونے کے علاوہ فقہاء کے اجتہادات سے بھی متصادم نہیں ہے بلکہ فقہاء کے اجتہادات سے اس کی پوری تائید ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فقہائے مجتہدین کی قبروں کو نور سے بھر دے، ان حضرات نے حقیقت اور ظاہریت کو چھوڑ کر شریعت کے مقاصد و کلیات کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کیا۔ ان کے فقیہانہ اجتہادات سے قیامت تک امت کو روشنی ملتی رہے گی۔ ہمارے فقہاء نے چاندی سونے کی کرنسی اور دوسری دھاتوں کے سکوں میں احکام کے اعتبار سے بڑا فرق کیا ہے۔ اگر سونے چاندی کے سکوں کے بدلے خرید وفروخت ہوئی اور قیمت کی حوالگی سے قبل وہ کینسل کر دئے گئے یا حکومت نے ان کی قیمت کم کر دی یا اس کی قدر میں اتار چڑھاؤ آگیا تو جمہور فقہاء کے نزدیک ان تبدیلیوں کے باوجود طے شدہ سکے ہی لازم ہوں گے اس کے برخلاف اگر دوسری دھاتوں کے سکوں میں سودا طے ہوا تھا اور قیمت کی حوالگی سے قبل وہ سکے ناپید ہو گئے یا کینسل ہو گئے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک بیع فاسد ہو گئی لیکن صاحبین کے نزدیک ان طے شدہ سکوں کی قیمت کے مساوی نئے مروج سکے لازم ہوں گے، صاحبین ہی کے مسلک پر فقہاء احناف نے فتویٰ

دیا ہے اور اگر بیع مکمل ہونے نے بعد طے شدہ سکوں کی ادائیگی سے قبل ان سکوں کی قیمتوں میں آتار چڑھاؤ آگیا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس آتار چڑھاؤ کا اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ طے شدہ سکے ہی لازم ہوں گے، انہیں کی ادائیگی ہوگی۔ امام ابو یوسف کا بھی پہلے یہی مسلک تھا۔ بعد میں انھوں نے اس مسلک سے رجوع کرکے یہ مسلک اختیار فرمایا کہ سکوں کی قیمت میں آتار چڑھاؤ کا لحاظ کیا جائے گا اور بیع کے دن یا اگر قرض کا معاملہ ہو تو قرض پر قبضہ کرنے کے دن طے شدہ سکوں کی جو قدر و قیمت تھی اس کا حساب لگاکر مروجہ دراہم میں ادائیگی کی جائے گی، اس مسئلہ میں امام ابو یوسف کے اسی قول پر فتویٰ ہے، علامہ ابن عابدینؒ اپنے رسالہ "تنبیہ الرقود علی مسائل النقود" میں لکھتے ہیں۔

وفي البزازية معزيا الى المنتقى غلت الفلوس اورخصت فعند الامام الاول والثاني اولا ليس عليه غيرها وقال الثاني ثانيا عليه قيمتها من الدراهم يوم البيع والقبض وعليه الفتوى وهكذا في الذخيرة والخلاصة بالعـ ... لى المنتقى وقد نقله شيخنا في بحره واقره فحيث صرح بان الفتوى عليه في كثير من المعتبرات فيجب ان يعول عليه افتاء و قضاء لان المفتي والقاضي واجب عليهما الميل الى الراجح من مذهب امامهما ومقلدهما ص ۵۸

بزازیہ میں منتقی کے حوالے سے لکھا ہے فلوس مہنگے ہوگئے ہوں یا سستے دونوں صورتوں میں امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک ان کے پہلے قول میں فلوس ہی ذمہ میں واجب ہوں گے لیکن امام ابو یوسف کے قول ثانی میں فلوس کی قیمت دراہم میں واجب ہوگی۔ قیمت کا اعتبار بیع کے دن یا قرض لینے کی صورت میں فلوس پر قبضہ کے دن کا ہوگا اسی قول پر فتویٰ ہے۔ ذخیرہ اور خلاصہ میں بھی منتقی کے حوالے سے ایسا ہی ہے اور ہمارے شیخ نے بحر الرائق میں بھی اسے نقل کرکے اس کی توثیق کی ہے کہ کتب معتبرہ میں اکثر پر فتویٰ ہے۔ اس لئے فتویٰ و قضاء کے لئے اسی کو اختیار کیا جائے کیونکہ مفتی اور قاضی پر واجب ہے کہ اپنے امام کے مذہب میں راجح قول کو اختیار کریں۔

مالکیہ کے یہاں بھی ایک قول یہ ہے کہ قیمت میں آتار چڑھاؤ کا اعتبار کیا جائے گا بشرطیکہ زیادہ آتار چڑھاؤ ہوا ہو۔

مختلف دھاتوں سے بنے ہوئے سکوں کے بارے میں فقہاء نے جو مسائل بیان کئے ہیں ان کا مطالعہ کرتے وقت یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ان سکوں اور کاغذی نوٹوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قدر و قیمت نہیں اس کے برخلاف دھاتوں کے بنے ہوئے سکے فی نفسہ قابل لحاظ مالیت رکھتے ہیں۔ اکثر حالات میں ان کی ذاتی مالیت بہ حیثیت

سکّہ ان کی مالیت کے مساوی یاقریب تر ہوتی ہے. کبھی کبھی توان سکوں کی ذاتی مالیت ان کی ثمنی مالیت سے بڑھ جاتی تھی، ایسے وقت میں بہت سے لوگ سکوں کو جمع کرکے پگھلاکر دھات کے بھاؤ سے فروخت کرتے تھے جس سے انھیں اچھاخاصا نفع ہوتا تھا. غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے مختلف فقہاء نے جب معدنی سکوں کے اندر قیمت کے پہلو کو ملحوظ رکھا ہے حالانکہ ان سکوں کی اپنی ذاتی مالیت بھی تھی اگر ان کے سامنے کاغذی نوٹوں کا مسئلہ آتا جن کی ذاتی کوئی مالیت نہیں ہے تو وہ حضرات کس حد تک قدر اور قوت خرید کے پہلو کو ملحوظ رکھتے۔

ان اشارات کے بعد زیر بحث مسئلے میں میری رائے یہ ہے کہ کاغذی نوٹوں کی قوت خرید میں انحطاط آنا اس دور میں چونکہ معمول بن چکا ہے اس لئے جب لوگ کوئی موخر معاملہ طے کرتے ہیں (مثلاً ایک شخص نے کوئی سامان ایک ہزار روپے میں فروخت کیا اور فروختگی کے وقت ہی یہ بات فریقین میں طے ہوئی کہ قیمت کی حوالگی خریدار ایک سال کے بعد کرے گا) تو فروخت کرنے والا یہ سوچ کر قیمت طے کرتا ہے کہ ایک سال میں روپیوں کی قدر میں کتنی کمی آسکتی ہے. بالفرض اگر معاملہ طے کرتے وقت صاحب حق ان پہلوؤں کو ملحوظ نہ رکھتا ہو تو بھی دین کی ادائیگی کے لئے آئندہ کی مدت طے کرنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ایک سال کی مدت میں ان روپیوں کی قوت خرید میں جو کمی آئے گی اس سے دست بردار ہونے کے لئے صاحب حق آمادہ ہے اور صاحب حق کو بہرحال اپنا حق کم کرنے یا معاف کرنے کا اختیار ہے. اس لئے صاحب حق کی طرف سے دین کی ادائیگی کی مدت طے ہونے اور اسی مدت میں ادائیگی کردئے جانے کی صورت میں اتنے ہی نوٹ اداکرنے ہوں گے جو طے ہوئے تھے. لیکن اگر فوری طور پر ادائیگی طے تھی لیکن مدیون نے ٹال مٹول کر دیا اور کچھ عرصہ کے بعد ادائیگی کی یا ادائیگی کا وقت طے تھا اس وقت ادا نہیں کرسکا تو اس دین کی ادائیگی جس وقت شرعًا واجب تھی اس وقت طے شدہ روپیوں کی جو قوت خرید تھی اس کا حساب لگاکر مدیون ادائیگی کرے گا. مثلاً زید نے خالد کے ہاتھ ایک قطعہ اراضی جنوری ۱۹۸۰ء میں دس ہزار روپے میں فروخت کی اور طے ہوا کہ خالد فوری طور پر قیمت کی حوالگی کرے گا لیکن خالد نے بروقت ان واجب الادا روپیوں کی ادائیگی نہیں کی بلکہ ۶ سال بعد ۱۹۸۶ء میں ادائیگی کر رہا ہے اس صورت میں اگر زید یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ۱۹۸۰ء کے مقابلہ میں ۱۹۸۶ء میں روپیوں کی قوت خرید نصف ہو چکی ہے لہٰذا میں بیس ہزار لوں گا تو اس کا مطالبہ حق بجانب ہے اور شرعًا درست ہے۔

امام ابو یوسفؒ نے معدنی سکوں میں مطلقًا قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کا اس لئے اعتبار کیا ہے کہ

ان کے دور میں سکوں کی قیمتوں میں استقرار اور ٹھہراؤ تھا، آتار چڑھاؤ کی صورت نادر طریقہ پر پیش آتی تھی اس لئے موخر معاملات کو طے کرتے وقت معاملہ طے کرنے والوں کے ذہنوں میں یہ بات آتی ہی نہیں تھی کہ طے شدہ سکوں کی مالیت میں اتنے دنوں میں اس قدر کمی آسکتی ہے لہٰذا ناگہانی طور پر جو اتار چڑھاؤ آیا اس پر ان کی آمادگی اور رضامندی کی کوئی علامت موجود نہیں تھی لیکن موجودہ دور میں صورتِ حال اس سے بالکل مختلف ہے، نوٹوں کی قوتِ خرید میں گراوٹ آنا معمول بن چکا ہے اس لئے موخر مطالبات کا معاملہ طے کرنے والے معاملہ طے کرتے وقت نوٹوں کی قوتِ خرید میں مسلسل گراوٹ کے پہلو کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں اور نوٹوں کی اس عمومی صورت حال کو مدّنظر رکھ کر معاملات طے کرتے ہیں لہٰذا ادائیگی کے لئے طے شدہ وقت تک پیدا ہونے والے اتار چڑھاؤ پر فریقین کو دلالت حال اور عرف کی بنیاد پر راضی تصور کیا جائے گا مگر مقررہ وقت کے بعد ادائیگی میں مزید تاخیر کرنے کی صورت میں نوٹوں کی قدر میں جو گراوٹ آئی ہے اس پر صاحبِ حق کے راضی ہونے کی کوئی علامت نہیں ہے بلکہ اس کی مخالف علامتیں موجود ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن موخر مطالبات میں بروقت دین کی ادائیگی نہیں کی گئی ان میں قدر اور قوتِ خرید کا اعتبار کس طرح کیا جائے؟ اس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ اشاریہ کو بنیاد بنانے کے بجائے زرِ خلقی سونے چاندی کو بنیاد بنایا جائے اولاً اس لئے کہ اشاریہ دقیق فنی اصولوں پر مبنی ہوتا ہے لہٰذا اس پر احکام شرعیہ کا دائر کرنا شریعتِ اسلامیہ کے مزاج کے خلاف معلوم ہوتا ہے ثانیاً اس لئے کہ اشاریہ کی ترتیب کے لئے کوئی معیار مرتب کرنا انتہائی دشوار کام ہے۔ ملکوں شہروں اور طبقوں کا اشاریہ ایک دوسرے سے مختلف ہوسکتا ہے بلکہ ہر فرد کا اشاریہ دوسرے سے مختلف ہوسکتا ہے اس لئے اشاریہ کو بنیاد بنانے میں احکام منضبط نہیں ہوسکیں گے تیسری وجہ یہ ہے کہ زرِ عرفی کو زرِ خلقی کی طرف لوٹانا غالباً کرنسی کے حالات میں زیادہ استقرار و ثبات پیدا ہونے کا سبب بن سکتا ہے۔

اس کے بعد یہ مسئلہ باقی رہتا ہے کہ سونے اور چاندی میں سے کس کو بنیاد بنا کر ادائیگی کی جائے میرا خیال یہ ہے کہ یا تو دونوں کا اوسط نکال لیا جائے یا پھر ان دونوں میں سے جس کی قدر کا اتار چڑھاؤ اشیاء ضروریہ کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ سے قریب تر ہو اسے بنیاد بنایا جائے۔

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ موخر مطالبات کی ادائیگی میں نوٹوں کی قوتِ خرید اور قدر کا لحاظ کرنے میں بظاہر باب ربوٰا کھلنے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے

کہ کسی معاملہ میں یہ یقین ہونے کے بعد کہ یہاں حقیقت ربوا نہیں پائی جارہی ہے محض ربوا کے نام سے ڈر کر ایسے احکام جاری کرنا جن سے عدل کے تقاضے مجروح ہوتے ہوں اسلامی تعلیمات کی روح اور تفقہ فی الدین کے سراسر خلاف معلوم ہوتا ہے، ہمارے فقہائے مجتہدین کے یہاں بکثرت ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ان حضرات نے بہت سے ایسے مسائل میں جن میں ظاہری طور پر دیکھنے میں ربوا کی صورت محسوس ہوتی ہے گہرائی سے مطالعہ کے بعد اس بات کا یقین حاصل ہونے کی صورت میں کہ ان مسائل میں حقیقت ربوٰ موجود نہیں ہے۔ بے تکلف جواز کا فتویٰ دیا اور شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے امت کے لئے یسر و سہولت پیدا کی، فلوس کے بارے میں قیمت میں آتار چڑھاؤ کی صورت میں امام ابو یوسفؒ نے جو مسلک اختیار کیا اور جس کو بہت سے فقہائے احناف نے مفتی بہ قرار دیا وہ ہمارے دعویٰ کی انتہائی روشن مثال ہے۔

جواب سوال ۵۔ جب یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ نوٹوں کی ظاہری شکل و صورت قابل لحاظ نہیں بلکہ نوٹوں کی اصل حقیقت ان کی قوت خرید اور معنوی قدر و قیمت ہے تو میرے خیال میں اس بات میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے کہ مؤخر مطالبات میں معاملہ طے کرتے وقت فریقین یہ بات باہم طے کرلیں کہ موجودہ وقت میں طے کردہ نوٹوں کی سونے کے اعتبار سے یا چاندی کے اعتبار سے جو مالیت ہے اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی وقت مقررہ پر کی جائے۔ کاغذی نوٹوں کا رشتہ خلقی ثمن سونا اور چاندی سے منقطع کردئے جانے کے بعد ان نوٹوں کی قوت خرید اور قدر میں جو عدم توازن اور عدم استقرار پیدا ہوگیا ہے اور اس کی وجہ سے مؤخر معاملات طے کرنے میں انسانوں کو جو دشواریاں اور الجھنیں پیش آرہی ہیں ان کا وقتی حل یہی نظر آتا ہے۔

اس موضوع پر موجودہ دور کے متعدد علماء و فقہاء قیمتوں کے آتار چڑھاؤ کا احکام شرعیہ میں فی الجملہ اعتبار کرنے کے سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کرچکے ہیں۔ برصغیر کے مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم کے صدر شعبۂ افتاء حضرت مولانا نظام الدین صاحب کا فتویٰ بھی اس سلسلے میں شائع ہوچکا ہے نظام الفتاویٰ جلد اول سے ایک استفتاء اور اس کا جواب ملاحظہ ہو۔

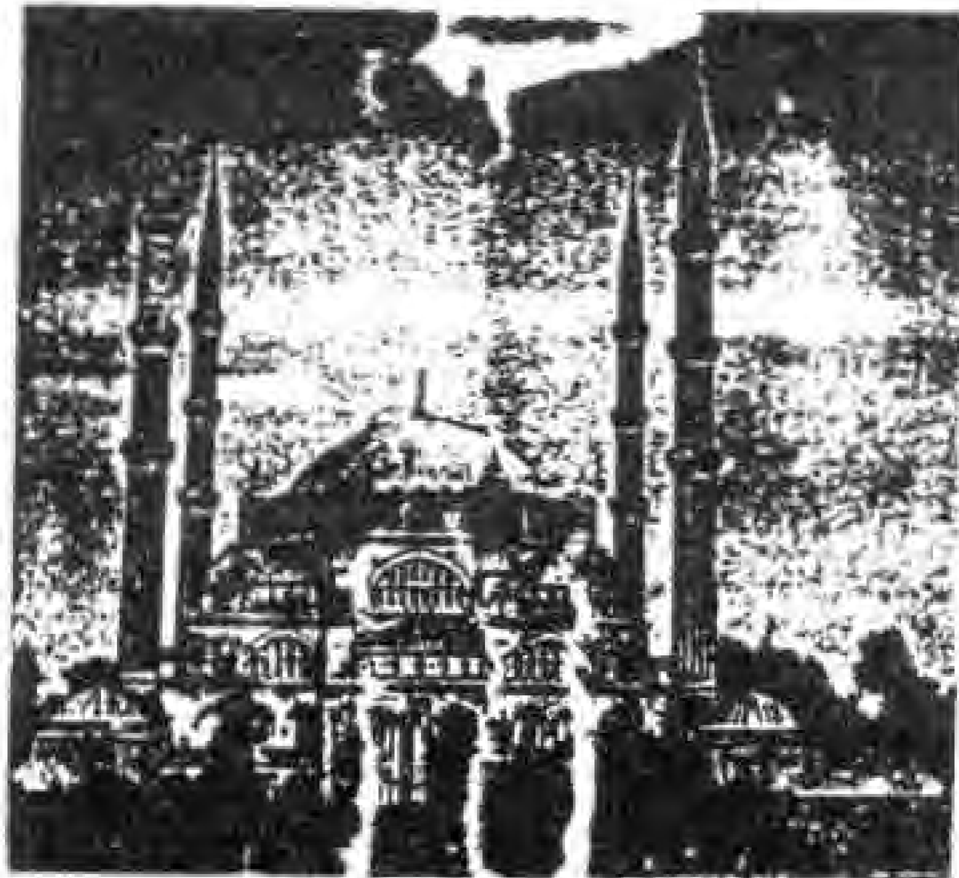
"ایک آدمی نے دوسرے آدمی کے پاس سے دس ہزار روپے بطور قرض لئے۔ اب وہ آدمی اس کا قرض دس سال بعد ادا کرتا ہے۔ اس درمیان میں سرکاری طور پر روپیہ کی قیمت آدھی گھٹا دی گئی ہے یعنی آج سے دس سال پہلے روپیہ کی جو قیمت تھی آج اس سے آدھی ہوگئی

جس کا سرکاری طور پر اعلان بھی ہوچکا ہے جس کو سرکاری اصطلاح میں ڈی ویلوئیشن کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ قرض لینے والا دس ہزار روپے ادا کرتا ہے لیکن ان کی قیمت جن روپوں میں قرض لیا تھا اس کے مقابلہ میں پانچ ہزار رہی ہے تو کیا قرض دینے والا اسی بنیاد پر اس سے بیس ہزار کا مطالبہ کرسکتا ہے؟ اور کیا یہ شرعاً سود کہلا سکتا ہے؟ قرض کی یہ لین دین نوٹوں کی شکل میں ہوئی تھی اور قیمت کی تقلیل بھی نوٹوں میں ہوئی ہے۔

جواب:۔ اس قرض میں لئے ہوئے نوٹوں کی قرض لینے کے زمانہ میں جتنی چاندی ملتی یا جتنا سونا ملتا اتنی چاندی میں یا اتنے سونے میں جتنے نوٹ آج بوقت ادا ملیں اتنے ہی نوٹ دینے ہوں گے پس نقدین میں سے جو زیادہ رائج ہوگا اس کا اعتبار ہوگا اور نوٹ اس کے تابع ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم (نظام الفتاویٰ ص ۲۴۳ جلد اول)

اگر تقلید ائمہ کے نقطۂ نظر سے مسئلہ کو دیکھا جائے تو بھی کاغذی نوٹوں کی قدر اور اتار چڑھاؤ کا احکام شرعیہ میں اعتبار کیا جانا شرعاً درست معلوم ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے نقطۂ نظر سے تو کاغذی نوٹوں میں علتِ ربوٰ پائی ہی نہیں جارہی ہے کیونکہ نوٹ نہ مکیلات میں سے ہیں اور نہ موزونات میں سے حالانکہ شیخین کے نزدیک علتِ ربوا کیل مع الجنس یا وزن مع الجنس ہے، شیخین ثمنیت کو علتِ ربوا تسلیم ہی نہیں کرتے اس لئے ان دونوں حضرات کے نزدیک ایک پیسے کی بیع دو پیسے کے بدلے میں جائز ہے۔ ان دونوں حضرات کے اصولوں کے اعتبار سے کاغذی نوٹ اموال ربویہ میں آتے ہی نہیں، امام احمد بن حنبل کا بھی تقریباً یہی مسلک ہے، اسی لئے ان کے ان یہاں بھی ایک پیسے کے بدلے دو پیسے کی بیع جائز ہے، امام شافعیؒ اگرچہ ثمنیت کو علت قرار دیتے ہیں۔ لیکن اسے علتِ قاصرہ مانتے ہیں اور دوسرے سکوں کی طرف اس کا تعدیہ نہیں کرتے۔ اسی لئے ان کے یہاں بھی ایک پیسے کی بیع دو پیسے کے بدلے میں درست ہے۔ صرف امام مالک اور امام محمد رحمہما اللہ ثمنیت کو ربوا کی علت متعدیہ تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں حضرات کے نزدیک ایک پیسے کی بیع دو پیسے کے بدلے میں جائز نہیں اس کے باوجود یہ دونوں حضرات عرفی ثمن کے بارے میں جو مسلک اختیار کرتے ہیں اس میں حرفیت کے بجائے حکمت وتشریع کا بھرپور لحاظ ہے، اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے کوئی سامان سونے یا چاندی کے روپوں کے بدلے میں فروخت کیا اور خریدار نے قیمت کی ادائیگی فوری طور پر نہیں کی بلکہ کچھ دنوں کی مہلت لے لی، اسی طرح حکومت نے سونے یا چاندی

کے ان سکوں کو کینسل کر دیا تو تمام ائمہ کے نزدیک انہیں طے شدہ روپیوں کی ادائیگی خریدار پر لازم ہو گی، حکومت کے جاری کئے ہوئے ان نئے روپیوں کی ادائیگی لازم نہ ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر بالکل یہی صورت حال سونے چاندی کے علاوہ دوسری دھاتوں سے بنے ہوئے سکوں کے بارے میں پیش آئے تو بعض ائمہ اس صورت میں بھی طے شدہ سکوں کی ادائیگی ہی لازم قرار دیتے ہیں لیکن تمام فقہائے احناف نے اس صورت میں خریدار کے ذمہ یہ لازم کیا ہے کہ وہ مالیت کا حساب کر کے حکومت کی طرف سے جاری کردہ نئے سکوں کی شکل میں قیمت کی ادائیگی کرے۔ ہمارے فقہاء کا ان دونوں بظاہر یکساں معاملات میں احکام کے اندر فرق کرنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ انھوں نے مسائل کی ظاہری شکل کو دیکھنے کے بجائے ان کی حقیقت اور گہرائی تک پہونچ کر اجتہادات کئے اور احکام شرعیہ بیان کئے۔ اس تفصیل سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ جزئیات فقہیہ اور اجتہاداتِ ائمہ کی روشنی میں بھی کاغذی نوٹوں کی قوتِ خرید میں ہونے والے اتار چڑھاؤ کا لحاظ کیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے اور ایسا کرنے سے محرمات شرعیہ کا ارتکاب نہیں ہو رہا ہے۔



کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت

سوالات کے جوابات

از ——————— شمس پیرزادہ بمبئی

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت متعین کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کی قانونی اور عرفی حیثیت واضح ہو۔

جہاں تک اس کی قانونی حیثیت کا سوال ہے سرکاری بینک اسے جاری کرتے ہیں اور ان کا اجراء باضابطہ طریقہ پر ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ایک روپیہ کا کرنسی نوٹ اور سکے تو حکومت خود جاری کرتی ہے بقیہ تمام قیمتوں کے کرنسی نوٹ رزرو بینک آف انڈیا جاری کرتا ہے اور

'The Reserve Bank is the sole authority for the issue of Currency in India'.

(Reserve Bank of India - Functions & Working
Edn. 1989-p.9)

لہٰذا کرنسی نوٹ کی حیثیت قانونی زر (LEGAL TENDER) کی ہے۔

'Currency notes are legal tender at any place in India in payment or on account, without limit.' (do.P. 10)

رزرو بینک آف انڈیا کرنسی نوٹوں کے مقابلہ میں قانون کے مطابق سونے کی ایک مقدار نیز خارجی وثیقے محفوظ رکھتی ہے۔ اپریل ۱۹۸۲ء میں رزرو بینک کے پاس ۲۲۵۰.۵۸ کروڑ روپے کا سونا محفوظ تھا بہ قیمت پرانے قانونی نرخ (Rs. 84.39 per 10 grammes) کے حساب سے ہے۔ بازار کا موجودہ نرخ اس کے تقریباً چالیس گنا ہے۔ اس حساب سے اس محفوظ سونے کی قیمت تقریباً نوے ارب روپے ہو جاتی ہے جب کہ جاری کردہ کرنسی نوٹ اپریل ۱۹۸۲ء میں ایک کھرب چھپن ارب روپے کے تھے۔ (ان تمام تفصیلات کے لئے دیکھئے رزرو بینک کی مذکورہ بالا کتاب

معلوم ہوا کہ کرنسی نوٹ کا ایک گونہ تعلق سونے سے ضرور ہے لیکن وہ اس کا بدل نہیں ہے۔ اول تو زرِ رو بینک نوٹوں کی قیمت کے بقدر سونا محفوظ نہیں رکھتا۔ دوسرے یہ کہ سونے کا جو ذخیرہ وہ رکھتا ہے وہ بیرونی ممالک کو ان کے قرضہ جات کے سلسلہ میں اطمینان دلانے کی غرض سے رکھا جاتا ہے تاکہ بحرانی حالت میں سونا ضمانت کا کام دے۔

کرنسی نوٹ اپنی ذات میں تو کوئی قیمت رکھتا ہی نہیں کیونکہ وہ ایک کاغذ کا پرزہ ہے لیکن اس کی حیثیت دین کے دستاویز (سند) کی بھی نہیں ہے کہ اس کو جاری کرنے والا بینک اس کے بدل کے طور پر چاندی یا سونا دے۔ کرنسی نوٹ پر ادائیگی کا وعدہ ضرور لکھا ہوتا ہے مگر روپیوں میں یعنی کوئی شخص اگر ایک سو روپے کا نوٹ زرِ رو بینک میں لے جائے اور ادائیگی کا مطالبہ کرے تو بینک والے ایک ایک روپے کے سو نوٹ یا سو سکے نکال کر دیں گے۔ بینک سونے یا چاندی کی شکل میں نوٹ کی قیمت ادا کرنے کا قانوناً ذمہ دار نہیں ہے۔ درحقیقت کرنسی نوٹ پر تحریر شدہ وعدہ ایک بے معنی سی بات ہے چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے۔

> 'It is hard to say precisely what 'issued by the Central Bank' means. In the U.S. for example, the Currency bears the words 'Federal Reserve Note' but these notes are not obligations of the Federal Reserve Banks in any meaningful sense. The holder who presents them to a Federal Reserve Bank has no right to anything except other pieces of paper adding upto the same face value. The situation is much the same in most other countries.'

: Encyclopaedia Britannica -Macropaedia 15th Edn.Chicago Vol. 5 p.352)

رہی کرنسی نوٹ کی عرفی حیثیت تو اس میں شک نہیں کہ عرفِ عام اور قانون دونوں نے ملکر اس میں مالی قوت پیدا کر دی ہے اس لئے اس کی حیثیت ثمن کی ہے اور وہ تمام اشیاء کی قیمتوں کے لئے معیار قرار پایا ہے۔ اس کی یہ عرفی حیثیت ہمیشہ برقرار رہتی ہے الا یہ کہ کبھی کوئی بحرانی صورت پیدا ہو جائے یا اس کی قانونی ضمانت باقی نہ رہے۔

دارالافتاء ریاض کے رکن عبداللہ بن سلیمان بن منیع اپنی کتاب الورق النقدی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

وانما سر قبوله ثقة الناس به كقوة شرائية مطلقة بغض النظر من اسباب حصول الثقة به وحيث ان الورق النقدي لمخصائص النقدية

الذهب والفضة من انه ثمن، وبه تقوم الاشياء والنفوس تطمئن بتمولہ وادخاره ۔ (الورق النقدی ص ۹)

ڈاکٹر یوسف قرضاوی فرماتے ہیں:۔

ان هذه الاوراق أصبحت ۔ باعتماد السلطات الشرعية اياها وجريان التعامل بها ۔ اثمان الاشياء، ورؤس الاموال، وبها يتم البيع والشراء والتعامل داخل كل دولة، ومنها تصرف الاجور والرواتب والمكافآت وغيرها وعلى قدر ما يملك المرء منها يعتبر غناه، ولها قوة الذهب والفضة فی قضاء الحاجات، وتيسير المبادلات، وتحقيق المكاسب والارباح، فهی بهذا الاعتبار اموال نامية أو قابلة للنماء، شأنها شأن الذهب والفضة (فقه الزكاة ج ۱ ص ۲۷۳)

اور رابطہ عالم اسلامی کی المجمع الفقہی الاسلامی کی مجلس نے کرنسی نوٹ پر جو قرارداد منظور کی اس میں کہا گیا ہے کہ:

وبما ان العملة الورقية قد اصبحت ثمنا، وقامت مقام الذهب والفضة فی التعامل بها، وبها تقوم الاشياء فی هذا العصر لاختفاء التعامل بالذهب والفضة، وتطمئن النفوس بتمولها وادخارها ويحصل الوفاء والابراء العام بها، رغم ان قيمتها ليست فی ذاتها، وانما فی امر خارج عنها، وهو حصول الثقة بها، كوسيط فی التداول والتبادل، وذالك هو سر مناطها بالثمنية ۔

اس کے بعد مجلس نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ:۔

يعتبر الورق النقدی نقدا قائما بذاته كقيام النقدية فی الذهب والفضة وغيرهما من الاثمان ۔

(قرارات مجلس المجمع الفقهی الاسلامی ص ۹۶)

ان تصریحات، دلائل اور علمائے دین کی آراء کے پیش نظر کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت ثمن اور نقدی کی قرار پائی ہے اور اس پر وہ تمام احکام مرتب ہوتے ہیں جو سونے اور چاندی کی نقدی پر مرتب ہوتے ہیں۔

زرِ حقیقی اور زرِ اصطلاحی کے شرعی احکام میں کیا کوئی فرق ہوگا؟

جب کاغذی نوٹ کی حیثیت ثمن اور نقدی کی قرار پائی تو اس کے شرعی احکام وہی ہوں گے جو سونے چاندی کے دینار و درہم کے ہوتے ہیں۔ دونوں میں فرق کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ البتہ اس بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ ہر ملک کی پیپر کرنسی اپنی خاص قیمت رکھتی ہے اس لئے وہ ایک جنس ہے لہٰذا مختلف ممالک کی پیپر کرنسی کا ایک دوسرے سے تبادلہ دراصل ایک جنس کا دوسرے جنس سے تبادلہ ہے اس لئے اس میں قیمتوں کا جو تفاوت ہوتا ہے اس کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کرنسی نوٹ کو سونے کا قائم مقام مان لیا جائے تب بھی دو ملک کے کرنسی نوٹوں کے درمیان قیمتوں کا فرق اس اعتبار سے ہوگا کہ سونے کی جتنی مقدار اپنے ملک کی کرنسی نوٹ کے ذریعہ خریدی جا سکتی ہے اتنی ہی مقدار میں سونا خریدنے کے لئے غیر ملک کی کرنسی کم یا زیادہ مقدار میں ادا کرنا ہوگی مثال کے طور پر ایک گرام سونا خریدنے کے لئے جتنے ہندوستانی روپے دینا ہوں گے اس سے کم امریکی ڈالر دے کر ایک گرام سونا ہندوستان ہی میں خریدا جا سکے گا۔ لہٰذا کرنسی نوٹوں کا یہ تفاوت ظاہری ہے اور حقیقت کے اعتبار سے دونوں کرنسیاں اپنے تفاوت کے ساتھ سونے کی حاصل کی جانے والی مقدار کے مساوی ہیں۔

المجمع الفقہی الاسلامی مکہ کی مجلس نے بھی مختلف ممالک کے کرنسی نوٹوں کو مختلف اجناس قرار دیا ہے:

کمایعتبر الورق النقدی اجناسا مختلفة، تتعدد بتعدد جهات الاصدار فی البلدان المختلفة، بمعنی ان الورق النقدی السعودی جنس وان الورق النقدی الامریکی جنس ــــــــــــــ
یجوز بیع بعضه ببعض من غیر جنسه مطلقا، اذا کان ذلك یدا بید، فیجوز بیع اللیرة السوریة أو اللبنانیة، بریال سعودی ورقا کان أو فضة، او اقل من ذلك او اکثر، وبیع الدولار الامریکی بثلاث ریالات سعودیة أو اقل من ذلك او اکثر اذا کان ذلك یدا بید، ومثل ذلك فی الجواز بیع الریال السعودی الفضة، بثلاثة ریالات سعودیة ورق، أو اقل من ذلك او اکثر، یدا بید،

لان ذلك يعتبر بيع جنس بغير جنسه ، و لا اثر لمجرد الاشتراك في الاسم مع الاختلاف في الحقيقة ۔ (قرارات المجلس ص ۹۷)

اگر کہا جائے کہ کرنسی نوٹ ذاتی طور پر کوئی قیمت نہیں رکھتا جبکہ سونے چاندی کے دینار و درہم ذاتی طور پر قیمت رکھتے ہیں تو اس سے عام حالات میں کوئی فرق عملاً واقع نہیں ہوتا۔ غیر معمولی یا بحرانی حالات ہی میں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے مگر حکم عام حالات ہی کو سامنے رکھ کر بیان کیا جاتا ہے۔

کرنسی نوٹوں کا نصاب زکوٰۃ سونے کے اعتبار سے مقرر کیا جائیگا یا چاندی کے؟

کرنسی نوٹ کا تعلق چاندی کی بہ نسبت سونے سے زیادہ ہے لیکن چونکہ یہ چاندی اور سونے دونوں کی نقدی کا بدل ہے اس لئے زکوٰۃ کے نصاب کے لئے معیار دونوں میں سے کم قیمت والی چیز کو بنانے میں ہے لہٰذا نصاب زکوٰۃ کے لئے چاندی کا اعتبار کیا جانا چاہئے۔

اگر کسی کے پاس کرنسی نوٹ سال گزرنے کے بعد اتنی مقدار میں ہے کہ اگر وہ چاندی خرید لے تو وہ نصاب کے بقدر ہو جائے تو اس کی حیثیت صاحب نصاب کی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

مکہ کی مجلس المجمع الفقہی الاسلامی نے اپنی قرارداد میں کہا ہے۔

وجوب زكاة الاوراق النقدية ، اذا بلغت قيمتها ادنى النصابين من ذهب او فضة ، او كانت تكمل النصاب مع غيرها من الاثمان والعروض المعدة للتجارة۔

(قرارات المجلس ص ۹۷)

کیا دیون کو قیمتوں کے اشاریے والبستہ کرنا شرعاً صحیح ہوگا؟

یہ واقعہ ہے کہ افراط زر کی صورت میں کاغذی نوٹوں کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے لیکن اس کے باوجود واجبات مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خرید کی رقم وغیرہ کو اس کے اشاریہ سے وابستہ کرنا نہ شرعاً صحیح ہوگا اور نہ عملاً یہ ممکن ہے شرعاً اس لئے صحیح نہ ہوگا کہ یہ سود کی صورت ہوگی کیونکہ یہ ایک ہی جنس کا اضافہ کے ساتھ تبادلہ ہے محض تاخیر (نسیئہ) کی بنیاد پر۔ اور عملاً یہ اس لئے ممکن نہیں ہے کہ اشاریہ میں کس چیز کو بنیاد بنایا جائے گا؟ بعض مرتبہ اناج کی قیمتیں بڑھتی ہیں لیکن سونے کی قیمت نہیں بڑھتی اور بعض مرتبہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسری اشیاء کا معاملہ ہے

کہ قیمتوں کے گھٹنے بڑھنے کا کوئی اصول نہیں ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ اگر ایک چیز کی قیمت گھٹ یا بڑھ گئی ہو تو دوسری چیزوں کی قیمت بھی اسی تناسب سے گھٹے یا بڑھے۔ اور اگر کوئی ایسا اشارہ بنا دیا گیا جیسا کہ حکومت ملازمین کی اجرت میں مہنگائی بھتہ کے اضافہ کے لئے بناتی ہے تو ہر وقت کرنسی نوٹوں کی قیمت میں کمی بیشی کا عمل کرتے رہنا ہوگا ظاہر ہے یہ سب باتیں ذہنوں کو الجھا دینے والی اور باہمی نزاع کا باعث ہونگی۔ قرض کی ہر قسط ادا کرنے کے وقت نیا حساب لگانا ہوگا۔ ظاہر ہے اس کو نہ لوگوں کا مزاج قبول کر سکتا ہے اور نہ اسلام کی سادہ اور سہل شریعت اس کو گوارا کر سکتی ہے۔

ماضی میں بھی درہم اور دینار کی قیمتوں میں فرق ہوتا رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سونے کا ایک دینار چاندی کے دس درہم کے برابر تھا لیکن اموی دور میں بارہ درہم کے برابر ہوا اور عباسی دور میں پندرہ درہم کے برابر (ملاحظہ ہو فقہ الزکوٰۃ ج ۱ ص ۲۷۶) لیکن کوئی مثال ہمارے سامنے ایسی نہیں ہے کہ واجبات کی ادائیگی میں بھی اس لحاظ سے فرق روا رکھا گیا ہو۔ ابو داؤد کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اونٹ گراں ہو جانے کی بنا پر دیت کی مقدار آٹھ ہزار دینار سے بڑھا کر دس ہزار دینار کر دی تھی اور درہم میں ادائیگی کی صورت میں آٹھ ہزار درہم سے بڑھا کر بارہ ہزار درہم کر دی تھی۔ (ابو داؤد کتاب الدیات باب الدیۃ کم ہی) گویا اونٹ کے مقابلہ میں دینار و درہم کی قیمت گھٹ گئی تھی لیکن اس کے باوجود نہ سونے چاندی کے نصاب میں کوئی فرق کیا گیا اور نہ قرضوں کی ادائیگی میں۔

عرف عام بھی یہی ہے کہ قرضہ جات اور واجبات (غیر سودی ہونے کی صورت میں) کی ادائیگی خواہ وہ کتنے ہی عرصہ بعد کیوں نہ ہو اتنے ہی روپیوں کرنسی نوٹوں میں ادا کی جاتی ہے جتنے روپے کی کرنسی نوٹ لئے گئے تھے یا واجب تھے۔ قیمتوں کے اشاریہ کے حساب سے واجبات کی ادائیگی کا تصور بالکل نیا، ناقابل عمل اور نزاع کا باعث ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر وقت اشیاء کی قیمتیں بڑھتی ہی رہیں۔ اگر کسی وقت قیمتیں گھٹ گئیں تو کیا واجبات کی ادائیگی کم روپیوں میں کی جائے گی؟ مثال کے طور پر اشیاء کی قیمتیں اگر دس فیصد گھٹ گئی ہوں تو کون شخص اس بات کو گوارا کرے گا کہ اس کو اپنے قرضدار سے ایک سو روپے کے بجائے نوے روپے مل جائیں؟

کیا یہ جائز ہوگا کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت طرفین واجب الادا نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرلیں اور بوقت ادائیگی اسقدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ طے کرلیں نوٹوں کی شکل میں دیے ہوئے قرض کو سونے یا چاندی کی مالیت میں طے کرنا اور بوقت

ادائیگی اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ طے کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ یہ ربا کی صورت ہوگی کرنسی نوٹ ایک جنس ہے اور اس کی اسی جنس کی شکل میں ادائیگی برابر کے اصول ہی پر ہونی چاہیے (سواءً بسواء) پھر جو صورت پیش کی گئی ہے وہ سود کی رقم وجائز قرار دینے کے لیے محض حیلہ ہے اور حیلہ کے ذریعہ کسی حرام کو حلال قرار دینا دوسرے گناہ کا باعث ہے۔ فقہی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو ثمن کا تبادلہ سونے کی مقدار سے نیسئۃً ہے اور پھر سونے کی مقدار کو ثمن کی شکل میں اضافہ کے ساتھ حاصل کرنا ہے اس لیے اس کے جواز کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

ادھار فروخت کا معاملہ بھی اسی طرح ہے۔ رہا مہر کا معاملہ تو مہر سونے یا چاندی ہی کی شکل میں کیوں نہیں طے کر لیا جاتا؟ اس تکلف کی آخر کیا ضرورت ہے کہ نوٹوں میں مہر مقرر کیا جائے اور سونے یا چاندی میں اس کی مالیت طے کی جائے اور پھر وصولیابی کے وقت سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹ حاصل کر لئے جائیں۔ سیدھی بات یہی ہے کہ اس حکم میں پڑے بغیر سونے یا چاندی کی مقدار مہر میں مقرر کی جائے۔ عورت چاہے تو ادائیگی کے وقت اس کی قیمت بازار کے نرخ سے وصول کر سکتی ہے اس میں نہ شرعاً کوئی حرج واقع ہوتا ہے اور نہ عورت خسارہ میں رہتی ہے نیز مرد پر بھی کوئی زائد بار نہیں پڑتا۔

کاغذی نوٹوں کی فقہی حیثیت

(از) ——— مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صدر مدرس دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

اصولی طور پر یہ بات ذہن نشیں رکھنی ضروری ہے کہ شریعت کے احکام دو طرح کے ہیں۔ عبادات اور عادات، عبادات سے متعلق احکام اصلاً حکم خدا پر مبنی ہیں، گو یہ احکام بھی مصلحت سے خالی نہیں ہیں اور نہ خلاف عقل و دانش ہیں، لیکن ضرور نہیں کہ ان کی مصلحت سمجھ میں آجائے، اس لئے کہ ان میں بن بجھے احکام خداوندی کی تعمیل ہی مقصود ہے، انہیں احکام کو فقہاء "تعبدی" کہتے ہیں، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب و سنت میں ان احکام کی اور ان سے متعلق ایک ایک جزئیہ کی اس درجہ صراحت و وضاحت ہے کہ قیاس و رائے کے لئے بہت کم گنجائش باقی رہتی ہے۔

"عادات" سے مراد ان قوانین کا انضباط اور ان کی تہذیب ہے جو انسانی ضروریات سے متعلق ہیں جیسے خورد و نوش، لباس و پوشاک، نظم حکومت، اپنی مملکت کا دفاع، بین ملکی تعلقات خرید و فروخت اور دوسرے مالی قوانین، ایسے احکام میں شارع نے ایک ایک جزئیہ کا احاطہ نہیں کیا ہے، بلکہ ہر شعبۂ احکام میں کچھ بنیادی اوامر و نواہی مقرر کر دیئے گئے ہیں اور ایسے قواعد کی رہنمائی کر دی ہے کہ ان کے ذریعہ عدل و توازن قائم رکھا جا سکے اور ظلم و ناانصافی سے بچا جا سکے، اسی لئے ان ابواب میں نصوص بہت کم ہیں اور فقہاء کے لئے اجتہاد اور رائے کا میدان بہت وسیع ہے، یہ عین مطابق مصلحت بھی ہے کہ اگر ایسا لچک دار رویہ اختیار نہ کیا جاتا تو فقہ اسلامی کے لئے تغیر پذیر قدروں کے ساتھ سفر مشکل ہو جاتا، یہ جزئیات عموماً شریعت کے مقررہ قواعد پر مبنی ہوتے ہیں، یہ قواعد ہی ہیں جو احکام فقہیہ میں عدل و توازن کو برقرار رکھتے ہیں، بعض اوقات

ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام قیاس کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے لیکن وہ کسی قاعدۂ فقہیہ سے متصادم ہوتا ہے، ایسی صورت میں قیاس کو ترک کر دیا جاتا ہے اور فقہی قاعدہ پر عمل کیا جاتا ہے، کتب فقہ میں اس کی نظیریں اس کثرت سے ہیں کہ ان کا نقل کرنا خاصا طوالت کا باعث ہوگا، فقہاء مالکیہ کے یہاں مصالح مرسلہ اور حنفیہ کے یہاں استحسان بالعرف، استحسان بالضرورۃ اور استحسان بالقیاس الخفی وغیرہ دراصل قیاس کے مقابلہ شریعت کے عمومی قواعد کی ترجیح اور رعایت ہی کا دوسرا نام ہے۔

دو اہم فقہی قواعد

ایسے ہی فقہی قواعد میں ایک "الضرر یزال" (نقصان کا ازالہ کیا جائے گا) ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث "لا ضرر ولا ضرار" (نہ نقصان اٹھایا جائے اور نہ پہونچایا جائے) پر مبنی ہے، اس اصل کو ارشاد خداوندی "لا تظلمون ولا تظلمون" [1] (نہ ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے) سے بھی اخذ کیا جا سکتا ہے، نوٹوں اور سکوں کے مسئلہ میں بھی ضروری ہے کہ اسلام کے اس تصور عدل کو کلیدی اہمیت دی جائے اور فقہی جزئیات اور قدیم فقہاء کے اجتہادات کو ثانوی، اس لئے کہ فقہاء کی رائیں اپنے عہد اور زمانہ کے لحاظ سے عین عادلانہ تھیں مگر ضروری نہیں کہ بدلے ہوئے حالات میں بھی اقامت عدل کے لئے یہ کفایت کر سکیں۔

اسی طرح قانون اسلامی کا ایک اہم ذیلی ماخذ عرف وعادت ہے، جن امور کی بابت نصوص موجود نہ ہوں اور کتاب وسنت نے صریح رہنمائی نہ کی ہو، ان میں لوگوں کا عام تعامل اور عادت خاص اہمیت رکھتا ہے اور عرف وعادت کے تغیر سے خاصا فرق واقع ہوتا رہتا ہے، اسی کو علماء نے "العادۃ محکمۃ" اور "الثابت بالعرف کالثابت بالنص" سے تعبیر کیا ہے، نوٹوں اور سکوں کی فقہی حیثیت متعین کرنے میں عرف ورواج کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

بحث طلب سوالات

نوٹوں اور سکوں کی فقہی حیثیت متعین کرنے میں درج ذیل امور قابل توجہ ہیں۔

(۱) نوٹ بذات خود ثمن ہیں یا وثیقہ اور سند کا درجہ رکھتے ہیں؟

---

[1] الاشباہ والنظائر للسیوطی ۱۰۳

(٢) اگر ثمن ہیں تو مثلی ہیں یا قیمی؟ "اور مثلی اور قیمی سے کیا مراد ہے؟
(٣) مثلی ہیں تو آیا اس میں قوت خرید بھی کوئی اہمیت رکھتی ہے یا نہیں؟
(٤) مثلی اشیاء میں قوت خرید کی کمی عیب ہے یا نہیں؟ اور عیب ہے تو اس کے بارے میں فقہاء کیا کہتے ہیں؟
(٥) اگر قوت خرید میں کمی اور زیادتی معتبر ہے تو اس کا اندازہ کس طرح کیا جائے گا؟

نوٹ ثمن ہیں یا سند؟

نوٹ بذات خود ثمن ہیں یا اصل ثمن کی سند ہیں؟ اس سلسلے میں علماء کی رائیں مختلف ہیں، ایک گروہ کا خیال ہے کہ نوٹ اور سکے وثیقہ کا حکم رکھتے ہیں، بعینہ ثمن نہیں ہیں، ہمارے علماء ہند میں اس سلسلہ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی[1] اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ[2] کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں عام طور پر علماء ہند و پاک نے اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے، دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ سکے اور نوٹ بجائے "خود ثمن" کا درجہ رکھتے ہیں، حضرت مولانا عبد الحیٔ لکھنوی فرنگی محلی[3] اور ان کے تلمیذ رشید حضرت مولانا فتح محمد صاحب[4] اسی کے قائل ہیں۔

اس مسئلہ پر ظاہر ہے کہ ہم کو کتاب و سنت کی تصریحات نہیں مل سکتیں۔ اس لئے کہ قدیم زمانہ میں خرید و فروخت کے لئے صرف سونا چاندی کا استعمال ہوتا تھا، سکوں اور خصوصیت سے نوٹ کا استعمال تو بہت بعد کو شروع ہوا، البتہ کتب فقہ میں بعض ایسی نظیریں ملتی ہیں جن سے زیر بحث مسئلہ میں روشنی حاصل کی جا سکتی ہے بعض لوگ نوٹ کو صرف وثیقہ اور سند مانتے ہیں۔ ان کی دلیل واضح اور بادی النظر میں قرین قیاس ہے، نوٹ پر اس عبارت کا درج ہونا کہ اتنے روپے ادا کرنے کی اجازت دیتا ہوں ——— بجائے خود نوٹوں کے وثیقہ ہونے کو بتاتا ہے جس کو ریزرو بنک کے گورنر کی توثیق کی وجہ سے قبول کیا جاتا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ خود اس کاغذ یا سکہ میں اتنی قوت خرید نہیں ہوتی جو اس توثیق کی وجہ سے اس میں تسلیم کر لی جاتی ہے اور نہ اس توثیق کے بغیر کوئی اس کو خرید و فروخت کے لئے قبول ہی کرتا ہے، دوسرے نوٹ کی ترویج اور اس کا آغاز جس طرح ہوا وہ خود بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں بینک

---

[1] امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۵ [2] آلات جدیدہ کے شرعی احکام [3] یہی رائے مولانا مفتی نظام الدین مفتی دار العلوم دیوبند کی ہے۔ نظام الفتاویٰ [4] مجموعۃ الفتاویٰ کتاب البیوع نرخ در بیع سلم۔

کی نوٹ کے بجائے لوگ بطور خود رقوم کے وثیقے لکھ دیا کرتے تھے اور وہی قبول کرلئے جاتے تھے، جو ظاہر ہے کہ چیک اور وثیقہ ہی کی شکل ہے، بعد کو یہ اختیار حکومتوں نے لیا اور ان کی مہر تصدیق کے ساتھ نوٹ چلنے لگے، پھر حکومت نے زر پر کنٹرول کرنے کے لئے یہ حق ریزروبینک کو سونپ دیا اور اس طرح اب بینک نوٹ جاری کرتے ہیں۔" دائرۃ المعارف برطانیہ نے نوٹ کی حیثیت یہ بتائی ہے کہ یہ گویا اس قرض کی سند ہے[2] جو صاحب نوٹ کا بینک کے ذمہ ہے[3]۔ نوٹ کے متعلق اس تفصیل نے اس بات کو واضح کردیا ہے کہ اس کی حیثیت وثیقہ کی ہے، اور فقہ کی اصطلاحی زبان میں یہ حوالہ ہے، نوٹ ادا کرنے والا "محیل" وصول کرنے والا "محتال" اور بینک محتال علیہ ہے، جس نے اس کی ادائیگی کا ذمہ لیا ہے۔ [4]

جن حضرات نے اس کو "ثمن" قرار دیا ہے، ان کے پیش نظر یہ امر ہے کہ نوٹ کا چلن آج بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے کسی زمانہ میں درہم و دینار کا ہوا کرتا تھا، حکومت نوٹ لینے پر مجبور کرتی ہے، اگر نوٹ ضائع ہوجائے تو اس کا عوض ادا نہیں کرتی، رہ گئی حکومت کی طرف سے نوٹ کی توثیق تو یہ نوٹ کی ثمنیت میں چنداں مضر نہیں، چونکہ نوٹ میں فی نفسہٖ مالیت نہیں ہوتی، اس لئے اس کی ثمنیت کی یقین دہانی اور اعتبار قائم کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے یہ توثیق ہے جو اس کے ثمن ہونے کے منافی نہیں۔

ان دونوں رایوں پر غور کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی چیز میں ثمنیت پیدا ہونے اور اس کو ثمن تسلیم کرنے کے کیا اصول ہیں؟ فقہی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ چیزیں تخلیقاً ثمن ہیں، یعنی وہ پیدا ہی اس لئے کی گئی ہیں کہ ثمن کا کام دیں[5]۔ یہ دو ہیں سونا اور چاندی عہد رسالت اور عہد صحابہ میں یہی دو چیزیں تھیں جو ثمن کے طور پر استعمال ہوتی تھیں، سکے بھی انہیں کے ڈھلتے تھے، سونے کے دینار ہوتے تھے اور چاندی کے درہم ثمنیت پیدا ہونے کی دوسری صورت "اصطلاح" یعنی باہمی اتفاق ہے، اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ لوگ عرف و رواج کے اعتبار سے کسی چیز کے ثمن ہونے پر اتفاق کرلیں، صاحب ہدایہ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: "لان الثمنیۃ بالاصطلاح"[6]

---

[1] تکملۃ فتح الملہم ۱/۵۱۶ [2] تکملہ فتح ۱/۵۱۹ [3] ویمکن اعتبارہ کسند عند الدائن کدین لصاحبہ البنک تکملہ فتح الملہم ج ۱/۵۱۹ [4] صاحب ہدایہ ایک مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: بخلاف النقود لانہا للثمنیۃ خلقۃ ہدایہ ۳/۶۵ – [5] ہدایہ ۳/۹۲

"فلوس نافقہ" کو اسی بنا پر ثمن تصور کیا جاتا ہے،

اب سوال یہ ہے کہ کسی چیز کے "ثمن اصطلاحی" بننے اور اس کی ثمنیت پر اتفاق رائے پیدا ہو جانے کا اندازہ کس طرح کیا جائے گا؟ —— تو ہمارے زمانے کے لحاظ سے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ عوام میں بطور خود اس کا چلن ہو جائے، جیسا کہ قدیم کتب فقہ میں مذکور ہے۔ مگر اس زمانہ میں نظام زر پر کنٹرول کے لئے جو اصول و قواعد مقرر ہیں اور جو نہ صرف ملکی اور قومی بلکہ بین قومی سطح پر نافذ ہیں، کے تحت ایسا ہونا بظاہر ممکن نہیں —— دوسری صورت یہ ہے کہ حکومت کسی چیز کو "ثمن" قرار دیدے اور یوں عوام اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں، یہی شکل اس وقت پوری دنیا میں جاری و ساری ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ نوٹ کی حیثیت فی زماننا "اصطلاحی ثمن" کی ہو گئی ہے اور ہمارے زمانہ کے عرف کے لحاظ سے اس میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ آج جب ایک شخص دوسرے کو نوٹ ادا کرتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ بات بالکل نہیں رہتی کہ وہ اس کو وثیقہ ادا کر رہا ہے، جس کی ادائے گی بینک کے ذمہ ہے، بلکہ وہ اسے مستقل ثمن سمجھ کر ادا کرتا ہے۔ اس کے برخلاف آج بھی بینک کے چیک اور ڈرافٹ وغیرہ دیئے جاتے ہیں، تو دینے والے اور لینے والے دونوں کے ذہن میں اس کی حیثیت رہتی ہے کہ یہ اصل رقم نہیں ہے، بلکہ وثیقہ ہے۔ اور جیسا کہ ذکر کیا گیا، فقہاء نے ثمن کے سلسلے میں جو تفصیلات ذکر کی ہیں ان سے واضح ہے کہ "ثمنیت" پیدا ہونا اصل میں عرف اور رواج ہی پر مبنی ہے اور وہی اس باب میں اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، "فلوس نافقہ" اور ایسے درہم و دینار جن پر کھوٹ غالب ہو اور وہ سونا چاندی کے حکم میں باقی نہ رہیں، اس کی واضح نظیر ہیں کہ ان کے "ثمن" تسلیم کئے جانے کی وجہ سوائے رواج و تعامل کے اور کیا ہے؟

نوٹ مثلی ہیں یا قیمی؟

"خلقی ثمن" یعنی سونا اور چاندی کو فقہاء نے "مثلی" مانا ہے، سوال یہ ہے کہ نوٹ مثلی ہیں یا قیمی" یعنی اگر ایک شخص کے نوٹ دوسرے شخص کے ذمہ واجب الادا ہوں تو وہ انہیں نوٹوں کا مثل ادا کرے یا اس کی قوت خرید کا اعتبار کرے گا۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس امر کی تعیین کریں کہ مثلی اور قیمی کی

لہ فلوس نافقہ سے تمبنے، پیتل وغیرہ کے وہ سکے ہیں، جن کا چلن ہو۔

محدود کیا ہیں اور دیکھیں کہ فقہاء اس باب میں ہماری کیا رہنمائی کرتے ہیں: مثلی کی تعریف فقہاء نے ان الفاظ میں کی ہے:

(۱) "علی مقدر بکیل او وزن" وہ اشیاء جن کی مقدار ناپ یا تول کے ذریعہ معلوم کی جائے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ جن کے اجزاء مختلف ہوں اور تانبے کے برتن جن کی مقدار تول کے ذریعہ ہی معلوم کی جاتی ہے تو اس تعریف کی رو سے مثلی ہونا چاہیے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

(۲) ناپ اور تول کے ذریعہ جس کی مقدار معلوم کی جا سکے اور اس میں بیع سلم جائز ہو جائے "ما حصر بکیل او وزن وجاز السلم فیہ"۔

(۳) ناپ تول کر فروخت کی جانے والی چیز جس میں سلم اور خود اس شئی کی اپنی ہم جنس سے خرید و فروخت درست ہو کل مکیل وموزون جاز السلم فیہ وبیع بعضہ ببعضہ۔

(۴) وہ شئی اگر دو شرکاء کے درمیان تقسیم کرنی ہو تو قیمت لگانے کی ضرورت نہ پڑے یقسم بین الشریکین من غیر تقویم ——— لیکن یہ تعریف اس لئے صحیح نہیں ہے کہ زمین کو مثلی نہیں مانا گیا ہے حالانکہ قیمت لگائے بغیر اس کو تقسیم کیا جا سکتا ہے ونقض بالاراضی المتساویۃ

(۵) جس میں ایک ہی نوع کے مختلف اجزاء میں قیمت کے اعتبار سے تفاوت نہ ہو مالا یختلف اجزاء النوع الواحد منہ بالقیمۃ[1]۔

(۶) وہ اشیاء جن کی مقدار ناپ تول کر معلوم کی جاتی ہو، یا شمار کر کے معلوم کی جاتی ہو لیکن اس کے مختلف افراد میں قابل لحاظ تفاوت نہ ہو کالمکیلات، والموزونات، والعددیات المتقاربۃ، اس طرح ہاتھ اور گز سے ناپی جانے والی اشیاء اور ایسی شمار کی جانے والی جن کے افراد میں باہم کافی تفاوت ہو، مثلی نہیں ہوں گی، ...... ممالا مثل لہ من المذروعات والمعدودات المتقاربۃ فعلیہ قیمتہ[2]

(۷) جس کا مثل بازار میں قابل لحاظ تفاوت کے بغیر دستیاب ہو وہ مثلی ہے، ورنہ قیمی[3]

(۸) مثلی اور قیمی کی تعریف میں حقیقی اختلاف نہیں، تعبیر و بیان کا اختلاف ہے، کسی شئی کے مختلف افراد میں مالیت کے اعتبار سے تفاوت نہ ہو یا اتنا کم تفاوت ہو جس کو عام طور پر لوگ

---

[1] الاشباہ والنظائر للسیوطی ص۵۴۶-۵۴۴، بیان المثلی والمتقوم

[2] بدائع الصنائع ۷/۱۵۰

[3] طحطاوی علی الدر ۴/۱۰۲

نظرانداز کر دیا کرتے ہو وہ "مثلی" ہے اور جس کے افراد میں قابل لحاظ تفاوت ہو وہ "قیمی" ہے سرخسی نے ایک مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے "وھذا لان اٰحاد ھذہ الاشیاء لاتتفاوت فی المالیۃ"[1] ہو سکتا ہے کہ بعض اشیاء کو فقہاء نے اپنے زمانہ کے عرف کے لحاظ سے مثلی نہ مانا ہو لیکن اب وہ مثلی ہو گئی ہوں جیسے گز سے ناپ کر فروخت کی جانے والی اشیاء کپڑے وغیرہ کہ فقہی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں کپڑوں کے ایک ہی تھان کے مختلف حصوں میں قابل لحاظ فرق ہوتا تھا، مگر آج ایسا نہیں ہے، کپڑے کی انواع اس طرح معین و مشخص ہو گئی ہیں اور ایک ہی نوع کے کپڑے میں آنا کم اور ناقابل لحاظ فرق ہے کہ ان کے "مثلی" ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔

ان تفصیلات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ نوٹ "مثلی ہی ہیں، یہ گو فقہاء کی زبان میں کیلی اور وزنی نہیں لیکن "عددی غیر متفاوت" ہیں، اس لئے کہ ایک ہی تعداد کے دو نوٹ مثلاً پانچ روپے کے دو نوٹ کی ایک وقت میں ایک ہی مالیت ہوتی ہے اور ان کی قدر میں کوئی تفاوت نہیں ہوتا جیسا کہ فقہاء نے دراہم و دنانیر کی طرح "فلوس" کو مثلی شمار کیا ہے واما مصنوع لایختلف کالدراھم والدنانیر والفلوس وکل ذلک مثلی[2]

مثلی اشیاء میں قدر کا لحاظ

لیکن سوال یہ ہے کہ "مثلی" اشیاء میں فقہاء کے نزدیک صرف اسی شئی کی ظاہری صورت ہی ملحوظ ہوتی ہے یا اس کی افادی صلاحیت معنوی قدر اور قیمت کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے گو فقہاء کی عام عبارات سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مثلی سامان کے یہاں ظاہری صورت مراد ہوتی ہے مثلاً کوئی شخص دس کیلو گیہوں کسی کو قرض دے تو دس کیلو گیہوں کے ذریعہ ہی اس کی ادائے گی عمل میں آئے گی، خواہ قرض لینے اور قرض ادا کرنے کے وقت گیہوں کی قیمت میں کچھ فرق ہو ——— ابن قدامہ کہتے ہیں۔

ان المستقرض یرد المثل من المثلیات سواء رخص سعرہ او غلا او کان بحالہ[3] — قرض خواہ مثلیات میں مثل ہی واپس کرے گا، اس کی قیمت کم ہو گئی ہو، بڑھ گئی ہو یا جوں کا توں۔

---

[1] المبسوط ۱۱/۹ [2] طحاوی ۳/۱۰۲ [3] المغنی مع الشرح الکبیر ۴/۳۶۵۔

نووی کا بیان ہے:

اذا اقرض شیئا لہ مثل کالحبوب والادھان والدراھم والدنانیر وجب علی المقرض رد مثلھا لانہ اقرب الیہ[1]

اگر مثلی چیز مثلاً دانے، تیل، درہم اور دینار قرض دیا جائے تو مقروض پر اس کے "مثل" کی واپسی واجب ہو گی کہ یہی اس کے قرض سے قریب تر چیز ہے۔

یہی فقہاء مالکیہ نے لکھا ہے:

(ولو بغلاء) واذا غصبہ وھو یساوی عشرۃ وحین تضمین کان یساوی خمسۃ او عکسہ اخذ بمثلہ ولا ینظر للسعر الرامغ[2]

(گو گراں ہو گیا ہو) یعنی کسی نے ایسی چیز غصب کی جو دس درہم کی ہو اور تاوان ادا کرنے کے وقت اس کی قیمت پانچ درہم یا اس کے برعکس ہو گئی ہو یعنی اس کی قیمت بڑھ گئی ہو تو اس بڑھی ہوئی قیمت پر توجہ نہیں کی جائے گی اور "مثل" وصول کیا جائے گا۔

اس طرح کی صراحتیں دوسرے فقہاء کے یہاں بھی منقول ہیں ـــــــ تاہم، ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مواقع پر فقہاء نے تقاضاء عدل کی تکمیل یا کسی اور وجہ سے مثلی اشیاء میں بھی قیمت اور منفعت کو ملحوظ رکھا ہے، چند مثالیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

(۱) پانی مثلی شئی ہے لیکن کسی شخص نے ایسے صحرا میں پانی غصب کر لیا جہاں پانی دستیاب نہیں ہے، تو اب اس شخص کا دوسری جگہ مثلاً نہر کے کنارے سے صرف پانی واپس کر دینا کافی نہیں بلکہ اس کی قیمت ادا کرنی ہو گی[3]۔

(۲) غصب کی ہوئی مثلی چیز اگر ایسی ہو کر بازار سے ناپید ہو گئی ہو تو اس کی قیمت ہی ادا کی جائے گی، امام ابوحنیفہؒ کے یہاں عدالت میں جس دن یہ قضیہ گیا تھا اس دن کی قیمت کا اعتبار ہو گا، قاضی ابو یوسف کے نزدیک اس دن کی قیمت معتبر ہو گی جس دن غصب کیا تھا، امام محمد کا خیال ہے کہ اس دن کی قیمت ادا کی جائے جس دن وہ سامان بازار سے ناپید ہوا ہو[4]۔

(۳) زیورات ضائع کر دے تو صرف اس کے ہم وزن سونا یا چاندی واپس کر دینا کافی نہیں بلکہ اس کی قیمت ادا کرنی ہو گی[5]۔

---

[1] شرح مہذب ۱۳/۱۶۲ [2] بلغۃ السالک لاقرب المسالک الی مذہب الامام مالک علی الشرح الصغیر ۲/۲۱۳۔
[3] الاشباہ والنظائر سیوطی ۱/۵۰۲ [4] الاشباہ والنظائر ابن نجیم ۱۲۳ [5] الاشباہ سیوطی ۱/۵۰۲

(۴) "فلوس" احناف کے نزدیک مثلی ہے۔ چنانچہ کسی نے فلوس قرض لئے اور ادائیگی سے پہلے ہی اس کا چلن بند ہو گیا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو اب بھی وہی فلوس ادا کرے گا، لیکن قاضی ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک اب اس کی قیمت ادا کرنی ہو گی[۱]

اس طرح کی اور مثالیں بھی فقہاء کے یہاں احرام میں شکار، غصب، قرض وغیرہ کے احکام کے ذیل میں مل جاتی ہیں ایسا اس لئے ہے کہ "مثل" یا "قیمت" اصل مقصود نہیں ہے بلکہ عدل مقصود ہے، اس لئے فقہاء جہاں مثل واجب قرار دیتے ہیں تو وہ اسی لئے کہ وہاں مثل کو واجب قرار دینا ہی زیادہ قرین انصاف ہے، سرخسی کا بیان ہے۔

۔۔۔ ولان المقصود وھو الجبران وذلك	کیونکہ اصل مقصود تلافی ہے اور وہ مثل کے ذریعہ
فی المثل اتم لان فیہ مراعاۃ الجنس	زیادہ مکمل طور پر ہوتی ہے، اس لئے کہ اس میں
والمالیۃ وفی القیمۃ مراعاۃ المالیۃ	جنس اور مالیت دونوں کی رعایت ہے جبکہ قیمت میں صرف
فقط فکان ایجاب المثل اعدل[۲]	مالیت کی رعایت ہے لہذا مثل کو واجب قرار دینا زیادہ قرین انصاف ہے۔

اب اگر کہیں تقاضا، عدل کی تکمیل کے لئے قیمت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہو جائے اور صرف "مثل" کی ادائے گی ضرر کا باعث بنتی ہو تو ضروری ہے کہ وہاں قیمت کا اعتبار کیا جائے یا اس کو ملحوظ رکھا جائے، علامہ ابن تیمیہ نے عاریت کے تلف ہو جانے سے متعلق ایک جزئیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

ولهذا كان من اوجب المثل فی كل شیئ	لہذا جن حضرات نے حتی المقدور ہر چیز میں قیمت کی
بحسب الامكان مع مراعاۃ القیمۃ اقرب	رعایت کے ساتھ مثل واجب قرار دیا ہے، ان کی رائے
الی العدل ممن اوجب القیمۃ من	بہ مقابلہ ان لوگوں کے جو بجائے مثل کے قیمت کو
غیر المثل[۳]	واجب قرار دیتے ہیں، زیادہ قرین عدل ہے۔

اسی لئے فقہاء لکھتے ہیں کہ کسی نے سکوں کے ذریعہ خرید و فروخت کا معاملہ طے کر لیا مگر اس سے پہلے کہ خریدار وہ سکے ادا کرے، ان سکوں کا چلن بند ہو گیا، تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ معاملہ ختم ہو جائے گا، قاضی ابو یوسف کے نزدیک ان سکوں کی قیمت ادا کرنی ہو گی، من اشتری بالفلوس شیئا ثم کسدت قبل القبض بطل الشراء[۴]

[۱] بدائع الصنائع ۷/۳۹۵ کتاب القرض اس کے علاوہ ابن نجیم نے الاشباہ ۳۶۲-۳۶۵ اور سیوطی نے اشباہ میں ایسی صورتوں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ [۲] المبسوط ۱۱/۵۰ [۳] مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ۱۰/۳۵۲ ——— یہی ابن قدامہ نے لکھا ہے "وان کان القرض فلوسا او مکسرۃ فحرمہا السلطان وترکت المعاملۃ بہا کان للمقرض قیمتہا" (المغنی مع الشرح الکبیر ۴/۳۶۵)
[۴] فتاوی ہندیہ ۳/۱۳۹۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے ایک جگہ کوئی چیز قرض لی، وہ شئی کسی دوسرے شہر میں ادا کرے، جہاں سے اس کو یہ سامان یعنی جگہ بے جانے میں اخراجات حمل ونقل سے گذرنا ہوگا، نیز مقام ادائے گی میں اس چیز کی قیمت کم ہو اور جہاں قرض لیا تھا وہاں زیادہ ہو تو قرض دہندہ اس کو قبول کرنے سے عذر کرسکتا ہے کہ اس میں اس کے لئے ضرر ہے[۱] یا اگر وہ اس سامان کی بجائے اس کی قیمت کا مطالبہ کرنا چاہے تو کرسکتا ہے فان طالبہ بالقیمۃ لزم اداءھا[۲]

مثلی اشیاء میں عیب کی تلافی

پھر یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ مثلی اشیاء میں اگر کوئی عیب اور نقص پیدا ہوجائے تو اس کی تلافی ضروری ہے مثلاً کسی نے سامان غصب کرلیا اور غاصب کے یہاں اس میں کوئی عیب پیدا ہوگیا، تو مغصوبہ سامان کے ساتھ اس عیب کا تاوان بھی ادا کرنا ہوگا، طحطاوی کہتے ہیں:

ولونقص المغصوب فی ید الغاصب	غصب کردہ سامان میں غاصب کے زیر قبضہ نقص پیدا
ضمن الغاصب النقصان ویردہ علی	ہوجائے تو غاصب اس نقصان کا تاوان ادا کرے گا اور وہ
المغصوب منہ مع ضمان النقصان[۳]	سامان نقصان کے تاوان کے ساتھ اصل مالک کو واپس کرے گا۔

اور عیب کے سلسلے میں فقہاء نے جو اصول متعین کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایسی تمام صورتیں جو تاجروں کے نزدیک قیمت کو گرادیتی ہو عیب ہے صاحب ہدایہ کے الفاظ میں: وکل ما اوجب نقصان الثمن فی عادۃ التجار فھو عیب۔[۴]

میرا خیال ہے کہ روپے کی قدر میں پیدا ہونے والی کمی بھی منجملہ عیوب کے ہے اور قرض وغیرہ کی ادائے گی میں اس کا لحاظ کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ قرض وغیرہ میں ضروری ہے کہ قرض خواہ قرض واپس کرتے ہوئے قرض انہی صفات کے ساتھ واپس کرے جس طرح کہ اس نے حاصل کیا تھا، ابن تیمیہ کے الفاظ میں: والمقرض یستحق مثل قرضہ فی صفتہ کما یستحق مثلہ فی الغصب والاتلاف۔[۵]

---

[۱] المجموع شرح مہذب ۱۳/۲،۱۰۲ [۲] الشرح الکبیر ۳/ ۲۶۵ مع المغنی [۳] طحطاوی علی الدر ۴/۱۰۱ [۴] ہدایہ مع الفتح ۶/۲ -
[۵] مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ ۲۹/ ۴۷۲ -

بعض فقہی عبارتوں سے شبہ

یہاں ان عبارتوں سے شبہ پیدا ہوتا ہے جن میں فقہاء نے نرخ کی کمی بیشی کو دین کی ادائیگی یا مال مغصوب کی واپسی میں غیر مؤثر مانا ہے، ابن قدامہ کہتے ہیں:

ولو کان ما اقرضه موجودا بعینه	سامان قرض بعینہ موجود ہو اور اس میں کوئی عیب
فرده من غیر عیب یحدث فیه لزم	نہ پیدا ہوا ہو اگر اس طرح واپس کیا جائے تو قرض دہندگان کے
قبوله سواء تغیر سعره او لم یتغیر[1]	اس کا قبول کرنا ضروری ہے، اس کی قیمت میں کوئی تغیر ہوا ہو یا نہ ہو

مالکی دبستان فقہ کی مشہور کتاب "بلغۃ السالک" میں ہے۔

اخذ بمثله ولا ینظر للسعر الرافع[2]	مثل لیا جائے گا اور بڑھتی ہوئی قیمت پر توجہ نہیں کیا جائے گا۔

فقہاء احناف بھی لکھتے ہیں۔

ولو رخصت لا[3]	اور اگر فلوس کی قیمت کم ہو جائے تو بیع باطل نہیں ہوگی، بلکہ وہی فلوس واجب ہونگے

علامہ کاسانیؒ نے بڑی وضاحت سے اس پر روشنی ڈالی ہے:

اذا عرض فی ید الغاصب ما یوجب	غاصب کے ہاتھ میں ایسی صورت پیدا ہو جائے جو
نقصان قیمة المغصوب والعارض	غصب شدہ سامان کی قیمت کو کم کردے تو یہ پیدا شدہ نقص
لا یخلو اما ان یسعر السعر واما ان یکون	یا تو قیمت میں تغیر کی وجہ سے ہوگا یا سامان مغصوب
فوات جزء من المغصوب ... فان	کے کسی جزء کے فوت ہو جانے کی وجہ سے .....
کان بغیر السعر لم یکن مضمونا[4]	تو اگر قیمت میں تغیر کی وجہ سے ہو تو تاوان عائد نہ ہوگا۔

فقہاء کی ان عبارتوں کو ضروری ہے کہ اس زمانہ کے تناظر میں دیکھا جائے، قرض لی جانے والی اور دی جانے والی اشیاء اگر سامان کی صورت میں ہوں تو ان کی قیمت میں کمی بیشی کے باوجود اس کی افادیت اور مقصدیت میں کوئی کمی نہیں آتی، مثلاً گیہوں کا مقصود کھانا ہے، اگر کسی نے دس سال قبل گیہوں (۱۰ کلو) قرض لیا جبکہ اس کی مجموعی قیمت دس روپے تھی، فرض کیجئے کہ اس گیہوں کی قیمت اب اس سے زیادہ یا کم ہو چکی ہے اور قرض خواہ اب ۱۰ کیلو گیہوں واپس کرتا

---

[1] المغنی مع الشرح الکبیر ۴/۳۶۵ [2] بلغۃ السالک لاقرب المسالک ۲/۲۱۲ [3] فتاویٰ خانیہ ۱۳۶ [4] بدائع الصنائع ۷/۱۵۵

ہے، تو اس کی غذائی افادیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ یہی حال درہم و دینار اور اس کے سونے چاندی کا بھی ہے۔

"فلوس" یعنی سونے چاندی کے علاوہ دوسرے معدنی سکے کی قیمت میں کمی و بیشی کا بھی فقہاء نے اعتبار نہیں کیا ہے، اس سے تامل ہوتا ہے، لیکن کتب فقہ پر وسیع نگاہ ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ایسا اس لئے تھا کہ وہ ان فلوس کو بھی ایک معدنی سامان کی نظر سے دیکھتے تھے اور یہ فلوس اپنے حجم اور قدر کے لحاظ سے بذات خود بھی قابل استفادہ اور لائق خرید و فروخت تھے، نیز جس طرح درہم و دینار اپنی ڈھلی ہوئی حیثیت سے قطع نظر اپنی ذات میں بھی اس سکہ کے مساوی قیمت رکھتے تھے، اسی طرح ان سکوں کی بحیثیت سکہ جو قیمت ہوتی تھی، وہ اس سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہوتی تھی جو معدنی حیثیت میں ان سکوں کی ذاتی قدر و قیمت ہوا کرتی تھی، شاید اسی لئے امام ابوحنیفہ نے "فلوس" کے ذریعہ مقررہ قیمت میں فلوس کا رواج بند ہوجانے کے بعد بھی انہی فلوس کی ادائے گی کو کافی سمجھا، ولو استقرض فلوسا فکسدت فعلیہ مثلہا عند ابی حنیفة[۱]

اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ متقدمین حنفیہ فلوس میں ایک کی دو سے خرید و فروخت کو درست قرار دیتے ہیں، اگر خریدنے اور بیچنے والا اسے بطور سامان خرید و فروخت کرے، حتی لو باع واحدا منہا باثنین یجوز[۲] البتہ بعد کو "فلوس" کے بحیثیت ثمن استعمال اور رواج کے عموم کو دیکھتے ہوئے علماء نے اس سے منع کردیا و مشائخنا یعنی مشائخ ماوراء النہر من بخارا و سمرقند لم یفتوا بجواز ذلک ای بیعہا بجنسہا متفاضلا فی العدالی والغطارفة[۳]

اسی طرح فقہاء شوافع نے بھی "فلوس" کو ثمن و قیمت کی نظر سے نہیں دیکھا ہے اور اس میں "ربا" کو حرام نہیں کہا ہے:

اذا راجت الفلوس رواج النقود لم یحرم الربا فیہا ھذا۔	فلوس گو نقود کی طرح مروج ہوجائیں پھر بھی ان میں سود حرام نہیں ہوگا۔
ہو الصحیح المنصوص وبہ قطع المصنف والجمہور وفیہ وجہ شاذ انہ یحرم، حکاہ الخراسانیون[۴]	یہی صریح و صحیح قول ہے اور مصنف اور جمہور نے یہی بات قطعیت کے ساتھ کہی ہے البتہ ایک قول شاذ حرمت کا بھی ہے جو اہل خراسان نے نقل کیا ہے۔

---

[۱] بدائع الصنائع ۵/۲۹۵ [۲] فتاوی خانیہ ۲/۱۳۱ [۳] البحر الرائق ۶/۱۰۲ ـــــــــ [۴] المجموع شرح المہذب ۹/۲۹۵

اس کے برخلاف موجودہ کاغذی نوٹوں کی بجائے خود کوئی قیمت نہیں ہے، نہ بحیثیت "ثمن" ریزرو بنک کی تصدیق کے بغیر اس سے خرید و فروخت ممکن ہے، دوسری طرف زمانہ کے تغیر کے ساتھ ساتھ اس کی قدر میں اس درجہ تغیر واقع ہوتا جاتا ہے کہ اس کی افادیت کو انتہائی کم کر دیتا ہے، مثلاً آج سے پچیس سال قبل کی خاتون کا مہر پانچ سو روپے مقرر ہوا تو اس کی قدر کسی طور پر اس زمانہ میں ۵ ر تولہ سے کم نہ تھی مگر آج صورت حال یہ ہے کہ اس پانچ سو روپے کی قدر ایک تولہ سونے کے ۱/۲ سے بھی کم ہے، ایسی صورت میں نوٹ کو سامان کی قیمت کے کم و بیش ہونے پر قیاس کرنا کسی طرح قرین انصاف نظر نہیں آتا۔

ربا کا شبہ

دوسرا شبہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ان نوٹوں کی تغیر پذیر قدر کا اعتبار کیا جائے تو اس سے "ربا" پیدا ہو سکتا ہے مثلاً ایک شخص دس سال پہلے ایک ہزار روپے لیتا ہے اور دس سال بعد روپیہ کی قدر میں واقع ہونے والی تبدیلی کے تحت دو ہزار روپے واپس کرتا ہے، تو کیا اس کی وجہ سے سود کا دروازہ نہیں کھلے گا؟

یہ اعتراض بادی النظر میں قوی نظر آتا ہے اور یہی شبہ ہے جس کی وجہ سے سب سے زیادہ تامل ہوتا ہے، مگر سود میں اور روپیہ کی قدر میں کمی زیادتی میں کئی اعتبار سے فرق ہے ــــ اول یہ کہ سود میں نفع مشروط ہوتا ہے اور زیر بحث صورت میں نفع مشروط نہیں ہوتا، اور "نفع" کو جو چیز سود بناتی ہے وہ دراصل یہی نفع کی لازمی شرط ہے، دوسرے سود میں حاصل کیا جانے والا نفع محض "مدت" اور اجل کی قیمت ہوتی ہے جبکہ یہاں روپیہ کی تعداد کا بڑھنا اور گھٹنا روپیہ کی قدر سے متعلق ہے جو علی حالہ برقرار بھی رہ سکتی ہے اور بڑھ بھی سکتی ہے، یہ اجل اور مدت کی قیمت نہیں ہے یہ دو ایسے جوہری فرق ہیں جو روپیوں کی کمی زیادتی اور ربا کے درمیان واضح خط امتیاز کھینچتے ہیں۔

نوٹوں کی قدر کے لئے معیار

رہ گئی یہ بات کہ نوٹ کی قدر میں کمی زیادتی کے اندازہ کے لئے معیار کیا ہوگا؟ زمانہ قدیم میں چاندی بھی "ثمن" ہوا کرتی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ میں سکوں کی قدر چاندی سے

مربوط نہیں رہی، سونے سے اب بھی کہا جاتا ہے کہ سکوں کی قدر متعلق ہے مگر ماہرین کا بیان ہے کہ دنیا کے اکثر ممالک نوٹ چھاپنے میں بین قومی ضابطہ کی پابندی نہیں کرتے ہیں اور سونے سے بھی اس کا رشتہ کمزور رہی ہے اس کے علاوہ فی زمانہ نوٹوں کی قدر پر کسی بھی ملک کی صنعتی قوت اور برآمدی صلاحیت کا بھی خاصا اثر پڑتا ہے اس لئے یہ طے کرنا آسان نہیں کہ روپے کی قدر کی تعیین کے لئے معیار کیا ہوگا؟

غور کیا جائے تو یہ ایں ہمہ سب سے زیادہ "ثمنیت" شریعت کی نظر میں بھی اور قانون معیشت میں "سونے" کے اندر ہے، چاندی کو گو فقہاء نے ثمن مانا ہے مگر کہیں کہیں اس کو بھی سامان کے حکم میں تسلیم کیا ہے، مگر سونے کو بہر حال "زر" تسلیم کیا گیا ہے سیوطی کہتے ہیں۔

الذهب والفضة قيم الاشياء، الا في باب السرقة فان الذهب اصل والفضة عروض بالنسبة اليه نص عليه الشافعي في الام [1]	سونا اور چاندی اشیاء کی قیمتیں ہیں، سوائے چوری کی سزا کے، کہ سونا اصل ہے اور چاندی بمقابلہ اس کے سامان ہے، امام شافعی نے کتاب الام میں اس کی صراحت فرمائی ہے۔

اور بمقابلہ دوسرے اسباب و سامان کے سونے کی قیمت میں زیادہ ٹھہراؤ اور ثبات بھی پایا جاتا ہے اس لئے سونا ہی ایک ایسی شئی ہے جس کو روپے کی قدر کے لئے معیار بنایا جا سکتا ہے، ڈاکٹر علی محی الدین نے لکھا ہے کہ "مجمع البحوث الاسلامیہ" نے بھی اسی کو ترجیح دیا ہے [2] لہٰذا ضروری ہے کہ طویل مدتی قرضہ جات اور دیون کی تعیین میں روپیوں کے ساتھ ساتھ سونے کی وہ تعداد بھی مقرر کر لی جائے جو ان روپیوں کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہو۔

خلقی اور اصطلاحی ثمن کے احکام میں فرق

پھر اصطلاحی ثمن نوٹ وغیرہ کن امور و احکام میں ثمن کی طرح ہوگا اور کن مسائل میں اس کا حکم سونا چاندی یعنی تخلیقی ثمن سے مختلف ہوگا، اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان جزئیات کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو فقہاء نے "فلوس نافقہ" کے سلسلے میں ذکر کی ہیں:۔

(۱) جس طرح سونا اور چاندی متعین کرنے کی وجہ سے متعین نہیں ہوتا، اسی طرح فلوس نافقہ

---

[1] الروضہ ۳/۲۷، بحوالہ: مقالہ تہذیب سارالنقود [2] مقالہ مذکورہ قسط ۵ ص ۳۷۔

کا اگر بطور ثمن معاملہ کیا جائے تو متعین اور مشخص نہیں ہو سکیں گے۔ الفلوس بمنزلۃ الدراہم اذا جعلت ثمنا لا تتعین فی العقد وان عینت[۱]

(۲) جس طرح معاملۂ خرید و فروخت کی اصل بنیاد "مبیع" اور اس کی موجودگی ہے ثمن ہلاک ہو جائے تو بیع ختم نہیں ہوتی، اسی طرح فلوس نافقہ اگر خریدار سے ضائع ہو جائے تو معاملہ باقی رہے گا ختم نہیں ہوگا لا ینفسخ العقد بہلاکہا[۲]

(۳) فلوس نافقہ کی خرید و فروخت خود فلوس نافقہ کے بدلے ہو تو دونوں طرف سے برابری ضروری ہوگی، ایک طرف سے کم اور دوسری طرف سے زیادہ ہو تو سود شمار کیا جائے گا۔ اگر خرید و فروخت کرنے والا تاویل کرے کہ ہم میں سے ایک فریق یہ نوٹ اور سکہ بطور "ثمن" دے رہا ہے اور دوسرا محض سامان کے طور پر، ثمن بنانا مقصود نہیں ہے، اس لئے ہم کمی بیشی کے ساتھ معاملہ کر رہے ہیں تو اس تاویل کا اعتبار نہ ہوگا کہ یہ سود کے لئے چور دروازہ بن سکتا ہے[۳]

(۴) اگر ثمن اصطلاحی کا رواج ختم ہو جائے تو پھر اس کی ثمن ہونے کی حیثیت ختم ہو جائے گی اور اس کی حیثیت محض ایک سامان کی سی قرار پائے گی[۴]

(۵) اگر اسی اصطلاحی ثمن پر معاملہ طے کیا گیا اور ثمن کی ادائے گی سے قبل ہی اس کا چلن بند ہو گیا تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک بیع فاسد ہو جائے گی اور امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک بیع باقی رہے گی[۵]

(۶) جس طرح سونا اور چاندی کی جنس علیحدہ علیحدہ ہے اور ایک دوسرے کے بدلہ کمی بیشی کے ساتھ ان کی خرید و فروخت درست ہے، اسی طرح فلوس نافقہ کی جنس بھی علیحدہ سمجھی جائے گی اس لئے سونے کی ایک خاص مقدار کے مقابلہ اس اصطلاحی ثمن کی جتنی مقدار کا چلن ہو ضروری نہیں کہ اتنے ہی ادا کئے جائیں، کمی بیشی کے ساتھ بھی معاملہ کر لیا جائے تو جائز ہوگا[۶]

(۷) اگر یہ اصطلاحی ثمن بطور قرض لیا جائے اور اس کا چلن ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کی ثمنیت ختم ہو گئی تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک انہیں سکوں کا ادا کرنا واجب ہوگا

---

[۱] عالمگیری ۳ / ۱۰۰ تا ۶ حوالۂ سابق ———————— (۵ بقیہ حواشی بر صفحۂ آئندہ)

امام محمد کے نزدیک اس کی وہ قیمت جو چلن ختم ہونے کے وقت بازار میں قائم تھی، ادا کرنی ہوگی اور اسی رائے پر فتویٰ ہے[ھ]۔

(۸) البتہ فقہاء نے "ثمن خلقی" اور "ثمن اصطلاحی" میں اس مسئلہ میں فرق کیا ہے کہ سونا چاندی ایک دوسرے کے بدلے خرید ا بیچا جائے تو مجلس کے اندر ہی دونوں فریق کا ایک دوسرے کے عوض پر قبضہ کرنا ضروری ہوگا، اس کے برخلاف اگر سونے یا چاندی کی خرید و فروخت "فلوس نافقہ" کے عوض ہو تو مجلس ہی میں قبضہ ضروری نہیں ہوگا۔

یہی فلوس نافقہ کے احکام موجودہ کاغذی نوٹ کے ہونے چاہئیں، ان نوٹوں میں زکوٰۃ واجب ہوگی، شیخ عبدالرحمٰن جزیری نے احناف، مالکیہ اور شوافع کی طرف نوٹ میں زکوٰۃ واجب ہونے کی نسبت کی ہے اور لکھا ہے کہ حنابلہ اس میں زکوٰۃ واجب قرار نہیں دیتے ، "جمہور الفقہاء یرون وجوب الزکاۃ فی الاوراق المالیۃ لانہا حلت محل الذھب والفضۃ فی التعامل وخالف الحنابلۃ فقط"[ع] معلوم نہیں حنابلہ کی طرف مصنف نے یہ نسبت کیوں کر کی ہے، بظاہر یہ نسبت صحیح نظر نہیں آتی ——— اور جب نوٹ کو عرف و تعامل کی وجہ سے "ثمن اصطلاحی" مان لیا گیا ہے تو اس کے ذریعہ زکوٰۃ ادا بھی ہو جائے گی۔

بقیہ صفحہ گذشتہ۔ ؎ ومشائخنا یعنی مشائخ ماوراء النہر من بخارا وسمرقند لم یفتوا بجواز ذلک ای بیعہا بجنسہا متفاضلاً فی العدالی والغطارفۃ مع ان الغش فیہا اکثر من الفضۃ لانہا اعز الاموال فی دیارنا فلو ابیح التفاضل فیہا ینفتح باب الربا الصریح فان الناس حینئذ یتسارعون فی الاموال النفیسۃ فیتدرجون ذلک فی النقود الخالصۃ البحر الرائق ۶/۲۱۹ ؎ تتعین بالتعیین ان کانت لاتروج لزوال المقتضی لثمنیتہ وھو الاصطلاح وھذا لانہا فی الاصل سلعۃ وانما صارت اثمانا بالاصطلاح فاذا ترکوا المعاملۃ بہا رجعت الی اصلہا، حوالہ سابقہ۔

؎ ولو استقرض الفلوس الرائجۃ او العدالی فکسدت قال ابو حنیفۃ یجب علیہا مثلہا، کاسدۃ ولا یغرم قیمتہا وقال ابو یوسف علیہ قیمتہا یوم القبض وقال محمد یغرم قیمتہا فی آخر یوم کانت رائجۃ وعلیہ الفتویٰ قاضی خان ص ۲۳۸ ج ۲ ؎ رجل اشتری بالفلوس الرائجۃ والعدالی فی زماننا شیئاً وکسدت الفلوس قبل القبض وصارت لا تروج رواج الاثمان فی عامۃ البلدان..... وعند الکساد یفسد العقد فی قول ابی حنیفۃ قاضی خان ج ۲/ ۲۰۲

حاشیہ صفحہ ھذا۔ ؎ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱/ ۶۰۵ ؎ قاضی خان ص ۲۳ ج ۲

نیز طویل مدتی قرضہ جات میں ادائے گی کے وقت روپوں کی قدر میں جو کمی واقع ہو جاتی ہے، وہ ایک "عیب" ہے اور اس عیب کی تلافی کے لئے قرض خواہ پر ضروری ہو گا کہ وہ سونے کی قیمت سے موازنہ کرکے اس کمی کی تکمیل کرے۔

خلاصۂ بحث

پس کرنسی نوٹ کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا اس کا حاصل یہ ہے کہ:

(۱) کاغذی نوٹ اور سکوں کی فقہی حیثیت میں ضروری ہے کہ "العرف ریزال" کے فقہی قاعدہ اور عرف و عادت کی اہمیت کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

(۲) نوٹ ثمن اصطلاحی ہیں نہ کہ محض سند اور وثیقہ

(۳) نوٹ مثلی ہیں نہ کہ قیمی

(۴) نوٹ کی قوت خرید میں کمی ایک عیب ہے اور مقروض پر اس نقصان کی تلافی واجب ہے کہ یہی عدل کا تقاضا ہے اور فقہاء تقاضاء عدل کی رعایت کرتے ہوئے مثلی اشیاء میں بھی قیمت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

(۵) اس پر سامان کی قدر میں کمی بیشی سے شبہ درست نہیں اس لئے کہ سامان بذات خود اپنی قیمت رکھتا ہے۔ اس کی قیمت کسی اور شئی سے مربوط نہیں، جب کہ نوٹ کی قیمت سونا اور دیگر مصنوعات سے وابستہ ہے۔

(۶) یہ شبہ بھی صحیح نہیں کہ اس سے سود کا دروازہ کھلے گا کہ سود میں نفع مشروط ہوتا ہے اور نفع محض مدت اور اجل کی قیمت ہوتی ہے جب کہ زیر بحث مسئلہ میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتیں،

(۷) کاغذی نوٹ کی قدر کی تعیین سونے کے ذریعہ کی جائے گی۔

(۸) سونے چاندی کے درہم و دینار اور کاغذی نوٹ کے احکام میں اسی طرح یکسانیت اور فرق ہے، جو فقہاء نے فلوس نافقہ اور خلقی ثمن کے درمیان رکھا ہے

سوالات کے جوابات

لہٰذا اب ان تفصیلات کی روشنی میں سوالنامہ میں مذکور استفسارات کے جوابات اس طرح

ہیں۔

(۱) کرنسی نوٹ اصطلاحی اور عرفی ثمن ہے۔

(۲) بعض احکام میں یکسانیت ہے اور بعض میں فرق "خلقی اور اصطلاحی ثمن میں فرق" عنوان کے تحت اس پر گفتگو ہو چکی ہے۔

(۳) ہمارے عہد میں چونکہ نوٹ "سونے" سے مربوط ہے اس لئے بمقابلہ سونے کے چاندی کی قدر بہت گھٹ گئی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ کرنسی نوٹوں کا نصاب زکوٰۃ سونے سے مقرر ہے۔

(۴) اشیاء صرف کی قیمتوں کے اشاریہ سے نوٹ کو وابستہ کرنے میں ایک تو بڑی دقت ہے، دوسرے یہ اشاریہ محض "تخمین" پر مبنی ہوگا اور مختلف اشیاء کی قیمتوں کے اوسط سے اشاریہ مرتب کرنا پڑے گا حالانکہ مختلف افراد واشخاص کی نسبت سے ان اشیاء صرف کے تناسب اور ان کی ضرورت میں فرق واقع ہوتا رہتا ہے۔

(۵) ہاں یہ مناسب ہے کہ نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لی جائے۔

کچھ اور احکام

نوٹ سے متعلق اس بحث کی روشنی میں ہمارے زمانہ کے بعض اور احکام سے متعلق بھی تنقیح ہوتی ہے:

(۱) نوٹ میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور نوٹوں ہی کے ذریعہ ادا ہو جائے گی چاہے ابھی زکوٰۃ لینے والا اس کو استعمال میں لایا ہو یا نہ لایا ہو۔

(۲) نوٹ میں تفاضل اور ربوا حرام ہوگا۔

(۳) فلوس نافقہ کی طرح نوٹ کے ذریعہ سونے چاندی کی ادھار خرید و فروخت درست ہوگی۔

(۴) مختلف ممالک کے نوٹ اور سکوں کی حیثیت جب مستقل ثمن اور مستقل جنس کی ہوگئی تو اب ان کے باہمی تبادلہ میں کسی خاص قدر کی رعایت ضروری نہ ہوگی اگر حکومت کے مقررہ نرخ سے کم یا زیادہ میں ان کا باہم تبادلہ کیا جائے تو بھی درست ہوگا۔

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت

(از) ——— مولانا عبید اللہ اسعدی جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ

کرنسی نوٹ بحالت موجودہ سکوں کی مانند ہے، جو کہ عہد قدیم سے چلے آرہے ہیں۔ دونوں خلقۃً ثمن نہیں ہیں اور دونوں کی ثمنیت اور نقدیت اصطلاح یعنی اس کے طے کر لینے اور طے پا جانے کی وجہ سے ہے۔ اور اصطلاح کے ختم ہو جانے یعنی کسی سکے یا نوٹ کے متعلق یہ فیصلہ ہو جانے کے بعد کہ اب اس کا استعمال نہیں ہوگا، ثمنیت ختم ہو جاتی ہے۔

ہاں سکہ و نوٹ کے درمیان ایک اہم فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ سکہ بند ہو جانے پر بھی اپنی ذاتی ایک حیثیت و مالیت رکھتے ہیں، اور دوسرے بہت کاموں میں آسکتے ہیں اور نوٹ چلن بند ہو جانے پر ردی کاغذ کی حیثیت رکھتے ہیں جن کو صرف جلایا جا سکتا ہے یا زینت کے طور پر سجایا جا سکتا ہے اور اگر گڈی ہو تو ——— ردی کی حیثیت سے بیچا جا سکتا ہے یا دوبارہ پھر کاغذ بنا سکتے ہیں۔ بہر حال منفعت کا پہلو اگرچہ اس میں بھی رہتا ہے مگر سکوں کی طرح عام و مفید نہیں۔

غالباً ذاتی حیثیت میں اس فرق کی وجہ سے مولانا عبد الحی صاحب وغیرہ کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی ثمنیت سکوں سے مختلف ہے کہ اس میں یہ وصف غالب ہے۔

زر اصطلاحی یعنی نوٹ کے احکام

جب کرنسی نوٹ فلوس و سکوں کی مانند ہے تو ذو جہتین ہے لہٰذا اس کا احکام دونوں قسم کے ہوں گے، زر حقیقی کے جیسے بھی اور کچھ مختلف بھی۔ (الف) ——— کرنسی نوٹوں کا کسی مطالبہ و حق کے طور پر دینا عین حق کا دینا ہے۔ (ب) ——— عین نوٹ کے دینے سے زکاۃ ادا ہو جائے گی زکواۃ کی ادائیگی بصحت

اس پر موقوف نہ ہوگی کہ غریب اس کو خرچ کر ڈالے۔

(ج) ـــــ ۱ کرنسی نوٹ کی بیع سکوں کے ساتھ صحیح ہے خواہ یہ صورت ہو کہ دوسری طرف صرف سکے ہوں یا کہ کچھ کرنسی نوٹ اور سکے ہوں، جیسے کہ دراہم و دینار کی آپس میں یا یہ کہ ان میں سے کسی ایک کی سکوں و پیسوں کے ساتھ بیع صحیح ہے بلکہ جس درہم و دینار میں برائے نام سونا چاندی ہو یا ہیں مقدار میں ان کی باہمی بیع کو جائز لکھا ہے۔ (ہدایہ مع الفتح ج ۶ / ص ۲۰۵)۔ ۲ ایک ملک کے کرنسی نوٹ کی بیع دوسرے ملک کی کرنسی سے صحیح ہے اگر ساتھ میں سکے ملائے جائیں تو کیا ہی بہتر ہو یہ خرید و فروخت اس تقدیر پر بھی صحیح ہو سکتی ہے کہ دونوں کی پس پشت ایک طرف سونا ہے اور ایک طرف چاندی ہے جبکہ دونوں ملکوں کی کرنسی میں اس قسم کا فرق ہو کہ ایسا بھی ہوتا ہے، اور ورنہ اس تقدیر پر صحیح ہوگی کہ نام الگ الگ ہے، تو گویا شے بھی الگ ہے اگرچہ دونوں ہی کاغذ کے ہوتے ہیں کہ کبھی کبھی نام بدل جانے سے بھی جنس مختلف مان لی جاتی ہے جیسا کہ بحر میں تصریح ہے۔

"اختلاف الجنس یعرف باختلاف الاسم الخاص واختلاف المقصود.........

والثوب الهروی والثوب المروی جنسان لاختلاف الصنعة وقیام الثوب بها. (البحر الرائق ج ۶ ص / ۱۳۸) ونحوه فی العنایه علی هامش الفتح ج ۶ ص ۱۶۲ - اور عموماً کرنسی کے ناموں میں اختلاف ہوتا ہے۔

کرنسی کے نام میں اتحاد کی صورت میں پہلی توجیہ چل سکتی ہے ورنہ یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ دونوں کاغذوں میں بہرحال کچھ صفت یہ کچھ حجم کا فرق ہوتا ہے، اس بنیاد پر باہم کوئی معاملہ ہو سکتا ہے کہ اگرچہ دونوں طرف کے مال کی جنس ایک ہے مگر احناف کے نزدیک حرمت ربوا کی دوسری علت "ناپ و تول" موجود نہیں ہے۔

۳۔ مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ اگر ایک ہی ملک کی کرنسی کی آپس میں بیع کا جو کہ کمی و بیشی کے ساتھ ہو اور کسی ایک طرف سے سکے و پیسے کا معاملہ نہ ہو۔

ہمارے یہاں شیخین کا قول فلوس کی باہمی بیع کے جواز کا ہے بلکہ الفقہ علی المذاهب الاربعہ کی تصریح کے مطابق مذاہب اربعہ میں اس کا جواز ہے اس اختلاف کے ساتھ کہ بہت سے حضرات کے نزدیک ادھار بیع صحیح نہیں ہے (شیخین کے نزدیک پیسوں کا متعین ہونا اور نقد ہونا ضروری ہے۔ (هدایه مع الفتح ج ۶ ص ۱۶۲) وعلیہ الامام مالک (الکافی ص ۳۳۳) وبعض الحنابلہ (الفقہ علی المذاهب الاربعہ ج ۲ ص ۲۴۲)

گویا نقد بالاتفاق جائز ہے بشرطیکہ احناف کے نزدیک یہ بیع خرید و فروخت کا معاملہ گن کر کیا جائے سکوں کا وزن کر کے معاملہ نہ ہو تو اس کی بنیاد پر ایک ملک کے کرنسی نوٹ کی باہمی بیع کمی و بیشی کے ساتھ درست ہے

چنانچہ سعودیہ کے مشہور مفتی شیخ ناصر سعدی وغیرہ کا فتویٰ یہی ہے۔ یہ سارے حضرات اس جواز میں اس کا لحاظ کرتے ہیں کہ اگرچہ دونوں طرف کا مال ایک جنس کا ہے مگر معاملہ (کیل وزن) کی بنیاد پر نہیں ہے جو احناف اور بعض کے نزدیک حرمت ربوا کی دوسری علت ہے اور بعض کے نزدیک ایسی چیزوں میں ربوا ہے ہی نہیں۔ بہرحال چونکہ معاملہ وزن سے نہیں بلکہ گن کر ہو رہا ہے اس لئے ممانعت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مگر امام محمدؒ کے نزدیک یہ بھی منع ہے اسی کو ابن تیمیہ وغیرہ نے بھی اختیار کیا ہے اس بنیاد پر کہ یہ اصل میں کیا ہیں اس سے قطع نظر، اپنی مخصوص صورت و بناوٹ کی بنا پر اب یہ ثمن ہیں اور کرنسی اور اس وصف کا اثبات عام انسانوں کے ہاتھوں میں نہیں ہے کہ جو چاہے جب چاہے حسب صواب دید ان کی حیثیت بدلتا رہے، بلکہ اسے حکومتیں ہی طے کیا کرتی ہیں جیسے عوام اپنی طرف سے کسی چیز کو ثمن و کرنسی کی حیثیت نہیں دے سکتے اس کو ختم بھی نہیں کر سکتے۔ ہدایہ اور اس کی شرح میں اسی انداز میں دلائل ہیں اور کچھ اشکالات و جوابات بھی ہیں بالخصوص عنایہ شرح ہدایہ مع الفتح والعنایہ ج/۶/ص/ ۱۶۲، ۱۶۳ میں۔ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی نے اسی ثمنیت کی بنیاد پر نوٹ کی باہمی بیع کو ممنوع قرار دیا ہے اور اس کی ثمنیت کو سکوں سے قوی اور سونے و چاندی کی مانند (معاملہ کے اعتبار سے) قرار دیا ہے۔ (مجموعۃ الفتاویٰ ج/۳/ص/ ۱۳۶)

احقر کے دل کو تو امام محمد کی ہی بات لگتی ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ درہم و دینار سونے و چاندی کے ہوتے ہیں گن کر بھی درہم کی بیع درہم سے اور دینار کی دینار سے صحیح نہیں اس لئے کہ جنس ایک ہے اور تانبے کے سکے آپس میں خرید سے بیچے جائیں تو اگر گن کر معاملہ ہو تو معاملہ درست ہے، جیسے وہاں اصل مادہ کا ہی لحاظ ہے یہاں کیوں نہیں یہ تو تمام دھاتوں اور معدنیات کا معاملہ ہے کہ ان کی خرید اور فروخت وزن کے ساتھ بھی ہوتی ہے اور عدد کی بنا پر بھی اور عدد میں بہرحال وزن ملحوظ ہوتا ہے، الا یہ کہ کہا جائے کہ سونا و چاندی کا تول کر معاملہ کیا جانا ہی نص میں آیا ہے اور باقی معدنیات کا نص میں کوئی ذکر نہیں ہے (حاشیہ چلپی علی الہدایہ ج/۶/ص/ ۱۶۳) مزید یہ کہ اس کے بعد پھر کم از کم نقد و کرنسی کی نسبت سے سود ہونے کے لئے کیا رہ جائے گا۔ بلکہ لوگ بہت آسانی سے آگے کو بڑھ جائیں گے اسی بنا پر صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ اگرچہ معمولی مقدار میں چاندی کے حامل دراہم کی باہمی خرید و فروخت کمی و بیشی کے ساتھ جائز ہے مگر مشائخ نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے سکہ ہونے کی وجہ سے یہ اہم ترین مال ہیں اور پھر لوگ دوسرے اموال میں بھی سودی صورتیں اختیار کرنے لگیں گے[1] مولانا عبدالحی نے فرمایا ہے کہ اگر اس میں حقیقۃ ربوا نہ ہو تو شبہ ربوا سے تو مفر نہیں اور تمام کتب فقہ میں ہے کہ شبہۃ الربوا باعث حرمت ہے (مجموعۃ الفتاویٰ ج/۳/ص/ ۱۳۷)

---

[1] ہدایہ مع الفتح ج/۶/ص/۲۸۵۔

کرنسی نوٹوں میں زکوٰۃ کا معیار

جب کرنسی نوٹ سکوں کی حیثیت رکھتے ہیں تو زکوٰۃ کے سلسلہ میں ان کے پس پشت محفوظ یا موعود[1] سونے و چاندی کا لحاظ نہیں ہوگا، بلکہ خود ان کی جو ذاتی مالیت مانی جاتی ہے اس کا سونے و چاندی میں سے جس کی بنیاد پر نصاب بنے اس سے موازنہ ہوگا کہ فقہاء نے سامان تجارت میں اسی کا اعتبار کیا ہے، سونے و چاندی میں سے جس سے زکوٰۃ کا نصاب بنتا ہو اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔

ادھار معاملات میں کرنسی نوٹوں کی واپسی کا معیار

ادھار کے متعلق یہ ضابطہ معروف ہے الدیون تقضی بامثالہا کہ ادھار و قرض کی ادائیگی مثل سے ہی ہوتی ہے اور اس کی تصریح بھی ہے کہ ایک شخص کے ذمہ اگر کوئی ناپ کر بیچی جانے والی چیز ہے تو [illegible] ادائیگی اصل کے مطابق ناپ کر دے، اور اگر گن کر دی جانے والی چیز ہے تو گن کر دی جائے خواہ ادھار لینے اور ادا کرنے دونوں اوقات میں لئے جانے اور دیے جانے والے مال کی مالیت میں کتنا ہی فرق ہو چکا ہو — اس ضابطہ کی بنا پر فقہ حنفی کی کتابیں اور المغنی کی تصریح کے مطابق حضرات ائمہ اربعہ کے نزدیک پیسوں پر بھی یہی حکم ہے، لہٰذا روپیوں میں ادھار لین دین میں تعامل بھی یہی چلا آرہا ہے، عرف عام معاملہ میں اسی طرح ہوتا رہا ہے، ہاں مذاہب اربعہ کے محققین کی ایک جماعت جن میں محقق ابن ہمام و ابن تیمیہ وغیرہ بھی ہیں بلکہ ان سے پہلے ہمارے ائمہ میں سے حضرات صاحبین کا قول ہے اور یہی احناف کا مفتی بہ مذہب ہے کہ فلوس و سکوں میں مالیت کے فرق کا لحاظ کرتے ہوئے ادھار و قرض کی واپسی و ادائیگی ہوگی اس لئے کہ دوسری اشیاء کی مالیت ذاتی ہوتی ہے اور ان کی ذاتی مالیت سکہ ہونے کی صورت میں محفوظ نہیں ہوتی اور یہ مالیت جیسے کبھی ختم ہو جاتی ہے بدلتی رہتی ہے لہٰذا مالیت کی کمی و بیشی دونوں میں جو ہو اس کا لحاظ ہوگا۔

مگر ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ

(الف) اس کو کتنا ہی ضبط میں لانے اور مقید کرنے کی کوشش کی جائے یہ چیز باہمی تنازعہ کا باعث بنے گی۔
(ب) قرض کے لینے دینے میں طول عمل کا باعث ہوگی کہ قرض دیتے و لیتے وقت جانبین پہلے مالیت کا پتہ

---

[1] یعنی جس کا حکومت وعدہ کرتی ہے اور نوٹ پر بصورت تحریر جو دی ہے۔

لگائیں اور واپسی میں بھی یہی کرنا ہوگا۔ اس کی وجہ سے بہت سے لوگ قرض دینے سے گریز کریں گے کون جھنجٹ میں پڑے۔

(ج) اور بہت سے لوگ محض اس لئے توسع کریں گے کہ جس رقم کو ضرورت [illegible] ائد ہونے کی وجہ سے چند سال محفوظ رکھتے، قرض دے دینے پر وہ چند سال بعد سوا گنا ہو کر واپس ہوگی۔

(د) ـــ کثرت ادھار قرض کی ادائیگی بتدریج [illegible] ہوتی ہے تو [illegible] واپسی [illegible] لمبا ہوتی مالیت پر مدار ہو تو یک مشت ادائیگی کا مسئلہ تو آسان ہے مگر بار بار سو سو دو دو سو روپئے ادا کرنے میں کہاں تک اور کیسے حساب ہوگا۔

(ہ) ـــ پھر اس انداز کی توسیع [illegible] سود میں چل سکے گی یا لوگ، چلائیں گے اگرچہ اصل کے اعتبار سے دونوں میں یہ فرق کیا جا سکتا ہے کہ سود میں زیادتی کا معاملہ شروع سے طے شدہ لازم ہوتا ہے، اور قرض کی اس طرح واپسی میں زیادتی لازم نہیں کمی بھی ہو سکتی ہے، اور زیادتی ہو تو معاملہ میں طے شدہ نہیں۔

مگر عام لوگ اس دقیق فقہی و شرعی فرق کو سمجھیں گے اور ملحوظ رکھ سکیں گے۔ کم از کم صاحب ہدایہ وغیرہ نے بعض مخصوص دراہم کی بابت جو بات کہی ہے یا مولانا عبدالحی صاحب نے شبہ ربوا کا جو ذکر کیا ہے اس کا تو یہاں لحاظ ہو ہی سکتا ہے۔ ورنہ عوام کے لئے روک نہ رہ جائے گی۔

ادھار معاملہ میں سونے یا چاندی کی قیمت و مالیت کا تعین

یہ تو اچھی صورت ہے کہ بجائے اس کے کہ جو روپیہ کا معاملہ کر کے بوقت واپسی کمی و بیشی کریں، اصلاً سونا چاندی یا سامان طے کریں پھر اس کی قیمت کا لین دین ہو جائے، قرض لیتے وقت بھی اور قرض کو واپس کرتے وقت بھی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مقصود اور واقعی لین دین کے اعتبار سے یہ کیا صورت ہوگی۔

اگر اصل معاملہ سونے یا غلہ وغیرہ کا طے ہوا اور مقصود قرض مانگنے والے کا روپیہ و نقد ہے تو اس کو حاصل کرنے کی کیا صورت ہوگی۔

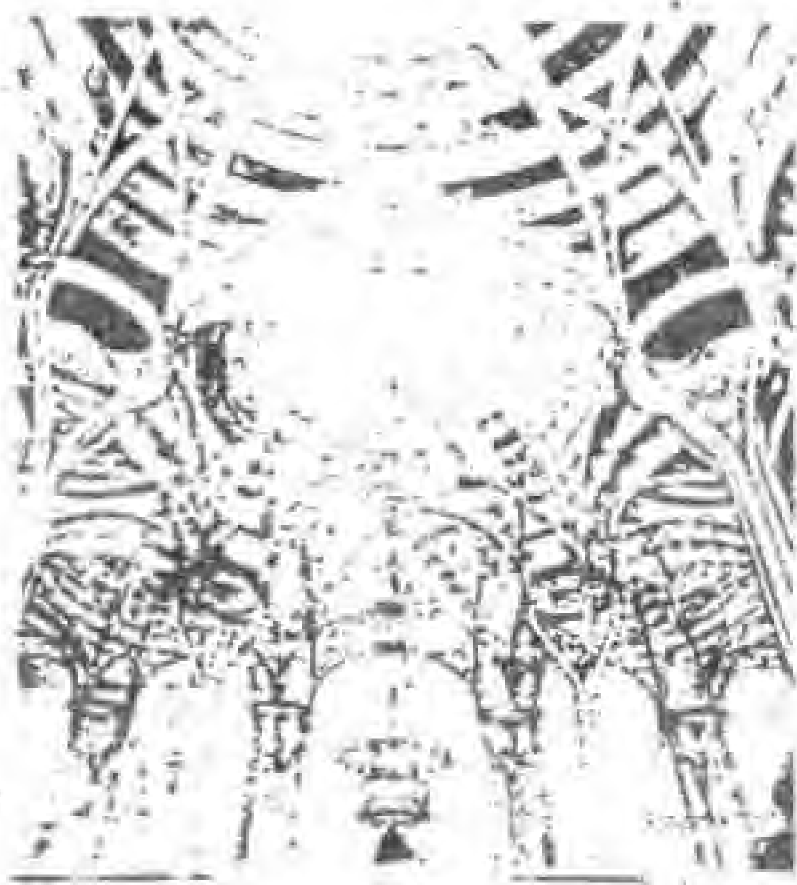
اگر قرض دینے والا ایسا سامان فراہم کرے جسے قرض لینے والا قبضہ کر کے بیچے، تو اولاً ہر آدمی ضرورت سے زاید ایسا سامان کہاں رکھتا ہے اور کون اس کا جھنجھٹ پائے گا پھر قرض دینے والے کا دے کر خریدنا اور واپسی میں پھر اسی مقدار میں اس چیز کی خرید و فروخت کا معاملہ طول عمل ہے ـــ جو کہ قرض جیسے کارخیر

کے بند ہونے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

اور اگر معاملہ تو کرے سونے و چاندی یا غلہ اور دینا لینا نقد کا ہو تو یہ قرض لئے ہوئے مال پر قبضہ کرنے سے پہلے تصرف ہوگا، جو کہ ایسے معاملات میں روا نہیں ہے۔

ایک جائز و آسان صورت یہ ہے کہ قرض دینے والا کسی غلہ کی قیمت طے کرکے اس کے حق میں بیع سلم یعنی ادھار خرید کا معاملہ کرکے طے شدہ مقدار کی قیمت دے دے اور ادائیگی کے موقع پر خواہ اصل سامان لے لے، یا اسے قبضہ میں لے کر قرض لینے والے کے ہاتھ ہی بیچ دے یا اصل کی جگہ نقد یا جو چاہے بقدر مالیت لے لے، مالکیہ کے نزدیک سلم میں قبضہ سے پہلے خریدے ہوئے سامان کے اندر تصرف درست ہے جیسا کہ المغنی میں آیا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم



نوٹ کی شرعی حیثیت

از ـــــــــــــــ مولانا مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

دنیا کے ابتدائی دور میں چیزوں کا لین دین عام طور پر چیزوں ہی کے ذریعے ہوا کرتا تھا کسی ایک کے پاس غلہ ہے اور دوسرے کے پاس کپڑا تو غلہ اور کپڑے کا تبادلہ آپس میں کرلیا جاتا تھا اسی طرح اور اشیاء کا تبادلہ اشیاء سے ہوتا تھا دنیا کی تجارت نے جب ترقی کرنا شروع کی تو چاندی سونے کی ڈلی کو خرید و فروخت اور لین دین کا ذریعہ بنایا گیا لیکن جب اس میں تول اور کھرا کھوٹا پرکھنے کی مشکلات سامنے آئیں تو حکومتوں نے عوام کی سہولت کے لئے سکے جاری کئے۔

سکہ اصل میں وہ لوہے کا آلہ کہلاتا ہے جس سے روپے وغیرہ ڈھالے جاتے ہیں لیکن مجازاً ڈھالی ہوئی چیز کو بھی سکہ کہا جاتا ہے کیونکہ سکے کے نقوش اس پر آجاتے ہیں بعض علماء نے سکے کی اصطلاحی تعریف یوں ذکر کی ہے سکہ اس "حکم نافذ" یا "عرف جاری" کو کہتے ہیں جس سے مسکوک یعنی قیمت پر کسی رد و انکار کے بغیر رائج ہوتا ہے اگر یہ سونے چاندی کا ہے تو اسے سکہ خلقی کہتے ہیں اور اگر سونے چاندی کا نہ ہو تو اسے سکہ عرفی کہتے ہیں۔

پھر عرفی سکے دو قسم کے ہوتے ہیں متقوم اور متبذل متقوم وہ سکہ ہوتا ہے جو سکہ بننے سے پہلے اپنی ایک قیمت رکھتا ہے جیسے تانبے گلٹ اور المونیم کے سکے کہ ان سکوں کی اصل تانبا گلٹ اور المونیم ہے۔ اور متبذل وہ سکہ کہلاتا ہے جو سکہ بننے سے پہلے یا سکہ نہ رہنے کی صورت میں اتنی کم قیمت والا ہو جائے کہ موجودہ قیمت کے حساب سے لاشئی سمجھا جائے جیسے کاغذ کے نوٹ ڈھر بھونڈ وغیرہ۔

سکۂ خلقی ہمیشہ غیر متعین ہوتا ہے۔ عقود میں ثمن کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی قیمت نہ تو سکۂ بلنے سے گھٹتی بڑھتی ہے اور نہ اس میں تفاوت جائز ہے۔ بیع صرف کے تمام احکام اس میں معتبر ہوتے ہیں۔ مستحق اس کے لینے پر مجبور کیا جاتا ہے اگر کبھی اس کا رواج ختم ہو جائے تو سکۂ متعلق واجب الادا ہونے کی صورت میں بعینہٖ وہی واجب ہوگا۔ زکوٰۃ بھی اس میں فرض ہوگی۔

نوٹ کی حقیقت اور اس کی شرعی حیثیت

سکۂ متبذل یعنی نوٹ حکومت کا ایک عہد نامہ ہے جو بہ تحکم سکے کی طرح واجب القبول بنایا گیا ہے چونکہ سکوں کی طرح اس کو قبول کرنے پر ہم مجبور ہیں اس لئے ضرورتاً اسے سکہ کا حکم دیا گیا۔

چونکہ نوٹ ایک نئی چیز وجود میں آئی پہلے اس طرح کے نوٹوں کا وجود نہ تھا اس لئے فقہائے کرام کی کتب متداولہ فقہیہ میں اس کا جزئیہ صراحت کے ساتھ نہیں ملتا لیکن اسلام چونکہ عالمگیر اور کامل ومکمل مذہب ہے اس کے احکام انسانی زندگی کے ہر گوشہ میں ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔ ائمہ مجتہدین نے قرآن وحدیث کو سامنے رکھ کر ایسے اصول وضوابط ہمارے لئے مدون فرما دیئے ہیں جو پیش آنے والے جدید مسائل میں اہل علم کے لئے رہنمائی کرتے ہیں ان اصول وضوابط میں غور وفکر کیا جائے اور ان پر گہری نگاہ ڈالی جائے تو نئے مسائل کا حل تلاش کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ چونکہ ہر شخص کا طریقۂ تخریج واستنباط جدا ہوتا ہے اس لئے اس طرح کے جدید مسائل میں اختلاف رائے ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ نوٹ کی شرعی حیثیت متعین کرنے میں بھی علمائے کرام کا اختلاف ہو گیا ہے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوریؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، استاذ محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب سابق مفتی اعظم مظاہر علوم سہارنپور وغیرہم نے نوٹ کو حوالہ، وثیقہ اور سرکاری سند قرار دیا ہے ان حضرات اکابر کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے۔

۱ـــــ اگر نوٹ کے سرکاری سند اور وثیقہ ہونے سے قطع نظر کر لیا جائے تو اسے کوئی ایک روپیہ میں بھی نہ خریدے گا۔

۲ ـــــ حکومت نے نوٹ کو اپنی طرف سے جاری کیا ہے اور اس کے حامل سے حکومت نے جو معاہدہ کیا ہے اس کی ادائیگی کا ہر وقت ذمہ لیا ہے حکومت نے اس کو سکہ قرار نہیں دیا جیسا کہ نوٹ پر لکھی ہوئی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

۳ ـــــ اگر یہ مال ہوتا تو اسے چاک کر دینے یا دریا میں پھینک دینے یا جل جانے یا اور کسی طرح نقصان یا ہلاک ہو جانے سے وہ بالکلیہ ہلاک نہ جانا چاہئے لیکن نوٹ کے نمبرات محفوظ کر کے چاک کر دیا جائے تو بعد طلب سرکار سے اتنے نوٹ مل جاتے ہیں۔

۴ ـــــ دنیا میں کوئی ایسی جنس نہیں ہے کہ مشتری کے قبضہ کر لینے کے بعد اسے ... نقصان ہو یا وہ فنا ہو جائے تو بدل ہیں۔ حالانکہ نوٹ کی تبدیلی بینک سے ... باقی ہے۔

۵ ـــــ یہ ایک رقعہ ہے جو غیر نامی ہے اس پر لکھی ہوئی رقم کو ہر وقت سرکار سے وصول کیا جا سکتا ہے۔ نیز یہ حضرات درمختار و شامی کی حسب ذیل عبارت بھی اپنے استدلال میں پیش کرتے ہیں۔

ففی الدر المختار بیع البراءت أی یکتبها المدیون علی العمال لا یصح .... قلت و عبارة الصیرفیة هکذا اسئل عن بیع الخط قال لا یجوز فانه لا یخلو اما ان یباع ما فیه او عین الخط لا وجه للاول لانه بیع مالیس عنده والا وجه الثانی لان هذا القدر من الکاغذ لیس متقوما (شامی ص ـــ)

نوٹ کو سند ز راور حوالہ و وثیقہ ماننے کی صورت میں زکوٰۃ تو واجب ہے بشرطیکہ صاحب نصاب ہو اور حولان حول بھی ہو چکا ہو لیکن ان حضرات کے نزدیک۔

۱ ـــــ زکوٰۃ صدقہ فطر اور کفارات وغیرہ کی ادائیگی نوٹ سے درست نہ ہوگی تاوقتیکہ فقیر کو نوٹ بھنا کر نقد نہ دیا جائے یا خود فقیر اس کا روپیہ نقد نہ بنالے یا غلہ کپڑا وغیرہ نہ خرید لے۔ کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے تملیک مال شرط ہے اور نوٹ دینے سے اصل مال پر قبضہ نہیں ہوتا بلکہ سند مال پر قبضہ ہوتا ہے جس طرح کسی فقیر کو پرچہ لکھ کر دے دیا جائے کہ فلاں شخص سے ہماری زکوٰۃ کے حساب میں اتنا روپیہ وصول کر لو۔ تو محض پرچہ پر قبضہ کرنے سے مال اور روپیہ پر قبضہ نہیں سمجھا جائے گا تاوقتیکہ اس شخص سے نقد روپیہ وصول نہ کر لے۔

۲ ـــــ زکوٰۃ میں دیا ہوا نوٹ اگر فقیر سے گم ہو گیا یا جل گیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

۳ ـــــ زکوٰۃ میں ملا ہوا نوٹ اگر فقیر نے ریل، بس یا مکان کے کرایہ میں دے دیا تو

زکوٰۃ دینے والے کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

۴ ـــــــ زکوٰۃ کا نوٹ اگر فقیر نے اپنے قرضہ میں دے دیا جب بھی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی نوٹ کا روپیہ بھنا کر قرضہ ادا کرنا ہوگا۔

۵ ـــــــ اگر کسی نے کسی کو ہبہ کے طور پر نوٹ دیا تو ہبہ جب تام ہوگا جب کہ اس نوٹ کا نقد روپیہ موہوب لہ بھنا لے یا کچھ مال خرید کر اس پر قبضہ کرے۔ محض نوٹ پر قبضہ کرنے سے شرعاً ہبہ صحیح وتام نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر موہوب لہ نے نوٹ کا روپیہ نہیں لیا یا کوئی چیز اس سے نہیں خریدی تو ہبہ کرنے والا اس ہبہ کئے ہوئے نوٹ کو واپس لے سکتا ہے۔

۶ ـــــــ ان حضرات کے نزدیک نوٹ سے سونا یا چاندی یا اس کے زیورات، سچا گوٹہ بلکہ حتیٰ کہ اشرفی خریدنا بھی جائز نہیں۔ پہلے اس نوٹ سے نقد روپیہ یا سامان ضرور خریدا جائے ورنہ بائع ومشتری دونوں سود کے لین دین میں ملوث ہوں گے۔

۷ ـــــــ نوٹ کو بٹہ پر چلانا بھی جائز نہیں جتنے کا نوٹ ہے اتنے ہی روپے دینے واجب ہیں کمی بیشی سود اور حرام ہے کسی فقیر کو اگر زکوٰۃ میں نوٹ ملا اور اس نے بٹہ دے کر اس کا روپیہ لیا تو جس قدر پیسے بٹہ میں کٹے ہیں اتنی زکوٰۃ دہندہ کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال ان حضرات اکابر کے سامنے مارکیٹ میں نوٹ کی ابتدا ہوئی تھی آج کی طرح اس کا رواج عام نہیں ہوا تھا بلکہ اس زمانے میں چاندی کا روپیہ بھی چلتا تھا اور نوٹ اپنے ابتدائی دور میں حوالہ کی حیثیت رکھتا تھا اور عند الطلب سرکار کے خزانہ سے اس کا عوض یعنی سونا اور چاندی کی شکل میں مل جاتا تھا لہٰذا اس دور میں بر بنائے احتیاط اکابر نے اس کو حوالہ اور سند زر قرار دیا اور اسی کے احکام متفرع کئے۔

لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ سونے اور چاندی کی کرنسی بازار سے بالکل ناپید ہوچکی ہے اور قانونی وعرفی طور پر نوٹ اس کثرت سے رائج ہوگیا ہے کہ سارا لین دین اسی سے ہو رہا ہے۔ حوالہ اور لین دین کی حیثیت گویا ختم ہوگئی آج نوٹ پر لکھے ہوئے وعدہ کے مطابق اگر ہم سرکار کے بینک سے چاندی سونا یا نقد روپیہ لینا چاہیں تو سرکار نہیں دیتی ہے وہ لکھا ہوا وعدہ بے کار اور بے سود ہوگیا ہے۔ دوسری دھاتوں کے روپئے یا ریزگاری اتنی عام نہیں کہ جب اور جہاں چاہیں نوٹ دے کر بھنا لیں حتیٰ کہ حکومت کے یہاں بھی ہم ہزار دو ہزار یا لاکھ دو لاکھ کی نقد یا ریزگاری یا نقد روپے طلب کریں تو ہمیں دستیاب نہیں ہوتے ہیں۔

سونے چاندی اور دیگر دھاتوں کے سکوں کے ناپید ہونے کی وجہ سے نوٹ کو حوالہ ماننے کی صورت میں بے حد دشواریاں پیش آگئی ہیں۔ حوالہ مان کر چلنے میں زکوٰۃ کی ادائیگی، صدقۂ فطر اور دیگر کفارات کی ادائیگی مشکل ہے بیرونی فقراء اور مقامی فقراء ہر دو کے لئے مشکلات ہوں گی نیز فقیر کی ہر قسم کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتی ہیں سونے چاندی کے زیورات کی خریداری سب سے زیادہ مشکل ہوگی۔ غریب آدمی زکوٰۃ کے نوٹ لے کر ریل بس کا سفر نہیں کر سکتا نہ اپنا قرضہ ادا کر سکتا ہے نہ مکان کا کرایہ یا بجلی پانی کا کرایہ دے سکتا ہے۔

غرض یہ دقتیں ایسی ہیں جس سے زندگی کا نظام معطل ہو کر رہ جائے گا اور نوٹ کو حوالہ ماننے کی صورت میں دنیاوی اور دینی سارے کاروبار درہم برہم ہو جائیں گے۔ اور غیر معمولی حرج واقع ہوگا معیشت میں ناقابلِ برداشت تنگی پیدا ہو جائے گی اس لئے الحرج مدفوع اور الامر اذا ضاق اتسع نیز المشقۃ تجلب التیسیر کے پیش نظر ایسی صورت اختیار کرنی لازمی اور ضروری ہوگی جس میں جب اور جہاں چاہیں اپنی تمام ضرورتیں آسانی کے ساتھ پوری کی جاسکتی ہوں۔

ان دشواریوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کچھ علماء کرام نے فقہاء کرام کے ذکر کردہ قواعد و اصول کے تحت نوٹ کو سکۂ متبذل مانا ہے یعنی عرفاً مثل ثمن خلقی قرار دیا ہے حقیقۃً اس میں ثمنیت نہیں ہے مگر عرفی ثمنیت ہے۔ یعنی نوٹ کو قانوناً روپے کے جمیع احکام، مقاصد، منافع اور آثار و نتائج میں مثل روپیہ سمجھا اور مانا ہے اس پر ملکیت اور قبضہ مثل روپیہ کے ملک و قبضہ کے ہے گویا صورتاً کاغذ کے ایک ٹکڑے پر قبضہ و ملک ہے لیکن معناً روپیہ پر قبضہ و ملکیت قانوناً و عرفاً ہے غرض صورۃً ثمن عرفی اور قانوناً و عرفاً و معنیً مثل ثمن خلقی ہے اور ذاتاً متبذل اور وصفاً متقوم ہے۔

اس کے قائل ہیں حضرت مولانا ابو الحسنات محمد عبد الحی فرنگی محلی لکھنوی ان کے شاگرد حضرت مولانا فتح محمد صاحب تائب، مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی اور علمائے رامپور بھی اس کے قائل ہیں۔ ان حضرات نے ضرورتِ شدیدہ کی بنا پر موجودہ رواج کو دیکھتے ہوئے نوٹ کو سکۂ عرفی مانا ہے اور اسے عرفاً ثمن کا حکم دیا ہے کیونکہ اب تمامتر چھوٹے بڑے کاروبار کا مدار نوٹوں پر ہو گیا ہے۔ سونے چاندی کے سکے بالکل ناپید ہو چکے ہیں۔

ان حضرات کے نزدیک بعینہٖ نوٹ سے زکوٰۃ، صدقۂ فطر، نذر و کفارات اور دیگر واجبات ادا ہو جاتے ہیں۔ زکوٰۃ کے نوٹ سے فقیر ریل، بس اور مکان وغیرہ کا کرایہ بھی ادا کر سکتا ہے

اور اس سے اپنا قرض بھی ادا کر سکتا ہے اور نوٹ ہبہ بھی کر سکتا ہے اور ہبہ تام بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعینہ نوٹ سے چاندی سونا اور اس کے ظروف، زیورات اور لچکہ سچا گوٹہ وغیرہ بھی خریدنا جائز ہے۔ نوٹ کو روپے میں بدلنا ضروری نہیں اسی طرح خرید و فروخت میں یہ حضرات ربوا کے قائل نہیں کیونکہ ربوا کی تحریم کی علت اتحاد قدر مع اتحاد جنس ہے۔ اگر دونوں متحقق ہوں تو کمی زیادتی دونوں صورتیں ناجائز ہوں گی اور اگر ایک متحقق ہو تو نقد میں زیادتی جائز اور ادھار ناجائز ہوگا اور اگر دونوں متحقق نہ ہوں تو کمی زیادتی اور ادھار دونوں صورتیں جائز ہوں گی۔

کما فی تنویر الابصار علة القدر مع الجنس فان وجدا حرم الفضل والنساء وان عدما حلا وان وجد احدهما حل الفضل وحرم النساء (درمختار ...)

نوٹ کو کمی زیادتی کے ساتھ لینے دینے کی صورت میں اتحاد قدر مع الجنس کی علت نہیں پائی گئی۔ کیونکہ ایک طرف کاغذ ہے دوسری طرف چاندی یا دوسری دھات کے سکے۔ قدر بھی ایک نہیں ہے کیونکہ ایک معدود ہے دوسرا موزون۔

فی الدر المختار اما الفلوس فان رائجة فثمن والا فسلع ...... ویفهم منه ان الکاغذ المذکور لیس کالصك بل هو مال بدلیل رواجه بین الناس وان کان صکا لا یروج ثم لا یخفی ان ثمنیته اصطلاحیة کالفلوس لا خلقیة کالنقدین فان عوض ذلك الکاغذ بالنقدین لا یجب التساوی والتقابض لان علة الربوا القدر مع الجنس فعدم القدر والجنس بینهما فحل التفاضل والاجل وقال محمد لا یجوز لان الثمنیة تثبت باصطلاح الکل فلا تبطل باصطلاحهما واذا بقیت اثمانا لا تتعین فصار کما اذا کانا بغیر اعیانهما وکبیع الدرهم بالدرهمین ولهما ان الثمنیة فی حقهما ثبت باصطلاحهما واذا بطلت الثمنیة تتعین بالتعیین (ہدایہ ص...)

درمختار میں ہے کہ فلوس اگر رائج ہوں تو ثمن ہیں ورنہ سامان تجارت کی طرح ہیں اور اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ کاغذ مذکور (یعنی کاغذی نوٹ) چیک کی طرح نہیں ہے بلکہ لوگوں کے درمیان رائج ہونے کی بنا پر مال ہے۔ اگر وہ چیک ہوتا تو اس کا رواج نہ ہوتا۔ پھر یہ بات بھی مخفی نہیں ہے کہ کاغذی نوٹ ثمنیت کی وجہ سے فلوس کے مثل اصطلاحی ہے نقدین کی طرح خلقی ثمن نہیں ہے۔ پس اگر اس کاغذ کا تبادلہ نقدین کے ذریعہ ہو تو برابری اور قبضہ کرنا ضروری نہ ہوگا کیونکہ علت ربوا قدر مع الجنس ہے پس قدر و جنس کا ان دونوں کے درمیان معدوم ہونا تفاضل نقد و ادھار کو جائز قرار دے گا۔ اور امام محمد کہتے ہیں کہ اس طرح تبادلہ جائز نہیں ہے اسی لئے کہ (کاغذی نوٹ) یا فلوس میں ثمنیت سب لوگوں کی اصطلاح سے ثابت ہوتی ہے اس لئے متعاقدین (بائع و مشتری) کی اصطلاح سے باطل نہیں ہوگی اور جب وہ اثمان باقی رہیں گے تو متعین نہیں ہوں گے اور یا ایسے ہو جائے گا گویا ان کو تعیین کے بغیر تبادلہ ہوا اور ایک درہم کی دو درہم کے بدلے بیع کے مثل قرار پائے گا۔ شیخین کی دلیل یہ ہے کہ ثمنیت ان دونوں (بائع و مشتری) کے حق میں ان کی اصطلاح سے ثابت ہوئی تھی اور جب ثمنیت باطل ہو گئی تو تعیین کے ذریعہ اس کی تعیین ہو جائے گی

احقر کے ناقص خیال میں شیخین اور امام محمدؒ کا اختلاف محض لفظی معلوم ہوتا ہے حضرات شیخین کے یہاں جواز کی وجہ یہ ہے کہ جب ان سکوں کو گلانے اور پگھل کر شیئ آخر بنانے کی غرض سے تبادلہ کیا جائے جیسا کہ پہلے دور میں تانبے کے سکوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ ہوتا تھا تو اس وقت عاقدین سے ثمنیت باطل ہو جائے گی اور کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ درست ہوگا۔ لیکن اس دور میں عموماً سکوں کا آپس میں تبادلہ کرنے والوں کی غرض محض اثمان کا حصول ہوتا ہے لہٰذا اثمان کا تبادلہ اثمان کے ساتھ ہونے کی صورت میں عاقدین کے ابطال سے سکوں کی ثمنیت باطل نہ ہوگی۔

کرنسی نوٹوں کا نصاب زکوٰۃ

کرنسی نوٹ جب ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کے برابر پہنچ جائیں ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی چونکہ نوٹ کی حیثیت قرض کی دستاویز کی حیثیت نہیں رہی اس لئے ان نوٹوں پر قرض کی زکوٰۃ کے احکام بھی جاری نہ ہوں گے ان پر مروجہ سکوں کے احکام جاری ہوں گے۔ زکوٰۃ کے واجب ہونے میں مروجہ سکوں کا حکم سامان تجارت کی طرح ہے جس طرح سامان تجارت کی مالیت اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت تک پہونچ جائے [illegible] پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے بعینہ یہی حکم مروجہ اور موجودہ کرنسی نوٹوں کا ہے۔ خواہ وہ کرنسی نوٹ سونے کا بدل ہو یا چاندی کا بدل ہو ہر دو صورت میں نصاب زکوٰۃ مقرر کرتے وقت چاندی کا اعتبار کیا جائے گا کیونکہ سامان تجارت کے نصاب کا مدار شریعت نے چاندی کے نصاب پر رکھا ہے۔ لقولہ علیہ السلام یقومها فیودی من کل مائتی درهم خمسة دراهم کما فی الهدایة

وعن سمرة بن جندب ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يأمرنا ان نخرج الصدقة من الذي يعد للبيع ابو داود (بحوالہ فتح القدیر ص۱۴۲ ج۱) یعنی جب سامان تجارت دو سو درہم (۵۲½ تولہ چاندی کی مالیت کو پہونچ جائیں تو ان پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ کا نکالنا واجب ہوگا۔

نوٹ کا تبادلہ نوٹ سے برابری کے ساتھ

کرنسی نوٹوں کا حکم مروجہ سکوں کی طرح ہے لہٰذا جس طرح سکوں کا تبادلہ برابری کے ساتھ جائز ہے اسی طرح ایک ہی ملک کے کرنسی نوٹوں کا تبادلہ برابری کے ساتھ بالاتفاق جائز ہے اور درست ہے یعنی دس کے نوٹ کا تبادلہ دس کے نوٹ کے ساتھ یا دو پانچ کے نوٹ کے

ساتھ یا دو دو روپے والے پانچ نوٹ کے ساتھ یا ایک ایک کے دس نوٹوں کے ساتھ درست ہے بشرطیکہ مجلس عقد میں فریقین میں سے کوئی ایک فریق بدلین میں سے ایک پر قبضہ کرے لہذا اگر تبادلہ کرنے والے دو شخصوں میں سے کسی ایک نے بھی مجلس عقد میں نوٹوں پر قبضہ نہیں کیا حتیٰ کہ وہ دونوں جدا ہو گئے تو یہ ادھار ہوا تو اس صورت میں حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ عقد فاسد ہو جائے گا ان کے نزدیک فلوس متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے ان کے یہاں فلوس کی تعیین صرف قبضہ سے ہوتی ہے لہٰذا جن فلوس پر عقد ہوا مگران پر قبضہ نہیں ہوا تو وہ فلوس متعین نہ ہوئے بلکہ ہر فریق کے ذمہ دین ہو گئے اور دین کی بیع دین سے ہو گئی جو بیع الکالی بالکالی ہونے کی وجہ سے ناجائز و حرام ہو گئی۔

نوٹ کا تبادلہ نوٹ سے کمی زیادتی کے ساتھ

جب کرنسی نوٹ کا حکم بعینہٖ فلوس کے سکوں کے مانند ہے اور فلوس کا حکم سامان تجارت کی طرح ہے تو اس صورت میں کرنسی نوٹوں کو اگر کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ کیا جائے مثلاً پانچ کا نوٹ لیا جائے یا دس کا نوٹ بیس کے نوٹ کے عوض میں لیا جائے تو یہ بھی ہینڈ ٹو ہینڈ (نقد) جائز ہوگا اور ادھار ناجائز ہوگا۔

نوٹ کا تبادلہ غیر ملکی نوٹ سے

جب یہ بات معلوم ہو چکی کہ موجودہ دور میں مروجہ سکوں اور کرنسی نوٹوں سے ان کی ذات اور ان کا مادہ مقصود نہیں بلکہ کرنسی قوت خرید کے ایک مخصوص معیار کا نام ہے اور چونکہ ہر ملک نے اپنا معیار الگ مقرر کر لیا ہے جیسے ہندوستان میں روپیہ ہے، سعودیہ میں ریال، امریکہ میں ڈالر برطانیہ میں پونڈ۔ یہ معیار ملکوں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے کیونکہ ہر ملک کے کرنسی کی حیثیت کا تعین اس ملک کی قیمتوں کے اشاریہ اور اس کے ایکسپورٹ وامپورٹ وغیرہ کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اور یہاں کوئی ایسی مادی چیز نہیں جس کے ذریعہ ان مختلف معیاروں کے درمیان کوئی ٹھوس اور صحیح تناسب قائم ہو سکے بلکہ ہر ملک کے اقتصادی حالات کے تغیر اور اختلاف کی وجہ سے اس تناسب میں ہر روز بلکہ ہر گھنٹے تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔

ان حالات میں تمام ملکوں کی کرنسیاں آپس میں ایک دوسرے کے لئے مختلف الاجناس

ہوگئیں کیونکہ ان کے نام ان کے پیمانے اور ان سے بھنائے جانے والی اکائیاں یعنی ریزگاری وغیرہ سب مختلف ہوتی ہیں اس طرح مختلف ممالک کی کرنسیاں جب اپنی اجناس کے لحاظ سے مختلف ہوگئیں تو ان کے درمیان آپس میں کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ کرنا بالاتفاق جائز ہوگا۔ لہٰذا ایک ریال ۴ روپے ہندوستانی کے عوض میں لینا اور پانچ یا چھ روپیہ کے عوض میں لینا بھی شرعًا درست رہے گا اسی طرح ایک ڈالر کو ہندوستانی ۲۲ روپے میں بیچنا اور ۲۶ روپے میں بیچنا بھی درست ہوگا کیونکہ دونوں کی کرنسیاں مختلف ہیں۔ اختلاف جنس کی وجہ سے سود لازم نہیں آئے گا۔ البتہ حکومت کی مقرر کردہ قیمتوں کی خلاف ورزی چونکہ سرکاری قانون کے لحاظ سے جرم ہے اور ایسا کرنے میں بے عزتی اور ضیاع مال کا خطرہ ہے اس لئے اس طرح بلیک کرکے حکومت کے قانون کی مخالفت نہ کرنی چاہئے۔

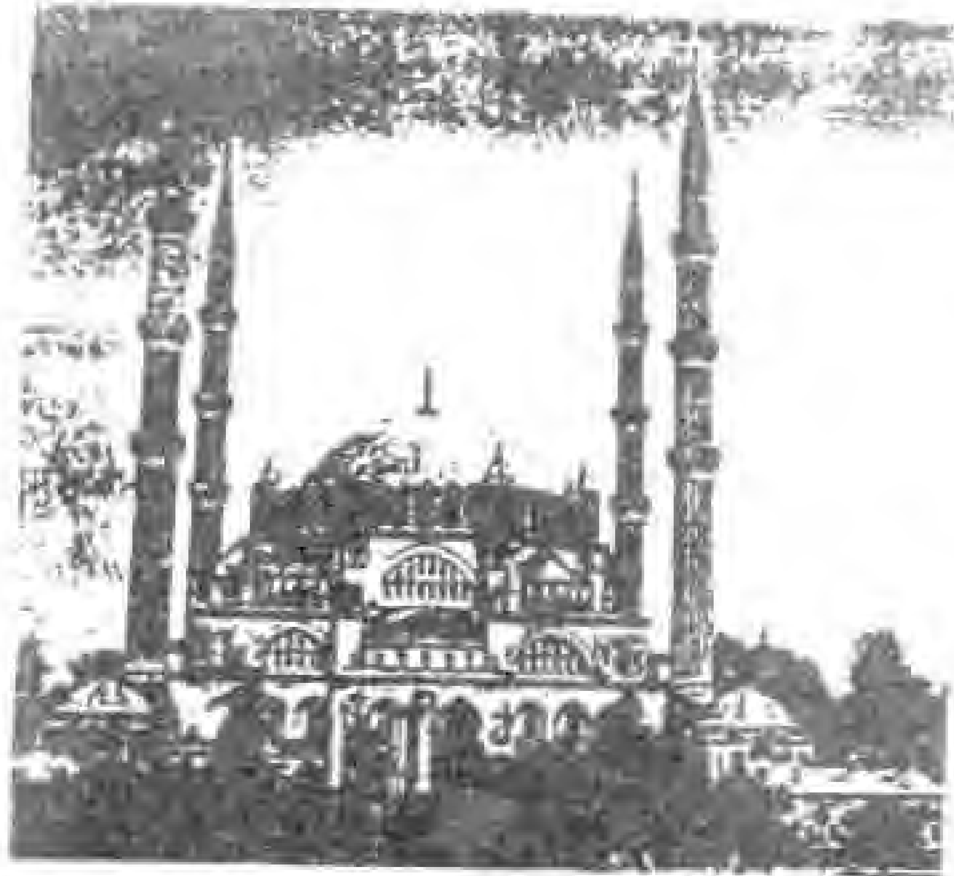
کرنسی کا ادھار معاملہ کرنا

تاجروں میں عمومًا اور دیگر لوگوں میں خصوصًا یہ رواج عام ہوگیا ہے کہ وہ ایک ملک کی کرنسی اس شرط پر کسی کو دیتے ہیں کہ تم اس کرنسی کے بدلے ایک ماہ یا دو ماہ کے بعد یا ایک ہفتہ دو ہفتے کے بعد فلاں ملک کی کرنسی فلاں ملک یا فلاں شہر میں مجھے دے دینا۔ مثلاً سعودیہ میں کسی نے پانچ سو ریال کسی کو اس شرط کے ساتھ دئے کہ تم مجھے ہندوستانی روپے اس کے بدلے میں ایک ماہ میں ڈھائی ہزار دے دینا تو اس طرح ادھار معاملہ کرنا دونوں کرنسیوں کی جنس مختلف ہونے کی وجہ سے جائز ہوگا اثمان کی بیع میں بیع کے وقت ثمن کا عقد کرنے والے کی ملکیت میں ہونا شرط نہیں لہٰذا جنسیں مختلف ہوں تو ادھار کرنا جائز ہوگا مبسوط للسرخسی میں ہے واذا اشترى الرجل فلوسا بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبيع جائز لان الفلوس الرائجة ثمن كالنقود وقد بينا ان حكم العقد في الثمن وجوبها ووجودها معا ولا يشترط قيامها في ملك بائعها لصحة العقد كما لا يشترط ذلك في الدراهم والدنانير (ص ۲۴ ج ۱۴)

۴ و ۵

یہ تعبیر کہ نوٹوں کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی ہیں احقر کے خیال میں درست نہیں بلکہ درحقیقت اشیاء کی قیمتوں میں کمی زیادتی ہوتی ہے اس لئے ڈیون میں نوٹ نئے یا طے کئے گئے ہیں تو بعینہٖ وہی

نوٹ یا اس کے مثل ادائیگی واجب ہوگی۔ قرض میں سو روپے کا نوٹ دے کر اس کے بدلہ میں ۵۰۰ کا نوٹ لینا ناجائز اور سود ہوگا اس لئے اس فتنہ وفساد اور حرص و ہوس کے دور میں پہلے سے اس کی قیمت سونے چاندی کے وزن کے ساتھ متعین کر دینا ازحد ضروری ہے۔ ادائیگی کے وقت خواہ سونا چاندی دے دی جائے خواہ اس کے مساوی نوٹ دے دئے جائیں یہ صورت بلاشبہ درست ہے۔ فقط



کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت موجودہ دور میں

(۱۲) ——— حضرت مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی مفتی دار العلوم دیوبند

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

کسی سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ موجودہ دور بڑی تیزی کے ساتھ انقلابات سے دوچار ہے سائنس کی ترقی نئی ایجادوں اور نئی تدبیروں کو جنم دے رہی ہے اور ان سے نئے مسائل ابھر رہے ہیں، ایسی ترقی جس کا انکار کوئی سمجھدار انسان نہیں کر سکتا ہے پہلے جو چیزیں خواب وخیال تھیں اب وہ مشاہدہ میں آرہی ہیں اور کائنات انسانی ان سے بھرپور فائدہ اٹھا رہی ہے اور بلاشبہ ان نئی ایجادوں سے فائدہ حاصل کرنا ہی دانشمندی ہے۔

ان حالات وانقلابات نے دین کے ان احکام ومسائل کو بھی متاثر کیا ہے جو مجتہد فیہا ہیں منقول ومنصوص نہیں ہیں اور یہ ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے۔ علماء اور فقہاء نے کبھی ان سے صرف نظر نہیں کیا ہے البتہ جب تک مسائل منقح نہیں ہوجاتے ہیں حکم نہیں لگایا جاتا ہے۔

اس کی مثالوں میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال، ہوائی جہاز پر نمازوں کی ادائیگی جیسے مسائل پیش کئے جاسکتے ہیں، ایک زمانہ تک لاؤڈ اسپیکر پر نماز کو ناجائز کہتے رہے مگر پوری سائنسی تحقیقات کے بعد ہم نے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا، اسی طرح ہوائی جہاز پر نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی مگر بعد میں اس کی بھی اجازت دی گئی، اور یہ عیب نہیں ہے، عرف وعادات کی تبدیلی سے احکام ومسائل ہر دور میں بدلتے رہے ہیں، متقدمین تعلیم قرآن اور درس حدیث وفقہ پر اجرت کو ناجائز کہتے تھے، اسی طرح امامت ومؤذنی کی اجرت کے جواز کا فتویٰ نہیں دیتے تھے، متاخرین نے اپنے دور میں حالات سے مجبور ہو کر ان کے جواز کا فتویٰ دیا اور ملت نے اس کو قبول کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا فقہاء نے صراحت کی ہے۔

العادۃ والعرف رجع الیہ مسائل کثیرۃ حتی جعلوا ذلک اصلاً فقالوا تترک الحقیقۃ بدلالۃ الاستعمال والعادۃ (رسم المفتی ص۹۵)

متاثر ہوتے ہیں اسی وجہ سے فقہار نے اس کو ایک قاعدہ کلیہ تسلیم کر لیا اور کہا کہ استعمال وعادت کی وجہ سے حقیقت ترک کر دی جائے گی چنانچہ اسی اہمیت کی وجہ سے علمار و فقہار کے لئے عرف زمانہ سے واقف ہونا ضروری قرار دیا ہے وقد قالوا من جهل باهل زمانه فهو جاهل (ص۹۹) جو اپنے اہل زمانہ کے احوال سے واقف نہ ہو وہ جاہل ہے۔

صاحب مبسوط نے لکھا ہے

الثابت بالعرف کالثابت بالنص (ص۹۵) عرف وعادت سے جو ثابت ہوتا ہے اس کا تقریباً وہی درجہ ہے جو نص سے ثابت ہے۔

علامہ شامی نے لکھا ہے

قد تغیرت احکامها التغیر الزمان اما للضرورة بہت سے احکام زمانہ کے انقلاب سے بدل گئے ایسا تو ضرورت کی وجہ سے ہوا۔

واما للعرف واما لقرائن الاحوال (ص۹۷) یا عرف وعادت کی وجہ سے یا پھر احوال زمانہ کے قرائن کے مدنظر۔

عرض یہ کرنا ہے کہ حالات وعرف کے بدلنے کا مسائل پر اثر ہوتا ہے اور عرف وعادت اور حالات کے پیش نظر احکام میں تبدیلی عیب بھی نہیں ہے بلکہ ہنر ہے، ناجائز نہیں، جائز ہے۔ اسلام رہتی دنیا تک کے لئے آیا ہے اور تمام دنیا اور کائنات کے لئے آیا اس لئے کیونکر اس کو برا کہا جا سکتا ہے کہ عرف وعادت اور حالات پر نظر نہ رکھی جائے یا ضرورت کا لحاظ و پاس نہ ہو۔

کرنسی نوٹوں کا مسئلہ بھی حالات اور عرف وعادت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ہے اور سو سال پہلے جو حکم تھا ہر حال میں وہی باقی نہ رہے گا بلکہ اس میں تبدیلی ہو گی، ایک دور وہ تھا کہ چاندی اور سونے کے سکے ڈھلتے اور چلتے تھے، یہاں بھی اور دوسرے غیر ممالک میں بھی۔ کرنسی نوٹوں کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں تھا، پھر زمانہ نے پلٹا کھایا، سونے چاندی کی کمی ہوئی اور اس کی کی تلافی دوسری دھاتوں کے سکوں سے کی گئی۔

یہ سکے بھی بہت دنوں تک رائج رہے، یہی وجہ ہے فقہ کی کتابوں میں اسی طرح کے سکوں کے مسائل بکثرت پائے جاتے ہیں، مگر ایک دور وہ بھی آیا کہ ہر ملک کی حکومت نے سکوں کی جگہ میں کرنسی نوٹوں کو رائج کیا ہزار کے نوٹ چھپے، سو کے چھپے، پچاس کے چھپے، دس کے چھپے، پانچ کے چھپے اور پھر دو اور ایک کے بھی، حکومت چاندی سونے کے سکوں کو اپنے خزانے میں جمع کرتی گئی پھر دوسری دھاتوں کے سکے بھی بازاروں سے غائب ہونے لگے۔ اب جہاں دیکھئے کاغذ کے ہی نوٹ نظر آتے ہیں

خواہ امریکہ اور روس ہو، عرب ممالک ہوں، ایشیا ہو، یورپ کے ممالک ہوں۔ ہمارے بچپن میں تو چاندی کے سکے بازار میں پائے جاتے تھے جن میں بارہ چودہ آنے چاندی ہوتی تھی اور دو چار آنے دوسری دھات کی ملاوٹ ہوتی تھی۔

اب تو ہمارے نوجوانوں کے خواب وخیال میں بھی چاندی کے سکے نہیں ہیں، اور انھوں نے عقل وہوش سنبھالنے کے بعد اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔ اب خود سوچئے جو سنتے آئے اور جو کتاب میں سونے چاندی کے سکے صرف پڑھتے آئے سب سے صرف نظر کرکے صرف ان کی بات اس موجودہ زمانہ میں کی جائے تو یہ کس قدر غلط بات ہوگی اور دنیا ہمیں کیا کہے گی، حکومت والوں نے ابتدا میں جب نوٹ رائج کیا تو اس کو سند اور وثیقہ قرار دیا اور اس پر طبع کرایا کہ اس کا مال چاندی یا سونے سے دیا جائے گا چنانچہ اس دور کے علماء نے اسے وثیقہ قرار دے کر لکھا کہ نوٹوں سے اس وقت تک زکوٰۃ ادا نہ ہوگی جب تک مستحق زکوٰۃ اس نوٹ کا غلہ کپڑا یا اور کوئی اسی طرح کا سامان نہ خرید لے یا اس کو سکوں سے بھنا نہ لے لیکن اس مستحق زکوٰۃ نے اگر ان نوٹوں کو اپنے قرض میں دے دیا تو اس سے زکوٰۃ دینے والے کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

نوٹ پر وجوب زکوٰۃ کا فتویٰ اس بنیاد پر دیا گیا کہ چونکہ یہ روپیہ کی سند ہے اور مقدور التحصیل ہے لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی لیکن ادائے زکوٰۃ کے سلسلے میں لکھا جاتا تھا کہ وجوب ادائے زکوٰۃ وصول نقد پر ہی ہوگا۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے فرمایا:

"چونکہ نوٹ مال نہیں ہے محض سند مال ہے اس لئے نوٹ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔"

آپ سوچیں موجودہ زمانہ میں جب آج نوٹ ہی نوٹ کا چلن ہے سکہ کا کوئی وجود نہیں، اگر اسی سابق بنیاد پر فتویٰ دیا جاتا رہا تو زکوٰۃ دینے والے اور لینے والے دونوں ہی پریشانیوں سے دوچار ہوں گے اور زکوٰۃ ادا کرکے بھی منتظر اور فکر مند رہیں گے کہ زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں ہوئی، ایسا نہ ہو کہ زکوٰۃ والے کو اس نے نوٹ اپنے قرض میں دے دیا ہو، یا ریل یا بس کے کرایہ میں دے دیا ہو، یا کسی دوست کو قرض دے دیا ہو تو پھر مری زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔

اس لئے ضرورت ہوئی کہ موجودہ حالات اور تقاضے کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کیا جائے اور جو ضرورتیں اور دقتیں ہیں ان کو سامنے رکھا جائے۔

ثمن اس چیز کا نام ہے جو بیع دین میں بطور معاوضہ دی جاتی ہے جس کو اردو زبان میں قیمت سے تعبیر کرتے ہیں، ثمن کی تعریف فقہاء نے اس طرح کی ہے۔

الثمن ما یکون بدلا للمبیع ویتعلق بالذمۃ وھو حال او موجل (التعریفات الفقہیہ ص۲۳۳)

ثمن وہ شے ہے جو بیع کا بدل ہو اور ذمہ میں لازم ہو جاتا ہو خواہ فوری ہو، یا ادھار ہو

ابوبکر جصاص رازی نے لکھا ہے

الثمن ما یثبت فی الذمۃ بدلا من البیاعات من الدراھم والدنانیر (احکام القرآن)

ثمن وہ شے ہے جو بیع و شراء کے راستے ذمہ میں لازم ہو جائے خواہ درہموں کے ذریعہ ہو یا اشرفیوں کی راہ سے۔

خرید کی جانے والی چیز کا جو بدل اور معاوضہ دیا جاتا ہے دراصل وہی ثمن ہے، یہ درہم و دینار سے بھی ادا ہو جاتا ہے اور مکیلی اور موزونی چیزوں سے بھی، دیہاتوں میں غلہ دے کر گوشت مچھلی خریدنے کا عام رواج ہے، تو اس صورت میں قیمت کی ادائیگی غلہ سے ہوتی ہے اور اس خریدی ہوئی چیز کے بدلے میں یہی غلہ ذمہ میں واجب ہوتا ہے۔

فقہاء عام طور پر درہم اور دینار کو نقد قرار دیتے ہیں کہ وہ خلقی ثمن ہیں۔

النقد عبارۃ عن الذھب والفضۃ (التعریفات الفقہیہ) نقد سونا چاندی کا نام ہے

پہلے دور میں عام طور پر بیع و شراء میں سونے چاندی کے سکے ہی استعمال ہوتے تھے لیکن بعد کے زمانہ میں فلوس چلنے لگے اور دوسرے سکے جن میں چاندی کم ہوا کرتی تھی اور کھوٹ زیادہ ہوتے تھے، چنانچہ فقہ کی کتابوں میں ان کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔

ماہر اقتصادیات نے اب جو نقد کی تعریف کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ نقد وہ چیز ہے جو تبادلہ کا ذریعہ بن سکے اور قیمتوں میں اس کو پیمانہ قرار دیا جائے، اور ثروت کے لئے اس کو جمع کرنا ممکن ہو اور دیون کی ادائیگی کے لئے معیار بن سکے، خواہ یہ سونا چاندی ہو، یا دھات کے سکے ہوں، یا سرکاری نوٹ ہوں، یہ تعریف سب پر صادق آتی ہے۔

سونا چاندی کی اہمیت ہر دور میں تسلیم کی گئی ہے، اسی لئے نقد کے لئے اس کو تجویز کیا گیا، اور اس کا ایک فائدہ یہ تھا کہ اگر یہ سکوں میں استعمال ہوں گے تو گردش میں رہیں گے، امام ابوحنیفہ نے تو اسی وجہ سے عورتوں کے زیورات پر زکوٰۃ کو واجب قرار دیا، تاکہ زیورات کے نام پر کوئی ان کو جمع نہ کر پائے اور اس کی وجہ سے ملک کی معیشت متاثر نہ ہوتے پائے۔

کرنسی نوٹ پر ثمن اور مال کی تعریف صادق آتی ہے، جو فقہاء نے لکھی ہے ثمن کی تعریف گذر چکی مال کی تعریف یہ ہے المال ما یمیل الیہ الطبع ویمکن ادخارہ لوقت الحاجۃ (رد المحتار ج ۴)

مال وہ ہے جس کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہو اور ضرورت کے وقت اس کا ذخیرہ کرنا ممکن ہو۔

جیسے پہلے زمانہ میں عرف و عادت کی بنیاد پر فلوس کو ثمن قرار دے دیا گیا اور عوام و خواص

اس سے کاروبار کرتے تھے، لین دین ہوتا تھا، تو اگر آج تمام حکومتوں نے کرنسی نوٹ کو وہی حیثیت دے دی ہے اور عوام و خواص نے عملاً اس کو تسلیم بھی کر لیا ہے تو آخر اس کو ثمن عرفی یا ثمن اصطلاحی قرار دینے میں کیا مضائقہ ہے، سونا چاندی کے علاوہ جس طرح دوسری چیزیں عرفی ثمن بن سکتی ہیں کرنسی نوٹ بھی ثمن عرفی یا ثمن اصطلاحی قرار پا سکتے ہیں۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوگا کہ نوٹ کا نوٹ سے تبادلہ ہو تو کیا اس میں مالیت کے کم و بیش کی اجازت ہوگی یا نہیں، جواب یہ ہے کہ جب یہ ثمن عرفی ہے اور ثمن خلقی کے قائم مقام ہے تو جس طرح ثمن خلقی میں کم و بیش جائز نہیں ہے، قاعدہ میں قائم مقام میں بھی کم و بیش بھی نہیں ہوگا۔ ہمارے یہاں اب تک کچھ مفتیان کرام کم و بیش کو جائز لکھتے ہیں، جو خاکسار کے نزدیک قطعاً درست نہیں ہے غالباً یہ حضرات اس ثمن اصطلاحی کو فلوس کے بیع پر قیاس کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ تفاضل کو جائز کہتے ہیں، حالانکہ اس مسئلہ میں بھی احناف میں امام محمدؒ تفاضل کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔

وقال محمد لا يجوز لان الثمنية تثبت باصطلاح الكل فلا تبطل باصطلاحهما واذا بقيت اثمانا لا تتعين فصار كما اذا كانا بغير اعيانهما وكبيع الدرهم بالدرهمين

(ہدایہ ص۷۵ ج۳)

فلوس کی بیع میں امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ تفاضل جائز نہیں کیونکہ اس کی ثمنیت عوام کی اصطلاح سے ثابت ہو چکی ہے تو دو شخصوں کے مان لینے سے وہ باطل نہیں ہوگی اور جب وہ ثمن باقی رہے تو متعین نہیں ہوں گے جیسا کہ غیر اعیان سے اور ایک درہم کا دو درہم کے عوض بیچنا درست نہیں ہے۔

شیخین کا یہ فرمانا کہ متعاقدین اس کی عرفی ثمنیت کو ختم کر سکتے ہیں کچھ زیادہ مضبوط بات نہیں ہے اس لئے کہ عرف و عادت سے جس نے ثمن خلقی کی جگہ لے لی ہے، تمام پبلک اور حکومت نے اس کو تسلیم کر لیا ہے وہ صرف دو آدمی کیسے ختم کر سکتا ہے، اور یہ کیونکر ممکن ہے جبکہ فقہاء یہ اصول بیان کرتے ہیں کہ الثابت بالعرف کالثابت بالنص، پھر کرنسی نوٹ کی حیثیت ایسی ہے کہ اگر کوئی اس کو تسلیم نہ کرے تو وہ قانون ملکی میں مجرم گردانا جائے گا۔ اس کی قانونی حیثیت کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ نے بھی فلس کی بیع میں تفاضل کو قطعاً جائز قرار نہیں دیا ہے۔ وہ اس مسئلہ میں امام محمدؒ کے ساتھ ہیں۔

لان مالكا قال لا يجوز بيع فلس بفلسين ولا تجوز الفلوس بالذهب ولا بالدنانير نظرة

(المدونۃ الکبریٰ ص۱۰۳ ج۳)

امام مالکؒ نے فرمایا کہ ایک فلس کا دو کے عوض بیچنا جائز نہیں ہے اور نہ فلوس کا سونا اور دنانیر کے عوض ادھار بیچنا درست ہے۔

سونا چاندی اور ان کے سکوں میں حقیقی ثمنیت پائی جاتی ہے اور دوسرے دھات کے سکوں میں عرفی اصطلاحی ثمنیت ہے، اس لئے اجناس مختلف ہوں تو بھی ادھار جائز نہیں۔

امام احمدؒ کا بھی ایک قول یہی ہے کہ فلوس کے تبادل میں تفاضل جائز نہیں ہے۔

یہ اختلاف ائمہ کا اس زمانہ کا ہے جب خلقی ثمن والے سکے بھی بکثرت رائج تھے، اور عرفی و اصطلاحی سکے بھی لہٰذا جنھوں نے تفاضل کے جواز کا حکم دیا انھوں نے دونوں سکوں میں فرق کو ظاہر کرنا چاہا اور ایک کو دوسرے کے برابر قرار نہیں دیا لیکن اب جبکہ نوٹ ہی نوٹ چل رہے ہیں اور اس چلن کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے، خلقی ثمن کے سکوں کا خارج میں کوئی وجود کہیں نظر نہیں آتا مختلف ممالک کے کرنسی نوٹوں کا جب تبادلہ ہوتا ہے تو وہ بھی نوٹوں کی شکل میں ہی ہوتا ہے، ان حالات میں نوٹوں کی شرعی حیثیت سے انکار سمجھ سے بالاتر ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کرنسی نوٹوں نے خلقی ثمن کی حیثیت حاصل کر لی ہے یا اس کی جگہ لے لی ہے، اس لئے اب اس دور میں اس باب میں اختلاف کی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے، اگر ہمارے اس زمانہ میں وہ ائمہ کرام ہوتے تو وہ بھی امام محمدؒ کے مسلک کو ترجیح دے کر تفاضل کو ناجائز قرار دیتے اور اصطلاحی ثمن یعنی نوٹوں میں بھی ان کا یہی فتویٰ ہوتا۔

اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اگر نوٹوں میں تفاضل کو جائز قرار دیا گیا تو سود کا دروازہ چوپٹ کھل جائے گا اور وہ ساری بندشیں پامال ہو کر رہ جائیں گی، جو سود پر باندھی گئی ہیں اور جس کی حرمت پر قرآن پاک نے بڑی شدومد ظاہر کی ہے اور حدیث نبوی میں جس کے لئے بڑی وعیدیں آئی ہیں۔

امام محمدؒ کے مسلک کی تائید اس مسئلہ سے بھی ہوتی ہے جو صاحب ہدایہ نے کھوٹے سکوں میں تفاضل پر لکھا ہے تحریر فرماتے ہیں۔

قال رضی اللہ عنہ ومشائخنا لم یفتوا بجواز ذلک فی العدالی والغطارفۃ لانہا اعز الاموال فی دیارنا فلو ابیع التفاضل فیہ ینفتح باب الربوا ہدایہ ج ۳ ص ۹۳	مصنف ہدایہ کا بیان ہے کہ ہمارے مشائخ نے عدالی اور غطارفہ اصطلاحی سکوں میں بھی تفاضل کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا ہے اس لئے کہ ہمارے دیار میں جن قیمت مال شمار ہوتے ہیں اگر تفاضل کو ان سکوں میں مباح کر دیا گیا تو سود کا دروازہ کھل جائے گا۔

عدالی اور غطارفہ اس زمانہ کے سکے تھے جو وہاں رائج تھے اور جن کو اس زمانہ کے سلاطین نے جاری کیا تھا اور وہ سکے دوسری دھاتوں کے بنے ہوئے تھے جس کو اصطلاح میں کھوٹ سے تعبیر

کرتے ہیں، چاندی اگر تھی تو برائے نام تھی اور ان کی رائے تھی کہ اگر ان غیر خلقی سکوں میں تفاضل کے جواز کا فتویٰ دیا گیا تو یہ جواز لوگوں کو کھینچ کر بتدریج سونے چاندی کے سکوں میں بھی تفاضل تک لے آئے گا اور وہ آہنی دیوار مسمار ہو جائے گی جو قرآن پاک نے اس کی حرمت پر قائم کی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔ احل اللّٰہ البیع وحرم الربوا (البقرہ) اللہ تعالیٰ نے تجارت کو جائز قرار دیا ہے اور سود کو حرام اس لئے سدّ اللباب تفاضل کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دینا لازم ہے۔

فان الناس حینئذ یعتادون التفاضل	پس اس وقت لوگ نفیس اموال میں تفاضل کے عادی ہو جائیں گے
فی الاموال النفیسة فیتدرجون الی ذلك فی	اور بتدریج خالص نقود میں بھی تفاضل تک پہونچ جائیں گے
النقود الخالصة فمنع ذلك حسما لمادة	اس لئے مادّۂ فساد کو ختم کرنے کے لئے اس سے روکا گیا۔
الفساد (فتح القدیر ج ۶ ص ۲۷۵)	

یہ بھی غور کیا جائے کہ نوٹ ہوں یا گلٹ کے سکّے ان سے بیع و شراء میں کام لینے کے سوا دوسرا کیا مقصد ہو سکتا ہے، ان غیر خلقی سکوں اور نوٹوں کو کوئی تانبا، کھوٹ یا رنگین کاغذ سمجھ کر خریدنے کا ہرگز ارادہ نہ کرے گا بلکہ مقصد اس کی اصطلاحی ثمنیت ہے کہ اس کے ذریعہ وہ اپنی ضروریات زندگی کا سامان خرید سکیں۔

لہٰذا کرنسی نوٹوں میں تبادلہ اس کی مالیت میں مساوات کے اعتبار سے ہوگا، ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ دس کا نوٹ دے کر دس دس کے دو نوٹ لے لے یا اس کے نوٹ کے بدلے بیس یا پچاس کے نوٹ لے لے بلکہ دس دے کر صرف پانچ کے دو نوٹ تو لے سکے گا جو مالیت میں دس کے ہی برابر ہیں یا دس دے کر ایک ایک کے دس نوٹ لے سکتا ہے کہ مالیت میں دونوں برابر قرار دئے گئے ہیں۔

اگر مالیت میں مساوات کی قید نہ لگائی گئی تو سود خوار بڑی آسانی سے مدیون سے کہیں گے کہ یہ سو کے نوٹ لے جاؤ اور اس کی ادائیگی کے دن تم سو سو کے دو نوٹ دے دینا، یا پچاس پچاس کے چار نوٹ دے دینا جس کے مفتی صاحبان نے جائز ہونے کا فتویٰ دے رکھا ہے، یہ واضح رہے حکیم الامت حضرت تھانوی جیسے اکابر کرنسی نوٹوں کے مساوات کا بھی فتویٰ دیا ہے اور انھوں نے یہ فتویٰ وثیقہ اور سند مان کر ہی دیا ہے، امداد الفتاویٰ میں اس کی صراحت موجود ہے جو اہل علم سے مخفی نہیں۔

البتہ اگر یہ کرنسی نوٹ ایک ملک کے نہ ہوں، بلکہ متعدد ممالک کے ہوں، اس لئے کہ ہر ملک کے

نوٹ کی اصطلاحی حیثیت الگ الگ ہوتی ہے، امریکہ کے نوٹ کی مالیت الگ ہے، یورپ کے نوٹ کی حیثیت الگ ہے اور سعودی عرب کے نوٹ کی مالیت الگ ہے، بین الاقوامی قانون یا عالمی بینک نے قیمتوں میں تفاوت کر رکھی ہے، یا کوئی اور صورت ہے، مجھے صحیح معلوم نہیں، لیکن ان میں باہم تفاوت ضرور ہے، تو یہ سب مختلف الاجناس قرار پائیں گے اور اسی وجہ سے ان کے تبادلہ میں اس قانون کی وجہ سے کافی فرق ہوتا ہے، اور اس میں کبھی کبھی کمی زیادتی بھی ہوتی رہتی ہے لہٰذا اس وجہ سے مختلف ملکوں کی کرنسی نوٹوں میں کمی و بیشی جائز ہوگی، چنانچہ عملاً اور قانوناً ایسا ہوتا ہے کہ سعودی عرب کا ایک ریال یہاں کے چار روپے کے برابر ہوتا ہے، کبھی کم بھی ہوتا ہے اور کبھی اس سے زیادہ بھی فرق ہوتا ہے اسی طرح کا تفاوت دوسرے ممالک کے سکوں اور کرنسی نوٹوں میں ہے لہٰذا اس کی رعایت درست ہوگی۔

دوسری بحث یہ بھی ہے کہ مہر اور قرضے جو چند سالوں کے بعد ادا ہوتے ہیں، تو کیا جو رقم طے پائی ہے اور جس قدر رقم دی گئی ہے، قرض لینے والا اتنی ہی رقم واپس کرے گا، یا وہ دینے کے وقت اور وصولی کے وقت سونے چاندی کے بھاؤ اور قیمت کا اعتبار کرے گا؟ جس کا ذکر سوال میں اس طرح ہے۔

"علماء معاشیات کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ اشاریہ کے ذریعہ نوٹ کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے اور اس متعین قدر کی ادائیگی واجب قرار دی جائے مثلاً آج اگر روپیہ کی قدر بارہ پیسوں کے برابر ہے تو آگے چل کر مہر یا کسی دین کی ادائیگی کا وقت آئے تو روپیہ کی قدر گھٹ کر چھ پیسے ہوگئی، تو ادائیگی سو روپیہ دین کی دو سو روپیہ کے نوٹ سے ہوگی الخ"

اس کے جواب میں عرض ہے کہ حکومتوں کا نظام اب تک یہی ہے کہ جس قدر قرض دیا گیا ہے دس بیس سال بعد بھی اتنی ہی رقم واپس ہوتی ہے اصل رقم میں کوئی اضافہ یا کمی نہیں ہوتی ہے، اگر کسی نے بیس سال پہلے بینک میں دو سو روپے جمع کرائے تھے تو بیس سال کے بعد بھی بینک اصل رقم میں دو سو ہی واپس کرے گا، سود کے نام پر جو اضافہ ملتا ہے اس کا تعلق اصل رقم کی کمی بیشی سے قطعاً نہیں ہوتا ہے، حکومت اصل رقم جمع شدہ دو سو روپے میں بیس سال بعد واپس کرتی ہے میرا خیال ہے ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اب تک یہی قدیم نظام ہے، اشاریہ سے سوال میں جس کی تعبیر کی گئی ہے وہ نظام قطعاً نہیں ہے، اور سچ پوچھئے تو وہ نظام، عام پبلک کے لئے سراپا درد سر ہے اور اس میں بیسیوں جھگڑے پیدا ہو سکتے ہیں، یہ نظام شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ

قطعاً نہیں ہے۔

اس دوسرے نظام میں روپیہ کی قدر و قیمت کے بڑھنے اور گھٹنے پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے یہ طریقہ کار پرانے دور میں کہیں نہیں ملتا ہے۔

اس سلسلہ میں جب ہم نے کتاب و سنت کا جائزہ لیا تو حدیث میں اس کی صراحت ملتی ہے کہ دراصل سامان کی قیمت بڑھنے کی وجہ سے ہی قیمت میں کم و بیش کا مسئلہ پیش آیا ہے یعنی ارزانی اور گرانی کا تعلق سامان اور اشیاء سے متعلق ہے ثمن خلقی کی قدر میں کم و بیش سے نہیں ہے باب الاحتکار میں ایک حدیث ہے

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احتکر طعاماً اربعین یوماً یرید الغلاء فقد بریٔ من اللہ وبریٔ اللہ منہ (مشکوٰۃ ص۲۵۱)	حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کھانے کے سامان چالیس دن دبا رکھے اور اس کا مقصد گراں کرنے کا ہو تو ایسا شخص اللہ سے بری ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بری ہے۔

یہاں گرانی کا تعلق جنس غلہ سے ظاہر کیا گیا ہے، روپے کی قدر میں کمی بیشی سے نہیں کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ عہدِ نبوی میں گرانی بڑھی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نرخ (بھاؤ) مقرر کر دینے کی درخواست کی

عن انس قال غلا السعر علی عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا یا رسول اللہ سعر لنا (مشکوٰۃ ص۲۵۱)	حضرت انسؓ سے روایت ہے نرخ میں گرانی عہد نبوی میں جب آئی تو صحابہ کرام نے عرض کیا ہمارے لئے نرخ متعین فرما دیا جائے۔

یہاں بھی غلہ اور دوسری اشیاء کی قیمتوں کے مقرر کر دینے کی درخواست کی گئی ہے کہ یہ طے ہو کہ فلاں چیز کا نرخ یہ ہوگا

اس سلسلہ کی ایک اور حدیث ہے

عن معاذ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول بئس العبد المحتکر ان ارخص اللہ الاسعار حزن وان اغلاها فرح (ایضا)	حضرت معاذؓ راوی ہیں کہ میں نے رسول کریمؐ سے سنا آپؐ نے فرمایا کہ غلہ کو دبا کر رکھنے والا بہت برا شخص ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نرخ کو ارزاں کر دیتا ہے تو وہ غمگین ہوتا ہے اور جب گراں کر دیتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔

ان حدیثوں کی روشنی میں یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ گرانی اور ارزانی سامان و اشیاء میں ہوتی ہے

جب سامان کی قیمت زیادہ ہوتی ہے قیمت بڑھ جاتی ہے، روپیہ کی قوت خرید کم نہیں ہوتی ہے، لہٰذا جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ صحیح نہیں۔

ثمن خلقی ہو یا ثمن عرفی و اصطلاحی، اس کی قیمت متعین ہوتی ہے، اس میں کمی و بیشی کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہے، بلکہ جو اشیاء خرید کی گئی ہیں، وہ گراں ہوگئی ہیں اس گرانی کی مختلف وجہیں ہوتی ہیں کبھی اس سامان میں کمی آجاتی ہے مثلاً قحط سالی ہوئی، غلہ کم پیدا ہوا، لہٰذا اس کی قیمت اس شے کی کمی کی وجہ سے بڑھ گئی یا کسی سال ملک سے بڑی تعداد میں مال باہر ملک میں چلا گیا۔

کبھی حکومت اپنے خزانے بھرنے اور وزراء اور حکام کی تنخواہوں میں اضافہ کے نام پر تاجروں پر ٹیکس بڑھا دیتی ہے اور مختلف ناموں سے ٹیکس وصول کرتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تجار اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور وہ اپنی یہ کمی خریداروں سے قیمت بڑھا کر وصول کرتے ہیں۔

اسی طرح نایاب و کم یاب چیزوں کی قیمت لوگ بالقصد بڑھا دیتے ہیں اور قیمت زیادہ لینا چاہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ روپیہ کی قیمت نہیں گھٹتی ہے، اب کچھ لوگ اس کی تعبیر الٹ کر یہ کرتے ہیں کہ روپیہ کی قیمت کم ہوگئی اور ایک حدیث میں تو اس کی صراحت ملتی ہے کہ اونٹ گراں ہوگئے۔

قال كانت قيمة الدية على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ثمان مائة دينار او ثمانية آلاف درهم ...... حتى استخلف عمر فقال خطيبا الا ان الابل قد غلت ففرضها عمر على اهل الذهب الف دينار و على اهل الورق اثنى عشر الف درهم (ابو داؤد ص۶۲۳)

کہتے ہیں کہ دیت کی قیمت عہد نبوی میں آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھی جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اب اونٹ گراں ہو چکے ہیں لہٰذا آپ نے سونے میں قیمت بڑھا کر آٹھ سو سے ایک ہزار کر دی اور چاندی کی دیت میں آٹھ ہزار سے بڑھا کر بارہ ہزار دیت مقرر فرمادی۔

یہاں حدیث کی یا مسئلہ کی بحث میں جانا نہیں چاہتا بلکہ صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ خلیفہ راشد کی زبان سے یہی نکلا کہ الآن ان الابل قد غلت کہ اونٹ کی قیمت بڑھ گئی ہے گرانی مبیع میں ہوئی ہے یہ نہیں فرمایا کہ روپیہ، درہم، دینار کی قیمت گھٹ گئی ہے۔

پھر یہ بھی ذہن نشین رکھیں کہ ہم نے چار سال پہلے دو سو روپے آپ سے قرض لئے تھے، آپ چار سال بعد قیمت گھٹنے کے نام پر تین سو روپے وصول کرنے لگیں تو اس ایک سو کو سود کے سوا کیا کہا جائے گا۔ ربا کی تعریف فقہاء یہی تو کہتے ہیں کہ جو زیادتی بلا کسی وجہ کے لی جائے کل زیادۃ لا

بمقابلھا عوض (احکام القرآن للجصاص ص ۲۴۲ ج ۱)

جہاں یہ نظام حدیث کے خلاف ہے وہیں اس سے سود کے دروازے کھل جائیں گے اور سود خواہ یہی کہنے لگیں گے کہ اتنے دنوں میں بازار کی قیمتوں میں اس قدر تفاوت ہوا اس لئے اضافہ لیا جانا ضروری ہے، سوچئے تو اسلام نے جس سود پر آہنی دیوار کھڑی کی تھی اس دوسرے نظام سے گر جائیگا اور قرض خواہوں کے لئے سود سے بڑھ کر ایک دوسری مصیبت آکھڑی ہوگی کیا تعجب ہے کہ اس دوسرے نظام سے سود کے لئے ایک دروازہ کھولنا مقصد ہو، اگر ایسا ہے تو یہ اسلام کے خلاف ایک اور مضبوط سازش سمجھی جائے گی جو سرمایہ داروں کا نیا حربہ ثابت ہوگا اور غریب اس نئے راستے سے پامال کئے جائیں گے۔

پھر روپیہ یا نوٹ کی قیمت کی تعیین حکومت کیا کرتی ہے یا عالمی بینک جس نے کوئی اپنا نظام تیار رکھا ہوگا۔ ہر خاص و عام کو اس کی قیمت کم کرنے یا زیادہ کرنے کا غالباً حق نہیں دیا گیا۔

یہ بھی مشاہدہ ہے کہ حکومت کے ایماء اور ڈھیل سے اشیاء کی قیمتیں بڑھتی ہیں اور اس کی توجہ سے قیمت گرتی ہے چنانچہ چینی اور شکر کے نرخ کا الیکشن کے زمانے میں سبھوں کو تجربہ ہے کہ ایسا ہوا ہے۔

یہاں یہ بھی پیش نظر رہے تو بہتر ہے کہ قرض کی اجازت شریعت نے مثلی چیزوں میں دی ہے جن کے اجزاء یکساں اور متقارب ہوں جیسے گیہوں، جو، چاول وغیرہ ذوات القیم میں قرض کی اجازت نہیں دی گئی ہے جن میں تفاوت لازماً ہوا کرتا ہے، خواہ کم خواہ زیادہ، جیسے جانور کہ ایک گائے دوسری گائے کے بالکل مماثل نہیں ہوتی ہے کوئی کسی سے ایک گائے لے کر اس کے بدلے میں دوسری گائے دے دی جائے گی تو یہ صورت شرعاً جائز نہیں ہوگی۔

لہٰذا اگر کوئی کسی سے کرنسی نوٹ جتنی مالیت کا قرض کے نام پر لے گا برسوں کے بعد اس کے ذمے اتنی ہی مالیت کا نوٹ ادا کرنا ضروری ہوگا، ایک ہزار کا ایک ہی ہزار واپس کرنا ضروری ہوگا اس پر اضافہ لینا شرعاً جائز نہ ہوگا، فقہاء نے صراحت کی ہے، ایک درہم دے کر دو درہم وصول کرنا قطعاً جائز نہیں ہے خواہ گرانی بڑھ گئی ہو اور کئی گنا بڑھ گئی ہو یہ نوٹ خلقی ثمن کے قائم مقام ہیں اس کا بھی وہی حکم ہوگا جو خلقی ثمن کا ہے۔

پھر اشاریہ والے نظام میں جو دوسری مشکلات ہیں وہ بھی ظاہر ہے کہ اس کا حساب و کتاب کرنا آسان نہیں ہوگا، اور نہ ہر شخص کے بس کی بات ہوگی، بلال کے باب میں ایک حدیث آئی ہے کہ میں

اس طرف اشارہ بھی موجود ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا انا امۃ امیۃ لانکتب ولانحسب (مشکوٰۃ) ہم لوگ ایک امی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو دقیق حساب کتاب نہیں جانتی۔

اس حدیث کا حاصل تو یہی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عوام کے لئے اس طریقے کو پسند نہیں فرمایا کہ جس کی وجہ سے عوام دقتوں اور مشکلات میں مبتلا ہو جائیں یا قدم قدم پر کسی حساب کرنے والے کے محتاج ہوں۔

فقہاء نے جہاں عرف وعادت کی بحث کی ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے۔

یعمل بمثل ما عملوا من اعتبار تغیرات العرف واحوال الناس وما هو الارفق بالناس وما ظهر علیه التعامل (رسم المفتی ص۹۲)	عرف اور لوگوں کے احوال بدل جانے جس پر عام لوگ عمل کر رہے ہوں اسی پر عمل کیا جائے گا جو عوام کے لئے زیادہ سہل ہو اور جس پر تعامل غالب آچکا ہو۔

فقہاء نے ایک ضابطہ یہ بھی بنایا ہے کہ ضرر جب دو قسم کے ہوں ایک کم اور دوسرا زیادہ تو کم ضرر والے کو اختیار کرنا مناسب ہوگا۔

الضرر الاشد یزال بالضرر الاخف (الاشباہ ص۱۲۱)	کم اور ہلکے ضرر کو قبول کرکے زیادہ نقصان دہ کو دور کیا جائے گا۔

لہٰذا پرانا جو طریقہ اس باب میں عرصہ سے چلا آرہا ہے اور عوام کے لئے سہل بھی ہے اور سود وغیرہ کے شائبہ سے پاک بھی، وہی طریقہ باقی رہنا چاہئے اشاریہ والے حساب کے چکر میں نہیں آنا چاہئے جو بہت الجھا ہوا ہے اور بہت سے خدشات کا حامل ہے۔

یہ صورت کہ قرض دیتے وقت سونا چاندی سے قیمت لگائی جائے یہ بھی مختلف پریشانیوں سے خالی نہیں ہے بازار جاکر نرخ معلوم کرنا، سونے اور چاندی کی قیمت میں تفاوت سے فائدہ حاصل کرنا قطعاً مناسب نہیں ہے، اور جب یہ معلوم ہوچکا کہ اسلام میں سادگی اور سہل الحصول طریقہ پسندیدہ ہے پھر نئے طریقے پر پڑنا سہولت کو ختم کرنا ہے اور سرمایہ دار کو اور زیادہ سرمایہ کا مالک بنانا ہے

لوگوں کو تنگی میں ڈالنا کسی طرح قابل مدح نہیں ہوگا، اسلام اس صورت کو پسند نہیں کرتا ہے حدیث نبوی ہے یسروا ولاتعسروا آسانی پیدا کرنا، دشواریوں میں مت ڈالنا۔

باقی نصاب زکوٰۃ کا مسئلہ تو چونکہ اس کا نصاب سونا چاندی کے ساتھ منصوص ہے اس لئے اس

میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

لیس فیما دون خمس اواق صدقۃ (بخاری) اور چالیس اوقیہ سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے

والاوقیۃ اربعون درھما (ہدایہ ج۱ ص۱۹۳) اور اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے

اس طرح نصاب زکوٰۃ چاندی سے دوسو درہم ہوتا ہے، سونا کے متعلق ارشاد نبوی ہے

لیس فیما دون عشرین مثقالا من ذھب صدقۃ (مشکوٰۃ)

یہ اور اس طرح کی دوسری حدیثوں کو بنیاد بناکر علماء نے لکھا ہے کہ چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی ہے اور سونا سے یہ نصاب ساڑھے سات تولہ ہے۔

لہٰذا کرنسی نوٹ سے ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت لگائی جائے گی اس وزن کی جتنی قیمت ہوگی نوٹوں سے وہی زکوٰۃ کا نصاب بنے گا اس زمانہ میں سونا چاندی کی قیمتوں میں بہت تفاوت پیدا ہوگیا ہے لہٰذا اگر سونا سے نصاب بنایا جائے گا تو اس کی قیمت بہت زیادہ بڑھ جائے گی یہاں فقہاء نے لکھا ہے کہ مستحقین فقراء کے لئے ان دونوں میں سے جس سے نصاب بنانے میں فائدہ ہو اس کا اعتبار کیا جائے گا یعنی فقراء کا لحاظ ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں فقہاء لکھتے ہیں

الزکوٰۃ واجبۃ فی عروض التجارۃ کائنۃ ما کانت اذا بلغت قیمتھا نصابا من الورق او الذھب (ہدایہ) تجارتی سامانوں میں زکوٰۃ واجب ہے خواہ جو بھی سامان ہو جبکہ اس کی قیمت چاندی یا سونے کے نصاب کو پہونچ جائے۔

اب یہ دیکھا جائے گا کہ فقراء کے لئے کس زمانہ میں کس چیز سے نصاب مقرر کرنے میں فائدہ ہے لہٰذا فقراء کے لئے جو سودمند زیادہ ہوگا اس سے قیمت لگائی جائے گی۔

یقومھا بما ھو انفع للمساکین احتیاطاً لحق الفقراء (ہدایہ باب زکوٰۃ الاموال ج۱ ص۱۹۵) حق فقراء کا لحاظ کرتے ہوئے اس چیز سے قیمت لگائی جائے گی جو ان کے لئے زیادہ نفع بخش ہو

یوں بھی سکے پہلے زمانہ میں عام طور پر چاندی کے ڈھالے جاتے تھے سونے کے سکے کا رواج برائے نام رہا ہے چنانچہ اس قاعدے کے مطابق چاندی کی قیمت سے نصاب مقرر کرنا اس زمانہ میں مفید ہوگا تاکہ مساکین کا خسارہ نہ ہو پھر سونا چاندی خلقی ثمن ہیں اس میں جو پائیداری پائی جاتی ہے دوسرے میں نہیں ہے۔

جب عرف وعادت اور حالات حاضرہ کے پیش نظر کرنسی نوٹوں کو ثمن اصطلاحی تسلیم کرلیا جائے گا تو ان نوٹوں سے جو زکوٰۃ ادا ہوگی اس سے نکالتے ہی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، اس سے کسی چیز کی خریداری کی شرط نہیں ہوگی۔

کاغذی نوٹ کی شرعی حیثیت

(از ــــــــ حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند)

احقر کے نزدیک کاغذ کے نوٹ (سکے) خواہ ہندوستانی ہوں یا غیر ہندوستانی ــــــــ خواہ کسی نام سے موسوم ہوں ــــــــ مثلاً پونڈ ــــــــ ڈالر ــــــــ ریال ــــــــ ین وغیرہ سب سکۂ نافقہ غیر خلقیہ ہیں جن کا رواج متعارف بتعارف عام قریب ہو ملک وخطہ میں ہو چکا ہے جس کی وجہ سے ان سب نوٹوں (کاغذی سکوں) کو سکۂ عرفی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اور سکۂ خلقیہ اصلیہ (سونے چاندی کے سکوں) کی طرح اور دوسرے غیر خلقی سکوں (گیلٹ لوہے، تانبے، وغیرہ کے عرفی سکوں) کی طرح جن کی خود اپنی بھی ایک مالیت وحیثیت ہوتی ہے چند شروط و فروق کے ساتھ جاری و نافذ رہ سکتے ہیں بلکہ نافق و رائج رہتے ہیں۔

فرق ۱ ــــــــ ایک فرق تو یہ ہے کہ ان کاغذی سکوں (نوٹوں) کے علاوہ اور جو سکۂ غیر خلقیہ یا عرفیہ مذکور ہیں، اگر وہ کاسد و غیر نافق ہو جائیں جب بھی ان کی اپنی ایک قیمت و مالیت باقی رہے گی ــــــــ اور اس قیمت و مالیت کے اعتبار سے بغیر لحاظ سکۂ ہونے کے بھی ان سے تبادلہ مثل بیع و شراء وغیرہ درست رہے گا ــــــــ اور اس عرفی سکوں (کاغذ والے سکوں) کی کوئی قیمت و مالیت باقی رہنا ضروری نہ رہے گا۔

فرق ۲ ــــــــ ایک فرق یہ ہے کہ ان مذکورہ کاغذی سکوں (نوٹوں) کے علاوہ اور جو عرفی غیر خلقی سکے ہیں ان میں اتحاد جنس وقدر (کیل و وزن) ہو سکتا ہے اور ان دونوں (قدر و جنس) اتحاد کے متحقق ہو جانے کے بعد ارشادِ نبوی (بیعوا الحنطۃ بالحنطۃ والذھب بالذھب الخ اوکما قال) سے اخذ کردہ علت ربوا (اتحاد جنس وقدر) کے تحت نقد ونسیہ دونوں صورتوں میں زیادتی و کمی کے ساتھ تبادلہ کرنے میں ربوائے شرعی لازم آکر ممنوع و حرام رہے گا

جیسے سونے کا تبادلہ کرنا سونے سے یا تانبے کا تبادلہ کرنا تانبے سے زیادتی وکمی کے ساتھ نقد ونسیہ ہو دو صورت میں ممنوع رہتا ہے۔

اور جب محض ایک وصف (جنس میں یا قدر میں) اتحاد ہو ۔۔۔۔۔۔۔ دونوں وصفوں (جنس و قدر) میں اتحاد نہ ہو تو صرف نسیئۃ زیادتی کمی کے ساتھ تبادلہ کرنا ممنوع رہتا ہے اور نقد تبادلہ کی صورت میں زیادتی کمی کے ساتھ ممنوع وحرام نہیں رہتا، کما ھو متعارف ومسلم جیسے سونا کا تبادلہ چاندی سے یا بالعکس یا تانبے کا تبادلہ غیر تانبے سے یا بالعکس کمی زیادتی کے ساتھ جائز رہتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی یہ حکم رہے گا۔

ان کاغذی سکوں (نوٹوں) میں اتحاد جنس تو ہوتا ہے کیونکہ کاغذ سب ایک جنس کے ہیں مگر قدر میں اتحاد نہیں ہوتا ۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ قدر کے معنی کیلی یا وزنی ہوتا ہے اور نوٹ نہ تو کیل کئے جاتے ہیں اور نہ تو وزن کئے جاتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ اس لئے یہ نوٹ بجائے کیلی و وزنی ہونے کے شرعاً عددی شمار ہوں گے۔

پس اس صورت میں ضابطہ شرعیہ مذکورہ کی وجہ سے نقد تبادلہ کرنے میں زیادتی کمی کے ساتھ تبادلہ کرنا جائز رہے گا ۔۔۔۔۔۔۔ ربوائے شرعی کا تحقق لازم نہ آئے گا ۔۔۔۔۔۔۔ البتہ نسیئۃً (ادھار) تبادلہ کرنا جائز وممنوع رہے گا۔

فرق ۲۱ ۔۔۔۔۔۔۔ ایک فرق دیون متقادمہ میں نکلے گا ۔۔۔۔۔۔۔ خواہ وہ دین بصورت قرض ہو یا بصورت دین واجب فی الذمہ ہو ۔۔۔۔۔۔۔ مثلاً چالیس پچاس برس پہلے کوئی عقد نکاح ہوا ہو تو اس میں یہ تفصیل ہوگی کہ اگرچہ مہر معجل نہ طے ہوئی ہو بلکہ مہر مؤجل (ادھار) ہی طے ہوئی ہو لیکن مہر فاطمی (ایک سو اکتیس تولہ اور تین ماشہ چاندی) مقرر ہوئی ہو یا کچھ متعین درہم یا دینار مقرر ہوئے ہوں، یا اس وقت سونے یا چاندی ہی کے سکے عام طور سے رائج ہوں اور ان میں سے کوئی متعین سکہ مقرر ہوا ہو اور وہ آج بھی متعین ہو کر معلوم ہو تو آج چالیس پچاس برس کے بعد بھی بوقت ادائیگی، اس مقرر شدہ دینار و درہم اور مہر فاطمی کی مقررہ چاندی آج کل کے عرفی سکہ (نوٹ) سے جتنے نوٹوں میں ملے گی اتنے نوٹوں کی ادائیگی واجب ہوگی اور یہ ادائیگی مہر مؤجل کی اس اجل تک مؤخر رہے گی جو اجل بین الزوجین آپس میں طے ہوگئی ہو ۔۔۔۔۔۔۔ ورنہ پھر عرف عام کے مطابق اختتام نکاح تک یہ ادائیگی مؤخر رہے گی ۔۔۔ اور یہ اختتام نکاح خواہ بصورت فسخ ہو یا بصورت طلاق وغیرہ کسی بھی صورت سے واقع ہوجائے

اس مہر مؤجل کی ادائیگی حسب قیود وضوابط شرعیہ واجب رہے گی حتیٰ کہ اگر اس منکوحہ کو نکاح زوج میں رہتے ہوئے زوجہ کا انتقال ہو جائے تو زوجہ کے ورثہ پر زوجہ کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل ہی واجب ہو جائے گی اور اس دین مہر موجل کے دین ضعیف، ہونے سے یہ ادائیگی ساقط نہ ہوگی۔

ہاں اگر منکوحہ اپنی خوشی سے جزء یا کل مہر معاف (حط) کر دے تو معاف کردہ مقدار کے وضع کرنے کے بعد محض باقیماندہ مہر کی ادائیگی باقی رہے گی ـــــ کیونکہ یہ مہر بذمہ شوہر دین واجب الادا اور واجب فی الذمہ رہتی ہے ـــــ اور اگرچہ اصطلاحًا دین ضعیف ہے مگر دین صحیح ہے، اور دین صحیح کا حکم ہے "لا یسقط الا بالاداء او بالابراء کما ھو مصرح فی کتب الفقہ" ـــــ نیز یہ دین ایسا دین ہے کہ اس کی ادائیگی کرنا شوہر کا ترکہ تقسیم کرنے سے پہلے ہی واجب رہتی ہے۔

اور دین کی ادائیگی میں وہی چیز ادا کرنا واجب رہتی ہے جو دین کے بالکل مثل ہو کما یظہر من تعریف الدین وھو عقد مخصوص یرد علی دفع مال مثلی لاخر لیرد مثلہ (متن الدر مع الشامی من باب القرض ص ج ۴)

البتہ اگر منکوحہ مثل کے بجائے مثل کا بدل لینے پر راضی ہو جائے یا بہ رضا متعارف ہو تو اس مثل کا بدل بھی دینا صحیح وکافی ہو جائے گا۔

اور اسی وجہ سے چونکہ درہم ودینار وغیرہ کے بجائے اور مہر فاطمی میں مقررہ چاندی کے بجائے اس کے بدل (قیمت ونوٹ) لے کر راضی رہنے کا عرف، متعارف ہے اس لئے اس کا بدل دے دینا بھی کافی اور صحیح شمار کیا جاتا ہے۔

فرق ۴ ـــــ اگر عقد نکاح مہر مؤجل (ادھار) پر اس طرح ہو کہ مثلاً پانچ سو روپیہ یا پانچ ہزار روپیہ سکۂ رائج الوقت مہر کے عوض میں تمہارے نکاح میں دیا تو چونکہ سکۂ رائج الوقت سے عرف میں مراد وقت ادا کا سکہ ہوتا ہے۔ اس لئے جو سکہ بوقت ادا رائج ہوگا صرف وہی ادا کرنا لازم رہے گا۔

فرق ۵ ـــــ اگر بوقت نکاح مہر معجل (نقدی) طے ہوئی تھی تو یہ قرض معجل کی صورت ہوئی اور قرض معجل کے معنی بھی وہی ہیں جو قرض مؤجل کے تھے یعنی عقد مخصوص یرد علی دفع مال مثلی لآخر لیرد مثلہ (متن الدر مع الرد ص ج ۴) اس لئے جو مہر معجل طے ہوئی تھی بالکل اسی

کے مثل اور فوراً ادا کرنا واجب رہے گا ــــــ حتی کہ منکوحہ کو حق رہے گا کہ بغیر مہر معجل وصول کئے اپنے اوپر شوہر کو قابو نہ دے مگر شریعت مقدسہ نے تسہیلاً علی الناس یہ موقع دے دیا ہے کہ اگر منکوحہ خود کچھ مدت تک عدم ادائیگی کی مہلت دے دے یا عند الطلب پر مؤخر کر دے تو اس دی ہوئی مہلت کے اختتام کے وقت اور عند الطلب میں طلب کے وقت اس مہر معجل کا ادا کرنا واجب اسی تفصیل کے ساتھ جو مہر موجل کے بیان میں نقدین و غیر نقد کے سلسلہ میں حط و معافی وغیرہ کے ساتھ اوپر گذر چکی ہے) واجب رہے گا؛ اور بغیر عذر شرعی کے اس ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا یا تاخیر کرنا باعث گناہ بھی ہوگا۔

فرق ۵ ــــــ اگر دیون متقادمہ مہر کے علاوہ کوئی اور دین ہو تو اس میں یہ تفصیل ہوگی۔

الف ــــــ وہ دین اگر بصورت قرض ہو اور سکۂ اصلیہ (سونا چاندی) کے سکۂ کا لینا متعین و ثابت ہو جب تو بحکم تعریف قرض بعینہٖ وہی سکۂ یا اس کے عدم وجود کے وقت اس کا بدل (چاندی سونا) یا اس کی بوقت ادا رائج قیمت دینی ہوگی الا یہ کہ صاحب دین خود کل یا جز معاف کر دے تو معاف شدہ مقدار کو وضع کرنے کے بعد باقیماندہ مقدار کا ادا کرنا لازم و واجب رہے گا کما مر سابقا۔

ب ــــــ اگر وہ دین بصورت قرض ہو لیکن سکۂ اصلیہ (سونا چاندی) کے بجائے عروض (سامان) لیا گیا ہو؛ جیسے دس ہزار اینٹ یا لوہا ــــــ تانبہ ــــــ پتھر وغیرہ تو اس صورت میں لی ہوئی چیز کا بعینہٖ مثل لوٹانا ضروری رہے گا ــــــ یا آپسی مصالحت سے اس کی جو قیمت طے ہو جائے وہ قیمت لوٹانا لازم رہے گا۔

ج ــــــ اگر وہ دین بصورت قرض نقد نہ ہو بلکہ کسی خریدی ہوئی چیز (یعنی اموال تجارت کے قبیل کی چیز) کی کل قیمت ہو یا صرف باقیماندہ قیمت ہو تو اگر وہ چیز سونے یا چاندی یا سکۂ اصلیہ کے ذریعہ خریدی گئی تھی جب تو وہی کل یا باقیماندہ سونا چاندی، یا اس کا سکۂ یا اس کی موجودہ قیمت دینی ہوگی۔

اور اگر عروض (سامان) کے ذریعہ خریدی گئی تھی تو اس عروض کے کل یا باقیماندہ حصہ سے یا اس کی قیمت سے ادائیگی لازم رہے گی۔

اور اگر وہ چیز سکۂ عرفیہ (نوٹ) سے خریدی گئی تھی تو بوقت ادا جو عرفی سکۂ رائج ہو

اس کی بوقت ادا رائج الوقت قیمت سے ادا کی جائے گی۔

د ـــــــ اگر وہ دین کسی خریدی ہوئی چیز کی کل یا باقیماندہ قیمت نہ ہو بلکہ غیر اموال تجارت کے قبیل کی چیز ہو جس کی قیمت ہلاک یا تلف کرنے کی وجہ سے واجب الادا ہو۔ خواہ وہ چیز از قبیل حیوان ہو، یا از قبیل غیر حیوان ہو ـــــــ جیسے اپنے ذاتی کام کے لئے متعین گھوڑا ہل بیل ـــــــ انجن و موٹر وغیرہ ـــــــ تو اس کا حکم یہ ہوگا کہ بوقت ادا اس کی جو قیمت عرفی سکے سے ہوگی وہ ادا کرنی واجب ہوگی۔

نوٹ :۔ امید ہے کہ اتنے بیان سے سوالنامہ ۸ کے ضمنی نمبرات ۱ و ۲ کا حکم شرعی بوضاحت حاصل ہو جائے گا۔

اور اب سوال ۸ کے ضمنی ۳ کا حکم شرعی عرض ہے

ضمنی ۳ ـــــــ یعنی کرنسی نوٹوں سے نصاب زکوٰۃ کی تعین

ظاہر ہے کہ جو نوٹ سکے کا متبادل قرار دیا جائے گا وہ سونے کے سکے کا متبادل قرار پائے گا ـــــــ اور جو نوٹ چاندی کے سکہ کا متبادل قرار دیا جائے گا وہ چاندی کے سکہ کا متبادل (بدل) قرار پائے گا۔

اور بدل کا حکم عقلاً بھی شرعاً بھی اور حسب ضابطہ لسانی بھی مبدل منہ کا حکم ہوتا ہے

پس جس طرح اگر کسی شخص کے پاس محض سونا یا سونے کا سکہ ہو اور کچھ بھی چاندی یا چاندی کا سکہ نہ ہو تو جب تک وہ سونا یا اس کا سکہ مفتی بہ قول میں ساڑھے سات تولہ سونے کے وزن کا نہ ہو جائے اس وقت تک وہ شخص نصاب زکوٰۃ کا مالک اور صاحب نصاب قرار نہیں دیا جاتا ـــــــ اور اس پر کوئی زکوٰۃ شرعاً واجب الادا نہیں ہوتی۔

اسی طرح جب کسی کے پاس محض چاندی یا چاندی کا سکہ ہو اور کچھ بھی سونا یا سونے کا سکہ نہ ہو تو جب تک وہ چاندی یا اس کا سکہ مفتی بہ قول میں ساڑھے باون تولہ چاندی کے وزن کا نہ ہو جائے اس وقت تک وہ شخص نصاب زکوٰۃ کا مالک اور صاحب نصاب قرار نہیں دیا جاتا۔ اور اس پر کوئی زکوٰۃ شرعاً واجب الادا نہیں ہوتی۔

اور جب کچھ سونا یا سونے کے سکہ کے ساتھ کچھ چاندی یا چاندی کا سکہ بھی کسی کے پاس جمع ہو جائے۔ تو اس وقت سونے اور چاندی دونوں (خواہ بشکل سکہ ہوں یا خواہ بشکل غیر سکہ ہوں) کی قیمت مفتی بہ قول میں ضم کر کے یعنی ملا کر کے دیکھتے ہیں ـــــــ اور جب اس کے پاس سونے و چاندی ہی سے

کسی ایک کا اس کی قیمت کے اعتبار سے بھی نصاب بن جاتا ہے تو وہ شخص نصاب زکوٰۃ کا مالک اور صاحب نصاب قرار دیا جاتا ہے ——— اور ختم کرنے کے بعد قیمت کا چالیسواں حصہ بعد حولان حول زکوٰۃ میں ادا کرنا مفتی بہ قول میں شرعًا واجب الادا ہو جاتا ہے۔

بالکل یہی حال وحکم ان متبادل نوٹوں کا ہوگا یعنی جو نوٹ سونے کے سکہ کا بدل ہوگا۔ جب تک صرف یہی نوٹ کسی شخص کے پاس ہوگا اور چاندی، اور چاندی کا بدل و متبادل نوٹ بالکل نہ ہوگا۔ اس وقت تک یہ شخص نصاب کا مالک اور صاحب نصاب شمار نہ ہوگا اور اس پر کوئی مقدار زکوٰۃ کی واجب الادا نہ ہوگی ——— ہاں جب کسی شخص کے پاس سونے کا بدل اتنا نوٹ جمع ہو جائے جو ساڑھے سات تولہ سونے کی قیمت کو پہونچتا ہو تو وہ شخص صاحب نصاب اور مالک نصاب قرار پائے گا۔

اسی طرح جو نوٹ چاندی کے سکہ کا بدل و متبادل ہوگا جب تک صرف یہی نوٹ (چاندی کا بدل) کسی کے پاس رہے گا، اور سونے یا سونے کا سکہ نہ ہوگا تو وہ شخص اس وقت تک صاحب نصاب قرار نہ پائے گا جب تک ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا کی قیمت کا یہ نوٹ اس کے پاس نہ ہو جائے۔

اور دونوں قسم کے متبادل نوٹوں کے جمع ہونے کے وقت دونوں کی قیمت کا اعتبار کریں گے اور اس ضم کردہ قیمت سے چاندی یا سونے جس کا بھی نصاب بن جائے گا اس کی قیمت کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرنا واجب ہو جائے گا۔

سوالنامہ ۲ کے ضمنی ۵ کا حکم شرعی

کاغذی نوٹوں کی اگرچہ اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں مگر جب ان نوٹوں کو اصل سونے یا چاندی کا متبادل و بدل قرار دے دیا گیا تو یہ نوٹ اپنے مبدل منہ کا حکم فی الجملہ اختیار کر لیں گے اور ان پر وہی احکام جاری ہوں گے جو ابھی ضمنی ۲ کے تحت مذکور ہو چکے ہیں۔ اور یہ کہنا کہ اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے صحیح نہیں ہے یہ ایک قسم کا مغالطہ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چیزوں کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے چیزوں کے خریدنے میں گرانی کے اعتبار سے زیادہ نوٹ دینے پڑتے ہیں۔ اور اسی گرانی کے اعتبار سے دیون (مؤخر مطالبوں) مثلاً قرض مہر، پنشن وغیرہ وغیرہ میں بھی دیون کی مالیت وحیثیت شخصیہ کے اعتبار سے زائد نوٹ دینے پڑیں گے جیسا کہ ابھی ضمنی ۱ اور ۲ کے مبحث میں تفصیل سے گذر چکا ہے۔

اس تقریر سے ضمنی ۵ کا جواب بھی بخوبی حاصل ہو گیا کہ ضمنی ۵ کے تحت ذکر کردہ تدبیروں کے اختیار کرنے کی حاجت نہ رہے گی ——— فقط واللہ تعالیٰ اعلم

نوٹ کی شرعی حیثیت

از ——— مولانا زبیر احمد قاسمی

یہ بات تقریباً مسلمہ ہے کہ کرنسی نوٹ جب حکومت نے جاری کیا تھا اس کا ایک مضبوط رشتہ سونے چاندی سے جڑا ہوا تھا اور اس کی غالب حیثیت سند مال کی تھی لیکن مختلف معاشی اور اقتصادی انقلابات کے نتیجے میں یہ رشتہ کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا اور آج ان کاغذی نوٹوں کا چلن ورواج اس رشتہ کے تناسب کی تحقیق کے بغیر ایک ثمن ونقد کی حیثیت سے اس طرح عام ہو چلا ہے کہ اس پر نقد کی فقہی تعریف صادق آنے لگی ہے۔

"کل ما نال ثقة الناس فی التعامل به واصبح ثمناً ومعیاراً للاموال ——— فهو نقد۔

لوگ عام طور پر جس چیز کے ذریعہ تبادلہ اشیا کرنے لگیں، عقد مبادلہ میں وہ ثمن ہو جائے اور مالوں کی قدر و مالیت کے لئے ایک معیار بن جائے وہ نقد کہلاتا ہے اس طرح یقیناً آج یہ نوٹ عرفاً اور اصطلاحاً نقد و ثمن بن چکا ہے۔

لیکن عرف و تعامل کے نتیجے میں اگر ان نوٹوں کے اندر نقد و ثمن کی شان پیدا ہو گئی ہے تو کیا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان سے سند مال ہونے کی حیثیت ختم ہو گئی؟ ظاہر ہے کہ جواب نفی ہی میں ہو سکتا ہے، کیونکہ درحقیقت کاغذ کے ان پرزوں کی ذاتی حیثیت میں کوئی قدر کوئی قیمت و مالیت نہیں ان میں تقوم و مالیت جس درجہ کی بھی عرف و تعامل میں تسلیم کی جاتی ہے وہ حکومت کی ضمانت اور دستوری اعلان کے

نتیجے میں ہی مجھی جاتی ہے اس میں تقوم منجانب حکومت آئی ہے اگر آج حکومت اس کی ثمنیت کو باطل کردے تو اس کا تقوم ختم ہو جائے ـــــــ گویا فی نفسہ ان بے قیمت کاغذی نوٹوں کا مالک جو اپنے کو ایک خاص قدر کے مال متقوم کا مالک تصور کرتا ہے وہ صرف اسی بنیاد پر کہ اس کے قبضہ اور اس کی ملکیت میں وہ وثیقہ اور سند بشکل نوٹ موجود ہے جس کے حامل و مالک کو حکومت ایک خاص قدر مال متقوم کا مالک تسلیم کرتی ہے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ نوٹوں کا رشتہ آج بھی کسی نہ کسی درجہ میں خلقی ثمن سونے چاندی یا کسی نہ کسی بنیادی سامان مثلاً غلے یا حیوانات کے ساتھ یقیناً جڑا ہوا ہے، پہلے اگر ایک کا کاغذی نوٹ ایک تولہ چاندی سے اپنا رشتہ اور نسبت رکھنے کے سبب ایک تولہ چاندی کی سند اور وثیقہ تھا تو آج کا وہی نوٹ ایک تولہ چاندی کے مثلاً پچاسویں جزء سے اپنا رشتہ و نسبت رکھنے کے سبب تولہ بھر چاندی کے ۱/۵۰ جزء کا وثیقہ و سند ہے علی ہذالقیاس دگر بنیادی سامانوں کے ساتھ اس کے رشتہ و نسبت کا حال سمجھا جا سکتا ہے۔

فیما بین الناس تعامل و اصطلاح کے سبب عرفاً اگر اس میں نقدیت اور ثمنیت کی شان بھی پیدا ہوتی ہے تو صرف اس لئے کہ حکومت اس کے خاص قدر مالیت کی ضامن ہے اور بحیثیت نقد و ثمن لوگوں کو اپنے معاملات میں اسے استعمال کرنے پر قانوناً مجبور کرتی ہے ان حقائق کی روشنی میں سوال نمبر ایک کا جواب ہمارے خیال میں یہ ہوگا۔

جواب ۱ ـــــ کرنسی نوٹ عرفاً و اصطلاحاً نقد و ثمن ہیں مگر فی نفسہ ایک بے قیمت کاغذ کا پرزہ ہونے کے باوجود حکومت کی ضمانت اور قانونی اعلان کے سبب ایک خاص قدر مال کا وثیقہ و سند بھی ہے۔

جواب ۲ ـــــ سونے چاندی کے سکے گو ثمن خلقی اور زر حقیقی ہیں اور یہ نوٹ محض ثمن اصطلاحی، تاہم ثمن ہونے کی حیثیت سے بہت سے احکام میں دونوں یکساں ہوں گے،

مثلاً ثمن خلقی عقود میں متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے اور اس کی ہلاکت سے عقد فاسد نہیں ہوتا یہی حکم اس ثمن اصطلاحی کا بھی ہوگا ـــــــ اسی طرح جیسے سونے چاندی کے مالک نصاب پر زکوٰۃ واجب اور اس سے اس کی ادائے گی صحیح ہو جاتی ہے ویسے ہی اس ثمن اصطلاحی کے مالک بقدر نصاب پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی اور اسی ثمن اصطلاحی کی شکل میں اس کی ادائے گی بھی صحیح قرار پائے گی ـــــــ

عقد صرف کی شکل میں جس طرح سونے چاندی پر تقابض کے بعد عقد صحیح ہوجاتا ہے اسی طرح اس ثمن خلقی کی طرح اتحاد جنس کے وقت ان نوٹوں کے باہمی تبادلہ کے وقت بھی عوضین کا مماثل اور مساوی القدر ہونا ضروری ہوگا ورنہ ربوٰا متحقق ہوجائے گا وغیرہ وغیرہ، یہاں یہ بات تقریباً علماء معاصرین کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ ایک ملک کے نوٹ متحد الجنس ہیں اور دو ملکوں کے نوٹ مختلف الجنس، اس لئے سعودی ریال امریکی ڈالر اور ہندوستانی روپے کا تبادلہ عددی طور پر کمی و بیشی کے ساتھ جائز مانا جاتا ہے۔

بہرحال اس طرح احکام میں دونوں ثمن خلقی یکساں ہوں گے مگر چونکہ ان نوٹوں میں سند اور وثیقہ کی بھی حیثیت پائی جاتی ہے اس لئے بعض احکام میں دونوں مختلف بھی ہوسکتے ہیں ـــــــ مثلاً دین و قرض اور وہ سارے مؤخر مطالبات جس کے وقت وجوب اور وقت ادا میں اتنا لمبا فصل ہو جائے کہ اس مدت کے اندر عموماً اس اصطلاحی ثمن کی مالیت اور قوت خرید میں تفاوت فاحش ہوجائے اور صاحب حق کا غبن فاحش سے دوچار ہونا مشاہدہ بن جائے تو ایسی صورت میں اس کے سند و وثیقہ ہونے کی حیثیت کا لحاظ رکھنا ہوگا اور اسی اعتبار سے ادائے گی دیون کا حکم لگایا جائے گا تاکہ اسلام کے قانون عدل کا تقاضہ پورا ہوسکے، عددی طور پر اگر زیادتی بھی ہوجائے تو اس پر ربوٰ کا شبہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ صرف صوری زیادتی ایک بے اثر چیز ہوا کرتی ہے۔ ہاں صورتاً اور معنیً ہر دو اعتبار سے اگر زیادتی ہوتی تو ربوٰا ہوتا جو یہاں مفقود ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عصر حاضر کے تمام ہی علماء اور صاحب فتویٰ ان نوٹوں کی اسی سند و وثیقہ کی حیثیت پر نظر رکھتے ہوئے اس کی مالیت اور قوت خرید کا اعتبار کرکے مختلف زمانے میں نصاب زکوٰۃ کی تعیین نوٹوں کی مختلف مقدار سے کرتے آئے ہیں اور کر رہے ہیں ـــــــ کبھی صرف چھپن ساٹھ نوٹوں کے مالک کو بھی مالک نصاب مانا گیا تو کبھی دوسو اور تین سو نوٹوں کے مالک پر بھی زکوٰۃ واجب سمجھا گیا۔ آج سے دس سال پہلے ڈیڑھ ہزار نوٹوں کے مالک پر وجوب زکوٰۃ کا حکم لگایا گیا تھا۔ لیکن آج جبکہ مثلاً چاندی کا نرخ چھپن روپے فی تولہ سے اوپر ہے کیا دو ہزار نوٹوں کے مالک کو مالک نصاب قرار دیا جا سکتا ہے ـــــــ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو آخر کیوں؟

اور دیکھئے ـــــــ تین ہندوستانی نوٹوں کا تبادلہ مثلاً ایک سعودی ریال سے بلا نکیر شائع

ہے علی ہذا القیاس مختلف ممالک کے کاغذی نوٹوں ریال، ڈالر اور پونڈوں کا ایک دوسرے تبادلہ عددی طور پر کمی بیشی کے ساتھ عام طور پر رائج ہے اور شاید کسی مفتی کی نظر میں یہ تبادلہ غلط اور خلاف شروع بھی نہیں آخر کیوں ؟

ظاہر ہے کہ ان مختلف ممالک کے مختلف ریال ڈالر پونڈ اور روپے کی اسی مالیت اور قوت خرید کے باہمی تفاوت کے سبب مقدار اور گنتی کی یہ کمی بیشی کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں حقیقتاً مماثلت و مساوات پیدا ہو جاتی ہے اور ہم اسے جائز کہتے ہیں ربوٰا کا شبہ بھی نہیں ہوتا۔

جب ہم ان مختلف ممالک کے نوٹوں میں اس ملک کی طرف سے اس کی مستند مالیت اور قوت خرید کا لحاظ رکھتے ہیں اور جب اللہ غنی کے حق مالی یعنی زکوٰۃ کے وجوب و عدم وجوب میں نوٹوں کی اسی سندی اور قانونی مالیت پر نظر کرتے ہیں تو یہ کیسی عجیب بات ہوگی کہ محتاج انسانوں کے مؤخر حقوق کی ادائے گی میں اس سے صرف نظر کر لیا جائے۔ جب یہ ایک حقیقت اور مشاہدہ ہے کہ ان نوٹوں کی مالیت اور قوت خرید میں ایک خاص مدت گذرنے پر نمایاں کمی آجاتی ہے تو مؤخر مطالبوں کی ادائے گی ان کم قدر و قیمت کے نوٹوں کے ذریعہ کیسے اسلامی عدل و انصاف کے تقاضہ کو پورا کر سکتی ہے۔

قرآن کہتا ہے "اعدلوا ہو اقرب للتقویٰ" عدل مساوات ہی تقویٰ کے قریب ہے۔ کیا دس سال پہلے کے نوٹوں کا معادل و مساوی آج کا نوٹ ہے ؟ قرآن کی ہدایت ہے " لا تظلمون ولا تظلمون" ظلم و زیادتی مت کرو تم پر بھی کوئی ظلم و زیادتی نہیں کرے گا "اقیموا الوزن ولا تخسروا المیزان" ٹھیک ٹھیک تولو، تول میں کمی مت کرو" لا تبخسوا الناس اشیاءہم" لوگوں کی چیزوں میں کمی مت کرو ــــــــــ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں "لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام" اسلام کسی کو نقصان پہونچانے کی اجازت نہیں دیتا اور فرمایا گیا "خیر الناس احسنہم قضاءً" "لوگوں میں سب سے بہتر وہی ہے جو دیون کی ادائے گی اچھے انداز سے کرے۔

ان نصوص کی روشنی میں غور کیا جائے کہ دس سال پہلے کے دو سو نوٹ جس کے بدلے ایک گھوڑا حاصل کیا جا سکتا تھا وہ آج کے دو سو نوٹ جس کے بدلے ایک بکرا بھی مشکل سے مل سکتا ہے کا مماثل و مساوی ہو سکتا ہے ؟ اگر نہیں تو پھر مؤخر مطالبوں کی ادائے گی

ان کم قدر اور کم قیمت نوٹوں کے ذریعہ کیا ادائے گی کا بہتر طریقہ ہو سکتا ہے ؟ کیا صاحب حق پر ظلم نہیں ہوگا ؟ کیا یہ طریقہ ادا اتلاف حق اور صاحب حق کے کھلے ہوئے ضرر و نقصان تک مفضی نہیں ہوگا ؟ اگر ہوگا اور یقیناً ہوگا تو اسے اسلام کا عادلانہ اور منصفانہ طریقہ کیسے کہا جا سکتا ہے ۔

اس لئے ہمارا خیال یہ ہے کہ سارے معاملات میں تو اس نوٹ کو عین ثمن خلقی کے درجہ میں رکھا جائے اور اس کی حیثیت محض ثمنیت ملحوظ نظر رہے کیونکہ نقد اور معجل معاملات میں ان کی مالیت اور قوت خرید میں کوئی قابل لحاظ تفاوت بھی نہیں ہوتا ۔ باقی رہا تفاوت یسیرہ تو وہ شرعاً بھی غیر معتبر ہے ، لیکن جہاں معاملہ ادھار اور مؤجل ہو وہاں سند و وثیقہ کی حیثیت ہی کا لحاظ ہونا چاہیئے کیونکہ ایک خاص مدت کے بعد ان کی قدر و مالیت میں یقیناً قابل لحاظ تفاوت ہو جاتا ہے جو ضرر اور اتلاف حق کو مستلزم ہو جاتا ہے با ایں ہمہ اس کا لحاظ نہ رکھنا یقیناً اسلام کے قانون عدل سے میل نہیں کھاتا ۔

ایک دوسرے انداز سے بھی اس مسئلہ پر غور کیا جائے ۔ ہمارے فقہاء نے اشیاء کی تقسیم ذوات الامثال اور ذوات القیم سے کی ہے اور دونوں کے جدا جدا احکام مفصل لکھا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ تقسیم اور پھر مثلی و قیمی کی تعریف محض تقریبی ہے کوئی بھی چیز منصوص نہیں ہمارے فقہاء نے اجتہادی طور پر صرف اسلام کے قانون عدل و مساوات کے تقاضوں کی تکمیل ہی کے لئے یہ ساری تفریعات و تخریجات پیش کی ہیں ۔ چنانچہ کتب فقہ میں ایسی نظیریں مل جاتی ہیں کہ اصول عام کے تحت جب مثلی کا ضمان اتلاف بشکل مثلی دلانے سے عدل کا تقاضہ پورا نہیں ہوتا تو بصورت قیمت اس کا ضمان دلواتے ہیں ۔ بلکہ حدیث مصراۃ کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مثل اور قیمت کے سوا کسی اور چیز کے دینے دلانے سے بھی تقاضۂ عدل اگر پورا ہو سکے تو یوں بھی کرنا چاہیئے ۔۔۔ آخر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مصراۃ کے خریدار کو کھجور دینے کا حکم فرمایا جو تلف شدہ اور کھائے ہوئے دودھ کا نہ مثل ہے نہ قیمت اس کا کیا منشا ہو سکتا ہے ، یہ جناب رسول اللہ کی عدالت ہی کا تقاضہ تھا کہ بائع کو معمولی خسارہ سے بھی بچا لیا جائے اور اس طرح ہمارے سامنے یہ ہدایت آئی کہ معاملات میں صرف اس کی ظاہری صورت پر نہیں بلکہ حقیقت و مقصد پر نظر رکھتے ہوئے عدل و انصاف کے تقاضہ کو پورا کرنا اسلام

میں مطلوب ہے۔

بہرحال غور کیا جائے کہ یہ کاغذی نوٹ فقہاء کی اس تقسیم کے مطابق مثلی ہے یا قیمی؟ گو بعض معاصر علماء نے مثلی اور قیمی کی بعض تعریف کے مطابق اسے قیمی قرار دیے جانے کا امکان بھی ظاہر کیا ہے اور اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو مسئلہ حل اور طے شدہ ہو جاتا ہے کہ ان نوٹوں کے ذریعہ مطالبات مؤخرہ کی ادائے گی میں قیمت کا اعتبار یقیناً ہونا چاہیئے۔ لیکن اسے قیمی قرار دینے میں بعض دشواریاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں مثلاً فقہ حنفی کے اعتبار سے قرض و استقراض کا معاملہ مثلی ہی میں صحیح ہوتا ہے قیمی میں نہیں۔ تو گو دوسری فقہ کے اعتبار سے ان نوٹوں کے قیمی ہونے کے باوجود ان کا قرض لینا دینا صحیح ہو جاتے مگر فقہ حنفی کے مطابق دشواری ہوگی۔ اس لئے مثلی کی جو تعریف فقہ حنفی میں مذکور ہے اس کے مطابق ان نوٹوں کے عددی متقارب ہونے کی بنیاد پر مثلی ہی کہنا مناسب ہے۔

اور اپنی جگہ یہ بھی طے شدہ اور مسلمہ ضابطہ ہے کہ کسی مثلی کے واجب فی الذمہ ہو جانے کے بعد اس کے مثل کی ادائے گی سے ذمہ فارغ ہو جائے گا۔

تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی کے ذمہ دس سال پہلے کسی کے سو نوٹ بطور دین و قرض واجب الاداء ہو جائیں تو کیا وہ شخص آج محض صوری اور عددی طور پر اس دین و قرض کے برابر نوٹ ادا کرنے سے فارغ الذمہ قرار دیا جائے گا؟ اور کیا ان دونوں نوٹوں میں مالیت اور قیمت خرید کے اعتبار سے تفاوت فاحش کے باوجود محض عددی اور صوری مساوات کی بنیاد پر ایک کو دوسرے کا مثل تسلیم کیا جائے گا؟ فقہی تصریحات سے اس کا جواب نفی میں نکلتا ہے۔

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں۔ المماثلة بين الشيئين تكون صورة و معنى (الهداية ثالث باب بيع)

علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں۔ المماثلة الحقيقة المطلوبة لا تتحقق الا باعتبار الصورة والمعنى۔

علامہ کاسانیؒ بدائع الصنائع فرماتے ہیں۔ والمثل المطلق هو المثل صورة ومعنى فاما القيمة فمثل من حيث المعنى دون الصورة ب ج ۱۵۰

ان عبارتوں سے واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ قیمت کو بھی دو چیزوں کے درمیان مماثلت مطلوبہ کے تحقق میں دخل ہے اور اگر دو چیزیں محض صورتاً مماثل ہوں اور قیمتاً متفاوت

تو مماثلت مطلوبہ فوت ہو جائے گی۔

بلکہ علامہ ابن قیمؒ تو اعلام الموقعین ص۴۵ ج۲ میں جنساً صفۃً مالیۃً مقصوداً اور انتفاعاً ہر طرح مساوات کو مماثلت کے لئے ضروری کہتے ہیں۔

المغنی ص۲۵۲ ج۴ میں وسیط سے امام غزالی کا قول نقل کیا ہے کہ والصحیح انہ (المثل) الذی تتماثل اجزاءہ فی القیمۃ والمنفعۃ" ظاہر ہے کہ ان تصریحات کی موجودگی میں دونوں نوٹوں کی قدر و قیمت اور مالیت کے مابین تفاوت فاحش کے باوجود ایک دوسرے کا مثل کہنا بہت مشکل ہے۔ ــــــ جن کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ نوٹوں کے ذریعہ مطالبات مؤخرہ کی ادائے گی میں قیمت و مالیت کا اعتبار ضرور ہونا چاہئے تاکہ ادا مثل بن کر ذمہ فارغ ہو جائے ورنہ اتلاف حق کی بناپر عند اللہ مواخذہ کا خطرہ ہو سکتا ہے۔

فقہاء لکھتے ہیں "یجیزون ردالعین المستقرضۃ مادامت لم تتعیب بعیب ینقض مالیتہ اما اذا تعیب لایصح ردھا" جب عین مستقرضہ کی واپسی عیب دار ہونے سے پہلے جائز ہے بعد میں نہیں تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ عیب ایک مثلی کو مثلی نہیں رہنے دیتا اور عیب دار چیز سالم من العیب کا مثل نہیں ہو سکتی اور اس کے ساتھ فقہاء کا یہ کلیہ پیش نظر رکھا جائے۔

"کل ما اوجب نقصان الثمن فی عادۃ التجار فھو عیب لان التضرر بنقصان المالیۃ وذٰلک بانتقاص القیمۃ والمرجع فی معرفتہ عرف اھلہ" ــــــ (ھدایہ ثالث ص۲۳)

جب ہر وہ چیز جو تاجروں کے عرف میں اشیاء کی قیمت کے نقصان کا سبب بن جائے وہ عیب ہے جس بنیاد پر مشتری کو مبیع واپس کر دینے کا حق مل جاتا ہے اس لئے کہ مالیت کی کمی سے اس کا ضرر و نقصان ہوتا ہے اور دفع ضرر ہر شخص کا شرعی حق ہے اور مالیت کی کمی قیمت کے کم ہونے سے ہوا کرتی ہے۔ تو کیا نوٹوں کی قیمت میں کمی ہونا صاحب حق کے لئے باعث ضرر نہیں ہوگا اور اس کے دفع کا حق اس کو نہیں ملے گا۔

نظر وسیع کریں تو دیکھیں گے کہ فقہاء نے ان چیزوں کو بھی نقصان ثمن کا سبب اور عیب کہا ہے جس کی بناپر مبیع کی طرف رغبت میں خلل آجائے، چنانچہ مسلمان سمجھ کر کسی غلام کو خرید ا جائے اور اس کا کافر ہونا ثابت ہو جائے تو صاحب ہدایہ لکھتے ہیں۔

"والکفر فیہما عیبٌ لانہ یمتنع صرفہ فی بعض الکفارات فتختل الرغبۃ" اور مِن البطور میں وہاں لکھا ہے" وھو سبب نقصان الثمن" بلکہ جو چیز مخل بالمقصود والانتفاع ہو جائے اسے بھی عیب اور نقصان کا سبب کہا گیا ہے جیسے لونڈیوں کے منہ اور بغل کی بدبو یا اس کا زانیہ اور ولد الزنا ہونا" اب ان تصریحات کی روشنی میں غور کیا جائے کہ کیا نوٹوں کی مالیت اور قدر و قیمت کی کمی باعث ضرر، مخل بالمقصود والانتفاع اور مخل بالرغبۃ نہیں ہوا کرتی ہے اگر ہوتی ہے اور یقیناً ہوتی ہے تو پھر حال کا یہ کاغذی نوٹ ان سارے عیبوں کے ساتھ انھی کے ان نوٹوں کا مثل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے جو اپنے وقت میں ان عیبوں سے محفوظ تھا۔

اور پھر سب سے بڑھ کر قوی اور نص صریح تو اس سلسلے میں حضرت امام ابو یوسف کا مفتیٰ بہ قول موجود ہے کہ اگر دراہم مغشوشہ اور فلوس نافقہ جو ثمن اصطلاحی کے درجہ کی چیز ہے اس کے ذریعہ بیع و شراء کا معاملہ کیا جائے یا قرض دیا جائے اور ابھی بیع میں ثمن کی یا معاملہ استقراض میں اس قرض کی ادائے گی نہ ہو سکی تھی ان دراہم مغشوشہ اور فلوس نافقہ کا چلن بند ہو گیا یا اس کی قدر و قیمت میں کمی آگئی تو اس مشتری اور مستقرض پر ثمن اور قرض میں لئے دراہم و فلوس کی قیمت لازم ہو گی ــــــ یعنی بیع و شراء کے دن یا قرض کے مسئلہ میں قبضہ کے دن ان دراہم و فلوس کی جو قیمت اور جتنی قدر و مالیت تھی اتنی ہی قیمتی اور مالیت کی چیز بطور ثمن مشتری پر اور بطور ادا قرض مستقرض پر ضروری ہو گا۔

"قال الثانی ثانیا علیہ قیمتہا من الدراھم یوم البیع والقبض وعلیہ الفتویٰ ای یوم البیع فی البیع ویوم القرض فی القرض...... فلا فرق بین الکساد والرخص والغلاء فی لزوم القیمۃ" ــــــ (شامی ج ۴ ص ۲۴)۔

بہرحال ان مذکورہ بالا فقہی تصریحات و نظائر کی روشنی میں ہمارا خیال یہی ہے کہ ان نوٹوں کو نقدا اور معجل معاملات میں تو ثمن تسلیم کیا جائے مگر ادھار اور موجل معاملات میں سند و وثیقہ سمجھا جائے تاکہ اسلام کے قانون عدل کا تقاضہ پورا کیا جا سکے اور صاحب معاملہ غبن فاحش کے ضرر و نقصان سے محفوظ رہ سکے۔

جواب ۳ ــــ آج جبکہ حکومت نے سونے چاندی کی کسی بھی خواص مقدار کو نظر انداز کر کے کرنسی نوٹ چھاپنا شروع کر دیا ہے اور نوٹوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کہ کون سونے کے سکے دینار کے متبادل، اور کون چاندی کے سکے درہم کے متبادل طور پر رائج

ہیں بلکہ محض اجمالی طور پر ہر نوٹوں کے مخصوص تقوم اور قدر و مالیت کی ضمانت کا اعلان کیا جاتا ہے اور بس، اور دوسری طرف شریعت اسلامیہ نے سونے چاندی ہر دونوں میں سے کسی کے بھی مقدار خاص کے مالک پر ادائے زکوٰۃ کو لازم قرار دیا ہے ایسا نہیں ہے کہ چاندی کے مالک نصاب پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی جب تک کہ اس کی چاندی سونے کے نصاب سے قیمتاً مساوی نہ ہو جائے

اس لئے نوٹوں کے نصاب زکوٰۃ کے تقرر میں کوئی پیچیدگی ہماری سمجھ میں نہیں آسکی سونے یا چاندی میں سے جس کے بھی نصاب معینہ کے بقدر مالیت کرنسی نوٹوں کا کوئی مالک ہو جائے گا ہم اسے مالک نصاب کہہ کر ادائے زکوٰۃ کا حکم دیں گے۔

مثلاً اگر آج چاندی ساٹھ روپے فی تولہ مل رہی ہے تو چاندی کے نصاب ساڑھے باون تولہ کی قیمت ساڑھے اکتیس سو پچاس روپے ہوتی ہے ہم ہر اس شخص پر جو آج ساڑھے اکتیس سو کرنسی نوٹوں کا مالک ہوگا زکوٰۃ واجب کہہ دیں گے اور یوں کہیں گے کہ یہ شخص گو سونے کے نصاب کا مالک نہیں مگر چاندی کے نصاب کا مالک ہے اور شریعت صرف چاندی کے مالک نصاب پر بھی زکوٰۃ واجب کرتی ہے۔ کما ہو الظاہر۔

جواب ۳ جیسا کہ جواب جواب ۱ کے ضمن میں عرض کیا گیا کہ کاغذی نوٹوں کے ذریعہ موخر مطالبوں کی ادائے گی کے وقت اس کی قدر و قیمت اور مالیت کا ضرور اعتبار ہونا چاہیئے اسلام کے قانون عدل کا تقاضہ یہی ہے، اب اگر علماء معاشیات کے دقیق اور فنی اصولوں کے مطابق اسے کسی اشاریہ سے وابستہ کرنا عامۃ الناس کے لئے مختلف دشواریوں اور باہمی تنازعہ تک منتضی ہو سکتا ہے تو چاندی جو ثمن خلقی ہے اور اس کی ثمنیت منصوص بھی ہے جیسے قرآن کہتا ہے" وشروہ بثمن بخس دراھم معدودۃ" اور جس کا نرخ عموماً ہر تاجروں کو معلوم ہوتا ہے اور نہ معلوم ہونے پر بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے، اسی سے وابستہ کیا جائے بلکہ اگر بعض باخبر حضرات کی یہ اطلاع امر واقعہ و حقیقت ہو کہ ہر ماہ حکومت کی طرف سے پرائز انڈکس بحساب اشاریہ نرخ جاری اور اخباروں میں شائع ہوتا رہتا ہے تو پھر کوئی دشواری نہیں صرف مسئلہ کی اہمیت کا احساس ہو جائے عام چلن ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ اس کی ضرورت اور نوبت کبھی کبھار ہی ہو سکتی ہے عموماً نوٹوں کے نرخ اور قیمت میں کمی بیشی ایک سال کی مدت کے بعد غبن فاحش کی حد کو چھوتی ہے درمیان سال اگر کمی ہوتی بھی ہے تو نہایت معمولی جو غبن یسیر ہونے کے سبب شرعاً بھی ناقابل لحاظ

ہے اس لئے ایک سال کی مدتک موخر مطالبوں میں بھی اس کی ضرورت نہیں پڑے گی ہاں اس سے زائد مدت کے موخر مطالبے خصوصًا ہندوستانی معاشرہ میں دین مہر وہی اس تقویم وتعدیل کے محتاج رہیں گے۔

جواب ۵: قرض دینے یا مہر کے تقرر کے وقت طرفین کے لئے واجب الاداد نوٹوں کی قدر و مالیت سونے چاندی یا کسی اساسی سامان مثلًا غلے کی شکل میں طے کر لینا نہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے خصوصًا جبکہ ان کی ادائیگی ایک طویل مدت کے بعد ہونے کا رواج اور ظن غالب ہو ورنہ اتلاف حق کا خطرہ رہے اور فی الحال ادا کردہ نوٹوں کی قدر و مالیت پر نظر کر کے اگر صاحب حق اپنے ضرر ونقصان کا احساس کرلے اور اسے قبول کرنے پر رضامند نہ ہو تو پھر ایک مستقل نزاع پیدا ہو سکتا ہے اور محض زبردستی عددی طور پر مساوی نوٹوں کے قبول کرنے پر اسے مجبور کر دیا جائے تو "لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفسہ" کی روشنی میں مستقرض پر مال غیر کے اکل بالباطل کا بھی شبہ ہو سکتا ہے اور لا تبخسوا الناس اشیاءھم" جیسی آیتوں کی خلاف ورزی بھی ہو سکتی ہے، اسلام کا قانون عدل اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ایک بیش قیمت چیز کے بدلے کم قیمت چیز لینے پر کسی کو مجبور کریں یا کسی کی حقیقت ناشناسی اور لاعلمی سے غلط فائدہ اٹھا کر اسے دھوکہ میں رکھیں اور نقصان پہونچائیں "لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام" ضرورت اور علماء عصر حاضر کی دیانت علمی کا تقاضہ ہے کہ اس سلسلے میں عوام کو حقیقت حال سے واقف کرایا جائے اور مروجہ نوٹوں کی قدر وقیمت کے اعتبار اور عدم اعتبار کے متعلق دو ٹوک فیصلہ کیا جائے۔

هذا ما عندي والله اعلم وعلمه اتم واحكم



نوٹ کی شرعی حیثیت

از ——— مفتی عزیز الرحمن بجنوری

حامداً و مصلیاً۔ اما بعد

بنیادی طور پر روز اول ہی سے سونے اور چاندی کو مال قرار دیا گیا ہے اگرچہ اس سے بہتر اور قیمتی معدنیات بھی ہیں اور کم تر بھی ہیں لیکن دوسری چیزوں پر مال کا اطلاق ثانیاً ہے قرآن شریف میں ارشاد ہے۔

(۱) الذین یکنزون الذہب والفضۃ۔ (توبہ)

عربی لغت میں الکنز مال مدفون کو کہا جاتا ہے۔ ماجدی ص ۴۲۹ ج ۲

(۲) المال الذہب والفضۃ وسلعۃ التجارۃ۔ درمختار ص ۱۱ ج ۲

اللہ تعالیٰ نے جو خصوصیت سونا اور چاندی کو عطا فرمائی ہے وہ دیگر اشیاء کو حاصل نہیں ہے دنیا بھر کے انسانوں نے ان کی کثرت اور قلت کو مالداری اور غربت کا معیار قرار دیا ہے اسی وجہ سے ابواب فقہ میں زکوٰۃ الاموال کے تحت اولاً سونے اور چاندی کا ذکر کیا ہے اور بعد میں دوسری چیزوں کا چنانچہ فرمایا ہے زکوٰۃ النقدین۔ ان کے جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے کی طرف انسان طبعاً مائل ہے۔

مال کی تعریف

(۱) المال ما یمیل الیہ الطبع ویجری فیہ المنع والبذل ——— درمختار ص ۳۱ ج ۴

(۲) المال ما یمیل الیہ الطبع ویمکن ادخارہ لوقت الحاجۃ والمالیۃ تثبت بتمول،

الناس عامة او بعضهم ____________ رد المحتار ص ج ۴
صاحب التتارخانیہ نے لکھا ہے۔

۳ لان الذهب والفضة اصول جملة هذه الاموال فی الغالب تحصل بها وکان الخلق هذه الاموال بالذهب والفضة اونی ____________ التتارخانیہ ص ۲۰ ج ۲

۴ الاموال ثلاثة الاول ثمن بکل حال وهو النقدان۔ در مختار ص ۲۶۵ ج ۴

ان تصریحات سے یہ ثابت ہے کہ سونا چاندی اصلاً مال ہیں ان سے لوگوں کی مالداری جانی جاتی ہے مالیت کے بعد ثانوی درجہ قیمت کا ہے۔ کیونکہ قیمت کے ذریعہ ہی دیگر چیزوں کی مالیت کا پتہ چلتا ہے
التقوم مثبت بها وبابلعة الانتفاع شرعاً ____________ رد المحتار ص ج ۴

سکہ کی حقیقت اور تعریف

خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کا اپنی ضرورت کو پورا کرنا اشیاء کے حصول اور انتفاع پر موقوف ہے اور اکثر حصول وانتفاع قیمت کے ذریعہ ہوتا ہے اور قیمت مال کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اور اپنی اصل کے اعتبار سے مال سونا اور چاندی ہیں جیسا کہ صاحب در مختار اور فتاویٰ التتارخانیہ نے فرمایا ہے لیکن اس کے باوجود انسانی ضروریات کے پورا ہونے کا کوئی ذریعہ ضرور تھا۔ شروع میں اشیاء کا اشیاء سے تبادلہ ہوتا رہا اور آج تک بھی وہ طریقہ رائج ہے لیکن اس میں بعض دشواریوں اور قباحت کی وجہ سے سکہ کا رواج ہوا تاکہ اس کے ذریعہ ضروریات بھی پوری ہوں اور اس کے حصول کے لئے انسان بھی راغب ہوں تاکہ اس کے ذریعہ ان کا تمول جانا جائے چنانچہ سب سے اول اہل بابل نے دو ہزار سال قبل مسیح سکہ رائج کیا اور پھر پوری دنیا میں یہ مختلف ناموں سے رواج پذیر ہوا۔ شروع میں اس کی شکلیں مختلف تھیں صاحب التتارخانیہ کی تحقیق کے مطابق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں درہم کھجور کی گٹھلی کی طرح کا ہوتا تھا حضرت عمرؓ کے زمانہ سے گول شکل میں تیار کیا جانے لگا ____________ التتارخانیہ ص ۲۳ ج ۲

بہرحال ڈھلے ہوئے سکوں کے ذریعہ سونے چاندی اور دیگر اشیاء کی چیزوں کا تعین ہوا۔ اور مالداری اور مالیت کا تعین سکوں کے ذریعہ دنیا میں رائج اور مقبول ہوگیا۔

(۱) افلدا ان التقویم انمایکون بالمسکوک عملاً بالعرف۔ در مختار ص ۳۱ ج ۴

(۲) وکان به المراد المضروب ________ رد المحتار ص ۳۱ ج ۴

(۳) النقر مطلق علی الفضة والذهب وعلی الفلوس ________ در مختار ص ۲۰ ج ۴

ان تصریحات سے چند باتیں ثابت ہوئیں۔
ا۔ سکہ کے ذریعہ قیمت کا تعین۔
ب۔ سکہ سے مراد ڈھلا ہوا سکہ ہے۔
ج۔ سکہ کے ذریعہ مالداری اور مالیت اور تمول کا اثبات

معلوم رہے زمانہ قدیم ہی سے سکہ تیار کرنا ہمیشہ گورنمنٹ کے اختیار میں رہا ہے عوام یا تاجروں کا اس میں عمل دخل نہیں رہا ہے۔

قال الامام احمد ولا یصلح ضرب الدراہم الا فی دار الضرب باذن السلطان

________ عربی مقالہ ص ۱۳ ________

نوٹ کی شرعی حیثیت

ایک عرصہ دراز تک دنیا کے ملکوں میں سونے۔ چاندی۔ لوہا۔ پیتل۔ تانبہ المونیم کے سکے مختلف ناموں سے رائج رہے۔ لیکن یہ تمام سکے۔ بنیادی سکوں جن کو شریعت نے مال اور نقدین کہا ہے کے بدل اور قائم مقام رہے۔ رسل و رسائل کے پھیلاؤ اور سامان تجارت کی خطہ ارض پر بڑی تیزی سے نقل و حرکت اس کی داعی ہوئی کہ درہم و دنانیر۔ روپے اشرفی۔ گنی۔ ڈالر۔ پونڈ۔ ریال کے بھاری اوزان کو تاجر کس طرح ساتھ لئے پھرتا ہے اس لئے نوٹ اور بینک کا وجود عمل میں آیا۔ کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پاکٹ میں رکھ کر سفر کر لیجئے کسی کو پتہ بھی نہ ہو گا۔ ضرورت جب اور زیادہ بڑھی تو۔ چیک۔ ڈرافٹ اور مختلف وکاس پتروں کا وجود عمل میں آیا۔

ابن بطوطہ کی تحریر کے مطابق دنیا کے ملکوں میں چین ہی ایک ایسا ملک تھا کہ جہاں خرید و فروخت نوٹ کے ذریعہ ہوتی تھی۔ سونے چاندی کے سکوں کو کوئی لینا پسند بھی نہیں کرتا تھا ________ عربی مقالہ ص ۱۲۱

ہمارے ملک میں اس وقت ایک روپیہ کے نوٹ کے علاوہ دیگر تمام نوٹوں پر یہ لکھا ہے کہ میں حامل ہذا کو اتنا روپیہ دینے کا وعدہ دیتا ہوں۔ اس وجہ سے ہمارے اکابر نے روز اول ہی

سے نوٹ کو اصلاً ثمن اور نقد قرار نہیں دیا۔ بلکہ وہ ایک قابل اعتماد وثیقہ اور سند رہے۔ اس اعتبار سے گورنمنٹ اور اس کے ذریعہ ہماری امین ہے اور اس کے وثیقہ اور سند سے ہمارا تمول قابل اعتبار ہے اور ہماری ضروریات ہر وقت پوری ہوتی رہتی ہیں اور ہم اس پر عملاً اور قلباً مطمئن ہیں۔

ہماری یہ مالداری جو گورنمنٹ نے ہم کو نوٹ دے کر مقرر کی ہے اس پر تمام احکامات زکوٰۃ اور انکم ٹیکس وغیرہ جاری اور نافذ ہوتے ہیں گورنمنٹ نے ہم کو سو روپیہ کا نوٹ (مثلاً) ایک سو روپئے دینے کا وعدہ کیا ہے اور بھروسہ دلایا ہے لیکن گورنمنٹ ہم کو وہ سو روپیہ دے گی جو سکوں اور ایک روپیہ کے نوٹ کی صورت میں ہمارے ملک میں رائج ہیں اور یہ سب سکے ہمارے تمول کو ظاہر کرتے ہیں جیساکہ اوپر تصریحات میں گذر چکا ہے۔

(۱) افادان التقویم انما یکون بالمسکوک عملاً بالعرف۔ درمختار ص ۳۱ ج ۴

(۲) ادنی القیمۃ التی تشرط بجواز البیع فلس ــــــــــــ درمختار ص ۲۳۸ ج ۴

ہمارے لئے یہی وہ مال ہے جس کی شرعی تعریف اوپر مذکور ہو چکی ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ ہندوستان میں نوٹ کی ابتدا۔ ملکہ وکٹوریہ کے چاندی کے روپئے اور گنی سے ہوئی تھی۔ اور اس کی انتہا لوہے المونیم اور کاغذ کے چند ٹکڑوں اور پرزوں پہ ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم چاندی اور سونے کے مالک نہیں ہیں اور ہمارا تمول چاندی سونے والا تمول نہیں ہے لیکن اس قدر کہ ہمارے پاس نوٹ کے مقابلہ میں مارکیٹ بھاؤ سے جتنا چاندی سونا آسکتا ہے اور یہی شریعت میں معیار نصاب زکوٰۃ اور معیار مالداری ہے۔

نوٹ کی فروخت اور قیمت

اس میں شک نہیں کہ نوٹ موجودہ زمانہ میں سکہ یا نقد کا بدل ہے۔ اور دنیا کے ملکوں کا نظام اسی نوٹ پر ہے۔ اور نوٹ نے تقریباً نقد کا مقام لے لیا ہے۔ اگرچہ سند اور وثیقہ کی حیثیت بجنسہٖ محفوظ ہے اس لئے اپنے ہی ملک میں کمی بیشی کے ساتھ اس کی فروخت جائز نہیں ہے۔

کل ما نال ثقۃ الناس فی التعامل بہ اصبح ثمنا وسیار الا موال فہو نقد یجری

فیصلہ الربا ۱ ء ــــــــــــ مقالہ عربی ۱۲۳

لیکن دوسرے ملکوں میں غیر ملک کے نوٹ کی خرید و فروخت کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے اس صورت میں وہ سکہ کاسدہ کے حکم میں آجاتا ہے۔

انما جعلت ثمنا بالاصطلاح فاذا ترک الناس المعاملة بها بطل الاصطلاح۔

—— ردالمحتار ج ۴ ص ۲۶ ——

اس کے بعد یہ چیز باقی رہتی ہے مثلاً کسی نے اتنے وقت پیشتر قرض لیا تھا یا مہر مقرر ہوا تھا کہ اس زمانہ میں سکہ یا اس کی قیمت اور تھی اور اب مطالبہ کے وقت یا ادائے گی کے وقت نمایاں فرق ہے مثلاً انگریز گورنمنٹ کے زمانہ میں چاندی کا روپیہ چلتا تھا اور اس وقت کا نوٹ اسی سکہ کا بدل یا وثیقہ یا سند زر تھا۔ اس لئے اب کتنی رقم ادا ہونی چاہیے ائمہ فقہ کا اس میں اختلاف ہے۔

(۱) وعند محمد یوم الکساد وھو آخر ما تعامل الناس بھا وفی الذخیرة والفتوی علی قول ابی یوسف۔

(۲) ویطالب بالنقد بذلک المعیار الذی کان وقت البیع کذا فی فتح القدیر

—— ردالمحتار ج ۴ ص ۲۶

(۳) واوجب محمد قیمتہ یوم الکساد وعلیہ الفتوی —— درمختار ج ۴ ص ۲۶۹

بہر حال یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے اس لئے فیصلہ میں جو قیمت بھی متعین ہو جائے جائز ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فنصلہ صالح النشوز

نوٹ کی شرعی حیثیت

از ——— مولانا انیس الرحمٰن قاسمی معاون مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

نوٹ کا رواج

نوٹوں کے رواج کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت نوٹوں کا چلن ہوا تھا اس وقت سے لے کر بعد کی دو صدیوں تک ان کی حیثیت وثیقہ اور سند کی تھی اور نوٹوں کے جاری کرنے والے ان پر ثبت شدہ تحریری ضمانت کے پابند ہوتے تھے۔ اور بوقت مطالبہ اصل سکے (سونے یا چاندی کے) ادا بھی کرتے تھے۔ ان کے ذریعہ کاروبار کرنے والے بھی انہیں وثیقہ ہی سمجھتے تھے اور عرفی و قانونی طور پر بھی یہی سمجھا جاتا تھا (۱) لیکن بیسویں صدی کے نصف اول میں جب نوٹوں کے چھاپنے اور جاری کرنے کے کام کو حکومتوں نے مکمل طور پر تحویل میں لے لیا۔ اور پھر مختلف معاشی اسباب اور وجوہ کی بنا پر سونے اور چاندی کے محفوظ ذخیرہ کی مالیت سے بہت زیادہ تعداد میں نوٹوں کو چھاپنا شروع کیا تو ان کے لئے یہ دشوار ہوگیا کہ مطالبہ پر اصل سکہ ادا کریں۔ دوسری طرف سونے اور چاندی کے سکے ناپید ہوتے گئے اور قانوناً سونے اور چاندی کے اصلی سکے کا رواج بھی بند ہوگیا بلکہ ۱۹۷۱ء میں بین الممالک سطح پر بھی تبادلہ کے لئے اصلی سکے یعنی سونا و چاندی کی ادائے گی موقوف ہوگئی (۲) اس لئے اب بالخصوص اس نویں دہائی میں پوری دنیا کے اندر یہی نوٹ اصلی سکے کی جگہ چلتے ہیں۔ تمام کاروبار تجارت، لین دین، قرض ادھار اور کرایہ و اجرت میں یہی نوٹ اصل سکہ کی طرح رائج ہیں تبادلہ اور قوت خرید کا میعار بھی یہی ہیں اس لئے نوٹوں کی حیثیت عرفاً و قانوناً اب اصل سکہ کی ہوگئی ہے۔ سند اور وثیقہ نہیں ہیں۔ جہاں تک بات ان پر ثبت شدہ ضمانتی تحریر کی ہے تو اس کی حیثیت اب نوٹوں کی مالیت اور ثمنیت کے محافظ کی ہے، اسی تحریر نے نوٹوں کی ثمنیت کو باقی رکھا

حاشیہ ۱، ۲ اگلے صفحہ پر۔

ہے اور سکہ کی طرح رواج دیا ہے۔ اس لئے اس ضمانتی تحریر سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔

سکہ کی حقیقت

لیکن نوٹوں کو سکہ قرار دینے کے بعد یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ کیا وہ سونے اور چاندی کے اصلی سکوں کی طرح ہیں؟ اور سکہ کے جو مقاصد شریعت اور عرف میں قائم ہیں ان کو وہ پورا کرتے ہیں؟ جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ فقہاء نے چاندی اور سونے کو خلقی سکہ قرار دے کر (۲) اسکے مقاصد میں یہ تحریر کیا ہے کہ وہ مبادلات کا ذریعہ اور اموال کا معیار ہوتے ہیں (۳) اور جن رواجی سکوں سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے اگر وہ سونے اور چاندی کے خلقی سکے نہیں ہیں تو ان کو سکہ اصطلاحی" قرار دے کر ان پر سکہ کے احکام جاری کئے ہیں۔ جیسے قدیم زمانہ کے وہ فلوس جو پیتل، تانبہ وغیرہ معدنی دھاتوں کے ہوا کرتے تھے اور سونے و چاندی کے اصلی سکوں کے ساتھ مبادلات کا ذریعہ تھے۔ ان کے بارے میں یہ تفصیل فقہاء نے درج کی ہے کہ وہ جب تک سکہ کی حیثیت سے معاشرہ میں رواج پذیر ہوتے ہیں اس وقت تک سکہ کے حکم میں ہیں ———

لہ نوٹ کی تعریف میں بھی مطالبہ کے وقت اصل سکہ کی ادائیگی کی وضاحت کی گئی ہے جیسا کہ شیخ احمد الحسینی نے بہجۃ المشتاق میں لکھا ہے۔ ورقۃ البنک هی ورقۃ قابلۃ لدفع قیمتها علیها لدی الاطلاع لحاملها وهی یتعامل بها کما یتعامل بالعملۃ المعدنیۃ (بحث ونظر شمارہ ۳ بحوالہ بہجۃ المشتاق ص۱۵)

لہ شیخ محمد عبداللطیف الفرفور نے تحریر کیا ہے۔ لان منع التعامل بالذهب والفضۃ اقرته جمیع الحکومات للمحافظۃ علی ما عندها من الذهب والفضۃ خوفا من تسربها الی الخارج۔ دیکھیے مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی جزء ثالث

لہ علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں تحریر کیا ہے۔ لان مالیۃ الفلوس والدراهم الغالبۃ الغش باصطلاح لا بالخلقۃ بخلاف النقدین فان مالیتهما بالخلقۃ لا بالاصطلاح (فتح القدیر ۱۳۲/۶ مطبوعہ مصر)

لہ ابن تیمیہ کہتے ہیں۔ فان المقصود من الاثمان ان تکون معیارا للاموال یتوسل بها الی معرفۃ مقادیر الاموال۔

(مجموع الفتاوی)

ہوتے ہیں اور جب کساد بازاری آجاتی ہے اور سکہ کی حیثیت سے ان کا چلن ختم ہو جاتا ہے
تو ان کی حیثیت عام سامانوں کی ہو جاتی ہے ۔ علامہ ابن ہمام نے اموال کی تقسیم کرتے
ہوئے لکھا ہے ۔

وتنقسم باعتبار الاصطلاح على الثمنية وهو في الاصل سلعة فان كانت
رائجة فهي ثمن لا تتعين بالتعيين وان كانت كاسدة فهي سلعة كالفلوس[1]

(یعنی اموال کی دوسری قسم ثمن اصطلاحی ہے ۔ جو اصلیت میں سامان نہیں ہے اور
اگر (سکہ کی طرح) رائج ہوتے ہیں تو وہ ثمن ہو جاتے ہیں ۔ اور جس طرح سکوں کی ذات
اپنی اصل کے اعتبار سے متشخص نہیں ہوتی ہے یہ بھی نہیں ہوں گے ۔ پھر اگر ان کا رواج ختم
ہو جائے تو وہ سامان کی حیثیت میں آجاتے ہیں جیسے فلوس)

علامہ ابن ہمام کی اس صراحت کے ساتھ بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ثمن اصطلاحی
میں وہ فلوس داخل ہیں جو سکوں کی طرح مبادلات کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور ان کا
اس حیثیت سے رواج بھی ہوتا ہے ۔ لیکن جس وقت ان کی رواجی حیثیت ختم ہو جائے گی
وہ سکہ کی حیثیت سے نکل جائیں گے اور عام سامانوں کی طرح ہو جائیں گے ۔ فقہ حنفی کی طرح
فقہ مالکی میں بھی رواجی سکوں کو قبول کرنے کی صراحت آئی ہے جیسا کہ المدونۃ میں
امام مالک سے منقول ہے[2]

سکوں کی خلقی و اصطلاحی تقسیم کی صراحت جو فقہا نے کی ہے ۔ اس پر جب ہم
نوٹوں کو قیاس کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ نوٹ بھی قانوناً و عرفاً سکہ کی حیثیت
سے رائج ہیں ۔ اور وہ فلوس نافقہ کی طرح ہیں ۔ بلکہ اپنے رواج و استعمال میں فلوس
سے بڑھ کر ہیں چنانچہ ہر معاملہ میں فلوس قبول کرنے پر لوگ پہلے مجبور نہ تھے لیکن نوٹوں

---

[1] فتح القدیر ، ۱۳۴/۶
[2] دیکھئے المدونۃ ، ۱۰۳/۳

کے لینے پر مجبور ہیں۔ اسی لئے بعض فقہاء جیسے علامہ عبدالحیؒ لکھنویؒ نے نوٹوں کو مین ثمن خلقی قرار دیا ہے[1] بعض فقہاء نے اگرچہ یہ اعتراض کیا ہے کہ نوٹ فلوس کی طرح نہیں ہیں کیونکہ فلوس معدنیات کے ہوتے تھے اور سکہ نہ ہونے کی حالت میں ان کی ایک قیمت ہوتی تھی۔ جبکہ نوٹ ایسے نہیں ہیں، وہ سکہ نہ ہونے کی حالت میں بے قیمت شئی ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض سکہ کے باب میں صحیح نہیں ہے کیونکہ سکہ کی جو تعریف و تقسیم فقہاء نے کی ہے اور اس کے جو مقاصد بیان کئے ہیں وہ نوٹ پر بھی صادق آتے ہیں۔ اور سکہ اصطلاحی کو انھوں نے معدنیات کے سکوں میں منحصر نہیں کیا ہے[2] بلکہ امام مالک سے "المدونۃ" میں منقول ہے کہ اگر چمڑے کے سکے بھی رائج ہو جائیں گے تو ان پر سکوں کے احکام جاری ہوں گے[3]

خلقی و اصطلاحی سکہ

لیکن اس کے باوجود کہ فقہاء نے مبادلات میں نقدین کی طرح اصطلاحی سکوں کو بھی قبول کیا ہے چونکہ اصطلاحی سکے پوری طرح خلقی سکے کے مقاصد کو پورے نہیں کرتے۔ اور نہ ان کی طرح قیمتی ہوتے ہیں اسی طرح اموال کا معیار بھی مکمل طور پر نہیں ہوتے ہیں اور افراط زر کی وجہ سے اشیاء کی نسبت سے ان کی مالیت میں کافی اتار چڑھاؤ بھی آتا رہتا ہے اس لئے فقہاء کے درمیان ان کی ثمنیت کے بقاء، وجوب زکوٰۃ، اور تحقق ربٰوا کے مسئلہ میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کا مسلک فلوس کی ثمنیت کے بارے میں یہ ہے کہ ان کی ثمنیت اصطلاحی ہے، اس لئے اگر متعاقدین فلوس رائجہ کی ثمنیت کو کالعدم قرار دے کر سامان کی حیثیت سے تبادلہ کریں تو کمی بیشی جائز ہوگی اور ثمنیت ختم ہو جائے گی۔ لیکن امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ رائجہ فلوس کی ثمنیت صرف متعاقدین کے کالعدم کرنے سے ختم نہ ہوگی جب تک کہ دیگر تمام لوگ اس کی ثمنیت ختم

---

[1] مجموعہ فتاویٰ عبدالحی ۳/۱۵-۱۶۔

[2] علامہ شیخ احمد زرقاء نے لکھا ہے۔ لان الفلوس النافقة هي ما كان متخذاً من غير النقدين (الذهب والفضة) ويجري الاصطلاح على استعماله النقدين فالورق المذكور من هذا القبيل ومن يدعي تخصيص الفلوس النافقة بالمتخذ من المعادن فعليه البيان۔

[3] المدونة ۳/۱۲۴ ——————— (شرح القواعد الفقهية ص ۱۳۱) ———

ختم کرنے پر متفق نہ ہوجائیں۔ عنایہ میں امام محمد کے مسلک و دلیل کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔

یقول الامام محمد بن الحسن: انہ لا سبیل الی اسقاط ثمنیتہا ما دامت رائجۃ لانہا صارت ثمنا بالاصطلاح فلا تبطل الا باصطلاح الجمیع فلیس للمتعاقدین ابطالہا و تعیینہا[1]

فلوس کی ثمنیت میں اس اختلاف کا اثر بظاہر نوٹوں پر بھی ہوگا۔ لیکن اگر اس جہت سے غور کیا جائے کہ فلوس کا رواج نقدین (سونے اور چاندی کے سکوں) کے رواج کی حالت میں تھا یعنی وہ تابع تھے۔ اور سامان کی حیثیت سے بھی ان کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اسی لئے عاقدین "فلوس" کو متشخص و متعین کر دیتے تھے۔ لیکن یہ صورت نوٹوں پر صادق نہیں آتی ہے کیونکہ ان کا عروض و سامان کی حیثیت سے استعمال نہیں ہوتا ہے اور نہ ان کے سکہ ہونے کی حیثیت کو ختم کرنا متعاقدین کے اختیار میں ہے تو بات اور صاف ہو جاتی ہے۔

نوٹوں میں سُود کا تحقق

اصطلاحی سکہ میں ثمنیت کی بقاء کے اختلاف کے ساتھ ان میں ربوا کے تحقق کے بارے میں بھی فقہاء کے مابین اختلاف ہوا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سود کے بارے میں جو نص نبوی آئی ہے وہ خاص طور پر نقدین کے بارے میں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

لا تبیعوا الذہب بالذہب الا مثلا بمثل و لا تشفوا بعضہا علی بعض ولا تبیعوا الورق بالورق الا مثلا بمثل و لا تشفوا بعضہا علی بعض و لا تبیعوا منہا غائبا بناجز[2]

چونکہ اس حدیث میں صرف نقدین میں تبادلہ کے وقت کی بیشی اور ادھار کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلوس اور نوٹ چونکہ سونے اور چاندی کی جنس سے نہیں ہیں تو کیا ان کا آپسی تبادلہ کمی بیشی اور ادھار کے ساتھ جائز ہوگا؟ امام شافعی

---

[1] العنایہ علی ہامش فتح القدیر ۵/۲۸۴ مطبوعہ مصر

[2] رواہ الامام البخاری فی الصحیح۔

کا مسلک قول صحیح کے اعتبار سے یہ ہے کہ اس میں ربوٰا کا تحقق نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ نقدین میں ثمنیت جوہریہ اصلیہ ہوتی ہے۔ بخلاف اصطلاحی سکوں کے کہ ان کی ثمنیت عارضی ورواجی ہوتی ہے۔ اسی لئے امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ربوٰا کی علت "قاصرہ" ہوتی ہے۔ وہ اس کو متعدی نہیں تسلیم کرتے۔ امام نوویؒ نے اس مسلک کی تفصیل کے بعد تحریر کیا ہے۔

اذا راجت الفلوس رواج النقود لم یحرم الربا فیہا ھذا ھو الصحیح المنصوص وبہ قطع المصنف والجمہور[1]

لیکن امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ربوٰا کی علت مطلق ثمنیت ہے اور چونکہ فلوس نافقہ میں بھی ثمنیت پائی جاتی ہے۔ اس لئے اس میں بھی تفاضل اور ادھار ناجائز ہوگا۔ مدونہ کبریٰ میں ہے۔

لان مالکا قال: لا یجوز فلس بفلسین ولا تجوز الفلوس بالذھب والفضۃ ولا بالدنانیر نظرۃ

یعنی آپس میں اگر ایک فلوس کا تبادلہ دو فلسوں سے کیا جائے تو جائز نہ ہوگا۔ اسی طرح فلوس کا تبادلہ سونے چاندی یا دنانیر سے کمی بیشی کے ساتھ جائز نہ ہوگا۔

اس طرح امام مالکؒ کے نزدیک خلقی سکوں کی طرح رواجی سکوں میں ربوٰا کا تحقق ہوتا ہے اور ان کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ ناجائز ہے۔ احناف کے نزدیک بھی رواجی سکوں میں ربوٰ کا تحقق ہوتا ہے۔ اور وہ بھی کمی بیشی کو سود ہونے کی بنا پر حرام قرار دیتے ہیں۔ احناف کے نزدیک اگرچہ ربوٰا کی علت ثمنیت کے ساتھ وزن اور جنس ہے۔ یعنی اگر یہ دو چیزیں ہم جنس ہیں اور وزنی یا کیلی (ناپی اور تولی جانے والی) ہیں تو ان کا آپس میں تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے مگر وہ سکوں کے بارے میں وزن کی جگہ پر علت کے لئے "مثل" کا لفظ لکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ سکے اگرچہ وزنی ہوتے ہیں مگر اصل ان میں قیمت ہے اس لئے اس قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اور دو سکوں کا تبادلہ اگر کیا جائے گا تو ان کا قیمت میں برابر ہونا ضروری ہوگا۔ ورنہ تبادلہ جائز نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر پانچ روپے کے نوٹ کا تبادلہ دوسرے نوٹ سے کرنا ہوگا تو چاہے ایک ایک روپے کے پانچ نوٹ دیئے جائیں جائز ہوگا۔ اگرچہ ایک طرف ایک نوٹ ہے اور دوسری طرف پانچ نوٹ ہیں مگر قیمت میں برابر

---

[1] المجموع ۹/۳۹۴

ہیں اس لئے جائز ہے۔

غیر ملکی کرنسی

لیکن یہ حکم اسی صورت میں ہوگا جبکہ ایک ہی ملک کی کرنسی کا آپس میں تبادلہ ہو۔ اگر کسی دوسرے ملک کی کرنسی سے تبادلہ کیا جائے تو وہ تفاضل جائز ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ملک کے مختلف سکّے اور کرنسی نوٹ ایک ہی جنس ہوتے ہیں جبکہ دوسرے ملک کی کرنسی دوسری جنس ہے۔ اور سود کے لئے ہم جنس ہونے کی شرط احناف کے نزدیک ضروری ہے۔ اور یہی امام مالک کا بھی مسلک ہے۔ اس لئے ایک ملک کی کرنسی دوسرے ملک کی کرنسی کے ہم شکل اور برابر نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے ان میں تبادلہ کے وقت کمی بیشی جائز ہوگا۔

لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور یہ کہ اکثر ممالک کی طرف سے مختلف کرنسیوں کی قیمت مقرر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی روپے کو لیں کہ پاکستانی روپے یا ریال ڈالر، پونڈ وغیرہ تمام کرنسیوں کی قیمت حکومت کی طرف سے ہندوستانی روپے میں مقرر ہے۔ تو کیا حکومت نے ایک ریال کی جو قیمت ہندوستانی نوٹ میں مقرر کی ہے اس سے زیادہ یا کم میں ریال کا تبادلہ نوٹ سے جائز ہوگا۔ اور کیا اس کمی بیشی کو سود کہا جائے گا؟

میرے نزدیک اس طرح کمی بیشی سے تبادلہ کرنا سود نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جب دونوں کرنسیاں جنس کے اعتبار سے مختلف ہیں اور مختلف الاجناس میں کمی بیشی جائز ہے تو پھر یہ تبادلہ جس مقدار میں کمی بیشی کے ساتھ ہو جائز ہوگا۔ یہ تبادلہ کرنے والے عاقدین کی رضامندی پر موقوف ہے۔ شریعت نے اس کی تحدید نہیں کی ہے۔

البتہ اس طرح عاقدین کے موجودہ زمانہ میں حکومت کے مقرر کردہ شرح کے علاوہ دیگر شرح پر تبادلہ کرنے سے زر کی مشکلات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور حکومت مختلف اقتصادی وجوہ سے قیمت مقرر کرتی ہے۔ لہٰذا حکومت کا یہ مقرر کردہ شرح "تسعیر" کے حکم میں ہوگا۔ اور اس کی خلاف ورزی عندالشرع مکروہ ہوگی۔

نوٹوں پر وجوب زکوٰۃ

نوٹ کو سکہ اصطلاحی تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں زکوٰۃ کس طرح واجب

ہوگی یہ واضح ہے کہ احادیث میں وجوب زکوٰۃ کے لئے تین اجناس واصناف کی تعیین آئی ہے وہ ہیں ۔الحرث۔العین ۔المواشی۔ اور فقہاء احناف نے اموال میں وجوب زکوٰۃ کی علت نمو و تجارت قرار دی ہے ۔ان کے نزدیک نقدین اثمان خلقیہ ہیں ۔ یعنی وہ خلقۃ تجارت کے لئے ہیں چاہے ان کو گھروں میں رکھا جائے کہ زیورات میں استعمال کیا جائے جب ان کا وزن نصاب کو پہونچ جائے گا زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اگرچہ ان کا استعمال خرید و فروخت میں نہ کیا جائے اسی لئے سامان تجارت کو نقدین میں سے کسی ایک کے ساتھ ضم بھی کیا جاتا ہے فلوس نافقہ کی حیثیت بھی ثمن اصطلاحی کی وجہ کر تجارت کی ہو جاتی ہے اس لئے ان میں بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ۔

علامہ ابن عابدین شرنبلالیہ سے نقل کرتے ہیں ۔

الفلوس ان کانت اثمانا رائجة اوسلعا للتجارة تجب الزکوٰۃ فی قیمتها والافلا[1]

اور فتاوی قاری الہدایۃ میں ہے ۔

الفتوی علی وجوب الزکوٰۃ فی الفلوس اذا تعومل بها، وبلغت ما یساوی مائتی درهم او عشرین مثقالا من الذهب[3]

اس تصریح کے بعد یہ واضح ہوجاتا ہے کہ وجوب زکوٰۃ کی علت نمو و تجارت نوٹوں کے اثمان رائجہ ہونے کی بناپر ان میں پائی جاتی ہے اس لئے ان میں زکوٰۃ ایسے ہی واجب ہوگی جیسے فلوس نافقہ میں ۔اور ان کا نصاب بھی سونے یا چاندی میں سے کسی ایک کا مقدار نصاب ہے وہ جس نصاب کو پہونچ جائے گا اس کا اعتبار ہوگا۔ اور اس کے ساتھ دیگر اسباب اور سونے و چاندی کو بھی ضم کیا جائے گا۔ اور چونکہ نوٹ سکہ ہیں اس لئے ادائے گی زکوٰۃ بھی نوٹوں کے ادا کرنے سے ہوجائے گی۔

---

[1] مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحئی ۳/۱۵-۱۶۔

[2] ردالمحتار مع خلاصۃ الفتاوی۔

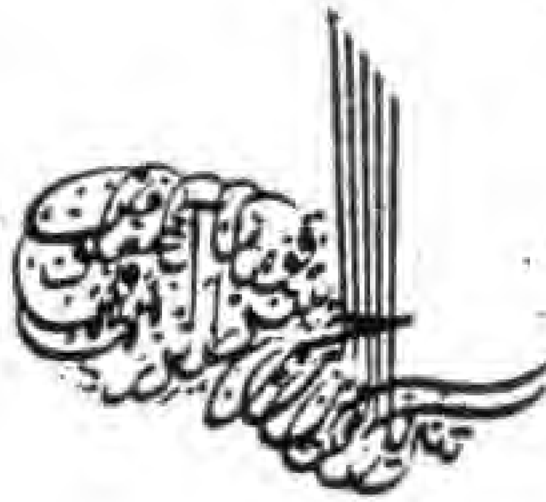
[3] مجلہ مجمع الفقہ الاسلامی جزثالث ص۴۰۔

یہاں اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ جن اکابر علماء نے نوٹ کو سند قرار دیا تھا انھوں نے بھی وجوب زکوٰۃ کو تسلیم کیا تھا ان کے نزدیک نوٹوں میں وجوب زکوٰۃ دین قوی ہونے کی بنا پر تھا۔ البتہ ادائے گی کا حکم اصلی (نقد) سکہ کی وصول یابی پر ہوتا تھا۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ مفتی اول دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں۔

وجوب ادا، زکوٰۃ وصول نقد ہی پر ہوگا اور نفس وجوب پہلے سے ثابت ہے لہٰذا اگر قبل وصول بھی زکوٰۃ دیدے گا تو درست ہے اور ایسا ہی کرنا بھی چاہیئے کیونکہ بعد وصول نقد بھی جملہ سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔[1]

خلاصہ بحث یہ ہے کہ نوٹ نقدین کی طرح سکہ ہیں۔ ان میں اصلی سکہ کی طرح سود کا تحقق ہوگا۔ اور زکوٰۃ بھی واجب ہوگی۔ البتہ بعض احکام میں اصلی سکوں سے مختلف ہوں گے۔



---

[1] فتاویٰ دارالعلوم مدلل ومکمل ۶/۱۰۹ کتاب الزکوٰۃ

زرِ کاغذی کے شرعی احکام

از ——— مولانا مفتی نسیم احمد قاسمی مظفرپوری
رفیق مجمع الفقہ الاسلامی (الہند)

زرِ کاغذی ثمن ہیں یا سندِ حوالہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے نقود کی حقیقت" اور اس سے متعلق احکام پر ایک نظر ڈالیں، کہ نقود کی حقیقت ان کاغذی نوٹوں پر صادق آتی ہے یا نہیں، اور عرفاً ان کے ساتھ وہ احکام و معاملات متعلق ہیں یا نہیں جو ان زرِ کاغذی کی ایجاد سے پہلے انسان سونے چاندی کے سکوں کے ذریعہ انجام دیتے تھے، اس کے بعد کاغذی نوٹوں کی حیثیت خود واضح ہو جائے گی۔

نقود کی حقیقت

علامہ یوسف القرضاوی اپنی شہرۂ آفاق کتاب "فقہ الزکاۃ" میں نقود کی حقیقت و اصلیت پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے بعض اساتذۂ اقتصاد کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں۔

"النقود هي كل ما يستعمل مقياسًا للقيم وواسطة للتبادل وأداة للادخار فأي شئ يودي الى هذه الوظيفة يعتبر نقودًا بصرف النظر عن المادة المصنوع منها، وبصرف النظر عن الكيفية التي أصبح بها وسيلة التعامل في مبدأ الامر" [1]

یعنی نقود ہر وہ شئی ہے جس میں حسب ذیل تین چیزیں پائی جاتی ہوں۔

(۱) وہ قیمتوں کا معیار ہو۔

(۲) تبادلہ کے لئے واسطہ ہو۔

---

[1] فقہ الزکاۃ۔ یوسف القرضاوی ۱/۲۰۶۔ دارالارشاد بیروت ۱۹۸۹ء

(۴) ذخیرہ اندوزی کا سامان ہو۔ یعنی مخزن ہو)
لہٰذا ہر وہ شئی جو ان وظائف کو ادا کرتی ہو وہ نقود شمار ہوگی، قطع نظر اس سے کہ وہ شئی کس چیز سے بنائی گئی ہے۔ اور ابتداء میں اس کی حیثیت لوگوں کے مابین کیا تھی، وہ کس طرح لوگوں کے درمیان تعامل کا وسیلہ تھی۔ شیخ عبدالوہاب خلاف "نقود کی حیثیت" واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان المراد بالنقود علی ما تتعامل بہ الامۃ وتقررہ قوانین الدولۃ ثمنا للاشیاء سواء کانت عملۃ نقدیۃ من الذھب والفضۃ او من ای معدن آخر کالنحاس والبرنز او من ای شئی آخر تتعارف الامۃ اتخاذہ نقدا کاوراق البنکوت"۔[1]

نقود سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ امت اپنے معاملات انجام دیتی ہو اور حکومت کے قوانین میں انہیں اشیاء کے لئے ثمن قرار دیا جا چکا ہو، چاہے وہ سونے، چاندی سے بنے ہوئے نقود ہوں یا کسی دوسری دھات پیتل، برنز وغیرہ یا کسی اور چیز سے بنائے گئے ہوں مگر وہ امت کے درمیان نقود کی حیثیت سے متعارف ہوں"۔

زر کاغذی کی حقیقت

مذکورہ بالا تفصیل سے جہاں نقود کی حقیقت واضح ہوئی، وہیں نقود کے وظائف کی بھی تعیین ہوگئی، اب جب ہم زر کاغذی پر نظر ڈالتے ہیں تو اس پر نقود کی تعریف صادق آتی ہے، اور آج امت ان کاغذی نوٹوں سے اپنے وہ تمام معاملات شرعی و عرفی انجام دیتی ہے جو کسی زمانے میں سونے چاندی کے سکوں سے انجام دیتی تھی۔

علامہ یوسف قرضاوی کاغذی نوٹوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

۔اس دور میں کاغذی نوٹوں کی ہر حکومت کے اندر وہی حیثیت متعین ہوگئی ہے جو کسی زمانے میں نقود معدنیہ کی تھی۔

(۱) ان کاغذی نوٹوں کے ذریعہ عورتوں کو مہر دیئے جاتے ہیں، اور اس کے ذریعہ

---

[1] مجلۃ لواء الاسلام۔ العدد الخامس۔ السنۃ الرابعۃ ص ۳۲۹، ۳۳۹۔ بحوالہ اقتصادیات النقود فی اطار الفکر الاسلامی لابی بکر الصدیق عمر متولی و شوقی اسماعیل ص ۳۰، مکتبہ وہبہ قاہرہ۔

شرعی طور پر انہیں حلال کیا جاتا ہے بغیر کسی رد و کد کے۔

(۲) ان کے ذریعہ اشیاء کی قیمت ادا کی جاتی ہے، اور سامان کو مشتری کے حوالہ بغیر کسی تنازع کے کیا جاتا ہے۔

(۳) مزدور کو اس کی محنت کا معاوضہ دیا جاتا ہے، لیکن مزدور یا وظیفہ پانے والا اپنے کام کے معاوضہ کے طور پر اس کے لینے سے انکار نہیں کرتا ہے۔

(۴) قتل خطا اور قتل شبہ عمد کی صورت میں ان کے ذریعہ دیت ادا کی جاتی ہے، جس سے قاتل بری الذمہ ہو جاتا ہے اور اولیاء مقتول بھی راضی ہو جاتے ہیں۔

(۵) ان نوٹوں کی چوری کی صورت میں چور، چوری کی سزا کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

(۶) یہ نوٹ ذخیرہ کئے جاتے ہیں، ان پر ملکیت ثابت ہوتی ہے، اور جس کے پاس جتنے نوٹ جمع ہوتے ہیں وہ اس کے اعتبار سے مالدار شمار کیا جاتا ہے، اور جب کسی کے پاس بہت زیادہ نوٹ جمع ہو جاتے ہیں تو لوگوں کے نزدیک اور خود اس کے نزدیک بھی اس کی مالداری میں اضافہ سمجھا جاتا ہے۔

ان سب کا حاصل یہ ہے کہ کاغذی نوٹوں کے وظائف اور ان کی اہمیت وہی ہے، جو شرعی نقود کی ہے۔[1]

علامہ یوسف قرضاوی ان نوٹوں کے بارے میں اپنی فیصلہ کن رائے کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"زر کاغذی عصر حاضر کی پیداوار ہے، اس لئے ہم اس کی توقع نہیں رکھ سکتے کہ علماء سلف نے ان کاغذی نوٹوں کے بارے میں کوئی حکم صادر کیا ہوگا، مگر یہ حقیقت ہے کہ اب یہ نوٹ حکومتوں کے قوانین اور لوگوں کے تعامل و تعارف کی وجہ سے اشیاء کے لئے ثمن اور اموال کی اصل بن گئے ہیں۔ اور ضروریات کی تکمیل اور مبادلات کی آسانی میں انہیں سونے چاندی کی قوت حاصل ہو گئی ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے زر کاغذی یا تو اموال نامیہ ہیں یا نمو کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کی شان وہی ہے جو سونے چاندی کی ہے۔"[2]

شیخ محمد ابو زہرہ کاغذی نوٹوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"کاغذی نوٹوں کے بارے میں کوئی نص وارد نہیں ہوئی ہے اس لئے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] فقہ الزکوٰۃ یوسف القرضاوی ص ۲۰۶ ج ۱ [2] بحوالہ بالا ص ۲۰۱ و ۲۰۲

کے زمانے میں ان نوٹوں کا وجود ہی نہیں تھا، مگر اب یہ نوٹ نقود ہیں ان کے ذریعہ تعامل، تجارت اور تبادلہ جاری ہے، اور انہیں اشیاء کی قیمتوں کا معیار قرار دیا جاتا ہے اور بالقوۃ ان میں نمو کی صلاحیت پائی جاتی ہے[1]

زرِ کاغذی پر وجوب زکاۃ

جب زرِ کاغذی ایجاد ہوا تھا تو حکومت کی طرف سے اس پر یہ عبارت تحریر کی گئی تھی

I PROMISE TO PAY THE BEARER THE SUM OF RUPEES)

جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کاغذی نوٹ اصلی سکہ و ثمن نہیں ہیں بلکہ سندات دیون ہیں، اور ان کی مالیت بنکوں کی تحویل میں محفوظ ہیں، جب لوگ چاہیں ان نوٹوں کے ذریعہ اپنی اصلی مالیت بنکوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ اس دور کی بات ہے جبکہ کاغذی نوٹوں کے ساتھ ساتھ چاندی کے سکے بھی رائج اور لوگوں کے مابین متعارف تھے، مگر رفتہ رفتہ چاندی کے سکوں کا رواج و چلن موقوف ہوگیا، اور ان کی جگہ کاغذی نوٹوں نے اپنا لی، اور اب تو صورت حال یہ ہے کہ نئی نسل چاندی کے سکوں سے واقف بھی نہیں ہے۔ اور حکومتوں کے قوانین نے بھی اس پر تحریر شدہ عبارت کو صرف رسمی قرار دیدیے، اب ان نوٹوں کے ذریعہ اصلی سکوں کا حصول ممکن بھی نہیں۔

جب کاغذی نوٹوں کے ساتھ چاندی کے سکے بھی رواج پذیر تھے تو اس وقت علماء کی اکثریت نے ان نوٹوں کو سندِ حوالہ قرار دیکر ان پر زکوٰۃ واجب نہیں کیا تھا مگر اس وقت بھی بعض علماء ان نوٹوں کو ثمن عرفی قرار دیکر ان پر نقود اصلیہ چاندی سونے کے سکوں کا حکم لگاتے تھے لیکن اب اس دور میں نوٹوں کے سونے چاندی کے سکوں کی طرح رواج و چلن کی وجہ سے علماء و فقہاء کی اکثریت زرِ کاغذی کو ثمن عرفی سمجھتی ہے، اور ثمن و نقود کے احکام اس پر نافذ کرتی ہے۔ احناف، شوافع اور مالکیہ تینوں کے نزدیک زرِ کاغذی پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی "الفقہ الاسلامی وادلتہ" میں زرِ کاغذی پر وجوب زکوٰۃ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "اور چونکہ ان کاغذی نوٹوں کا نظام پہلی عالمی جنگ کے بعد ظاہر ہوا ہے

---

[1] اقتصادیات النقود فی اطار الفکر اسلامی ص ۲۶۔

اس لئے ہمارے فقہاء متقدمین نے زرکاغذی کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی ہے البتہ معاصر علماء نے اس پر وجوب زکوٰۃ کی بحث کی ہے۔ اور ان فقہاء نے زرکاغذی پر وجوب زکوٰۃ کا حکم لگایا ہے، ان میں فقہاء حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ سبھی شامل ہیں، البتہ علماء حنابلہ اس پر زکوٰۃ واجب قرار نہیں دیتے ہیں، لیکن اگر اس کے ذریعہ سونا، چاندی کا تبادلہ کرلیا جائے تو پھر ان کے نزدیک بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ڈاکٹر زحیلی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اور حق یہ ہے کہ ان کاغذی نوٹوں میں زکوٰۃ واجب ہو، اس لئے کہ یہ نوٹ اس دور میں اشیاء کے لئے ثمن بن گئے ہیں، اور سونے کے ذریعہ تعامل موقوف ہوچکا ہے"۔ جن لوگوں نے نوٹوں کو سند دیون قرار دیا ہے، اس کی تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب تحریر کرتے ہیں۔

"ان نوٹوں کو دین پر قیاس کرنا اس وجہ سے درست نہیں ہے کہ دین کا حال یہ ہے کہ اس سے دائن انتفاع نہیں کرپاتا ہے اور اسی وجہ سے فقہاء نے "اموال دیون" پر اس وقت زکوٰۃ واجب قرار دیا ہے جبکہ وہ دائن کے قبضہ میں آجائے، لیکن ان نوٹوں کا حال یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسان اسی طرح فائدہ اٹھاتا ہے جس طرح وہ کسی زمانے میں سونے سے فائدہ اٹھاتا تھا جو اشیاء کے لئے ثمن ہیں۔ لہٰذا ان نوٹوں پر زکوٰۃ کے وجوب اور عدم وجوب کے بارے میں اختلاف کرنا درست نہیں ہے اور بلاشبہ عدم وجوب زکوٰۃ کا قول خطاء اجتہادی پر مبنی ہے"۔[۱]

زرِ کاغذی پر وجوبِ زکوٰۃ کی شرطیں

زرکاغذی پر وجوب زکوٰۃ کی چند شرطیں ہیں، جب وہ شرطیں پائی جائیں گی تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۱) زرکاغذی نصاب شرعی کی مقدار کو پہنچ جائے (یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی اس سے خریدی جاسکے)

---

[۱] الفقہ الاسلامی وادلتہ۔ الدکتور وہبۃ الزحیلی ۲/۷۷۳-۷۷۴۔ دارالفکر دمشق ۱۴۰۵ھ

(۲) زرِ کاغذی پر مکمل ایک سال گزر جائے۔
(۳) وہ نصاب دین سے فارغ ہو
(۴) اور وہ نصاب حوائج اصلیہ سے فاضل ہو[۱]

شیخ محمد ابوزہرۃ زر کاغذی پر زکوٰۃ کے وجوب کا حکم ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"زر کاغذی اور وہ سکے جو سونے چاندی کے نہیں ہوتے ہیں جیسے وہ سکے جو نکل وغیرہ سے بنائے جاتے ہیں، ان کی زکوٰۃ کے بارے میں کوئی نص وارد نہیں ہوئی ہے اس لئے کہ ان کا وجود عہد نبوی میں نہیں تھا۔ زر کاغذی اور اس طرح کے سکوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور یہی قیاس فقہی کا تقاضہ ہے[۲]"

علامہ عبدالرحمٰن الجزیری صاحب "الفقہ علی المذاہب الاربعہ" کاغذی نوٹوں پر وجوب زکوٰۃ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"جمہور فقہاء زرِ کاغذی پر وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں، اس لئے کہ زر کاغذی نے تعامل و رواج میں سونے چاندی کی جگہ لے لی ہے، اور ان نوٹوں کا چاندی سے تبادلہ آسان ہے، لہٰذا یہ بات کسی بھی طرح معقول نہیں ہے کہ لوگ کاغذی نوٹوں کی وجہ سے صاحب ثروت ہوں، اور ان کے لئے نصاب زکوٰۃ کو چاندی کی صورت میں کر لینا ممکن ہو۔ مگر اس کے باوجود وہ ان نوٹوں کی زکوٰۃ نہ نکالیں، اور اسی بناپر ائمہ اربعہ میں سے تین فقہاء کاغذی نوٹوں پر وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں، البتہ حنابلہ کا اختلاف ہے تفصیل اس کی یہ ہے۔

شافعیہ کا مسلک

حضرات شوافع کہتے ہیں کہ زر کاغذی جسے "البنکوت" کہا جاتا ہے، اس کے ذریعہ لوگوں کا تعامل حوالہ کے قبیل سے ہے۔ گویا اتنی مالیت اس کی بینک کے پاس ہے، لہٰذا وہ اتنی مالیت کا بینک پر دین کے طور پر مالک ہوتا ہے، اور بینک کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اقرار کرنے والا، اور ٹال مٹول نہ کرنے والا مدیون ہے، اس کی ادائیگی کے لئے ہر وقت تیار اور آمادہ ہے اور جب مدیون ان اوصاف کے ساتھ متصف ہو تو اس دین پر زکوٰۃ فوری واجب ہوتی ہے

---

[۱] الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۷۷۲، فقہ الزکوٰۃ ۱/۲۷۰ — ۲۸۱ [۲] بحوالہ اقتصادیات الاسلامی ص ۳۹

اس پر اعتراض یہ وارد ہوا کہ صحت حوالہ کے لئے محتال اور محتال علیہ کی طرف سے ایجاب وقبول کا پایا جانا ضروری ہے جو اس جگہ مفقود ہے۔ لہٰذا حوالہ باطل قرار پائے گا، فقہاء شافعیہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ چونکہ زر کاغذی پر لوگوں کا تعامل جاری ہے اور عرفاً اسے ثمن سمجھا جاتا ہے اس لئے ایجاب وقبول کے نہ پائے جانے کی وجہ سے حوالہ باطل نہیں قرار پائے گا۔ نیز بعض ائمہ شافعیہ نے کہا ہے کہ ایجاب وقبول سے مراد ہر وہ چیز ہے جو قولاً یا فعلاً رضا پر دلالت کرے، اور ان نوٹوں کے تعامل میں رضا متحقق ہے[1]۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب زر کاغذی کو ثمن عرفی کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا، اس کی حیثیت محض سند حوالہ کی تھی اس وقت بھی ائمہ شافعیہ نے کاغذی نوٹوں پر زکوٰۃ اس وجہ سے واجب قرار دیا تھا کہ بینک کی حیثیت مدیون کی ہے اور نوٹوں کے مالک کی دائن کی، اور بینک ان نوٹوں کی مالیت کی ادائے گی پر ہر وقت آمادہ ہے اس لئے یہ دین قوی ہوا جس پر زکوٰۃ فوری واجب ہوتی ہے، مگر اب اس دور میں حکومت کے قوانین اور عرف ورواج اور لوگوں کے تعامل نے زر کاغذی کو ثمن عرفی تسلیم کر لیا ہے۔ اس لیے زر کاغذی بھی نقود اصلیہ کے حکم میں ہوں گے۔ اور جس طرح سونے چاندی کے سکوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اسی طرح ان نوٹوں پر بھی زکوٰۃ کا وجوب ہوگا۔

حنفیہ کا مذہب: ——— فقہاء احناف کہتے ہیں کہ کاغذی نوٹ (البنکوت) دینِ قوی کے قبیل سے ہیں، اور ان نوٹوں کو چاندی سے تبدیل کرنا فوری طور پر ممکن ہے اس لئے ان نوٹوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

مالکیہ کی رائے: ——— علماء مالکیہ کہتے ہیں کہ زرِ کاغذی اگرچہ سندات دین ہیں مگر چونکہ انھیں چاندی میں تبدیل کرنا ممکن ہے، اور ان نوٹوں نے تعامل میں سونے کی جگہ لے لی ہے اس لئے ان نوٹوں پر ان کی شرطوں کے ساتھ زکوٰۃ واجب ہوگی۔

حنابلہ کا مسلک: ——— حنابلہ ان کاغذی نوٹوں پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب قرار نہیں دیتے ہیں جب تک کہ ان نوٹوں کے ذریعہ سونا یا چاندی حاصل نہ کر لی جائے[2]۔

---

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۲ فی الحوالۃ ص ۲۲۶ ج ۱، المکتبۃ التجاریۃ الکبری سنہ ۱۹۰۱
[2] الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۶۰۶/۱، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷۷۲، فقہ الزکوٰۃ ص ۲۷۲ ج ۱

علامہ یوسف القرضاوی زرِ کاغذی پر وجوب زکوٰۃ کی علت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:
"ان کاغذی نوٹوں کے وہی وظائف اور اہمیت ہے جو شرعی نقود کے وظائف اور ان کی اہمیت ہے، اور اس کے ساتھ اسی طرح کا تعامل جاری ہے جو نقود شرعیہ کے ساتھ جاری تھا، لہذا ہمارے لئے کیسے یہ جائز ہوگا کہ ہم فقراء و مساکین اور تمام مستحقین کو ان نوٹوں سے انتفاع کرنے اور ان کے دیگر وظائف سے روک دیں، جن کے لئے یہ کاغذی نوٹ بنائے گئے ہیں۔

- کیا یہ حقیقت واقعہ نہیں ہے کہ ہر آدمی زرِ کاغذی کو حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کرتا ہے۔
- کیا اس کے مالک ان نوٹوں کو ایسی نعمت خداوندی نہیں سمجھتے ہیں جن پر شکر کرنا واجب ہو؟
- کیا فقراء کی نگاہیں ان نوٹوں پر جمی نہیں رہتی ہیں؟ اور ان کے لینے کے شوق میں ان کا لعاب نہیں بہتا ہے؟
- کیا فقراء خوش نہیں ہوتے ہیں جب انھیں ان نوٹوں میں سے کچھ دیا جاتا ہے؟ کیوں نہیں، بخدا![1]

اور جب زرِ کاغذی کی یہ حیثیت ہے تو اس پر زکوٰۃ کے عدم وجوب کا کیا معنی ہے؟
مفتی محمد تقی عثمانی کاغذی نوٹوں پر زکوٰۃ کے وجوب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:
جب کرنسی نوٹ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر پہنچ جائیں) تو ان پر بالاتفاق زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور چونکہ اب یہ نوٹ قرض کے دستاویز کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں، اس لئے ان نوٹوں پر قرض کی زکوٰۃ کے احکام جاری نہیں ہوں گے، بلکہ اس پر مروجہ سکوں کے احکام جاری ہوں گے تجارت کی مالیت اگر ساڑھے باون تولہ چاندی تک پہنچ جائے تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے۔ بعینہ یہی حکم مروجہ سکوں اور موجودہ کرنسی نوٹوں کا ہے[2]۔

زرِ کاغذی کے ذریعہ ادائے گی زکوٰۃ

جب یہ زرِ کاغذی "ثمن عرفی" قرار پاچکے تو ان پر بھی وہ سارے احکام جاری ہوں گے:

[1] فقہ الزکاۃ ص ۲۷۶ ج ۱
[2] احکام الاوراق النقدیہ ص 16

چاندی سونے کے سکے پر جاری ہوتے ہیں، مولانا محمد تقی صاحب کاغذی نوٹوں کے ذریعہ ادائے گی زکوٰۃ کا حکم ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اور انہیں کاغذی نوٹوں کے ذریعہ فقیر کو زکوٰۃ کا مال دینا جائز قرار پائے گا اور جس وقت فقیر ان کاغذی نوٹوں کو اپنے قبضہ میں لے گا اسی وقت اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، ان نوٹوں کو سونے چاندی میں تبدیل کرنے پر زکوٰۃ کی ادائے گی موقوف نہ رہے گی"[1]

زرِ کاغذی پر وجوب زکوٰۃ کا معیار

اس سلسلہ میں علماء کے خیالات مختلف ہیں کہ زرِ کاغذی پر وجوب زکوٰۃ کے لئے سونے کو معیار قرار دیا جائے گا یا چاندی کو، علامہ یوسف القرضاوی کا خیال ہے کہ سونے کے نصاب کو معیار قرار دینا زیادہ بہتر ہے یعنی اگر کسی کے پاس زر کاغذی کی اتنی مقدار جمع ہو چکی ہے جس سے ساڑھے سات ۷½ تولہ سونا خریدا جا سکتا ہے تو اس صورت میں زر کاغذی پر زکوٰۃ واجب ہوگی[2]

مگر خود علامہ قرضاوی علمائے معاصرین کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ ان کی اکثریت چاندی کو معیار قرار دیتی ہے، علامہ فرماتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں اس کا احتمال باقی نہیں رہا ہے کہ سونے کے سکوں کے لئے الگ نصاب تجویز کیا جائے اور چاندی کے سکوں کے لئے الگ دوسرا نصاب متعین کیا جائے، کیونکہ اب کاغذی سکے ہی کا لوگوں کے درمیان تعامل ہو گیا ہے اور اسی کا رواج ہے، اور لوگوں کے درمیان نقود معدنیہ بالخصوص سونے کے سکوں کا رواج نہیں رہا ہے۔ لہٰذا اب ہم کو اس بحث کی ضرورت نہیں ہے جو علماء متقدمین کے مابین ہوتی تھی، کہ کیا نقدین میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملایا جائے گا۔ البتہ اس وقت ہمیں اس پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم نقدین سونے چاندی میں سے کس کے ذریعہ نصاب شرعی کی تحدید و تعیین کریں گے، یعنی غنی کی وہ ادنیٰ حد کیا ہوگی جس پر وجوب زکوٰۃ کا حکم ہوگا۔ اس گفتگو کی ضرورت اس بنا پر پڑی ہے کہ شارع نے سونے، چاندی کے لئے علیحدہ علیحدہ

---

[1] احکام الاوراق النقدیہ ص ۱۶ ۔ انظر بحث گنج سکیا سعا جدید ص ۲۳ ۔ مولانا احمد سعید لکھنوی ذخیرہ تطہیر الاموال ص ۲۱۹
[2] فقہ الزکوٰۃ ص ۲۶۵ ج ۱۔

نصاب مقرر کیا تھا، ایک کا نصاب دوسرے کے مخالف تھا۔ تو کیا ہم چاندی کو وجوب زکوٰۃ کا معیار قرار دیں گے۔

بہت سے معاصرین علماء کا اسی طرف میلان ہے اور اس میلان کی دو وجہ ہے۔

(۱) ـــ چاندی کا نصاب متفق علیہ ہے، اس کا ثبوت احادیث صحیحہ مشہورہ سے ہے۔

(۲) ـــ چاندی کو معیار قرار دینے اور اس کے ذریعہ تقدیر کی صورت میں فقراء کا زیادہ نفع ہے، کیونکہ زکوٰۃ کا معیار چاندی کو قرار دینے کی صورت میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پر زکوٰۃ واجب ہوگی[۱]

راقم الحروف کا بھی خیال یہی ہے کہ کاغذی نوٹوں پر وجوب زکوٰۃ اور نصاب شرعی کا معیار چاندی کو قرار دیا جائے گا۔ اور اس کی وجوہات وہی ہیں جو ما قبل میں گزریں۔ لہٰذا اس دور میں کسی کے پاس کاغذی نوٹ اتنی مقدار کو پہنچ گئے جن کے ذریعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کا خریدنا ممکن ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ زکوٰۃ کے وجوب میں ہمیشہ فقراء و مساکین کی منفعت کے پہلو کو پیش نظر رکھنا چاہیے، کیونکہ زکوٰۃ کی مشروعیت ہی فقراء کو نفع پہونچانے کے لئے ہوئی ہے۔

نوٹوں سے نوٹوں کا تبادلہ

اس دور میں نوٹوں سے نوٹوں کا تبادلہ ایک اہم ضرورت بن گئی ہے، بیرون ملک سفر کرنے، حج یا زیارت کے اسفار کی صورت میں بغیر تبادلہ کے چارہ کار نہیں رہتا۔

مولانا محمد تقی عثمانی نوٹوں سے تبادلہ پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"نوٹوں کا نوٹوں سے تبادلہ کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) ـــ ایک یہ کہ ایک ہی ملک کے مختلف مقدار کے نوٹوں کا آپس میں تبادلہ کیا جائے۔

(۲) ـــ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ملک کے کرنسی نوٹوں کا دوسرے ملک کے کرنسی نوٹوں سے تبادلہ کیا جائے۔

ملکی کرنسی نوٹوں کا آپس میں تبادلہ

موجودہ زمانے میں کاغذی کرنسی کا تبادلہ مساوات اور برابری کے ساتھ کرنا جائز ہے۔

---

[۱] فقہ الزکاۃ ص ۲۶۳ ج ۱۔

کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں۔

پھر یہ برابری کرنسی نوٹوں کی تعداد اور گنتی کے لحاظ سے نہیں دیکھی جائے گی، بلکہ ان نوٹوں کی ظاہری قیمت کے اعتبار سے دیکھی جائے گی جو اس پر تحریر شدہ ہوتی ہے۔ لہٰذا پچاس روپے کے ایک نوٹ کا تبادلہ دس دس روپے کے پانچ نوٹوں کے ذریعہ کرنا جائز ہے، اس تبادلہ میں اگرچہ ایک طرف صرف ایک نوٹ ہے۔ اور دوسری طرف پانچ نوٹ ہیں لیکن ظاہری قیمت کے لحاظ سے ان پانچ نوٹوں کے مجموعے کی قیمت پچاس روپے کے برابر ہے، اس لئے کہ یہ نوٹ اگرچہ عددی ہیں، لیکن ان نوٹوں کے آپس میں تبادلہ اور بیع کرنے سے بذات خود وہ نوٹ یا ان کی تعداد مقصود نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کی صرف وہ ظاہری قیمت مقصود ہوتی ہے جس کی وہ نوٹ نمائندگی کرتا ہے، لہٰذا مساوات اس کی قیمت میں ہونی چاہیے۔ [1]

مختلف ممالک کے کرنسی نوٹوں کا آپس میں تبادلہ

پھر غور کرنے سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ ایک ہی ملک کے مختلف سکے اور کرنسی نوٹ ایک ہی جنس ہیں، اور مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف الاجناس ہیں، اس لئے کہ موجودہ دور میں سکے اور کرنسی نوٹوں سے ان کی ذات اور ان کا مادہ مقصود نہیں ہوتا بلکہ آج کے دور میں کرنسی قوت خرید کے ایک مخصوص معیار سے عبارت ہے۔ اور ہر ملک نے چونکہ اپنے یہاں کی کرنسی کا الگ الگ معیار مقرر کیا ہے۔ مثلاً پاکستان میں روپیہ، سعودی عرب میں ریال، امریکہ میں ڈالر، اور ظاہر ہے کہ یہ معیار ملکوں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے۔ اس وجہ سے کہ ہر ملک کی کرنسی کی حیثیت کا تعین اس ملک کی قیمتوں کے اشاریہ اور اس کی درآمدات وبرآمدات وغیرہ کی بنیاد پر ہوتا ہے اور کوئی ایسی مادی چیز موجود نہیں ہے جو ان مختلف معیارات کے درمیان کوئی پائیدار تناسب قائم رکھے بلکہ ہر ملک کے اقتصادی حالات کے تغیر واختلاف کی وجہ سے اس تناسب میں ہر روز بلکہ ہر گھنٹے تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا ان مختلف ممالک کی کرنسیوں کے درمیان کوئی ایسا پائیدار تعلق نہیں پایا جاتا جو ان سب کو جنس واحد بنادے، کچھ سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] احکام الاوراق النقدیہ ص ۲۱

"لہذا جب ان کے درمیان کوئی ایسی معین نسبت جو نفس کو متحد کرنے کے لئے ضروری تھی نہیں پائی گئی تو تمام ممالک کی کرنسیاں آپس میں ایک دوسرے کے لئے مختلف الاجناس ہو گئی، یہی وجہ ہے کہ ان کے نام، ان کے پیمانے اور ان سے بھنائے جانے والی اکائیاں (ریزگاریاں) بھی مختلف ہوتی ہیں۔

اور جب مختلف ممالک کی کرنسیوں کا مختلف الاجناس ہونا واضح ہوگیا۔ تو ان کے درمیان کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ بالاتفاق جائز ہے، حضرت امام شافعی کے نزدیک جواز کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک ایک ہی ملک کے سکے کا تبادلہ دو سکوں سے کرنا جائز ہے، تو مختلف ممالک کے سکوں کے درمیان کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ بطریق اولیٰ جائز ہوگا، حنابلہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ اور امام مالکؒ کے نزدیک کرنسی نوٹ اگرچہ اموال ربویہ میں سے ہے۔ لیکن اموال ربویہ میں جب جنس مختلف ہوجائے تو ان کے نزدیک بھی کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز رہتا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک ایک فلس کا دو فلسوں (پیسوں) سے تبادلہ اس وجہ سے ناجائز تھا کہ وہ سکے آپس میں بالکل برابر اور مساوی تھے۔ جس کی بنا پر تبادلہ کی صورت میں ایک سکہ بغیر عوض کے خالی رہ جاتا تھا، لیکن اب مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف الاجناس ہونے کی بنا پر ہم شکل برابر نہ رہیں، اس لئے ان کے درمیان کمی زیادتی کے ساتھ تبادلے کے وقت کرنسی کے کسی حصہ کو خالی عن العوض نہیں کہا جاسکتا، اور جب کوئی سکہ خالی عن العوض نہیں رہا تو کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ بھی جائز قرار پائے گا۔ لہذا ایک سودی ریال کا تبادلہ ایک سے زائد پاکستانی روپیوں سے کرنا جائز ہے[1]۔

خلاصۂ مباحث

(۱) موجودہ دور میں کاغذی نوٹ "ثمن عرفی" ہیں۔

(۲) لہذا بعینہ انہیں نوٹوں پر وجوب زکوٰۃ ہوگا۔

(۳) اور انہیں نوٹوں کے ذریعہ ادائے گی زکوٰۃ درست ہوگی، اور جیسے ہی فقیر اسے اپنے قبضہ میں لے گا زکوٰۃ کی ادائے گی ہوجائے گی۔

---

[1] احکام الاوراق النقدیہ صفحہ ۲۲-۲۰۔

(۴) نوٹوں پر وجوب زکوٰۃ کے لئے معیار چاندی کا نصاب" قرار پائے گا اور جب کسی کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کے بقدر نوٹ جمع ہو جائیں گے تو زکوٰۃ واجب ہو گی۔

(۵) ان نوٹوں کے ذریعہ عورت کو مہر دینا، مزدور کو مزدوری دینا، اور اس قسم کے جتنے بھی وظائف واحکام سونے چاندی کے سکوں کے ہیں وہی وظائف واحکام ان نوٹوں کے بھی ہوں گے۔

(٦) ایک ہی ملک کے مختلف نوٹوں کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

(۸) مختلف ممالک کی کرنسیوں کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ بھی جائز ہے۔



نوٹ کی شرعی حیثیت اور اس کے احکام

از: ———— مولانا ابوالحسن علی دارالعلوم ماٹلی والا، گجرات

نوٹ بلاشبہ اپنے ابتدائی دور میں قانوناً اور رواجاً حوالہ اور سند کی حیثیت رکھتا تھا اسی وجہ سے علماء سلف نے اپنے اپنے فتاوی اور تحریرات میں اس کو سند اور حوالہ ہی قرار دیا ہے اور اسی لحاظ سے مسائل کا استخراج بھی کیا ہے، مگر جیسے جیسے حالات بدلتے گئے عرف ورواج بھی بدلتے گئے اور اب نوٹ عرف ورواج میں سند وحوالہ نہیں سمجھے جاتے ہیں اور نہ حکومتوں ہی کا معاملہ اب اس کے ساتھ حوالہ اور سند کا رہا گو اب بھی نوٹ پر اس قسم کی عبارت لکھی ہوئی ہوتی ہے "کہ حکومت اس نوٹ کے حامل کو اس کی مقدار میں روپیہ یا درہم ودینار یا پونڈ وڈالر ادا کرنے کی ذمہ دار ہے"۔ لیکن اب یہ عبارت بھی بے کار ہی ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ اب کوئی بھی حکومت اس نوٹ کے عوض سونے یا چاندی کے اصل سکے یا سونے چاندی کی وہ مقدار ادا کرنے کو تیار نہیں اور یہ بات اب واضح ہو چکی ہے کہ حکومت کی طرف سے جاری کئے گئے نوٹ کا رشتہ اب سونے چاندی کے ساتھ باقی نہیں رہا ہے بلکہ موجودہ دور میں اب اس کی حیثیت مستقل ثمن کی ہو چکی ہے اور کاغذی نوٹ اب درہم ودینار کی جگہ لے چکا ہے اور یہ ایک بین الاقوامی عرف ورواج بن چکا ہے اور شریعت میں عرف عام کا اعتبار کیا گیا ہے چنانچہ شریعت کا یہ اصول کہ "مَا ثَبَتَ بِالْعُرْفِ کَمَا ثَبَتَ بِالنَّصِّ" مشہور و معمول ہے، اس لئے میری رائے ہے کہ موجودہ کرنسی نوٹ کو درہم ودینار کی جگہ ثمن قرار دینا چاہئے۔

چنانچہ مہر اور قرض وغیرہ کی ادائیگی میں نوٹ پر درج شدہ قیمت ہی کا اعتبار ہوگا اور آج کے علماء معاشیات کی مفروضہ اصطلاح یعنی کرنسی کی حقیقی قیمت جس کو اشاریہ سے مربوط کرکے یقینی طور پر طے کر لیا جاتا ہے شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ آج کی کرنسی تمام معاملات مثلاً سود جاری ہونے زکوۃ واجب ہونے، بیع سلم، مضاربت اور شرکت وغیرہ کا راس المال بننے میں نقدین ہی کی طرح ہوگی اور

جس طرح کہ نقدین یعنی دراہم ودینار کی قیمت کے بڑھنے اور گھٹنے کا شرعاً اعتبار نہیں کیا جاتا ہے اسی طرح کرنسی نوٹ کے افراط زر اور تفریط زر کے وقت قیمتوں میں کمی بیشی کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اور پھر ہو یا قرض اس کی ادائیگی میں مقدار معینہ کی ادائیگی ہی کو کافی قرار دیا جائے گا اس لئے کہ قرض کی ادائیگی میں قرآن وحدیث کی روشنی میں تمام فقہاء کرام کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ مقدار میں قطعی مثلیت اور برابری ہونا ضروری ہے الکل اور اندازہ سے واپس کرنا جائز نہیں ہے یہاں تک کہ اگر ایک شخص نے ۵ کیلو گیہوں بطور قرض لیا اور واپسی کے لئے یہ شرط لگایا کہ اندازہ کے ساتھ بغیر ناپ ووزن کے ۵ کیلو گیہوں واپس کروں گا تو قرض کا یہ معاملہ قطعاً ناجائز ہوگا اس لئے کہ گیہوں اموال ربویہ میں سے ہے اور اموال ربویہ میں اندازہ اور تخمین سے واپس کرنا جائز نہیں ہے چنانچہ اسی وجہ سے احادیث میں بیع مزابنہ کو حرام قرار دیا گیا ہے یعنی درخت پر لگے ہوئے کھجور کو ٹوٹے ہوئے کھجور کے بدلہ میں بیچنا ناجائز ہے اور اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ درخت پر لگی ہوئی کھجور کے وزن کو معلوم کرنے کا طریقہ اندازہ اور تخمین پر مبنی ہے گو کہ وہ اندازہ کبھی کبھی بالکل صحیح بھی ہوجاتا ہے لیکن پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع مزابنہ کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اموال ربویہ میں بعض کو بعض کے ساتھ تبادلہ کا طریقہ صرف یہی ہے کہ مقدار میں برابری اور مثلیت موجود ہو۔

اور جو حضرات قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ مربوط کرتے ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرض خواہ کو قرض کے برابر ہی روپیہ نہ ملے بلکہ قیمتوں کے اشاریہ میں اشیاء کی قیمت میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہے اسی تناسب سے قرض میں اضافہ کرکے واپس کیا جائے ورنہ قرض خواہ کا نقصان ہوگا مثال کے طور پر اگر ایک شخص نے ایک ہزار روپیہ کسی سے قرض لیا اور قرض کی واپسی کے وقت قیمتوں کے اشاریہ میں اگر ۱۰ فی صد کے حساب سے اضافہ ہوچکا ہے تو اب قرضدار بھی قرض خواہ کو قرض میں ۱۰ فی صد اضافہ کرکے گیارہ سو روپے واپس کرے

قرض کے قیمتوں میں اشاریہ سے ربط وتعلق کے جواز کے قائلین کہتے ہیں کہ یہ زیادتی جو قرضدار قرض خواہ کو واپس کررہا ہے یہ حقیقی زیادتی نہیں ہے بلکہ وہ اسی مالیت کو واپس کررہا ہے جو قرضدار نے قرض خواہ سے لیا تھا اس لئے کہ ایک ہزار روپے کی قوت خرید قرض لیتے وقت زیادہ تھی اور قرض کی واپسی کے وقت قوت خرید ۱۰ فیصد کے حساب سے کم ہوگئی تو اب اگر اسی صورت میں اس نے اس کو وہ پوری مالیت واپس نہیں کی جو اس نے قرض لیا تھا بلکہ وہ قرض کی مالیت کو کم کرکے واپس کررہا ہے لیکن اگر قرضدار پر یہ لازم کردیا جائے کہ وہ ایک ہزار کے بجائے گیارہ سو روپے واپس کرے تو یہ گیارہ سو روپے اس کی کل

مالیت ہوگی۔ اس لئے کہ گیارہ سو روپے کی مالیت قرض کے واپسی کے وقت بعینہ وہی مالیت ہے جو قرض لیتے وقت ایک ہزار کی تھی لہٰذا یہ سو روپے کی زیادتی اسی نقصان کی تلافی ہے جو نوٹ کی قیمت میں کمی کی صورت میں واقع ہوئی ہے اور اس سو روپے کی زیادتی سے قرض کی مالیت میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے اس لئے اس زیادتی کو سود کہہ کر حرام نہیں کہہ سکتے ہیں، لیکن غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس زیادتی کو زائد قرار دینا شرعی حیثیت سے کسی طرح بھی درست نہیں ہے، اس لئے کہ شریعت میں قرضوں میں مقدار کے اندر مثلیت یعنی برابری ضروری ہے اور قرضدار پر اسی مقدار میں قرض کی واپسی ضروری ہے جو اس نے قرض خواہ سے لیا ہے اور اسی مقدار میں مساوات کا مطلب ہے، ناپ، وزن اور عدد میں مثلیت اور برابری نہ کہ قیمت اور مالیت میں مساوات و مثلیت، مثال کے طور پر دیکھئے کہ اگر زید عمرو سے دو کیلو گیہوں بطور قرض لیتا ہے اور مان لیجئے کہ قرض لیتے وقت دو کیلو گیہوں کی قیمت ۷ روپے تھی اور جب زید عمرو کو دو کیلو گیہوں واپس کر رہا ہے تو اس وقت دو کیلو گیہوں کی قیمت کم ہو کر ۳ روپے ہو گئی تو اب زید عمرو کو وہی دو کیلو گیہوں واپس کرے گا زیادہ نہیں دیگا حالانکہ دو کیلو گیہوں کی مالیت اور قیمت کم ہو کر صرف ۳ روپے ہو گئی ہے۔ یہاں فقہاء میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا ہے کہ اس صورت میں صرف دو کیلو گیہوں واپس کرنا قرض خواہ پر ظلم ہوگا، لہٰذا گیہوں کی قیمت میں جتنی کمی ہوئی ہے اسی حساب سے گیہوں اضافہ کر کے واپس کرنا چاہئے یعنی دو کیلو گیہوں کے بجائے چار کیلو گیہوں واپس کرنا چاہئے اس لئے کہ واپسی کے وقت چار کیلو گیہوں کی مالیت اب وہی ہے جو قرض لیتے وقت دو کیلو گیہوں کی قیمت و مالیت تھی۔

ظاہر ہے قرض میں اس طرح کی زیادتی ربوا کو مستلزم ہے جو حرام ہے اور ربوا کو حلال قرار دینے کی کوئی بھی جرأت نہیں کر سکتا ہے۔

بہرحال اوپر کی مثال سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قرض میں جو مثلیت اور برابری شریعت اور عرف میں معتبر ہے وہ مقدار میں برابری ہے نہ کہ قیمت اور مالیت میں۔

اس سلسلے میں بخاری اور مسلم شریف کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے جس کو ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو خیبر کا عامل بنا کر وہاں زکوٰۃ عشر وغیرہ وصول کرنے کے لئے بھیجا وہ آدمی جب واپس آیا تو اس نے آپ کی خدمت میں عمدہ قسم کی کھجور پیش کیا حضورؐ نے دیکھ کر سوال کیا کہ

کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں تو انھوں نے جواب دیا نہیں بلکہ ہم نے اس عمدہ کھجور کے ایک صاع کو گھٹیا کھجور کے دو صاع کے بدلے میں اور دو صاع عمدہ کھجور کو تین صاع گھٹیا کھجور کے بدلے میں تبدیل کرلیا ہے تو حضور نے فرمایا ایسا نہ کرو بلکہ تمام کھجور یعنی ملی جلی کھجور کو پہلے دراہم و دینار کے عوض میں فروخت کرلو اور پھر ان دراہم سے عمدہ کھجور خرید لو۔ بخاری جلد اول ص۲۹۳ مسلم شریف جلد ثانی ص۲۴ بعض روایت میں آپ نے اس کو صاف طور سے ربا قرار دیا ہے اور پھر منع فرمایا ہے۔ اس قسم کی روایتیں کثرت سے مروی ہیں جس سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ اموال ربویہ کے تبادلہ وغیرہ میں جو تماثل اور مساوات شرعًا مطلوب ہے وہ مقدار میں تماثل ہے نہ کہ قیمت اور مالیت میں کیونکہ یہاں آپ نے اس کھجور کو جو عمدہ قسم کی تھی جمیع یعنی مخلوط کھجور کے ساتھ تبادلہ میں وزن کی برابری کا لحاظ فرمایا اور اس میں عمدہ اور گھٹیا ہونے کا اعتبار نہیں کیا۔

اس حدیث کے علاوہ یہاں اس حدیث کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے جو تقریبًا تمام ہی حدیث کی کتابوں میں موجود ہے میں یہاں اس حدیث کا بھی صرف ترجمہ ہی پیش کرتا ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا درہم کی بیع درہم کے ساتھ اور دینار کی بیع دینار کے ساتھ برابر برابر کرو اس میں کمی زیادتی نہیں ہے۔

اسی طرح قرض میں بھی خاص طور پر مثلیت اور برابری کی شرط کو ابوداؤد شریف کی مندرجہ ذیل حدیث واضح طور پر ثابت کرتی ہے حدیث درج ذیل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ میں مقام بقیع میں اونٹ بیچا کرتا تھا تو کبھی دیناروں کے ذریعہ بھاؤ کرکے اونٹ بیچتا اور بجائے دینار کے مشتری سے دراہم لے لیتا اور کبھی دراہم کے ذریعہ قیمت طے کرکے ان دراہم کے بدلے مشتری سے دینار حاصل کرلیتا تھا اسی طرح ادا کرتے وقت بھی دراہم کے بدلے دینار اور دینار کے بدلے دراہم ادا کرتا۔ پھر میں ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر پر تھے تو میں نے حضور سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ذرا ٹھہرئے میرا ایک سوال ہے اور وہ یہ کہ میں مقام بقیع میں اونٹ بیچتا ہوں تو کبھی دیناروں کے ذریعہ بیچتا ہوں اور اس کے بدلے دراہم وصول کرتا ہوں اور کبھی دراہم کے ساتھ بیع کرکے اس کے بدلے دینار حاصل کرتا ہوں اور ادا کرتے وقت بھی دراہم کے بدلے دینار اور دینار کے بدلے دراہم ادا کرتا ہوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اس طرح معاملہ کرتے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ اسی دن کے بھاؤ کے برابر لو اور تم دونوں یعنی بائع اور مشتری کے درمیان

اس حالت میں جدائیگی عمل میں آئے کہ تمہارے درمیان کوئی لین دین باقی نہ رہے سنن ابی داؤد کتاب البیع جلد ۲ صفحہ ۱۲۰ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمر کے لئے اس بات کو جائز رکھا کہ جب بیع دینار کے ذریعہ ہو اور اس کی جگہ درہم وصول کر لیا جائے تو ادائیگی کے دن جو اس کی قیمت ہو اسی قیمت کے برابر درہم لیا جائے اور جس دن دینار ذمہ میں واجب ہوا ہو اس دن کی قیمت کا اعتبار نہ کیا جائے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ دینار کی ادائیگی کے دن کی قیمت کا اعتبار ہے اور جس دن وہ ذمہ میں واجب ہوا تھا اس دن کی قیمت کا بالکل اعتبار نہیں ہے اب اگر قرضوں میں قیمت کے اعتبار سے مثلیت اور برابری معتبر ہوتی تو ان کے ذمہ دینار کی وہ قیمت واجب ہونی چاہیئے جو قیمت ذمہ میں واجب ہونے کے دن تھی۔

دوسری بات یہ بھی یہاں قابل غور ہے کہ اگر قرضوں وغیرہ کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ مربوط کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرض کی ادائیگی میں واقعی اور حقیقی مثلیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ ایک تخمینی مثلیت پر اس کی بنیاد قائم کی جائے گی اس لئے کہ اشیاء کی قیمتوں میں زیادتی اور کمی کا جو حساب نکالا جاتا ہے وہ محض تقریبی اور تخمینی ہی ہوتا ہے اور یہ بات قیمتوں کے اشاریہ کو وضع کرنے کا جو طریقہ معاشین کے یہاں رائج ہے اور کرنسی کی قیمت کی تعین میں جو طریقہ مشتمل ہے اس پر غور کرنے سے واضح ہو جاتی ہے اور اس کی جانکاری حاصل کرنے کے لئے علمائے معاشین کی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے، اور اس وقت یہاں اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں ہے،

بہر حال دیون یعنی موخر مطالبوں میں جیسے قرض، مہر، پنشن اور ادھار خریداری کی رقم کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے متعلق کرنا نہ تو شرعاً جائز ہے اور نہ قیمتوں کے اشاریہ کے ذریعہ ادائیگی کے لئے کوئی منضبط یقینی قاعدہ ہے اور جو دقیق فنی قاعدے اس سلسلہ میں بیان کئے جاتے ہیں وہ عوام الناس کے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں جس کی وجہ سے عوام الناس کے درمیان قرض کی ادائیگی کے لئے قیمتوں کے اشاریہ کو معیار قرار دینا ایک مستقل تنازع کا سبب بھی بن جائے گا اس کے علاوہ اسی طریقہ کار سے سود کا دروازہ بھی کھل جائے گا لہٰذا شرعی نقطہ نظر سے قیمتوں کے اشاریہ کا اعتبار نہ کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔

اب رہی یہ صورت کہ نوٹ قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کی صورت میں طرفین واجب الادا نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں اور ادائیگی کے وقت اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹ ادا کرنے پر معاملہ طے کر لیں تو یہ صورت بھی شرعاً

جائز نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں نقد بن کے اندر ربا النسیئہ کی صورت لازم آتی ہے جو حرام ہے اور اس حدیث کے خلاف ہے جس کو امام مسلم نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سونے کو سونے کے بدلے میں اور چاندی کو چاندی کے بدلے میں، گیہوں کو گیہوں کے بدلے میں، جو کو جو کے بدلہ میں کھجور کو کھجور کے بدلہ میں اور نمک کو نمک کے بدلہ میں برابر کر کے ہاتھ در ہاتھ بیچو، ہاں اگر جنس بدل جائے تو پھر جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ ہاتھ در ہاتھ ہو یعنی نقد ہو ادھار نہ ہو۔ (مسلم شریف جلد ثانی ص۲۵)

اسی حدیث سے مذکورہ بالا صورت کا عدم جواز ثابت ہو رہا ہے کیونکہ اس میں نقد کا معاملہ نہیں بلکہ ادھار کا معاملہ ہے اس کے علاوہ ان صورتوں میں بیع الدین بالدین کی صورت بھی لازم آرہی ہے جو ممنوع ہے۔

البتہ یہاں ایک اور بات بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ کیا اجیر کی اجرتوں کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کرنا جائز ہے یا ناجائز ہے؟ غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اجرت جب تک قرض نہ بن جائے تب تک تو اس کا حکم قرضوں کے اشاریہ سے ربط والے حکم سے مختلف ہوگا اور جب اجرت قرض بن جائے گا تو پھر اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو قرضوں کے اشاریہ سے ربط کا حکم ہے اور اس کی تفصیل اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اجرتوں کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ مربوط کرنے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً ایک صورت یہ ہے کہ تنخواہوں کو نوٹوں کے ذریعے طے کیا جائے کہ اتنی اجرت یعنی تنخواہ دی جائے گی اور پھر متعاقدین یعنی مالک و مزدور کے درمیان یہ معاہدہ بھی ہو جائے کہ تنخواہ ہر سال کے شروع میں قیمتوں کے اشاریہ کے زیادتی کے تناسب سے بڑھتی رہے گی مثلاً حکومت یا کوئی کمپنی یا ادارہ تین ہزار ماہوار پر ایک ملازم رکھے اور اس ملازم سے یہ معاہدہ طے ہو جائے کہ ہر سال کے شروع میں قیمتوں کے اشاریہ کے تناسب سے تمہاری تنخواہ بڑھتی رہیگی اس صورت میں اجیر مذکور کی تنخواہ تو فی الحال تین ہزار روپے ماہوار ہے اب وہ سال بھر تک تو کچھ بول نہیں سکتا ہے مگر سال کے آخر میں جب کہ نیا سال شروع ہوگا تو اس وقت قیمتوں کے اشاریہ کو دیکھا جائے گا کہ ایک سال میں اس کے اندر کس تناسب سے زیادتی ہوئی ہے اب اگر مان لیا جائے کہ اس درمیان قیمتوں کے اشاریہ میں ۱۰فیصد کے تناسب سے زیادتی ہوئی ہے تو اس ملازم کی تنخواہ میں بھی نیا سال شروع ہوتے وقت اسی تناسب سے زیادتی ہو جائے گی لہٰذا اب نئے سال سے اس کی تنخواہ تین ہزار تین سو ہو جائے گی۔

شرعاً یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ دونوں فریق ہر سال کے شروع میں ایک معین تناسب سے تنخواہ میں زیادتی پر متفق ہو گئے ہیں البتہ اس زیادتی کا تناسب عقد کے وقت کسی کو معلوم نہیں ہے مگر ساتھ ہی دونوں کو وہ پیمانہ معلوم ہے جس کی بنیاد پر تناسب کا تعین ہو سکتا ہے اس لئے زیادتی کی مقدار میں جہالت کا جو شبہ تھا وہ مرتفع ہے اور فی الجملہ جہالت سے عقد اجارہ فاسد نہیں ہوتا ہے لہٰذا عقد اجارہ کی یہ صورت شرعاً جائز ہونی چاہئے۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ اجرت کی تعین نوٹوں کے ایک معلوم مقدار پر ہو جائے لیکن عقد میں یہ شرط طے ہو جائے کہ مالک کے ذمہ یہ مقدار معلوم واجب نہیں بلکہ اس کے ذمہ وہ مقدار واجب ہوگی جو قیمتوں کے اشاریہ کے حساب سے مہینہ کے آخر میں اس مقدار معلوم کے مساوی ہوگی مثلاً ایک شخص نے زید کو ملازم رکھا اور یہ طے کیا کہ مہینہ کے آخر میں قیمتوں کے اشاریہ کے حساب سے اتنی رقم اجرت یعنی تنخواہ دے گا جو اس ماہ کے شروع کے ایک ہزار روپے کے برابر ہوگا۔ اب قیمتوں کے اشاریہ میں ۵ فیصد کا اضافہ اس ماہ کے آخر تک ہو گیا تو اب مالک پر یہی واجب ہوگا کہ زید کو مہینہ کے آخر میں ۵ فیصد اضافہ کر کے کل ایک ہزار پچاس روپے تنخواہ دے کیونکہ یہ ایک ہزار پچاس شروع ماہ کے ایک ہزار کے برابر ہے البتہ اب جب کہ اس کی تنخواہ ایک ہزار پچاس روپے طے ہو چکی تو اب آئندہ ہمیشہ کے لئے اس کی یہی تنخواہ مقرر ہو چکی ہے اب اس میں اضافہ نہیں ہوگا یہاں تک کہ اگر مالک کسی ماہ کے آخر میں اس کو یہ تنخواہ نہ دے اور مہینہ گزر جائے یا اس سے بھی زیادہ مثلاً چھ ماہ گزر جائے یا ایک سال گزر جائے اور اب سال گزرنے کے بعد اگر مالک اس کو تنخواہ دے گا تو اسی ایک ہزار پچاس روپے ماہوار کے حساب سے ہی دے گا اس درمیان قیمتوں کے اشاریہ میں جو اضافہ ہوا ہوگا تنخواہ میں اس کے تناسب سے اضافہ نہیں ہوگا کیونکہ دونوں کے درمیان پہلے ہی یہ طے ہو چکا ہے کہ مہینہ کے آخر میں جتنے روپے موجودہ ایک ہزار کے برابر ہوں گے وہی دیئے جائیں گے اور اس کے تعین کے لئے قیمتوں کے اشاریہ کو سامنے رکھا جائے گا اور جب مہینہ کے آخر میں قیمتوں کے اشاریہ کے حساب سے ایک مرتبہ تنخواہ طے ہو گئی تو اب قیمتوں کے اشاریہ میں کچھ بھی تغیر ہو تنخواہ میں اس سے کمی زیادتی نہ ہوگی کیونکہ تنخواہ کی رقم مالک کے ذمہ قرض ہے اور قرض کی ادائیگی میں قیمتوں کے اشاریہ کا اعتبار نہیں ہے۔

اجارہ کی یہ مذکورہ صورت بھی جائز ہو سکتی ہے بشرطیکہ متعاقدین کو قیمتوں کے اشاریہ کے حساب سے اچھی طرح واقفیت حاصل ہو تاکہ آپس میں نزاع کی صورت پیدا نہ ہو۔

تیسری صورت یہاں ایک اور بھی ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ اجرت روپے کی متعین مقدار کے ذریعہ طے ہو جائے مثلاً زید اور عمر کے درمیان یہ طے ہوگیا کہ زید عمرو کو ایک ہزار روپے ماہوار تنخواہ دیگا اور زید کے ذمہ بھی ایک ہزار روپے واجب ہوگا مگر دونوں اس بات پر بھی متفق ہو جائیں کہ جس دن زید عمرو کو تنخواہ ادا کرے گا اسی دن قیمتوں کے اشاریہ میں جس قدر اضافہ ہوا ہوگا اسی تناسب سے وہ ایک ہزار روپے میں بھی اضافہ کر دیگا۔ اب اگر مہینے کے آخر میں تنخواہ دیگا تو دیکھا جائے گا کہ قیمتوں کے اشاریہ میں کس تناسب سے اضافہ ہوا ہے اب اگر بالفرض ۲ فی صد اضافہ ہوا ہو تو زید بھی عمرو کو ۲ فیصد اضافہ کر کے تنخواہ ادا کرے گا یعنی ایک ہزار بیس روپے دے گا۔ لیکن اگر مالک یعنی زید نے عمرو کو یہ تنخواہ مہینے کے آخر میں نہیں دیا اور سال بھر گزر گیا تو ظاہر ہے تنخواہ زید کے ذمہ قرض ہوگیا اور اگر اب وہ سال گزرنے کے بعد تنخواہ ادا کرتا ہے اور اس وقت تک قیمتوں کے اشاریہ میں ۱۰ فیصد کا اضافہ ہو چکا ہے تو وہ تنخواہ میں بھی ۱۰ فیصد کا اضافہ کر کے ادا کرے گا اور شرعی نقطہ نظر سے یہ صورت ناجائز ہے کیونکہ یہاں بھی قرض کو قیمتوں کے اشاریے کے ساتھ مربوط کیا گیا جو ناجائز ہے جیسا کہ پہلے اس کو تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں اجرت بھی اس صورت میں مجہول ہو جاتی ہے جو مفسد اجارہ ہے۔



کرنسی نوٹ
ایک تحقیقی جائزہ

از — مولانا القمر۔ امام عادل دارالعلوم دیوبند

قدیم زمانے میں سونا اور چاندی کے سکے رائج تھے جن کو دینار و درہم کہا جاتا تھا۔ لیکن مختلف تاریخی اسباب کی بناپر سونا چاندی کے سکوں کا رواج اٹھتا گیا۔ اور ان کی جگہ کرنسی نوٹوں نے لے لی، نوٹ درحقیقت حکومت کی جانب سے ایفائے عہد کی ایک رسید ہے۔ کہ اس پر رقم کی جو مقدار تحریر کی گئی ہے اس کے بقدر سونا یا چاندی نوٹ کا مالک کسی بھی وقت حکومت سے لے سکتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت دنوں تک اسے وثیقہ زر ہی کی حیثیت حاصل رہی۔ اور اسی کے مطابق فتوے بھی دیئے جاتے رہے —— لیکن اب جبکہ سونا چاندی کا رواج بالکل ختم ہوگیا۔ اور زندگی کے تمام کاروبار کرنسی نوٹوں ہی سے چلنے لگے، اس لئے اب اسے صرف وثیقہ محض کی حیثیت دینا مشکل ہوگیا۔

(۱)

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت

اتنی بات تو مسلم ہے کہ نوٹ، سونا چاندی کے مماثل نہیں ہیں، تاہم یہ غور طلب ضرور ہے کہ سونا چاندی کو جو نقدیت اور ثمنیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کا مفہوم اور اس کے بنیادی عناصر کیا ہیں؟

مفہوم اور عناصر سونا چاندی فی نفسہٖ کوئی مفید چیز نہیں ہیں، وہ تو پتھر ہیں۔ نہ انہیں کھایا پیا جا سکتا ہے، اور نہ پہنا جا سکتا ہے۔ لیکن محض کمیابی، اور خوبصورتی کی بنا پر ان کی وقعت وعزت دلوں میں پیدا ہوئی، اور پھر وہ ایک ذریعۂ تبادلہ، اور پیمانۂ قیمت بن گئے —— اس لئے غور کرنا چاہئے، کہ نقدیت وثمنیت کا حقیقی مفہوم، اور اس کے بنیادی عناصر کیا ہیں؟ ثمن کی تعریف یہ کی گئی ہے۔

الثمن ما يثبت في الذمة بدلاً من البياعات من الدراهم والدنانير[1]

خرید و فروخت میں جو کچھ بطور بدل کے خریدنے والے کے ذمہ آتا ہے، خواہ وہ درہم ہو یا دینار وہی ثمن ہے۔

اس کے بنیادی عناصر کا جدید ماہرینِ اقتصادیات نے اپنی تعریفوں میں ذکر کیا ہے، انھوں نے نقد کی تعریف یہ کی ہے۔

النقد ما يستخدم وسيطاً للتبادل ومقياساً للقيم ومخزوناً للثروة ومعياراً للمدفوعات الآجلة من الديون[2]

نقد ہر وہ چیز ہے جو ذریعۂ تبادلہ، اور قیمتوں کے لئے پیمانہ ہو، اور حصولِ ثروت کے لئے اس کا جمع کرنا ممکن ہو، اور موخر حقوق و مطالبات کے لئے معیار ہو۔

اس تعریف کی روشنی میں نقد کے چار پہلو روشن ہوتے ہیں۔

(۱) نقد ذریعۂ تبادلہ ہوتا ہے۔ ہر انسان کو زندگی میں مختلف چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن ہر چیز ہر ایک کے پاس ہونا ضروری نہیں، ایک چیز ایک شخص کے پاس ہے۔ تو دوسرے کے پاس نہیں، اور دوسرے کے پاس جو چیز ہے وہ اس کے پاس نہیں ——— اس وقت ایک دوسرے سے تبادلہ کی صورت کیا ہوگی؟ سامان کو ذریعۂ تبادلہ بنایا جا سکتا ہے' لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر آدمی کو ہر سامان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور نہ ہر ایک کا ہر سامان پر راضی ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے سونا چاندی کو ذریعہ تبادلہ کے طور پر پیدا فرمایا، اور ہر انسان کے دل میں ان دونوں کی محبت و عظمت ایسی ڈال دی کہ اپنے اندرونی تقاضے سے ہر آدمی اس کے لینے پر مجبور ہو جاتے، چنانچہ شروع سے لیکر آج تک یہ قابل قدر ہے، اور معنوی حیثیت سے اب تک یہی ذریعہ تبادلہ ہے۔

(۲) نقدیت کا دوسرا عنصر پیمانۂ قیمت ہونا ہے۔ کہ سامانوں کی قیمتوں کا معیار کیا ہو؟ اگر اس کے لئے کوئی معیار اور پیمانہ مقرر نہ ہو۔ تو ہر آدمی اپنے اندازے اور مفاد کے مطابق قیمتوں کا تقرر کرے گا جس سے نزاع کی صورت پیدا ہوگی۔ مثلاً ایک اونٹ کی قیمت، سامان اور دیگر اشیاء سے کیا ہو؟ کوئی کہے گا کہ سو کوئنٹل اناج اس کی قیمت ہونی چاہیئے، اور کوئی کہے گا کہ ہزار کوئنٹل اناج۔ غرض جتنی زبانیں اتنے جوابات ہوں گے۔ اس وقت انسان قیمتوں کے لئے

---

[1] احکام القرآن للجصاص ص ۱۲ ۱۲ [2] الحضارۃ الاسلامیۃ ص ۳۲۰ ج ۲ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ۱۲

کسی مقیاس و پیمانہ کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ خدا نے اپنے فضل سے سونا چاندی کو پیمانہ و معیار مقرر فرمایا۔ یعنی اونٹ کی قیمت اب سونا چاندی سے نکلنی چاہئے، نہ کہ کسی اور سامان سے۔

(۳) تیسرا عنصر قابل مخزون ہونا ہے۔ ہر انسان اپنی آئندہ زندگی کے لئے مختلف آرزوؤں کے تحت کچھ مال جمع کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ پوری زندگی آرام کے ساتھ گذار سکے، لیکن اس کے پاس موجودہ سامانوں میں سے کوئی اسکے اس ارادہ کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہے، اس لئے کہ انسان کے پاس آنے جانے والے سامانوں میں سے ہر ایک معمولی زندگی لے کر آتا ہے۔ چند دنوں کے بعد ہی وہ خراب ہونے لگتا ہے، اس وقت انسان کے مالدار اور خوشحال زندگی گذارنے کی صورت کیا ہوگی؟ اور وہ اپنے مستقبل کے لئے شاندار اقدام کس طرح کرے گا؟ خدا نے اسی مشکل کے حل کے طور پر سونا چاندی کو پیدا کیا، جو نہ خراب ہوتے ہیں، اور نہ عموماً کسی تغیر کے شکار ہوتے ہیں۔

(۴) نقدیت کا چوتھا اور آخری عنصر مؤخر حقوق و مطالبات کے لئے معیار ہونا ہے، یعنی قرض، مہر وغیرہ دوسرے مؤجل معاملات میں سونا چاندی ہی معیار ہیں، جیسا کہ عرف عام بھی یہی ہے۔ کوئی بھی آدمی ان مطالبات میں کسی سامان کو معیار نہیں بناتا ـــــ اس لئے کہ معیار صرف وہی چیز بن سکتی ہے۔ جو تغیر و تبدل سے پاک ہو۔ دوسرے تمام سامان چند دنوں کے بعد تغیر و تبدل کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اس کے برخلاف سونا چاندی عام طور پر تغیر و تبدل سے پاک رہتے ہیں۔

نقدیت و ثمنیت کے یہ وہ چار عناصر ہیں۔ جن کی بنا پر سونا چاندی کو نقد اور ثمن قرار دیا گیا ہے۔

نقد کے اجزائے تعریفی کی تعیین و تشریح کے بعد یہ سمجھنا آسان ہوگیا کہ نقد کے مفہوم میں کیا کیا چیزیں داخل ہوسکتی ہیں ـــــ نقد کے حقیقی اور اولین مصداق تو سونا چاندی ہیں اس لئے کہ ان کے اندر نقدیت کے تمام عناصر مکمل طور پر موجود ہیں، اور اسی وجہ سے فقہاء نے انھیں ثمن خلقی قرار دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی دوسری چیز بطور سکہ کے لوگوں میں رائج ہو جائے، اور وہ بھی اسی طور پہ ذریعۂ تبادلہ قرار پا جائے، جس طرح کہ سونا چاندی، تو نقد کا اطلاق اس پر درست ہوگا یا نہیں؟

قاعدہ کی بات تو یہی ہے کہ اس وقت اس پر بھی نقد و ثمن کا اطلاق درست ہے، البتہ یہ فرق ضرور ملحوظ رہے گا کہ سونا چاندی، ثمن خلقی ہیں۔ اور یہ ثمن عرفی۔

چنانچہ مالکیہ کا مشہور مذہب اور حنفیہ کا مسلک یہی ہے۔ امام مالکؒ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر چمڑا کو بھی اس حیثیت سے رواج مل جائے تو وہ بھی ثمن ہو جائے گا، جیسا کہ المدونۃ الکبری میں ہے۔

ولو ان الناس اجازوا بينهم الجلود حتى يكون لها سكة وعين لكرهتها ان تباع بالذهب والورق نظرة [1]

یعنی اگر لوگوں کے درمیان چمڑے کے ذریعہ خرید وفروخت کا اس قدر رواج پاجائے کہ وہ چمڑا ثمن اور سکہ کی حیثیت اختیار کر جائے تو اس صورت میں میرے نزدیک سونے چاندی کے ذریعہ اس چمڑے کو ادھار فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

کرنسی پر ایک نظر

اس کے بعد اب جائزہ لینا چاہیے کہ کرنسی نوٹ جو ہمارے زمانے میں رائج ہے اس پر نقد کی مذکورہ تعریف صادق آتی ہے یا نہیں؟ (۱) عرف اور رواج کی روشنی میں یہ بالکل واضح ہے کہ یہ کرنسی نوٹ، بلاشبہ ذریعۂ تبادلہ بن چکا ہے۔ اور اس سے زیادہ تبادلہ کی آسان صورت فی زمانا کوئی بھی نہیں ہے بلکہ انکار اس سے اشیاء کا تبادلہ اور ان کا خرید وفروخت ہوتا ہے، روپیہ سے زیادہ کوئی دوسرا ذریعہ اتنا آسان ہے اور نہ رائج۔

(۲) اسی طرح نقدیت کا دوسرا جز پیمانۂ قیمت ہونا بھی نوٹ کے اندر موجود ہے، اشیاء کی قیمتوں کا اندازہ سامان، یا دیگر اشیاء کی بجائے، نوٹ سے لگایا جاتا ہے۔ جو اس بات کی کھلی علامت ہے کہ ہمارے عرف میں صرف نوٹ ہی مقیاس قیمت ہے۔

(۳) نقدیت کے تیسرے جز مخزونیت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، یہ بینکوں کا نظام اسی مخزون للقوة کی واضح تشکیل ہے، بینکوں میں انسان کے روپے محفوظ رہ جاتے ہیں۔ اور وہ برسوں کے بعد جب چاہے انہیں حاصل کر سکتا ہے —— روپیہ اگرچہ کاغذ ہے۔ جو پائدار نہیں ہے اور اس سے شاید یہ شبہ پیدا ہو کہ روپیہ یا اس جیسے اثمان اصطلاحیہ مخزون القوة کی صلاحیت نہیں رکھتے —— لیکن نظر وفکر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے وہ یہ کہ بینکنگ نظام اس کمی کی تلافی کر دیتا ہے۔ کرنسی کا کاغذ اگرچہ غیر محفوظ ہے لیکن اس پر جو نمبر پڑا ہوا ہے، وہ یقیناً محفوظ ہے۔ کرنسی اگر پھٹ بھی جائے، اور نمبر محفوظ ہو تو نمبر دکھا کر دوسرا اسی قیمت کا نوٹ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کرنسی نوٹ قابلِ خزانہ نہیں ہیں۔ اگر یہ جمع کرنے کے لائق نہیں تھے، تو دنیا کے کروڑوں انسان بینکوں میں اپنے روپے کیسے جمع کرتے ہیں اور قریب وبعید جب اور جہاں چاہتے ہیں، محفوظ طور پر انہیں نکال بھی لیتے ہیں"

---

[1] المدونۃ الکبریٰ ج ۳ ص ۱۰۳ ۱۲

ناقابل تغیر اور محفوظ ہونے کی اس سے زیادہ واضح دلیل کیا ہو سکتی ہے۔

رہا قیمت کے گھٹنے بڑھنے کا مسئلہ کہ جو روپے دس سال قبل بینک میں جمع کئے گئے تھے وہ زیادہ قیمتی تھے۔ ان سے بہت سی چیزیں خریدی جا سکتی ہیں۔ اور آج دس سال کے بعد جب وہ روپے نکالے گئے، تو ان سے سوا [illegible] سکتی ہیں اس طرح قیمت کا [illegible] تفاوت [illegible] محفوظ ہونے کی دلیل نہیں [illegible] اس کی [illegible] آئندہ سطور میں کریں گے۔

(۴) نقود [illegible] موجودہ حقوق [illegible] مکمل طور پر نوٹ کرنسی میں موجود [illegible] دنیا [illegible] معاملات [illegible] وہ سب روپے ہی سے طے کئے جاتے ہیں۔ دین قرض، مہر وغیرہ تمام معاملات اس معیار میں کرنسی نوٹ ہیں۔

اس جائزے سے ثابت ہو گیا کہ کرنسی نوٹ پر ثمن کی تعریف صادق ہے، اس لئے ان کی ثمنیت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

محض اس بنیاد پر کہ اس نوٹ پر وعدۂ زر کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں، اسے سند اور وثیقہ محض قرار دینا، انصاف کی بات نہیں ہے، اس لئے کہ یہ ابتدائی صورت حال تھی جبکہ ان نوٹوں کے عوض سونا چاندی کا حاصل کرنا آسان تھا، آج ہمارے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ سونا چاندی حکومت سے حاصل کرنا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ اس پر مزید عرف عام اور اصطلاح ناس نے نوٹ کی یہ حیثیت لوگوں کے ذہنوں سے بھلا دی ہے۔ اب آپس کے لین دین کے وقت کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتا کہ ہم سند اور وثیقہ پیش کر رہے ہیں اور ہمارا جو قرض حکومت پر ہے، اپنا وہ حق اس کے حوالے کر رہے ہیں۔ اس وقت یہ رسمی الفاظ وعدہ اپنی حقیقت کھو چکے ہیں، اور خود ارباب حکومت کے یہاں بھی ان الفاظ کی کوئی حقیقت نہیں رہ گئی ہے، ورنہ سونا چاندی کی ادائے گی میں انھیں تامل نہیں ہوتا۔

غرض نوٹ ہمارے زمانے میں عرف عام کی بنا پر بلاشبہ ثمن ہیں، اگرچہ وہ فی نفسہ کاغذ کے بے قیمت پرزے ہیں لیکن اس کے باوجود مال کی سب سے اعلیٰ قسم میں داخل ہے۔ جب تک کہ حکومت وقت یا عرف عام اس کی ثمنیت ختم نہ کر دے، اس لئے کہ مال کی تعریف اس پر صادق ہے، ردالمحتار میں مال کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

المال مایمیل الیہ الطبع ویمکن ادخارہ لوقت الحاجۃ [1]

مال وہ ہے جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو، اور حاجت وضرورت کے وقت کے لئے اس کا محفوظ کرنا ممکن ہو۔

فلوس کے بارے میں علماء کا اختلاف

کرنسی نوٹ کو مال اور ثمن مان لینے کے بعد یہ سوال اٹھتا ہے، کہ اگر یہ ثمن ہیں، تو ان میں تفاضل و تناقص کے ساتھ بیع کا کیا حکم ہے؟ کیا وہی جو درہم و دینار کا ہے یا اس سے کچھ مختلف ہے؟

اصل میں اس سوال کی بنیاد فلوس کی بیع کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، فلوس کی بیع آپس میں تفاضل و تناقص کے ساتھ ہونے کے جواز میں علماء کا اختلاف ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک درہم و دینار کے سوا کوئی چیز ثمن نہیں بن سکتی، اگرچہ وہ عرف میں بطور سکہ و ثمن کے رائج ہو جائے، اسی وجہ سے ان کے نزدیک فلوس کی بیع تفاضل کے ساتھ جائز ہے۔

یقول الامام الشافعی: المذھب والفضۃ بائنان من کل شئی لایقاس علیھما غیرھما لمباینتھما ما قیس علیھما [2]

امام شافعی فرماتے ہیں، کہ سونا چاندی کا معاملہ ہر چیز سے الگ ہے، ان پر کسی دوسری چیز کو قیاس نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ مقیس اور مقیس علیہ کے درمیان تباین کی نسبت ہے۔

علامہ نووی فرماتے ہیں۔

اذا راجت الفلوس رواج النقود لم یحرم الربا فیھا ھذا ھو الصحیح المنصوص علیہ [3]

جب فلوس کو نقود کی طرح رواج مل جائے، تو اس میں ربا حرام نہیں ہے، یہی بات ہے جس کی تصریح کی گئی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک فلوس وغیرہ رواج و عرف کی بنا پر اگرچہ ثمن بن جاتے ہیں لیکن ان کو ثمنیت دائمہ حاصل نہیں ہوتی یعنی اگر متعاقدین ثمنیت کے ابطال پر راضی ہو جائیں، تو ثمنیت باطل ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک فلوس کی بیع تفاضل کے ساتھ جائز ہے، ہدایہ میں ہے۔

---

[1] رد المحتار ص ۲ ج ۴ [2] المجموع ص ۳۹۲ ج ۹ [3] الکافی ص ۵۲ ج ۱۲ مزید تفصیل کیلئے نہایۃ المحتاج ص ۴۲۸ ج ۳ اور ابن حجر کی تحفۃ المحتاج ص ۲۹۰ ج ۴ دیکھئے۔

ويجوز بيع الفلس بالفلسين بأعيانهما عند أبي حنيفة وأبي يوسف وقال محمد لا يجوز لأن الثمنية تثبت باصطلاح الكل فلا تبطل باصطلاحهما . . . فصار . . . . . . الدرهم بالدرهمين ولهما أن الثمنية في حقهما باصطلاحهما إذ لا ولاية للغير عليهما فتبطل باصطلاحهما ؎

اور ایک فلس کی بیع دو فلس سے جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک لیکن امام محمدؒ کے نزدیک ناجائز ہے۔ اس لئے کہ اس کی ثمنیت عرف عام سے ثابت ہوئی ہے اس لئے ان دونوں کی باہمی اصطلاح سے وہ باطل نہیں ہو سکتی۔ پس وہ ایک درہم کی بیع کی طرح ہو گیا دو درہم کے بدلے شیخین کی دلیل یہ ہے کہ ثمنیت ان دونوں کی باہمی اصطلاح سے ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ کسی کی ولایت کے تحت نہیں ہے۔ اور جب انہی دونوں کی اصطلاح سے ثمنیت کا ثبوت ہوا ہے تو انہی دونوں کی اصطلاح سے وہ ساقط بھی ہو جائے گی۔

مالکیہ کا مسلک اس باب میں یہ ہے کہ علی الاطلاق کسی صورت میں تفاضل جائز نہیں ہے۔

لأن مالكاً قال لا يجوز بيع فلس بفلسين ولا تجوز الفلوس بالذهب ولا بالدنانير نظرة ؎

امام مالک کے نزدیک ایک فلس کی بیع دو فلسوں کے عوض ناجائز ہے۔ اسی طرح سونا چاندی، اور درہم و دینار کے ذریعہ بھی فلوس کی ادھار بیع جائز نہیں ہے (اس لئے کہ سونا چاندی اور درہم و دینار میں حقیقی ثمنیت موجود ہے اور سکوں میں اصطلاحی ثمنیت موجود ہے اور امام مالک کے نزدیک ثمنیت کے ہوتے ہوئے اگر اجناس مختلف ہوں تب بھی ادھار جائز ہے)

رہے امام احمد تو اس باب میں ان کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ ایک سکے کا تبادلہ دو سکوں سے جائز ہے اس لئے کہ ان کے نزدیک حرمت ربوٰ کی علت وزن ہے۔ اور سکے، فلوس وغیرہ چونکہ عددی ہیں، اس لئے ربوٰ کی علت موجود نہیں ہے ...... دوسرا قول یہ ہے کہ فلوس کا اس طرح تبادلہ ناجائز ہے۔ ؎

؎ ہدایہ ج۳ ص۹۵ ؎ المدونۃ الکبریٰ ج۳ ص۱۰۳ ؎ المغنی لابن قدامہ مع الشرح الکبیر ج۴ ص۱۳۱ و ج۴ ص۱۲۹ و فتاویٰ ابن تیمیہ ج۲۹ ص۴۶۰

اختلاف کا حل یہ وہ اختلاف ہے جس سے ثمن اصطلاحی کی حیثیت کے بارے میں تشویش پیدا ہو سکتی ہے، لیکن ان اختلافات کے بارے میں صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ یہ اختلافات اس وقت کے ہیں جبکہ خرید و فروخت میں اشیا کا معیار سونا چاندی تھے، دوسری چیزیں مثلاً فلوس وغیرہ جو [illegible] ہوتی تھیں، وہ [illegible] میں اختلاف کی گنجائش تھی [illegible] اس کی بھی گنجائش تھی کہ ثمن اصطلاحی [illegible] کی موجودگی میں انہیں وہ حیثیت نہ دی جائے جو ثمن خلقی کی ہے ـــــ لیکن اب جبکہ ہمارے زمانے میں سونا چاندی کے سکے [illegible] اب اختلاف [illegible] کی گنجائش [illegible] ہے [illegible] قائم کرنے کی [illegible] اگر وہ ائمہ کرام بھی ابھی موجود ہوتے، تو وہ بھی اس تفاضل کے عدم جواز ہی کا فتویٰ دیتے اس لئے کہ اگر تفاضل کی ذرا بھی گنجائش دے دی جائے تو ربا کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور اس کو بند کرنے کی پھر کوئی صورت نہ ہوگی۔

رہی گفتگو دلائل کے اعتبار سے، تو ماکیہ ان امام محمد کا موقف زیادہ مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ شریعتِ اسلامیہ میں عرف کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ عرف کو کسی بھی جگہ نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، پھر جب عرف میں کسی چیز کو ثمنیت حاصل ہو گئی ہے۔ تو اس کی ثمنیت کے ابطال کے کیا معنی ہیں ہے اور وہ بھی اس وقت کہ عرف عام بن چکا ہو۔ پوری دنیا میں اسی کا رواج چل پڑا ہو، اور سونے چاندی کے سکے غائب ہو چکے ہوں، امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف نے اس صورت میں تفاضل کو جائز قرار دیا ہے جبکہ متعاقدین ثمنیت کے ابطال پر راضی ہو جائیں، لیکن یہ فہم سے بالاتر ہے کہ جو ثمنیت عرف عام اور اصطلاح ناس سے ثابت ہو، اس کو دو آدمی آخر کیسے توڑ سکتے ہیں؟ اور اس عموم کلی سے یہ دو آدمی کیونکر مستثنیٰ ہو سکتے ہیں؟ اس کے علاوہ مزید غور طلب بات یہ ہے کہ فلوس سکے، اور نوٹوں کی بیع میں ثمنیت کے سوا دوسرا آخر کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ اور کون ہوگا جس کا مقصد سکوں کی خریداری بجائے ثمنیت کے گلٹ، تانبا، کاغذ ہو ـــــ اس لئے ان دونوں کا باہمی طور پر ثمنیت کے ابطال کی کوشش کرنا حیلہ کی ہی ایک صورت ہے۔ جس کی شریعت میں کبھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

اس پوری بحث سے نوٹ کی شرعی حیثیت واضح طور پر سامنے آگئی اور تمام تر سوالات کا تعلق نوٹ کی شرعی حیثیت ہی سے ہے۔ اس کی حیثیت کی تعیین کے بعد تمام مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہاں یہ مسئلہ بھی تنقیح طلب ہے کہ نوٹ کو ثمن ماننے کے بعد کیا تمام احکام میں یہ سونا چاندی کے

برابر ہو جاتے ہیں، یا ثمن خلقی اور ثمن عرفی کے درمیان کچھ فرق باقی رہتا ہے۔؟

(۲)

کرنسی نوٹ اور درہم و دنانیر کے احکام میں فرق

کرنسی نوٹ اگرچہ [illegible]
درہم و دینار تھے، لیکن اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے بالکل مماثل نہیں ہیں۔

(۱) [illegible]

مطلب [illegible] حکومت اس کو غیر معتبر قرار [illegible]
رہ جائے گا اس کی ساری ثمنیت ختم ہو جائے گی۔ اس کے برخلاف درہم و دینار کی ثمنیت خلقی ہے۔ اس کی ثمنیت عرف عام کے تابع نہیں ہے، اگر عرف عام میں اس کا رواج موقوف ہو جائے یا حکومت اس کا اعتبار ختم بھی کر دے، تو بھی ان کی ذاتی ثمنیت ختم نہیں ہو سکتی، کم از کم ان کی ذاتی قیمت ضرور رہ جائے گی، جس طرح کہ دوسرے سامانوں کی ایک خاص قیمت ہے، اور ان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح سونا چاندی بھی زینت و جمال کے لئے مستعمل ہیں، لیکن نوٹ کے بے قیمت پرزے ثمنیت کے باطل ہو جانے کے بعد کیا کام آئیں گے کیا کاغذ کے ان پرزوں پر لکھنا بھی ممکن ہو گا؟

(۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ درہم و دینار میں ثمنیت کے ساتھ وزنیت بھی معتبر ہے۔ دونوں میں سے کسی بھی چیز کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ربٰو کے باب میں درہم و دینار کی بیع تفاضل کے ساتھ جائز نہیں ہے۔ اس کا مطلب جس طرح یہ ہے کہ ایک درہم یا دینار کی بیع دو درہم یا دینار سے جائز نہیں ہے، وہیں یہ بھی ہے کہ ایک زیادہ وزنی درہم یا دینار کو ہلکے وزن کے درہم و دینار کے بدلے بیع کرنا جائز نہیں ہے، دونوں صورتیں ربٰو میں داخل ہیں۔

حدیث میں اشیاء ستہ میں جو سونا چاندی کا ذکر کیا گیا تو وہاں وزنا بوزن کی تصریح کی گئی کہ سونا چاندی کی بیع میں وزن کے اعتبار سے مساوات ضروری ہے، ورنہ ربٰو کا تحقق ہو جائے گا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

ارایت الذھب والفضۃ مضروبین	مہر کردہ سونا چاندی کے بارے میں آپ کی رائے
دنانیر او دراھم۔۔۔ لایحل الفضل	کیا ہے خواہ دینار ہوں یا درہم۔۔۔ ان میں سے

في واحد منهما على صاحبه لا ذهب بدنانير ولا فضة بدراهم إلا مثلا بمثل وزنا بوزن وما ضرب منهما وما لم يضرب سواء لا يختلف..... الربوا في مضروبه وغير مضروبه سواء[۱]

کسی میں بھی ایک دوسرے پر زیادتی جائز نہیں ہے، نہ سونے کی بیع میں دینار کے بدلے، اور نہ چاندی کی بیع میں درہم کے بدلے۔ صرف برابر سرابر بیع جائز ہے اور یہ برابری وزن کے اعتبار سے ہوگی مہر کردہ سونا چاندی، اور غیر مہر کردہ یعنی سکہ اور غیر سکہ دونوں ربٰو کے باب میں برابر ہیں، دونوں میں ربٰو کا تحقق زیادتی کی صورت میں ہوگا۔

اس عبارت میں امام شافعی نے وزن کا خاص اعتبار کیا ہے، اور اس میں ذرا بھی فرق نہیں کیا کہ غیر مضروبہ ہونے کی صورت میں وزنیت معتبر رہتی ہے، اور سکہ ہونے کی صورت میں وزنیت ساقط ہو جاتی ہے

علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں۔

فإذا باع دينارا بدينار كذلك وافترقا فوجد أحدهما ما قبضه ناقصا بطل الصرف لأنهما تبايعا ذهبا بذهب متفاضلا[۲]

جب دینار کی بیع دینار سے کی گئی، اور متعاقدین ایک دوسرے سے جدا ہو گئے، پھر کسی نے اپنے مقبوضہ دینار کو کم پایا۔ تو بیع صرف باطل ہو گئی، اس لئے کہ ان دونوں نے سونے کی بیع سونے سے تفاضل کے ساتھ کی (جو ربٰو ہے۔)

علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں۔

فإذا استقرض مائة دينار من نوع فلابد أن يوفي بدلها مائة من نوعها الموافق لها في الوزن أو يوفي بدلها وزنا لا عددا[۳]

جب ایک آدمی نے ایک قسم کے سو دینار قرض لئے تو ضروری ہے کہ اس کے بدلے میں اسی قسم کے دینار واپس کرے، جو وزن میں اس کے برابر ہوں۔ یا قرض کا ادا وزن سے کرے نہ کہ عدد سے۔

ان عبارات سے یہ بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ سونا چاندی میں ثمنیت کے ساتھ وزن کا خاص خیال کیا گیا ہے ـــــــ جبکہ نوٹ میں وزن کے لحاظ کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ وہاں صرف ثمنیت اور قیمت میں مساوات ضروری ہے۔ اگر گنتی یا وزن کے اعتبار سے مساوات

---

[۱] کتاب الام ص ۹۸ ج ۳ [۲] المغنی ص ۵۰ ج ۴ [۳] ابن عابدین ص ۱۷۴ ج ۵

موجود نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی ایک سو کے نوٹ کے بدلے، سو کی تعداد میں ایک ایک کے نوٹ حوالے کرے، جو بلا شبہ عدد اور وزن دونوں اعتبار سے سو کے نوٹ سے زیادہ ہیں۔ تو اسے ربو نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ یہاں صرف ثمنیت اور قیمت میں مساوات ضروری ہے نہ کہ وزن وعدد میں۔

(۳) تیسرا فرق یہ ہے کہ سونا چاندی کی زکوٰۃ کا نصاب شریعت نے خود مقرر کیا ہے، اس لئے کہ اس کا نصاب ذاتی ہے۔ اس کے برخلاف نوٹ فی نفسہ کوئی قیمت نہیں رکھتے، ان کے اندر ثمنیت اصطلاح وعرف سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے سونا، یا چاندی کے نصاب کے بقدر اگر اس کی قیمت پہونچ جائے، تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔ غرض نوٹ کی نصابیت سونا چاندی کی نصابیت کے تابع ہے۔

(۴) ایک فرق یہ بھی ہے کہ نوٹ کی قیمت اور جنس ممالک کے اختلاف سے مختلف ہو جاتی ہے۔ امریکہ کا ڈالر، عرب کا ریال، اور ہندوستان کا روپیہ سب نوٹ ہی ہیں۔ لیکن ہر ملک کے اقتصادی حالات کے مطابق ہر ملک کی کرنسی کی قیمت یکساں نہیں ہے، اس لئے یہ سب مختلف الاجناس کے حکم میں ہے اور جب جنس کا اختلاف ہو جائے، تو ربا نہیں ثابت ہوتا، اس لئے اگر کوئی شخص ایک امریکی ڈالر کو ہندوستانی ۵۰ روپے کے عوض فروخت کرے تو اس کی گنجائش ہے، اور اسے ربو نہیں کہہ سکتے۔ اس کے برخلاف درہم و دینار کی قیمت وجنس دنیا کے ہر گوشے میں یکساں رہتی ہے۔ ممالک کے اختلاف سے نہ ان کی قیمت میں فرق آتا ہے۔ اور نہ ان کی جنس تبدیل ہوتی ہے، اس لئے اگر کوئی ہندوستانی آدمی، امریکہ کے کسی باشندے سے ایک درہم یا دینار کی بیع دو درہم یا دو دینار کے عوض، یا وزن کے اعتبار سے کمی بیشی کے ساتھ کرے۔ تو یہ ناجائز ہے۔ ربو میں داخل ہے۔

(۵) نوٹ، کرنسی پر اگر حکومت کی جانب سے وعدۂ زر کی عبارت نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہیں ہے جبکہ درہم و دینار اس قسم کی کسی عبارت کے محتاج نہیں ہیں۔

(۶) سونا چاندی، اور گیہوں جو وغیرہ کے بارے میں فقہاء، متفقہ طور پر اس کے قائل ہیں۔ کہ ان میں مثلیت کا ہر حال میں اعتبار کیا جائے گا، اسی لئے ایک کلو گیہوں کی بیع دو کلو گیہوں سے کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ خواہ متعاقدین متفق الدار ہوں۔ یا مختلف الدار، اسی طرح سونا چاندی کا معاملہ ہے۔ اس کے برخلاف فلوس اور ان سکوں کے بارے میں جن میں کھوٹ ہو ان کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ ان کی قیمتوں کی گرانی وارزانی کے وقت قیمت ملحوظ ہوگی۔ یا اسی طرح

کا سکہ ادا کرنا کافی ہوگا۔ بعض لوگوں نے قیمت کا اعتبار کیا ہے۔ اور بعض نے ثمنیت کی بنا پر مطلقاً اسی طرح کا سکہ ادا کر دینے کو کافی قرار دیا ہے ۔۔۔ فلوس اور کھوٹے سکوں کا اختلاف نوٹ کی جانب متعدی ہو سکتا ہے یا نہیں، اس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ اس وقت [illegible]

[illegible]

[illegible] اختلاف ختم ہو گیا، اب ہم صرف ان کے نام سن رہے ہیں۔ اس وقت اس اختلاف [illegible]

[illegible]

[illegible] ثمنیت اصطلاحی ہے [illegible] دلائل سے ثابت کر دیا ہے اور اس کے نظری ہونے کی وجہ سے ہی بہت سے علماء کو اس مسئلہ میں تذبذب ہوا ہے۔

کرنسی نوٹ اور سونے چاندی کے سکوں کے درمیان احکام کا یہ وہ اختلاف ہے۔ جو دلائل کی روشنی میں بالکل ظاہر ہے۔

(۳)

"کرنسی نوٹ کا نصاب زکوٰۃ"

گزشتہ گفتگو سے نوٹ کی شرعی حیثیت معلوم ہو گئی ہے۔ اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہمارے زمانے میں مروجہ ہی ایک ذریعۂ تبادلہ رہ گیا ہے۔ اس کے بعد اگلی منزلیں آسان ہیں۔ اصل چیز حیثیت شرعی و عرفی کا تعین ہے۔ اس کے تعین کے بعد مسائل کی تفریع آسان ہو جاتی ہے۔

نوٹ کو ثمن عرفی ماننے، اور مال کا اطلاق اس پر صحیح قرار دینے کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس کا نصاب زکوٰۃ کیا ہے۔ یہ مسئلہ اس لئے پیدا نہیں ہو رہا ہے (جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے) کہ اس کی ثمنیت ناقص یا یہ دوسری حیثیت رکھتا ہے۔ جو سامان تجارت کی ہے۔ یعنی جس طرح سامان تجارت میں ملحوظ نظر قیمت ہوتی ہے۔ نفس سامان نہیں ہوتا، بلکہ اس کی قیمت سونا یا چاندی کے نصاب تک پہنچتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ورنہ نہیں۔ ۔۔۔۔ یہی حال کرنسی نوٹ کا بھی ہو، کرنسی اس میں نوٹ ثمنیت نہیں ہے۔ بلکہ اس کی قیمت سونا چاندی کے نصاب تک پہونچے۔ اگر ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی خواہ ایک ہزار نوٹوں سے وہ نصاب مکمل ہو جائے۔ یا دس سال

کے بعد دس ہزار نوٹوں سے۔

اس مسئلہ کے پیدا ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پیدا ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ نوٹ کا وجود عہد نبوی۔ عہد صحابہ و تابعین میں نہیں تھا۔ اگر اس کا وجود اس وقت ہوتا، تو اس کا نصاب بھی مقرر کیا جا چکا ہوتا، اور اسی کے ساتھ یہ بھی بات ہے کہ نصاب زکوٰۃ معقول اور قیاسی معاملہ تو نہیں ہے کہ قیاس و عقل سے اس کا نصاب متعین کر لیا جائے، ان مجبوریوں کی بنیاد پر نوٹ کے لئے سونا چاندی کے نصاب کو معیار بنایا گیا، نصاب کے لئے سونا چاندی کو متعین کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ثمنیت میں دونوں شریک ہیں۔ کچھ احکام میں فرق ضرور ہے، لیکن وہ خلقی و اصطلاحی بنیاد پر، نہ کہ نفس ثمنیت کی بنا پر، اس شاہبت و اشتراک کی وجہ سے کرنسی نوٹ کے نصاب زکوٰۃ کے لئے سونا چاندی کے نصاب کو معیار قرار دیا گیا۔

رہی یہ بات کہ سونا چاندی میں سے خاص کر کس کو معیار قرار دیا جائے؟ اور نوٹوں میں نصاب زکوٰۃ مقرر کرتے وقت سونے کا اعتبار کیا جائے یا چاندی کا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سونا چاندی میں سے جو انفع للفقراء ہو اس کا اعتبار کیا جائے گا، جیسا کہ فقہاء کا اصول سامان تجارت کی زکوٰۃ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

الزکوٰۃ واجبۃ فی عروض التجارۃ کائنۃ	سامان تجارت میں زکوٰۃ واجب ہے جبکہ اس کی قیمت
ما کانت اذا بلغت قیمتہا نصابا من	سونا چاندی کے نصاب کو پہنچ جائے، ان (دونوں (سونا
الورق او الذھب یقومہا بما ھو انفع	چاندی) میں جو نصاب فقراء اور مساکین کے لئے زیادہ
للفقراء والمساکین منہما [1]	نفع بخش ہوگا اس کے اعتبار سے قیمت لگائی جائے گی۔

موجودہ وقت میں معروف ریٹ کے مطابق چاندی کی بہ نسبت سونا بہت گراں ہے۔ اس لئے کرنسی نوٹ کی زکوٰۃ میں سونا کی بجائے چاندی کے نصاب کا اعتبار کیا جائے گا، اس لئے کہ اس وقت یہی انفع للفقراء ہے ــــــــ رہی اس کی تاریخی حیثیت کہ بعض کرنسیاں سونے کے عوض جاری کی گئیں۔ اور بعض چاندی کے عوض، تو اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اب حیثیتوں کی یہ تفریق نہ عوام کے ذہنوں میں باقی رہی، اور نہ سرکاری طور پر ہی رہی، کون یہ متعین کر سکتا ہے کہ فلاں کرنسی سونے کی کرنسی کی جگہ پر ہے، اور کون چاندی کی کرنسی کے بدلے ،

---

[1] قدوری ص۳۰

اس لئے اس تاریخی سرگذشت میں الجھنا امت کے لئے مفید نہیں ہے، اب تمام کرنسیاں ایک ہی حکم میں ہیں۔ یعنی جو نصاب انفع للفقراء ہوگا، اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ اس لئے کہ فقہ کا اصول ہے۔

اذا اجتمع امران من جنس واحد ولم یختلف مقصودهما دخل احدهما فی الآخر غالبا لہ

کہ جب دو چیزیں ایک جنس کی جمع ہو جائیں۔ اور ان دونوں کا مقصود مختلف نہ ہو، تو ایک دوسرے میں عام طور پر داخل ہو جاتے ہیں۔

جب سونا چاندی کی متبادل کرنسیاں جاری کی گئیں اور جنس ثمنیت ایک ہے۔ اور ذریعۂ تبادلہ ہونے کا مقصد بھی دونوں میں مشترک ہے اس لئے دونوں ایک دوسرے کے حکم میں داخل ہوں گے۔ اور سونا چاندی میں جو نصاب بھی انفع الفقراء ہوگا اس کا اعتبار کیا جائے گا ــــــ یہ بھی ملحوظ رہے کہ صرف نوٹ کی ادائیگی سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، اس لئے کہ یہ وثیقہ سے زیادہ ثمن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے وثیقہ اور سند ہونے کا پہلو عرف میں نگاہوں سے اوجھل اور ارباب حکومت کے یہاں ناقابل عمل ہو گیا ہے۔

(۴)

"نوٹ سے دیون کی ادائے گی"

نوٹ کے باب میں یہ مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے نوٹ کو ثمن عرفی ماننے کے بعد بھی دیون (موخر مطالبے مثلاً قرض، مہر، پنشن، اور ادھار خریداری کی رقم وغیرہ) کی ادائے گی میں جو بھی رخ اختیار کیا جاتے وہ کشمکش سے خالی نہیں ہے۔

اگر نوٹ کو ایسا ہی ثمن قرار دیا جائے جیسا کہ درہم و دینار ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دس سال قبل اگر سو روپے قرض لئے تھے۔ تو آج بھی اسی روپے کی ادائے گی لازم ہے۔ سو روپے سے ایک روپیہ کا بھی اضافہ موجب ربٰو ہوگا، خواہ دس سال قبل کے سو روپے۔ اور آج کے سو روپے کی قیمتوں میں آسمان و زمین کا تفاوت ہو گیا ہو، اس سے یقینی طور قرض خواہ۔ اور صاحب حق کا نقصان ہوگا کیونکہ دس سال قبل اگر وہ سو روپے، اس کے پاس ہوتے تو وہ بہت کچھ خرید سکتا تھا لیکن آج دس سال کے بعد اس سو روپے سے بہت معمولی چیزیں خرید سکتا ہے۔

لہ الاشباہ ص ۱۵۲ بحوالہ قواعد الفقہ ص ۵۲ ۱۲

اور اگر درہم و دینار کی طرح ثمن نہ قرار دیا جائے۔ بلکہ ان کی قیمتوں کا لحاظ کیا جائے، تو اس سے ایک طرف ربٰو کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور دوسری طرف اگر معیار قیمتی متعین کیا جائے، تو عوام الناس کے تمام کاروبار درہم برہم ہو جائیں گے۔ اور ایسے دقیق فنی اصول قائم کرنے پڑیں گے جو عوام کی دسترس سے باہر ہوں گے۔ اور باہمی مستقل تنازعہ کے موجب ہوں گے۔

غرض جو رخ بھی اختیار کیا جائے۔ وہ خطرات سے خالی نہیں ہے اس لئے اس مسئلہ پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ہمیں چند اصولوں کو سمجھ لینا پڑے گا۔

(۱) فقہ کا اہم ترین اصول ہے۔

الضرر الاشد یزال بالضرر الاخف [۱]   بڑا نقصان چھوٹے نقصان کو گوارا کر کے دور کیا جائے گا۔

یعنی اگر معاملہ کے دو رخوں میں سے ہر رخ میں ضرر کا پہلو ہو تو بڑے ضرر سے بچنے کے لئے چھوٹے ضرر کو برداشت کیا جائے گا۔ اس کی بہتری مثالیں کتب فقہ میں موجود ہیں۔

(۲) اسلام کے مزاج میں سادگی ہے۔ باریک تشقیقات اور خواہ مخواہ کی موشگافیاں اسلام کو پسند نہیں ہیں۔ خصوصاً اس وقت جبکہ عوام الناس کے پریشان ہونے کا مسئلہ ہو۔ اور کاروبار کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہو حضور علیہ السلام کا یہ مشہور فرمان حدیث کی کتابوں میں موجود ہے

نحن امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب (الحدیث[۲])   کہ ہم امی جماعت ہیں۔ حساب و کتاب نہیں جانتے۔

اس حساب و کتاب کا مطلب وہی ہے کہ باریک حسابات، اور فنی تشقیقات جو عوام کی دسترس سے باہر ہوں۔ وہ اسلام کو پسند نہیں، اس لئے کہ اسلام صرف خواص کے لئے نہیں بلکہ عوام کے لئے بھی ہے، اسی لئے اسلام ہمیشہ اپنے ایسے اصول بناتا ہے۔ جس میں پرمبنی سادگی ہو۔ اور عوام و خواص سب کے لئے یکساں دلچسپی کے حامل ہوں۔

اس لئے ایسا اقدام کرنا یا ایسے اصول بنانا جس سے سادگی پر زد پڑتی ہو۔ اور اس میں فنی یا قانونی پیچیدگی پیدا ہوتی ہو۔ اس کی اسلام میں بالکل اجازت نہیں ہے۔

(۳) قیمتوں کے گھٹنے بڑھنے کا مطلب کیا ہے؟ اور اس کے لئے کیا معیار ہے؟ قیمتوں کی کمی بیشی اضافی چیز ہے۔ یا حقیقی؟ ان سوالات کے حل ہونے کے بعد بہت سے مشکلات خود بخود حل ہو جائیں گے۔

---

[۱] الاشباہ ص ۱۱۱ بحوالہ قواعد الفقہ ص ۹۱ [۲] بخاری شریف ج ۱ ص ۲۵۶ و ابو داؤد ج ۱ ص ۳۱۸

مثال کے طور پر ایک گھڑی کی قیمت آج سے پانچ سال قبل تین سو روپے تھی۔ جبکہ آج پانچ سو روپے ہے۔ تو کیا کہا جائے گا، گھڑی کی گرانی بڑھ گئی؟ یا روپیہ کی قیمت گھٹ گئی؟ یا یہ کہ دونوں جانب تبدیلی ہوئی۔

یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ عام محاورات میں دونوں طرح کی بات کہی جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ گھڑی مہنگی ہوگئی۔ اور کوئی کہتا ہے۔ اب روپیے کی حیثیت ہی نہیں رہی ——— لیکن یہ تو محاورات کی بات ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ روپیہ تو ثمن ہے۔ اس کی قیمت کیا گھٹے گی یا بڑھے گی؟ وہ تو اپنے حال پر ہے۔ البتہ اس کے مقابلے میں جو سامان خریدا گیا ہے۔ وہ گراں ہوگیا ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ گراں کیوں ہوگیا؟ وہ بھی تو اچھے حال پر ہے۔ تو اس گرانی کے متعدد وجوہ ہوسکتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بازار میں وہ سامان کم ہوتا ہے۔ اور طلب کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ جس سے قدرتی طور پر اس کی حیثیت بڑھ جاتی ہے۔ اور وہ گراں ہوجاتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ملک کی کسی اقتصادی خرابی کی بنا پر حکومت کاروباری لوگوں اور اہل تجارت پر زیادہ ٹیکس لگا دیتی ہے، جس کا براہ راست اثر سامانوں کی قیمتوں پر پڑتا ہے۔ اور سامانوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے اہل تجارت ٹیکس کی نا مدد رقم قیمت بڑھا کر ہی پوری کر سکتے ہیں ——— غرض گرانی و ارزانی کا تعلق روپیے سے نہیں بلکہ سامانوں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ملک میں کسی خاص چیز کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔ اور پھر بھی اس کی گرانی کم نہیں ہوتی، تو لوگ عام طور پر بولتے ہیں کہ امسال اتنی پیداوار ہوئی ہے، پھر بھی مہنگائی نہیں گھٹی۔ اس قسم کے اظہارات سے بھی عرف کے اندرونی احساسات کا پتا چلتا ہے۔ کہ عام لوگوں کے نزدیک بھی سامان ہی سے قیمت میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ نہ کہ روپیہ سے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ جب سامان کی گرانی میں اضافہ ہوگا۔ تو اس کے مقابلے میں روپیہ اب زیادہ دینا پڑے گا۔ اس کی وجہ سے بہت سے لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں، کہ روپیہ کی حیثیت اب گر گئی، حالانکہ روپیہ کی حیثیت کیا گری؟ سامان کی حیثیت بڑھ گئی۔

تو گویا قیمت کا بڑھنا گھٹنا۔ اضافی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک چیز ایک شخص کی نظر میں بہت قیمتی اور باقدر ہوتی ہے۔ اور وہ ہزاروں روپے پر بھی بیچنے کو آمادہ نہیں ہوتا ——— لیکن دوسرے کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ غرض یہ کمی بیشی کوئی حقیقی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اضافی ہے۔ اضافی ہم محاوراتی روشنی میں کہہ رہے ہیں۔ ورنہ حقیقت میں گرانی و ارزانی کا تعلق سامان سے ہے نہ کہ روپیے سے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں۔

ورنہ گرانی وارزانی کا تعلق روپیہ سے قائم کردیا جائے۔ تو چند در چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ اس لئے کہ نوٹ کے اندر یہ سوچ کر طفل تسلی حاصل کی جاسکتی ہے کہ یہ ثمن خلقی نہیں بلکہ عرفی ہے۔ اس لئے اس میں قیمت کا اعتبار کرکے ایک سو روپے کے بدلے پانچ سو روپے لے سکتے ہیں۔ لیکن اس جزئیہ کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی، جو روایت میں آتا ہے۔

عن عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال کانت قیمۃ الدیۃ علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثمان مائۃ دینارا وثمانیۃ آلاف درھم فکان ذلک کذلک حتی استخلف عمر فقال خطیبا الا ان الابل قد غلت قال ففرضہا عمر علی اھل الذھب الف دینار وعلی اھل الورق اثنی عشر الف درھم۔

دیت کی قیمت عہد نبوی میں آٹھ سو دینار، یا آٹھ ہزار درہم تھی۔ یہ مقدار اسی طرح باقی رہی۔ یہاں تک کہ حضرت عمر نے اپنے زمانۂ خلافت میں تقریر کرتے ہوئے۔ فرمایا کہ اب اونٹ گراں ہوگئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمر نے سونا والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم مقرر کئے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے (ابو داؤد شریف ص ۲۲۲) کہ اونٹ کی قیمت عہد نبوی ہی میں بارہ ہزار درہم پہونچ گئی تھی، اور آپ نے بارہ ہزار درہم دیت کے لئے مقرر فرمائے۔

روی ابو داؤد والنسائی والترمذی بسندھم ان رجلا من بنی عدی قتل فجعل النبی علیہ السلام دیتہ اثنی عشر الفا۔ کما روی الدارمی ان الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فرض علی اھل الذھب ضعیفا۔

قبیلۂ بنی عدی کا ایک آدمی قتل کردیا گیا۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت بارہ ہزار درہم مقرر فرمائی اور سونا والوں پر ایک ہزار دینار مقرر فرمائی۔

بتایا جائے کہ یہاں کیا کہا جائے گا؟ اونٹ کی قیمت بڑھ گئی تھی؟ یا درہم و دینار کی قیمت گھٹ گئی تھی؟ اگر اونٹ اپنے حال پر رہتے، اور درہم و دینار کی قیمت گھٹ گئی تھی۔ تو اس صورت میں کیا مسئلہ ہوگا؟ جبکہ ایک آدمی نے آٹھ ہزار درہم اس وقت قرض لئے تھے، جبکہ اتنے میں سو اونٹ خریدے جاسکتے تھے اور واپس اس وقت کر رہا ہے جبکہ سو اونٹ کی قیمت بارہ ہزار ہوچکی ہے۔ تو کیا قرض کی ادائے گی میں قیمت کا اعتبار کرکے چار ہزار درہم کے اضافہ کے ساتھ قرض کی ادائے گی درست ہوگی؟ اور کیا یہ ربٰو کے مفہوم میں داخل نہ ہوگا؟ —— اس صورت میں تمام علماء بالاتفاق کہتے ہیں کہ ایک درہم کی زیادتی بھی ربا کا موجب ہوگی —— حالانکہ اشیاء میں گرانی، یا درہم

ك الهداية مع فتح القدير ص ۱۵۳ ج ۸، ومجموع الفتاوى ص ۲۰۱ ج ۲۹ وص ۲۰۳ ج ۲۹۔

و دینار میں ارزانی موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ ثمن کی قیمت میں کمی بیشی نہیں ہوتی، بلکہ اشیاء کی گرانی بڑھ جاتی ہے۔ اسی لئے جس مقدار ثمن پر پہلے وہ چیز مل جایا کرتی تھی، اس مقدار سے بڑھا کر ادا کرنے پر اب وہ چیز مل سکتی ہے۔

اس لئے یہ خیال شرعی، عقلی اور عرفی ہر نقطۂ نگاہ سے سراسر غلط ہے کہ ثمن (خواہ خلقی ہو یا عرفی) کی قیمت میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

(۴) یہیں پر ایک یہ بھی اصول مدنظر رہنا چاہئے۔ سکہ کی قیمت میں کمی بیشی کا اختیار اگر کسی کو ہو سکتا ہے۔ تو وہ سب سے پہلے حکومت وقت کو ہو سکتا ہے۔ اور سب سے پہلے حکومت ہی اس کمی بیشی کا احساس بھی کر سکتی ہے۔ اگر حکومت کی جانب سے کوئی ایسا اقدام نہیں ہوتا جس سے معلوم ہوا کہ قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی ہے تو پھر بغیر قرینہ کے کمی بیشی کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

نوٹ کے بارے میں کبھی حکومت نے ایسا رویہ نہیں اختیار کیا، جس سے معلوم ہو کہ نوٹ کی قیمت میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ بلکہ اس کا سلوک تو اس قسم کا ہے جس سے سمجھ میں آتا ہے، کہ نوٹ کی قیمت یکساں رہتی ہے۔ مثلاً آپ سرکاری یا غیر سرکاری جس بینک میں چاہے روپیہ جمع کریں، اور دس سال کے بعد وہ رقم نکالیں۔ تو وہ اتنی ہی رقم واپس کرے گا جتنی اس نے جمع کی تھی، اور زائد رقم جو وہ دیتا ہے وہ اصل مال کہہ کر نہیں دیتا۔ بلکہ سود کہہ کر دیتا ہے، جو اس بات کی کھلی دلیل ہے۔ کہ حکومت کے نزدیک نوٹ کی قیمت یکساں رہتی ہے، خواہ اشیاء کی قیمتوں میں کتنا ہی اضافہ ہو جائے۔ مگر نوٹ کی قیمت جوں کی توں رہتی ہے۔

(۵) آخر میں یہ اصول بھی سامنے رہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ قرض کا جواز صرف مثلی چیزوں میں ہے یعنی ایسی چیزوں میں جن کے اجزاء یکساں یا متقارب ہوں، مثلاً گیہوں، جو وغیرہ۔ ذوات القیم میں قرض کا جواز نہیں ہے۔ یعنی ایسی چیزوں میں جن کے اجزاء کے درمیان تفاوت ظاہر ہو مثلاً جانور وغیرہ کہ ان کے درمیان تفاوت ہے۔ ان میں قرض کا معاملہ کرنا یہ کہہ کر کہ ہم بھی جانور واپس کریں گے ناجائز ہے۔

ان اصول خمسہ کی روشنی میں نوٹ سے دیون کی ادائیگی کے مسئلے کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ نوٹ ثمن عرفی ہے۔ ان کو عملاً ثمنیت میں وہی پوزیشن حاصل ہو چکی ہے، جو کسی زمانے میں سونے چاندی کی کرنسیوں کی تھی۔ اس لئے اگر نوٹوں سے قرض کا معاملہ کیا جائے تو جتنی مدت کے بعد میں اس کی ادائیگی ہوگی۔ بعینہٖ اسی مقدار کے نوٹ واپس کرنے ضروری ہیں۔ ایک روپیہ کا اضافہ

بھی جائز نہیں ہے۔ خواہ قیمتوں میں آسمان وزمین کا فرق ہو جائے۔ ورنہ یہ سود ہو جائے گا۔ مثلاً کسی نے اگر دس سال قبل سو روپے قرض لئے تھے، اور قرض کی ادائے گی آج کر رہا ہے۔ تو سو روپے واپس کرے گا۔ ایک روپیہ بھی زیادہ دینا یا لینا سود کا موجب ہوگا، جبکہ یہ واقعہ ہے کہ سو روپے میں دس سال قبل جتنی چیزیں خریدی جا سکتی تھیں۔ وہ آج پانچ سو میں بھی بمشکل مل سکتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کمی بیشی کر کے ادائے گی جائز نہیں ہے ـــــ اس باب میں عہد نبوی کا واقعہ بہترین اسوہ ہے، کہ عہد نبوی میں اونٹ کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی ایک درہم کی بیع دو درہم سے ناجائز تھی۔

اس صورت میں اگرچہ قرض دینے والے کا بڑا نقصان ہوگا۔ لیکن اس نقصان کو اس بڑے نقصان سے بچنے کے لئے برداشت کیا جائے گا، جو اس چھوٹے نقصان کو برداشت نہ کرنے سے سکتا ہے۔ اس لئے کہ اولاً اس کا یہ نقصان اس صورت میں بھی ہو سکتا تھا۔ جبکہ وہ نوٹوں کی بجائے درہم ودینار کے ذریعہ قرض کا معاملہ کرتا۔ اس وقت بھی اشیاء کی گرانی بڑھ سکتی تھی، بلکہ یقیناً بڑھتی اس میں درہم ودینار اور نوٹ کا تصور نہیں ہے۔ اقتصادی حالات اشیاء کی قیمتوں کو بڑھاتے ہیں۔

ثانیاً: اگر ہم اس ایک قرض دینے والے کے نقصان کی تلافی کرنے لگ جائیں۔ تو اس سے بڑھ کر مشکلات اور خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ مثلاً اس سے ربا کا دروازہ کھل جائے گا، اور ہر آدمی اپنے من مانی معاوضہ مقرر کر کے زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرنے کی کوشش کرے گا، جس سے مقروض اور غریب لوگوں کا سخت نقصان ہوگا، جبکہ مقروض اور غریب لوگوں کی اکثریت ہے

اور اگر اس کے لئے کوئی معیار مقرر کریں۔ اور قرض دیتے وقت ہی دونوں معاملہ کرنے والوں کو مجبور کریں کہ سونا چاندی کی قیمت معلوم کر کے دستاویزی شکل میں اپنے قرض کی رقم کی قیمت، وہ محفوظ رکھیں۔ تو اس سے وہ پریشانیاں سامنے آئیں گی۔ جو تصور سے باہر ہیں۔ پھر قیمتوں میں کمی بیشی کے اصول ومعیار کیا ہیں، اس سے خواص ہی واقف ہو سکتے ہیں۔ نہ کہ عوام۔ جبکہ دین سب کے لئے ہے۔ اس کی سہولت بخشی مسلم ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وماجعل علیکم فی الدین من حرج کہ اللہ نے تمہارے دین میں تنگی پیدا نہیں کی ہے۔ حالانکہ اس سے تنگیوں اور پریشانیوں کا سلسلہ جاری ہو جائے گا۔ اور ایسی ایسی اصولی ذہنی تشققات کرنی پڑے گی۔ جو اسلام کی سادگی، مذکورہ حدیث کے مفہوم، اور اس کی تسہیلات کے منافی ہے۔

اس کے علاوہ غور طلب بات یہ بھی ہے کہ نوٹوں سے قرض کا عام رواج ہے۔ اگر نوٹ ذوات القیم میں سے ہوتا۔ یعنی اس میں قیمتوں کا لحاظ ضروری ہوتا۔ تو اس سے قرض کا جواز ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ جبکہ تمام مسلمان، علما، فقہا، سب بلا پس و پیش نوٹوں سے قرض کا معاملہ طے کرتے ہیں۔ اور اسی تعداد میں نوٹ واپس کرتے ہیں۔ اور کوئی نزاع بھی نہیں ہوتا۔ جو اس بات کی کھلی علامت ہے کہ نوٹ ذوات الامثال میں سے ہے، اس لئے اس کے اندر تمام معاملات میں مثلاً بمثل کا لحاظ کرنا ضروری ہے جس طرح کہ دراہم و دنانیر میں ہے۔

(۶) اب اس سوال کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اس کی بنیاد قیمتوں کی کمی بیشی پر ہے۔ اور اس کو ہم پیچھے منہدم کر چکے ہیں۔



(جواب) نوٹ کی شرعی حقیقت

(۱۸) ——— مولانا محمد زید صاحب جامعہ عربیہ ہتوڑہ باندہ

نوٹ کی شرعی حقیقت کے بارے میں محققین و اہل علم کے مختلف نظریات ہیں۔

نظریہ اولی ! ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ نوٹ بذات خود کوئی سامان یا مال نہیں بلکہ اس کی حیثیت محض سند اور وثیقہ کی ہے۔ کیونکہ نوٹ تو محض دو پیسہ کا کاغذ ہے اس میں ہزار پانچ سو کی مالیت کس طرح آسکتی ہے۔ نوٹ کے سند، حوالہ وثیقہ ہونے کی حقیقت معروف و مشہور ہے۔ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں (ملاحظہ ہو۔ امداد الفتاوی ص ج ۲)

بعض مشائخ ازہر علامہ سید احمد الحسنی مصری وغیرہ کی یہی رائے ہے چنانچہ اس موضوع سے متعلق اپنی کتاب "بہجۃ المشتاق" میں تحریر فرماتے ہیں فکل هذه الاوراق بما ذكرهي سندات ديون ——— (بہجۃ المشتاق ص ۶۸)

ہندوستانی علماء میں سے اکابر علماء دیوبند حضرت گنگوہیؒ حضرت تھانویؒ مفتی شفیع صاحبؒ کی یہی رائے ہے ——— (فتاوی رشیدیہ ص ۳۵۶) امداد الفتاوی ص ج ۲ آلات جدیدہ کے شرعی احکام)

نظریہ ثانیہ ! اس کے بالکل برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ نوٹ کی حیثیت محض مال اور سامان کی ہے کیونکہ لین دین اور سارے معاملات نفس کاغذ ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور کاغذ مال متقوم ہے جس کی قدر و قیمت عرف و رواج کی وجہ سے بڑھ گئی۔ جیسے ہیرے جواہرات کہ انتہائی قیمتی ہوتے ہیں لیکن ان کی حیثیت مال اور سامان کی ہوتی ہے۔ سونے چاندی کے احکام اس میں جاری نہیں ہو سکتے یہی حیثیت کاغذی نوٹوں کی ہے۔

شیخ عبدالرحمن بن سعدی اور شیخ یحیی امان رحمہما اللہ کی یہی رائے اور یہی ان کا

فتویٰ ہے۔ فرماتے۔

"ان الثمن ھو النوط حیث اشتری بہ کما انہ ھو السلعۃ ــــــــ فلیس ھو ذھبا ولا فضۃ وانما العقد واقع علی نفس القرطاس وھو المقصود لفظا ومعنی ــــــ لا یحکم علیھا باحکام الذھب والفضۃ من زیادۃ ونقصان و جواز بیع بعضھا ببعض وبیعھا بنقد متماثلا ومتفاضلا من جنس او اجناس ــــــــ (فتاویٰ السعدیہ ص۳۱۰ ص۳۲۹)

ہندوستانی علماء میں علماء رام پور، علماء بریلی" احمد رضا خاں" کی بھی یہی رائے اور فتویٰ ہے۔ ملاحظہ ہو (نوٹ کی شرعی حقیقت اور اس کے احکام مؤلفہ مفتی سید احمد صاحب ص۲۰۔ ص۲۹)

نظریہ ثالثہ: ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ کاغذی نوٹ دراصل نقدین (سونے چاندی کے دراہم ودنانیر) کے قائم مقام ہیں۔ یعنی نہ تو ان کی حیثیت محض سند اور حوالہ کی ہے اور نہ ہی یہ سامان کے حکم میں ہیں اور نہ ہی ان میں بذات خود ثمنیت پائی جاتی ہے لیکن چونکہ عرف ورواج کی وجہ سے یہ کاغذی نوٹ اصل ثمن (سونے چاندی) کے قائم مقام اور اس کا بدل ہیں لہٰذا جو احکام اصل اور مبدل عنہ کے ہوں گے وہ اس کے قائم مقام اور بدل کے ہوں گے کیونکہ بدل کے اندر مبدل عنہ کے احکام جاری ہوا کرتے ہیں۔ واللہ اعلم ــــــــ الورق النقدی ص۹۶۔

یہی نظریہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی اور ان کے تلمیذ خاص حضرت مولانا فتح محمد صاحب کا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ (مجموعۃ الفتاویٰ ص۲۲۴، ۱۳۸ عطر الہدایہ ص۹۵۲)

نظریہ رابعہ: چوتھا نظریہ یہ ہے کہ روپئے دراصل سکوں کے حکم میں ہیں، کیوں کہ نہ تو اس کی حیثیت سامان کی ہے اور نہ ہی ان کو اب محض وثیقہ اور سند سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کی حیثیت اثمان مروجہ کی ہے۔ اور اس نظریہ کو معتدل اور حق سمجھا گیا ہے۔ شیخ عبداللہ بن سلمان (عضو دار الافتاء فی الریاض) فرماتے ہیں۔

"ھذہ النظریۃ تری ان الاوراق النقدیۃ کالفلوس فی طرو الثمنیۃ علیھا فما ثبت الفلوس من احکام الربا والزکوۃ والسلم ثبت للاوراق النقدیۃ مثلھا۔ وقد قال بھذہ النظریۃ مجموعۃ کبیرۃ من افاضل العلماء ویعتبر القائل بھا فی الجملۃ وسطا بین القائلین

بالنظرية السندية والقائلين بالنظرية العرضية ——— ولا شك انه اقرب الاقوال الى الاصابة فى نظرنا ——— (النقد الورقى ص۸۳)

شیخ احمد خطیب بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں: فتبین بجمیع ذلك ان النوت كالفلوس النحاسية فى جميع احكامها ظاهراً و باطناً الخ (افتاع النفوس بالحاق اوراق النوت بعلة الفلوس ص۴۸).

اسی کے قریب قریب فضیلۃ الشیخ عبداللہ بن بسام فرماتے ہیں کہ نوٹ فروش (نکل کے مخصوص سکے) کے حکم میں ہیں کیونکہ یہ سونا چاندی تو یقیناً نہیں بلکہ یہ تو اثمان مروجہ ہیں جو فروش کی طرح متغیر ہوتے رہتے ہیں اس لئے یہ بھی انہیں کے حکم میں ہوں گے۔

"لانها ليست ذهباً ولا فضة وانما هى اثمان تتغير كما تتغير الفروش بالكساد والرواج وتقرير الحكومات ——— فاذا كان الورق بالفروش اشبه وبه اولى فالاحسن ان تلحق به وان تعطى حكمه وحكم الفروش معروف ان الفروش يجرى فيها الربا النسيئة ولا يجرى فيها ربا الفضل فكذلك يجرى معرّاها الورق بانواعها الخ ——— (الورق النقدى ص۸۱)

الترجیح بین الاقوال الاربعۃ

یہ حقیقت ہے کہ کاغذی نوٹوں کی حیثیت ابتداً محض وثیقہ، سند حوالہ کی تھی، عرف میں بھی اس کو سند تمسک سمجھا جاتا تھا اور مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس نوٹ کے عوض حکومت کے خزانہ میں اتنی چاندی یا سونا محفوظ ہے جس کی ادائے گی کی حکومت ذمہ دار ہوتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ یہ رشتہ کمزور ہوتا گیا اور اب صورت حال یہ ہے کہ ان نوٹوں کا متبادل (سونا چاندی) حکومت کے خزانہ میں محفوظ نہیں ہوتا اور نہ ہی حکومت اب اس کی ذمہ داری قبول کرتی ہے اگرچہ ہر نوٹ میں ایسی عبارت مرقوم ہوتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اس کے متبادل کی ذمہ دار ہے۔

دوسری طرف ان نوٹوں کا اتنا رواج ہو گیا ہے کہ انہیں کاغذی نوٹوں کو عرف میں ثمن کی حیثیت حاصل ہو گئی، اور جو شخص بھی اپنی جیب سے کاغذی نوٹ خرچ کرتا ہے اس کے خواب خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ یہ نوٹ سند یا وثیقہ ہے، بلکہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ شخص گویا اپنی جیب سے دراہم و دنانیر خرچ کر رہا ہے، قرض کا لین دین، ادائیگی، وہ دنیا بھی ان نوٹوں

ہی سے کبھی جاتی ہے، بیع شراء، ہدایا تحائف، وقف وصیت سارے ہی احکام میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ نوٹ ہی اصل ثمن ہیں سند اور حوالہ کا خطرہ بھی نہیں گذرتا۔ یہ ایسے حقائق ہیں جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس لئے اگرچہ ابتداً اس کی حیثیت سند و حوالہ کی تھی لیکن اب اس کی حیثیت "اثمان مروجہ" کی ہے۔

اکابر علماء دیوبند نے اُس وقت سند ہونے کی حیثیت سے نوٹ کے احکام جاری فرمائے تھے لیکن اب عرفاً اس کی حیثیت ثمن کی متعین ہو جانے کے بعد احکام بدل گئے۔ اور اب اکابر علماء دیوبند، سہارنپور، وجمہور علماء کا یہی فتویٰ ہے کہ ادائے گی زکوٰۃ وغیرہ میں انہیں نوٹوں کے ذریعہ ہوگی (ملاحظہ ہو حاشیہ امدادالفتاوی از مولانا سید احمد صاحب پالنپوری ص ۲)

انہیں تغیرات وتصورات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد تقی عثمانی کا بھی یہی رجحان معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کاغذی نوٹوں کی حیثیت سند کی نہیں رہی۔ (احکام اوراق النقود ص ۱۱)

یہ حقیقت ہے کہ کاغذی نوٹ محض کاغذ کا ٹکڑا اور مال متقوم ہے اور اس لحاظ سے وہ سامان ہے لیکن عرف ورواج میں جب اس کی حیثیت ثمن کی ہوگئی اور اس معنی میں وہ معروف ومشہور بھی ہوگیا تو اب اس کی حیثیت سامان نہیں بلکہ ثمن کی متعین ہوگئی کیونکہ ثمن جو بھی ہوتا ہے وہ مال متقوم ہی ہوتا ہے (غیر مال متقوم ثمن کس طرح بن سکتا ہے) البتہ اصطلاح وعرف کی بنا پر اس کی قدر وقیمت بڑھ جاتی ہے سونے چاندی، پیتل گلٹ کا مروج سکہ جس قدر وقیمت کا ہوگا اتنی قیمت کا وہ پیتل اور تانبا نہیں ہوگا جو سکہ کے ہم وزن ہو لیکن سکہ نہ ہو یہ تو کھلا ہوا فرق ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں۔

"لان الفضة الخالصة اذا كانت مضروبة رائجة تقوم باكثر من غيرها فاذا كانت العشرة من الكاسدة تساوى تسعة من الرائجة ا لخ (شامی ج۴ ص۲۵)

اس لئے کاغذی نوٹ اگرچہ مال متقوم ہیں اور اس لحاظ سے سامان ہیں لیکن اصطلاح وعرف کی وجہ سے ثمن بن گئے یہی وجہ ہے کہ اس نوٹ کی قدر وقیمت سامان کے برابر نہیں (کیونکہ کاغذ تو دو پیسہ کا ہوگا) بلکہ ثمن ہونے کی وجہ سے اس کی قدر وقیمت بڑھ گئی۔ اور ثمن بن جانے کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ اصطلاح ناس عرف رواج کی وجہ سے کوئی مال ثمن بن جائے۔

علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں: ان الاموال ثلثة ثمن بکل حال وهو النقدان
وثمن بالاصطلاح وهو سلعة فی الاصل کالفلوس فان کانت رائجة
فهی ثمن والا فسلعة ——————— (بحر الرائق کتاب الصرف ج ۶ ص ۲۲۱)

حاصل کلام یہ کہ کاغذی نوٹ فلوس کی طرح اثمان مروجہ ہیں لہٰذا جو احکام فلوس کے ہونگے وہی اس کے بھی ہوں گے اگرچہ بعض صورتوں میں دونوں میں فرق ہوتا ہے لیکن اصل احکام کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں، واللہ اعلم۔

ربٰو کی علت

مذکورہ بالا مذاہب کی تفصیلات سے واضح طور سے معلوم ہوا کہ فلوس کی باہم بیع کمی بیشی کے ساتھ ائمہ اربعہ کے نزدیک جائز ہے۔

حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک تو ظاہر ہے کیونکہ ان حضرات کے نزدیک ربٰو کے تحقق کیلئے قدری وجنسی ہونا شرط ہے اور قدری (یعنی کیلی ووزنی ہونا) یہ علت متعدیہ ہے یعنی سونے چاندی کے علاوہ بھی ہر کیلی اور وزنی میں جاری ہوگی۔ لوہا، پیتل، تانبا بھی اگر موزونی ہوں تو اتحاد جنس کی صورت میں ان میں بھی ربٰو کا تحقق ہوگا۔ حنابلہ اور احناف کا یہی مسلک ہے۔

البتہ احناف کے نزدیک قدریۃ کا تحقق مطعومات میں اس وقت ہوگا جبکہ نصف صاع یا اس سے زائد ہو۔ ورنہ نہیں۔

اور غیر مطعومات یعنی نقدین میں قدریۃ کا تحقق حبہ سے کم میں بھی ہو جائے گا۔ اسی لئے نصف صاع سے کم میں مطعومات میں اتحاد جنس کے بعد بھی زیادتی کے ساتھ بیع جائز ہے اور غیر مطعومات (سونا چاندی، دراہم دنانیر) میں اگرچہ وہ موزون نہ ہوں بلکہ عددی ہونے کی حیثیت سے مستعمل ہوں تب بھی ان میں ربٰو کا تحقق ہو جائے گا اور اتحاد جنس کی صورت میں تفاضل کے ساتھ بیع جائز نہیں (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ص ۲۴۹ ج ۲)

البتہ سونے چاندی کے علاوہ جن موزونی اشیاء میں اس علۃ کا تعدیہ کیا گیا ہے اس میں فی الواقع موزونی ہونا شرط ہے۔ عددی ہونے کی حیثیت سے اگر معاملہ ہوگا تو اس میں بھی جواز ہوگا اسی لئے فلوس کی بیع باہم تفاضل کے ساتھ جائز ہے واللہ اعلم۔

شافعیہ مالکیہ کے نزدیک نقدین (سونے چاندی) میں ربوٰ کی علت قدری ہونا نہیں بلکہ ثمنیت اصلیہ شرط ہے۔ اور ان کے نزدیک یہ علت قاصرہ ہے یعنی نقدین کے سوا دوسری دھاتوں میں ان کے نزدیک ربوٰ نہیں ہوگا۔

اور فلوس میں بھی ان حضرات کے نزدیک چونکہ ثمنیت اصلیہ نہیں بلکہ ثمن کا حدوث ہوا ہے اس لئے فلوس میں بھی ان حضرات کے نزدیک ربوٰ کا تحقق نہ ہوگا۔

(کمافی شرح المہذب ص ۲۹۵ ج ۹)

وذهب بعض الى ان علة الربا فى الذهب والفضة غلبة الثمنية وهذا الرأى المشهور عن الامامين مالك والشافعى فالعلة عندهما فى الذهب والفضة قاصرة عليها والقول بالغلبة احتراز عن الفلوس اذا راجت رواج النقود فالثمنية عندهما طارئة عليها فلا ربا فيها۔ (الورق النقدی ص ۱۰۰)

البتہ بعض علماء ابن تیمیہ وابن قیمؒ ربوٰ کی علت مطلق ثمنیت کو قرار دیتے ہیں خواہ کسی بھی صورت اور کسی بھی دھات کے بنے ہوئے سکے ہوں۔ لہٰذا ان حضرات کے نزدیک فلوس میں بھی (جبکہ وہ ثمن مروج ہوں) ربوٰ کا تحقق ہو جائے گا۔ کیونکہ ربوٰ کی علت مطلق ثمنیت پائی گئی لہٰذا ایک پیسہ کی بیع دو کے عوض جائز نہ ہوگی۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۴۷۳ ج ۲۹۔ اعلام الموقعین ص ۱۳۷ ج ۲ بحوالہ الورق النقدی ص ۱۰۰)

کتب فقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ احناف میں امام محمدؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جمہور فقہاء وائمہ اربعہ کے نزدیک فلوس کی بیع باہم تفاضل کے ساتھ جائز ہے خصوصاً احناف کے نزدیک کیوں کہ ربوٰ کی علت قدری یعنی کیلی ووزنی ہونا ہے اور فلوس نہ کیلی ہیں نہ وزنی بلکہ عددی ہیں اور کاغذی نوٹ تو بدرجہ اولی عددی ہیں اس لئے کہ فلوس تو پھر بھی وزنی ہو سکتے ہیں لیکن کاغذی نوٹ عددی ہی ہوتے ہیں۔ اور عددیات کی بیع باہم تفاضل کے ساتھ جائز ہے۔

ويجوز بيع المعدودات المتقاربة من غير المطعومات بجنسها متفاضلاً عند ابى حنيفة وابى يوسف بعد ان يكون يداً بيد كبيع الفلس بالفلسين باعيانهما وعند محمد لا يجوز ـــــــ لهما علة الربا هى القدر مع الجنس وهو الكيل والوزن المتفق عند اتحاد

الجنس والمجانسة ان وجدت ههنا فلم يوجد القدر فلا يتحقق الربا ——————— بدائع ص ۱۸۵ ج ۲)

اعیان فلوس کا مطلب

جب فلوس کی بیع باہم تفاضل کے ساتھ کی جائے گی اس وقت یہ فلوس ثمنیت سے نکل کر خود بخود عرضیت کے حکم میں ہوجائیں گے کیونکہ ثمن غیر متعین ہوتا ہے اور مبیع متعین ہوتی ہے اور یہاں فلوس کو مبیع بنایا جارہا ہے اس لئے لامحالہ فلوس کی بیع اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ اعیان کے ساتھ ہو غیر اعیان کے ساتھ فلوس کی بیع نہیں ہوسکتی۔ اور یہی مطلب ہے ——————— (حل بیع فلس بفلسین او اکثر باعیانها نهما (شامی ق ۱۸ ج ۴) کا۔

یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تفاضل کے ساتھ نوٹوں اور پیسوں کی بیع کے واسطے بائع مشتری پر لازم ہو کہ وہ پہلے نوٹوں اور پیسوں کو بالتصریح ثمنیت سے خارج کرکے عرض کے درجہ میں کریں پھر بیع وشراء کا معاملہ کریں۔ بلکہ یہ تعیین خود بخود ہوجائے گی۔

اذا باع فلساً بفلسين باعيانهما حيث يتعين من غير تصريح لانه لو لم يتعين لفسد البيع ——————— (مجمع الانهر ص ۱۲۱ ج ۲)

لان فعل المسلم يجب حمله على احسن الوجوه ما امكن (مبسوط ص ۵۹ ج ۱۴)

لان امور المسلمين محمولة على الصحة والسداد ما امكن (بدائع ص ۲۱۶ ج ۵)

قلنا ثمنيتها قد بطلت فى حقهما قبل البيع فالبيع صادفها وهى سلعة عددية

——————— لان خروجها من وصف الثمنية لضرورة صحة العقد

وجوازه لانهما قصدا الصحة ولا صحة الا بما قلنا۔ (بدائع ص ۱۸۵ ج ۵)

اس مسئلہ میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف بھی ہے ان کے نزدیک بیع الفلوس بالتفاضل جائز نہیں۔ لیکن اصحاب ترجیح نے شیخین ہی کے قول کو راجح اور مفتی بہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ بدائع اور فتح القدیر نے شیخین ہی کی دلیل کو مؤخر بیان کیا ہے۔

وتاخير دليلهما بحسب عادة المصنف ظاهر فى اختياره قولهما (فتح القدير ص ۲۴۹ ج ۶)

بیع الفلوس بالتفاضل کی بابت حضرت گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں۔

" فلوس وخرمہرہ سب عددی ہیں اگر اپنی جنس سے تبادلہ کیا جائے مثلاً ایک فلس عوض

ایک فلس یا دو کے تو درست ہے کیونکہ اتحاد جنس ہے۔ مگر کیل و وزن نہیں تو تفاضل سب درست ہوا مگر نسیئہ حرام ہے" ——— (فتاویٰ رشیدیہ کراچی ص۵۰۰)

نوٹوں اور پیسوں کی بیع بیع صرف نہیں

ماقبل میں یہ بات گذر چکی ہے کہ نوٹوں و پیسوں کی بیع باہم تفاضل کے ساتھ جائز ہے لیکن شبہ ہو سکتا تھا کہ بیع صرف کی تعریف تو اس پر صادق آتی ہے کیونکہ یہ اثمان کی بیع اثمان کے ساتھ ہے اور اسی کا نام بیع صرف ہے لہٰذا اس کی بیشی کے ساتھ بیع جائز نہ ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ بیع صرف کا باب ربوٰ ہی کے باب سے متعلق ہے اور بیع صرف کا تعلق صرف نقدین یعنی دراہم و دنانیر (سونے چاندی کے سکوں) کے ساتھ خاص ہے اس کے علاوہ نوٹوں اور پیسوں کی باہمی بیع کو بیع صرف میں نہیں داخل کیا جا سکتا جیسا کہ فقہاء کی مندرجہ ذیل عبارات سے معلوم ہوتا ہے۔

(١) عقد الصرف بيع الثمن بالثمن اى ما خلق للثمنية ومنه المصوغ جنساً بجنس او بغير جنس كذهب بفضة (در مختار شامی ص۲۴۴ ج۴)

(٢) فالصرف فى متعارف الشرع اسم لبيع الاثمان المطلقة بعضها ببعض وهو بيع الذهب بالذهب والفضة بالفضة ——— بدائع ص۲۱۵ ج۵

(٣) وعقد الصرف ما وقع على جنس الاثمان ذهبا و فضة بجنسه او بغير جنسه ——— (فتح القدير ص۱۵۹ ج۶)

(٤) الصرف هو البيع اذا كان كل واحد من العوضين من جنس الاثمان اى بيع الذهب بالذهب والفضة بالفضة (كفاية شرح هداية ص۱۵۸ ج۶)

(٥) اقسام الصرف ثلثة بيع الذهب بالذهب وبيع الفضة بالفضة وبيع احدهما بالآخر ——— (عینی و عنایۃ حاشیۃ کنز ص۲۶۱)

(٦) وغالب الغش ليس فى حكم الدراهم والدنانير فيصح بيعها بجنسها متفاضلاً وزناً وعدداً ... ——— (بحر الرائق ص۲۱۸ ج۶)

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کرام نے بیع صرف میں خالص دراہم و دنانیر کی تصریح اور اس کی تخصیص فرمائی ہے جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ فلوس مروجہ چونکہ سونے چاندی

کے مروج سکے جن میں کھوٹ غالب ہو ان کی بیع کو بھی من کل الوجوہ بیع صرف نہیں کہہ سکتے اور اتحاد جنس کے باوجود کمی بیشی کے ساتھ ان کی بیع جائز ہے۔

الدراھم التی غشہا غالب بان کان ثلثاھا صفراً وثلثہا فضۃ کالدراھم التی تروج فی دیارنا یجوز بیع الواحد بالاثنین منہا باعیانہما لکن یشترط التقابض فی المجلس کما فی الصرف۔ (فتاویٰ قاضیخان ص ۲۵۲ ج ۲)

اسی طرح اگر خالص دراہم دنانیر کی بیع فلوس کے ذریعہ کی جائے تو اگرچہ جانبین میں اثمان مروجہ ہیں لیکن پھر بھی اس کو بیع صرف نہیں کہا جا سکتا۔

اذ اشتری الرجل فلوساً بدراھم ونقد الثمن ولم تکن الفلوس عند البائع فالبیع جائز لان الفلوس الرائجۃ ثمن کالنقود وبیع الفلوس بالدراھم لیس بصرف۔ ——— (مبسوط سرخسی ملخصاً ص ۲۴ ج ۱۴)

جب غالب الغش دراہم دنانیر کی بیع کمی زیادتی کے ساتھ جائز ہے اور اس میں بیع صرف کے احکام پورے طور سے جاری کرنا درست نہیں۔

اور جب فلوس اور خالص دراہم کی بیع بیع صرف نہیں کہلاتی جبکہ ایک جانب ثمن خلقی (دراہم یا دنانیر) موجود ہیں تو اگر دونوں جانب فلوس ہی فلوس ہوں نوٹ ہی نوٹ ہوں اس بیع کو کیوں کر بیع صرف میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ اور کیوں کر اس کی باہمی بیع کمی بیشی کے ساتھ جائز نہ ہو گی۔

مختلف ممالک کی کرنسیوں کی بیع

نوٹوں کی بیع باہم تفاضل کے ساتھ جائز ہے خواہ مختلف ممالک ہی کے نوٹ کیوں نہ ہوں لیکن چونکہ تمام نوٹوں کی جنس متحد ہے اس لئے تقابض ضروری ہے لیکن اگر یہ بات محقق ہو جائے کہ ان کاغذی نوٹوں کی جنس اصل، مادہ بھی مختلف ہے جیسا کہ بعض علماء کی رائے ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو مختلف ممالک کے کاغذی نوٹوں کی باہمی بیع میں تقابض کی قید بھی مرتفع ہو جائے گی۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔

وانما العقد وا قع علی نفس القرطاس والورق۔ ——— وانما وقع العقد علی اوراق تخالف ذاتہ معدنہ ذات الذھب والفضۃ ومعدنہا

من كل وجه ـــــــــــ (فتاوى السعدية ص ٢٢٨ تا ٢٢٩)

اگر واقعی یہ بات صحیح ہے تو ایک ہی ملک کی کرنسی میں بھی اگر جنس بدل جائے تو ان میں بھی تفاضل بغیر تقابض کے جائز ہوگا۔

تبدیل جنس کی بابت فقہاء کرام فرماتے ہیں۔

(١) وكل نوع مبني على اصله فاذا كان شيأن من اصلين فهما جنسان ـــــــــ (المغني ص ٢٥ ج ٤)

(٢) واختلاف الجنس يعرف باختلاف الاسم الخاص واختلاف المقصود ـــــ فالثوب الهروي والمروي جنسان لاختلاف الصنعة وقيام الثوب ـــــــــ (بحر الرائق ص ١٢٨ ج ٦)

اس تصریح کے مطابق اختلاف صنعہ کی بنا پر بھی جنس بدل جاتی ہے لہذا اگر دوسرے ممالک کے کاغذی نوٹوں کی صنعت میں بھی فرق ہوگا تب بھی جنس بدل جائے گی خصوصاً جبکہ مادہ بھی مختلف ہو۔

اس لئے دوسرے ممالک کی کرنسی کی بیع تفاضل کے ساتھ بغیر تقابض کی شرط کے بھی جائز ہونا چاہئے۔ واللہ اعلم

کرنسی نوٹوں میں زکوٰۃ کا حکم اور اس کا حساب

نوٹ اگرچہ ابتداً سونے یا چاندی کے متبادل طور سے مستعمل ہوتے تھے لیکن اب ان کی وہ حیثیت ختم ہوچکی اور مانند فلوس کے یہ نوٹ بھی اثمان مروجہ بن گئے۔ جن میں بذات خود ثمنیت عرفیہ غالب ہے۔ لہذا اب خود نوٹوں ہی کی مالیت کا اندازہ کرتے ہوئے وجوب زکوٰۃ کا حکم ہوگا۔ اور یہ نوٹ مالیت میں جب دو سو درہم یا بیس مثقال کے مساوی ہونگے تو ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

قال محمد على بن الشيخ حسين من قارى الهداية من فتاواه الفتوى على وجوب الزكوة فى الفلوس اذا تموّل بها اذا بلغت ما يساوى مائتى درهم من الفضة او عشرين مثقالا من الذهب۔

ـــــ شمس الاشراق فى حكم التعامل بالاوراق ص ٦ بحواله الرق المنشور ص ٩٥

بالغرض اگر کرنسی کو سونے یا چاندی کا تبادل بھی مانا جائے تب بھی اصولی حیثیت سے نصاب مقرر کرنے میں اسی نقد کا اعتبار ہوگا جس سے وجوب زکوٰۃ کا حکم ہو جاتا ہو خواہ سونا ہو یا چاندی راجح یہی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارات سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ولو بلغ باحدهما نصابا دون الآخر تعین ما یبلغ به

———— (درمختار ص۳۱ ج۲ بحر ص۲۳۶ ج۲)

(۲) صرح المصنف باختلاف الروایة واقوال الصاحبین فی التقویم انه بالانفع ——— ولیس کذلک بل لا اختلاف فی تعیین الانفع بهذا المعنی علی مایفید لفظ النهایة والخلاصة۔ قال فی النهایة فی وجه هذه الروایة ان المال کان فی ید المالک ینتفع به زمانا طویلا فلابد من اعتبار منفعة الفقراء عند التقویم ——— وجمع بین الروایتین بان المذکور فی الاصل من التخییر هو ما اذا کان التقویم بکل منهما لا یتفاوت ———— (فتح القدیر ص۱۶۶ ج۲)

جواب ۳ نوٹوں میں دین اور قرض کی ادائیگی کا معیار

نوٹوں اور سکوں کی قدر و قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ آج آپ نے کسی کو بطور قرض کے ایک ہزار روپے دیئے جس سے ایک سائیکل خریدی جا سکتی ہے پانچ سال بعد جب آپ کو یہی ایک ہزار روپیہ ادا کیا جائے گا اس وقت ان کی قدر و قیمت بہت گر چکی ہوگی یہ ایک ہزار پانچ سو کے مساوی ہونگے۔ اور اس ایک ہزار میں سائیکل نہیں خریدی جا سکے گی۔

اس قسم کی تمام صورتوں میں کیا دائن کو حق حاصل ہے کہ وہ مدیون (مقروض) سے اصل تعداد کا اعتبار نہ کرتے ہوئے محض نوٹوں کی قدر و قیمت کے لحاظ سے معاملہ اور مطالبہ کرے؟

اس قسم کی صورتیں فقہ کے اس جزئیہ سے ملتی جلتی ہیں جس کو فقہاء نے ذکر فرمایا ہے کہ: "اگر بائع و مشتری کے مابین معاملہ ہوا۔ ابھی مشتری نے بیع کا ثمن (فلوس) ادا نہ کئے تھے کہ ان فلوس کی قیمت میں فرق آگیا، ان کا چال چلن بند ہوگیا یعنی

صورت میں امام صاحب کے نزدیک تو بیع ختم ہوجائے گی اور صاحبین کے نزدیک بیع باقی رہے گی۔ اور ثمن کی ادائے گی فلوس کی قدر وقیمت کے لحاظ سے ہو گی فقہاء نے صاحبین کے قول کو ترجیح دی ہے۔ تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے (شامی ص ۲۲ ج ۴)

اگر فلوس نافقہ کا چال چلن بند ہو جائے تو یہ حکم ہے ہی لیکن اگر فلوس کے رائج ہوتے ہوئے بھی ان کی قدر وقیمت گھٹ جائے، یا ان کے رواج میں کمی آجانے کے باعث عیب پیدا ہو جائے (جیسا کہ آج کل ہوا کرتا ہے) تب بھی یہی حکم ہے یعنی یہ کہ معاملہ کے کے وقت فلوس (پیسوں) کی جو قدر وقیمت تھی اس وقت کی قیمت کے لحاظ سے ثمن ادا کیا جائے گا۔

هذا اذا كسدت او انقطعت، اما اذا غلت قيمتها او انتقصت فالبيع على حاله ولا يتخير المشتري ويطالب بالنقد بذلك العيار الذي كان وقت البيع كذا في فتح القدير ——— (شامی ص ۲۲ ج ۴)

یہ مسئلہ صرف بیع ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ دیون اور قرضوں کا بھی یہی حکم ہے یعنی جس دن بیع اور قرض کا معاملہ ہوا تھا اس دن ان فلوس کی جو قدر وقیمت تھی اسی قدر وقیمت کے لحاظ سے ادائے گی کی جائے گی۔

اگرچہ قاضی خاں اور اسبیجابی نے ذکر کیا ہے کہ ایسی صورت میں قدر وقیمت کا لحاظ نہ کر کے محض عدد اور مثل کا لحاظ ہو گا اور اسی لحاظ سے ثمن یا قرض کی ادائے گی ہو گی۔

ولو استقرض فلوسا فكسدت عليه مثلها ——— قيد بالكساد احترز عن الغلاء والرخص ——— لان الفلوس اذا لم تكسد ولكن غلت قيمتها او رخصت فعليه مثل ما قبض من العدد۔

——— رسائل ابن عابدین (تنبیہ الرقود فی احکام النقود ص ۶۰ ج ۲)

وفي فتاوى قاضي خان يلزمه المثل وهكذا ذكر الاسبيجابي قال ولا ينظر الى القيمة ولكن صورها ——— (بحر الرائق ص ۲۱۹ ج ۶)

لیکن یہ رائے مرجوح اور غیر مفتی بہ ہے۔

راجح اور معتمد ومفتی بہ قول یہی ہے کہ فلوس کی قدر وقیمت گھٹنے بڑھنے کی صورت میں قرض میں بھی عدد ومثل کا لحاظ نہ کرتے ہوئے قدر وقیمت کے لحاظ سے ادائے گی کی

جائے گی جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارات سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱) وفی البزازیۃ معزیا الی المنتقی غلت الفلوس القرض أو رخصت فعند الامام الاول والثانی اولاً لیس علیہ غیرھا وقال الثانی ثانیاً علیہ قیمتہا من الدراھم یوم البیع والقبض وعلیہ الفتویٰ وھکذا فی الذخیرۃ والخلاصۃ۔
(بحر الرائق قبیل الکفالۃ ص ۲۱۹ ج ۶)

(۲) بقی الکلام فیما اذا نقصت قیمتہا فھل للمستقرض رد مثلہا وکذا المشتری أو قیمتہا ؟ لا شک ان عند ابی حنیفۃ یجب رد مثلہا واما علی قولہما فقیاس ما ذکروا فی الفلوس انہ یجب قیمتہا من الذھب یوم القبض عند ابی یوسف ویوم الکساد عند محمد۔ (رسائل ابن عابدین ص ۶۱ ج ۲)

(۳) اذا غلت الفلوس قبل القبض أو رخصت قال ابو یوسف قولی وقول ابی حنیفۃ فی ذلک سواء ولیس لہ غیرھا ثم رجع ابو یوسف وقال علیہ قیمتہا من الدراھم یوم وقع البیع فی صورۃ البیع ویوم وقع القبض فی صورۃ القرض کما نبہ علیہ فی النہر ــــــــــــ (رد المحتار ص ۲۳ ج ۴)

(۴) ونقلہ فی البحر واقرہ فحیث صرح بان الفتوی علیہ فی کثیر من المعتبرات فیجب علیہ ان یعول علیہ افتاءً وقضاءً لان المفتی والقاضی واجب علیہما المیل الی الراجح من مذھب امامہما ومقلدھما ولا یجوز لہما الاخذ بمقابلہ لانہ مرجوح بالنسبۃ الیہ۔ ولم ار من حمل الفتویٰ علی قول الامام (رسائل ابن عابدین ص ۵۹ ج ۲ شامی ص ۱۳ ج ۴)

(۵) وحاصل ما مر انہ علی قول ابی یوسف المفتی بہ لا فرق بین الکساد والانقطاع والرخص والغلاء فی انہ تجب قیمتہا یوم وقع البیع او القرض لا مثلہا۔ (شامی ص ۲۳ ج ۴)

مذکورہ بالا واضح تصریحات سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ فلوس (اور نوٹ بھی فلوس کے حکم میں ہیں) کی قدر و قیمت گھٹ بڑھ جائے تو عدد شئی کا لحاظ نہ کرتے ہوئے مثل بالقیمۃ کے لحاظ سے دیون اور قرض کی ادائے گی کی جائے گی مفتی بہ اور راجح قول یہی ہے جس کے خلاف فتویٰ دینے اور فیصلہ کرنے کی قاضی و مفتی کے لئے فقہاء کی تصریح کے مطابق گنجائش نظر

نہیں آتی واللہ اعلم۔

علّت اور دلیل

وجہ اس کی یہ ہے کہ شریعت نے جن معاملات واحکام میں مثل بالمثل کو لازم اور واجب قرار دیا ہے ان میں مثل ہی لازم ہونا چاہیے۔ مثلاً قرض وغیرہ میں۔ لیکن اگر مثل کی ادائے گی میں دائن یا صاحب معاملہ کا ضرر ہوتا ہو تو شریعت ضرر سے بچاتی ہے اور اضرار سے منع کرتی کرتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لا ضرر ولا ضرار (بیہقی دارقطنی) فقہ کا مسلہ اصول الاشباہ میں مذکور ہے

القاعدۃ الخامسۃ الضرر یزال اصلہا قولہ علیہ السلام لا ضرر ولا ضرار اخرجہ المالک فی الموطا وفسرہ فی المغرب بانہ لا یضر الرجل اخاہ ابتداءً ولا جزاءً .... (الاشباہ ص ۱۳۹)

دین وقرض کی ادائے گی جبکہ نوٹ وفلوس کی قدروقیمت گر گئی ہو) اگر عدد مثل کے تناسب سے ہو تو یہ یقیناً دائن کے حق میں کھلا ہوا ضرر ہے۔ ابتداءً تو ضرر نہ تھا لیکن انتہاءً ضرر پایا گیا۔ اور یہی راز ہے کہ فقہاء احناف نے امام صاحب کے قول پر فتویٰ نہ دے کر صاحبین کے قول پر فتویٰ دینے پر اصرار کیا ہے۔

وقولہما انظر للمقرض من قول ابی حنیفۃ لان فی رد المثل اضرارا بہ .... (شامی ص ۱۲۸ ج ۴)

اسی وجہ سے اگر قرض کے سکوں کا چال چلن بند ہو جائے تو صاحبین کے نزدیک دائن اور مقرض کو ضرر سے بچانے کے لئے مثل عددی کے بجائے مثل بالقیمۃ کے ذریعہ ادائے گی ہو گی۔

وجہ قولہما ان الواجب فی باب القرض رد مثل المقبوض وقد عجز عن ذلک لان المقبوض کان ثمنا وقد بطلت الثمنیۃ بالکساد فعجز عن رد المثل فیلزمہ رد القیمۃ (بدائع ص ۲۹۵ ج ۷)

مدیون ومقروض اگر اپنے دین وقرض کی ادائے گی مثل عددی کے ساتھ کرے لیکن وہ ادا بالمثل عیب سے خالی نہ ہو اگر دائن ومقرض اس کو بخوشی منظور کرے تو فبہا ورنہ

دائن کو اس مثل کے قبول کرنے پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ فلوس اور نوٹوں کی قدر و قیمت کم ہو جانے پر اس میں نقص اور عیب پیدا ہو گیا اور عیب دار چیز کے قبول کرنے پر دائن کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

المدیون اذا قضی الدین اجود مما علیہ لا یجبر رب الدین علی القبول کما لو دفع الیہ انقص مما علیہ وان قبل جاز (عالمگیری ص۲۳۳ ج۳)

عیب کی تعریف معروف و مشہور ہے: فما اوجب نقصا فیہا عیبا والمرجع فی ذالک الی العادۃ فی عرف اھل ھذا الشان وھم التجار ——— (المغنی ص۱۶۸ ج۴)

وما اوجب نقصان الثمن فی عادۃ التجار فھو عیب ———

لان التضرر بنقصان المالیۃ وذلک بانتقاص القیمۃ ——— (شامی ص۵ ج۴)

اور یہ یقینی بات ہے کہ تجار کے نزدیک نیز عرف و رواج میں جس طرح فلوس کا کاسد ہونا عیب سمجھا جاتا ہے اسی طرح اس کی قیمت کا کم ہو جانا بھی عیب اور نقص شمار ہوتا ہے لہذا جو حکم فلوس کا سدہ کا ہوتا ہے (یعنی یہ کہ مثل کے بجائے قیمت کا لحاظ کرتے ہوئے دین ادا کیا جائے) وہی حکم نوٹ اور فلوس (جن کی قیمت گر جائے) کا بھی ہوگا۔ علت کے پیش نظر دونوں کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔

یہ صحیح ہے کہ نوٹ اور فلوس کی قدر و قیمت کم ہو جانے کی حیثیت اوصاف کی ہے جس کا لحاظ نہ کرتے ہوئے ادا بالمثل ہی ہونا چاہیے۔ لیکن واضح رہے کہ دیون میں اوصاف بھی مقصود و ملحوظ ہوتے ہیں۔

"لان القرض وان لم یقتض وصف التمنیۃ لا یقتضی سقوطہا اعتبارہا اذا کان المقبوض قرضا موصوفا بہا لان الاوصاف معتبرۃ فی الدیون الخ"

——— (فتح القدیر ص۲۰۹ ج۶)

تقویم کا معیار

جب یہ بات متحقق ہو گئی کہ نوٹوں اور پیسوں کی قدر و قیمت گر جانے کی صورت میں اس کی ادائے گی مثل عددی کے ساتھ نہیں بلکہ بالقیمت کے لحاظ ہو گی اور اس معاملہ میں تقویم کا معیار فقہاء کرام کی تصریح کے مطابق صرف سونا اور چاندی ہی بن سکتے ہیں، چنانچہ فلوس کاسدہ

کی ادائے گی یں سونے یا چاندی ہی کی قیمت کو معیار بنایا گیا ہے جیسا کہ ماقبل کی عبارات میں تفصیل کے ساتھ گذر چکا ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ سونا چاندی خلقی اعتبار سے ثمن ہیں (شامی ج۴ ص۱۶۲) اس کے علاوہ دیگر اجناس میں ثمن اور معیار بننے کی صلاحیت اپنی اصل کے اعتبار سے نہیں پائی جاتی (بحر ج۶ ص۲۱۱)

نیز اس وجہ سے بھی کہ بسا اوقات مختلف قریبی علاقوں میں بھی اجناس میں بہت تفاوت ہوتا ہے کیونکہ کثرت استعمال کے سبب کوئی جنس بڑی قدر و قیمت کے لحاظ سے دیکھی جاتی ہے اور دوسرے علاقوں میں اس کی وہ حیثیت نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف سونا چاندی ساری دنیا میں معیاری حیثیت رکھتا ہے اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ خود سونے چاندی کی قیمت بہت گر جائے جیسا کہ شیخ یوسف قرضاوی نے اس بحث کو چھیڑا ہے۔ لیکن ایسا نادر ہوتا ہے والنادر کالمعدوم احکام میں اکثر و اغلب کا اعتبار ہوتا ہے اسی وجہ سے ہمارے فقہاء نے نقدین کو معیاری حیثیت دی ہے واللہ اعلم۔

اور فلوس و نوٹوں کی قدر و قیمت گھٹنے میں معیار ہر زمانہ کے عرف و رواج اور تجار کے عادات کے اعتبار سے ہوگا۔ جب تاجروں کی جماعت نوٹوں اور پیسوں میں نقص کو ثابت کرے گی اس وقت ان کا قول قابل لحاظ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

دیون اور قرض کے لئے بہترین شکل اور آسان صورت

سب سے بہتر اور آسان صورت یہ ہے کہ قرض دیتے وقت یا دیون یعنی مہر مقرر کرتے اور معاملہ فرخنگی کے وقت طرفین واجب الادا نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کریں اور بوقت ادائے گی اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائے گی پر معاملہ کریں۔ مثلاً اس طرح کہ "آج دو تولہ چاندی کے برابر دو سو روپیہ قرض میں دے رہا ہوں اور وصولیابی کے وقت دو تولہ چاندی کے برابر روپئے لوں گا خواہ کتنے ہی نوٹوں کے برابر ہو۔

یہ صورت بلاشبہ جائز ہے جس کی صریح تائید مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے فتدبر۔

وفي دعوى البزازية من النوع الخامس عشر من فوائد الامام

ابی حفص الکبیر۔ استقرض منہ دانق فلوس حال کونہا عشرۃ بدانق فصارت ستۃ بدانق، اورخص وصار عشرون بدانق یاخذ منہ عدد مااعطی ولا یزید ولا ینقص الخ۔

قلت ھذا مبنی علی قول الامام وھو قول ابی یوسف اولا وقد علمت ان المفتی بہ قولہ ثانیا بوجوب قیمتہا یوم القرض وھو دانق ای سدس درھم سواء صار الآن ستۃ فلوس بدانق او عشرین بدانق

(شامی کتاب البیوع ج۴ ص۲۴) واللہ اعلم

ھذا ما سنح لی بعون اللہ تعالیٰ، والعلم عند اللہ تعالیٰ ان کان صوابًا فمن اللہ وان کان خطأ فمنی۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرًا، وما توفیقی الا باللہ۔



سوالنامہ
بینک انٹرسٹ و سودی لین دین کے بارے میں
سوالات

از ــــــــــــــ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

قرآن وسنت میں ربوا کی حرمت جس شدت وقطعیت کے ساتھ بیان کی گئی ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں، دوسری طرف موجودہ ربوا کے بینکنگ نظام نے ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ سماج کے اکثر افراد خصوصاً اعلیٰ اور متوسط طبقہ کا بینکوں سے برابر واسطہ پڑتا ہے بینکوں سے معاملات پڑنے کی وجہ سے ربوا کے بارے میں مختلف قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں، جن کے بارے میں عصر حاضر کے بابصیرت فقہاء اور ارباب افتاء کا اجتماعی فیصلہ امتِ مسلمہ کے سامنے آنا چاہئے، اسی طرح حکومت ترقیاتی اسکیموں کے تحت قرضے تقسیم کرتی ہے اور ان قرضوں پر کچھ سود بھی وصول کرتی ہے، ان ترقیاتی قرضوں کے بارے میں جو فقہی سوالات ابھرتے ہیں وہ بھی اصلا ربوا ہی کے مسئلہ سے مربوط ہیں۔ اسی نوعیت کے بہت سے مسائل اس بات کے متقاضی ہیں کہ ربوا کے بارے میں چند اصولی باتیں طے کرکے اہم سوالات کے شرعی جوابات دیئے جائیں۔ اس پس منظر میں مندرجہ ذیل سوالات و تنقیحات جواب وتحقیق کے لئے پیش خدمت ہیں۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی اہم سوال یا تنقیح رہ گئی ہو تو اسے بھی شامل کرلیں۔

۱ــــ ربوا کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کا دائرہ کیا ہے؟

۲ــــ کیا دار الحرب میں سودی معاملات، حقیقت قرار نہیں دیئے جاسکتے، اس وجہ سے کہ اموال اہل حرب معصوم اور قابل ضمان نہیں، اور سود کے تحقق کے لئے بدلین کا معصوم ومتقوم ہونا ضروری ہے، لہذا اس شرط کے مفقود ہونے کی وجہ سے حقیقۃً ربوا کا تحقق ہی نہیں ہوگا۔ اگرچہ وہ معاملات صورۃً سودی معاملات ہوں؟

۳ــــ دار الحرب اور دار الاسلام کی تعریف کیا ہے اور شرطیں کیا ہیں، اور کیا موجودہ حالات میں "دار" کا حصر دار الاسلام اور دار الحرب میں درست ہے۔ کیا ہندوستان (جیسا ملک جہاں ایک دستوری حکومت، تمام شہریوں کے مساوی حقوق کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور قانونی و دستوری

نقطۂ نظر سے بلا تفریق مذہب وزبان وعلاقہ ہر شہری کو اپنے مذہبی شعائر کی آزادی کے ساتھ ملک کے وسائل آمدنی سے منتفع ہونے کا مساوی حق ہے) دار الحرب ہے؟ اگر دار الاسلام اور دار الحرب کے علاوہ "دار" کی کوئی تیسری قسم ہے تو وہ کیا ہے اور اس کی شرطیں کیا کیا ہیں؟

۴۔ بینکوں میں جمع شدہ رقوم پر جو سود ملتا ہے اس کا بینکوں سے لینا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے اور لینے کے بعد اسے کس مصرف میں خرچ کیا جائے؟ سرکاری بینکوں اور غیر سرکاری بینکوں سے سود لینے کے حکم میں کوئی فرق ہے؟

۵۔ سود لینے اور دینے کے حکم میں کوئی فرق کیا جا سکتا ہے، اور کیا غیر اسلامی ملک میں واقعی کچھ ایسی مجبوریاں ہو سکتی ہیں جن کی بنیاد پر سود دینا جائز ہو؟

۶۔ کیا سودی قرضے لینے کی کسی حال میں شرعاً گنجائش ہے؟ کن حالات اور کن مجبوریوں کے تحت مسلمان کے لئے سودی قرض لینا جائز ہو سکتا ہے؟

۷۔ حکومت ترقیاتی اسکیموں مکانات کی تعمیر تجارت کی ترقی، صنعت وحرفت کی ہمت افزائی نیز بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے جو سودی قرضے تقسیم کرتی ہے اس کا لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس کا حکم عام سودی قرضوں کی طرح ہے یا اس سے کچھ مختلف ہے؟

کیا اس بنیاد پر حکومت کے سودی قرضوں کا لینا جائز قرار پا سکتا ہے کہ حکومت ہند ترقیاتی قرضوں کیلئے جو رقم مختص کرتی ہے وہ اس کی مختلف ذرائع سے ہونے والی آمدنی کا ایک حصہ ہوتا ہے اور جمہوری حکومت کے خزانہ عامہ کی مالک اس ملک کے شہریوں کی مجموعی اکائی ہوتی ہے۔ اس خزانۂ عامہ میں سے جو رقم ترقیاتی اسکیموں کے لئے مختص کی گئی ہے اس سے انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ مسلمان اپنے اس حق کی تحصیل کے لئے جب آگے بڑھتا ہے تو ان قرضوں پر سود عائد کرنے کی پالیسی آڑے آتی ہے۔ لہذا جس طرح اپنا حق وصول کرنے کیلئے بہت سے فقہاء نے رشوت دینے کو جائز کہا ہے اسی طرح یہاں حق وصول کرنے کے لئے مجبوراً سود دینے کی اجازت کیوں نہ دی جائے؟

۸۔ اگر حکومت کسی قرض پر کوئی چھوٹ بھی دیتی ہو اور اس پر سود بھی عائد کرتی ہو تو اگر چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی ہے تو کیا اس قرض لینے کو شرعاً جائز کہا جائے گا؟

۹۔ غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں بسا اوقات سود ادا کئے بغیر چارہ نہیں۔ مال کی

روانگی کے دن سے ہی سود لگا دیا جاتا ہے۔ اور اسی طرح اگر کوئی تاجر دیگر ممالک کو مال برآمد کرے تو بین الاقوامی تجارتی ضوابط کے تحت اسے سود ملتا ہے۔ درآمد برآمد کی اس تجارت میں سود سے نجات مشکل ہے۔ ان صورتوں کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟

۱۰ــــ بینک دو طرح کے ہیں۔ ایسے بینک جس کے مالک اشخاص و افراد ہوتے ہیں اور دوسرے سرکاری بینک جو حکومت کی ملکیت ہے، کیا قرض لے کر سود ادا کرنے کے بارے میں دونوں قسموں کے بینکوں کے حکم میں کچھ فرق ہوگا۔

۱۱ــــ کچھ افراد یا کمپنیاں سرمایہ کاری کرتی ہیں۔ یعنی صنعت و حرفت اور تجارت کے لئے سرمایہ فراہم کرتی ہیں اور اس پر سود لیتی ہیں، مثلاً کوئی شخص اگر ٹرک حاصل کر کے چلانا چاہتا ہے تو وہ اپنی پسند کا ٹرک خریدتا ہے سرمایہ کار اس کی قیمت ادا کرتا ہے اور قسط وار اپنا سرمایہ مع سود وصول کرلیتا ہے۔ سرکاری بینکوں سے سرمایہ حاصل کرنے میں ضابطہ کی خانہ پوری طول عمل کا موجب ہوتی ہے، دوسری طرف رشوت دینی پڑتی ہے، تیسری طرف انکم ٹیکس وغیرہ کے مسائل ہوتے ہیں، ان سے بچنے کے لئے عام طور پر تاجر و صنعت کار پرائیویٹ سرمایہ کاروں سے معاملہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیا کسی مسلمان کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ ان پرائیوٹ سرمایہ کاروں سے اپنی صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے سرمایہ حاصل کرے اور اس پر سود ادا کرے واضح رہے کہ یہ صورت حاجت و اضطرار کی نہیں ہے۔



ربوا درحقیقت کیا ہے؟

از ــــــــــــــ بروی جماری مھتر

تعارف: یہ مضمون ربوا (سود) شرح سود شرح منافع کے درمیان تعلق قائم کرنے کی ایک کوشش ہے تاکہ ربوا اور منافع کو ختم کرنے سے متعلق اسلامی معیشت کے اصول کو بہتر طریقہ سے سمجھا جاسکے، ان معاشی اخلاقی اصولوں کے درمیان یکسانیت اور تضاد پر بھی بحث ہوگی لیکن اس مضمون میں صرف ربوا پر غور کیا جائے گا، دوسرے نکات آئندہ زیر بحث آئیں گے۔

ربوا

ربوا کے لغوی معنی ہیں اضافہ یا ایزاد، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر اضافہ یا ایزاد بُرا ہے۔ اصطلاحی لحاظ سے ربوا جس کا امتناع اسلام کا مدعا ہے اصل پر ادائیگی یا وصولی میں وہ اضافہ ہے جو صحیح متبادل قیمت کا حامل نہیں قطع نظر اس کے کہ یہ مذکورہ اضافہ خواہ نقد کی شکل میں ہو یا جنس کی اس سلسلے میں الجزری کی "الفقہ علی المذاھب الاربعہ" سے جو اسلامی اصول فقہ کے چاروں موثر مکاتب خیال یا مسالک سے متعلق قانونی آراء کا لب لباب ہے تفصیلی اقتباسات پیش کرنا مناسب ہوگا۔

ربوا کے معنی ہیں وہ اضافہ جو دو متجانس مساویات میں سے ایک پر تبادلہ کی صورت میں بغیر کسی متبادل معاوضہ کے حاصل کیا جائے اس کی درجہ بندی دو اقسام میں کی جاسکتی ہے، اول ربوا النسیئہ جس میں یہ اضافہ معینہ قیمت کی ادائیگی میں التوا یا تاخیر کے باعث ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر موسم سرما میں ایک آرداب (ایک پیمانہ) گیہوں کی خریداری کے معاوضہ میں موسم گرما میں ڈیڑھ آرداب گیہوں کی ادائیگی، چونکہ یہ نصف آرداب جس کا اضافہ معاوضہ

میں کیا گیا فروخت شدہ مال کی مساوی قیمت سے علیحدہ تھا یا زائد تھا اور صرف ثمن کی ادائیگی کی تاخیر کے بدلہ میں ادا کیا گیا اس لئے یہ ربوا ہوا۔ اس کو" ربوا النسیئۃ" کہا جاتا ہے۔ دوسری قسم ہے" ربوا الفاضل" جس کے مطابق مذکورہ اضافہ بلا امتیاز تاخیر ہوا اور معاوضہ میں ادا کی گئی کسی چیز پر اثر انداز نہ ہو ــــ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب ایک ارداب گیہوں کا تبادلہ ہاتھ کے ہاتھ اسی جیسے ایک ارداب اور ایک قلہ گیہوں سے کیا جائے اور خریدار اور بیچنے والے مال کا باہمی قبضہ حاصل کریں، یا جیسے دس قیراط سونے کی کسی چیز کا تبادلہ اسی جیسے سونے کی بارہ قیراط وزن کی کسی چیز سے کیا جائے۔

ربوا کی اقسام کو مختلف الفاظ کا جامہ پہنانے کے باوجود تقریباً اسلامی فقہاء اس پر متفق ہیں کہ ربوا قرض اور فروخت دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قرض کی صورت میں جو ربوا ہوتا ہے وہ ربوا الدیون ہوتا ہے اور مال کی فروخت کے سلسلے میں جو ربوا ہوتا ہے وہ ربوا البیوع کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں جو تنسیخ ربوا کا فرمان الٰہی ہے وہ ربوا الدیون سے متعلق ہے اس لئے ربوا الدیون کو ربوا الجاہلیہ، اور ربوا القرآن بھی کہا جاتا ہے۔ ربوا الدیون کو فقہاء نے ربوا النسیۃ کا نام بھی دیا ہے کیونکہ الدیون (قبض) سے متعلق قرض کی ادائیگی میں اضافہ بوجہ انتظار وقت یا مدت ادائیگی جزو لازم ہے۔

ربوا البیوع کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا ہے یہ قبل از اسلام کے عربوں کے علم میں بھی نہیں تھا وہ صرف ربوا الدیون کے ہی عادی تھے۔ ربوا البیوع کی تنسیخ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے عمل میں آئی۔ ملحد عربوں کو یہ تنسیخ قابل حیرت محسوس ہوئی کیونکہ ربوا کے سلسلے میں ان کا تصور صرف ربوا الدیون تک ہی محدود تھا۔ ربوا البیوع کو مزید دو اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے ــــ (۱) ربوا الفاضل (۲) ربوا النسیۃ۔ ربوا البیوع میں ربوا النسیۃ کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ انتظار کا عنصر فروخت کے معاملہ میں بھی موجود ہے۔

چونکہ ربوا الدیون (قرض میں ربوا) ایک جانا مانا مفروضہ ہے اس لئے اس مضمون میں ربوا البیوع (تجارت میں ربوا) کے کم معروف معمولات پر زیادہ زور دیا جائے گا۔ ربوا البیوع کے بنیادی حقائق مندرجہ ذیل احادیث سے سامنے آتے ہیں۔

(۱) سونا برائے سونا مساوی، چاندی برائے چاندی مساوی مساوی، کھجور برائے کھجور مساوی مساوی، نمک برائے نمک مساوی مساوی، جَو برائے جَو مساوی مساوی۔ اگر تبادلہ میں کوئی

زیادہ طلب کرتا ہے وہ ربوا کا ارتکاب کرتا ہے اگر فوری دست بدست سپردگی کی جائے تو چاندی کے عوض سونا فروخت کرو۔ اگر فوری دست بدست سپردگی ہو تو کھجوروں کے بدلے جَو فروخت کرو۔ (بخاری و مسلم)

(۲) سونے کے عوض سونا، چاندی کے عوض چاندی، گیہوں کے عوض گیہوں، جَو کے بدلے جَو، کھجور کے بدلے کھجور، نمک کے بدلے نمک، مساوی مساوی اور دست بدست، تم مختلف اشیاء کی تجارت لین دین کر سکتے ہو خواہ وہ دو مختلف نوعیت کی ہوں اور اگر ان کا تبادلہ دست بدست ہو۔ (بخاری و مسلم)

یہ عمل جسے عرب ربوا نہیں سمجھتے تھے اسلام میں ربوا قرار دیا گیا ہے۔ ان احادیث سے مسلم فقہاء نے مندرجہ ذیل اصول وضع کئے جو ربوا البیوع کے دائرہ میں آتے ہیں۔

(۱) دھات سے دھات یا اشیائے خوردنی سے اشیائے خوردنی مثلاً سونے سے سونا یا کھجور سے کھجور کے تبادلہ میں دو شرائط پوری ہونی ضروری ہیں۔

(الف) دونوں اشیاء کی مقدار قطعی مساوی ہو۔

(ب) فوری ادائیگی ہو (یعنی دست بدست)۔

(۲) دو مختلف دھاتوں کے تبادلہ یا دو مختلف اشیاء خوردنی کے تبادلہ (مثلاً سونے سے چاندی یا گیہوں سے جَو کا تبادلہ) اس میں شرط صرف مال کی ادائیگی کی ہے مساویت کی شرط نہیں ہے۔

(۳) دھات سے اناج (مثلاً سونے یا چاندی کا گیہوں یا جَو سے تبادلہ) کے تبادلہ کے سلسلے میں مذکورہ بالا دونوں شرائط ختم کر دی گئیں ہیں ان کی آزادانہ تجارت ہو سکتی ہے خواہ ان میں مساویت ہو یا نہ ہو مال کی ادائیگی فوری ہو یا تاخیر سے ہو، تبادلہ کی شرائط کی مندرجہ ذیل نقشہ میں تلخیص پیش کی جاتی ہے۔

	قیمتی دھاتیں		اشیائے خوردنی			
	سونا	چاندی	گیہوں	جَو	کھجور	نمک
سونا	۲	۱	صفر	صفر	صفر	صفر
چاندی	۱	۲	"	"	"	"

	قیمتی دھاتیں		اشیائے خوردنی			
	سونا	چاندی	گیہوں	جَو	کھجور	نمک
گیہوں	صفر	صفر	۲	۱	۱	۱
جو	"	"	۱	۲	۱	۱
کھجور	"	"	۱	۱	۲	۱
نمک	"	"	۱	۱	۱	۲

پیمانہ :- صفر — غیر مشروط
۱ — فوری ادائیگی کی شرط
۲ — مساویت اور فوری ادائیگی کی شرط

اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ ربوا النسیئہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ربوا الفاضل کا ارتکاب اس وقت ہوتا ہے جب اوپر مذکورہ قواعد میں تحریراً اصول مساویت کی خلاف ورزی کی جائے۔ اس لئے ربوا الفاضل کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ یکساں اقسام کی اشیاء کا تبادلہ مقدار میں اضافہ کے ساتھ کیا جائے۔ اس موقع پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ قطعی یکساں مساوی اشیاء کے تبادلہ کا کوئی مقصد نہیں نکلتا تا آنکہ وہ ماہیتی اعتبار سے مختلف ہوں۔ پھر مختلف ماہیت کی اشیاء کے تبادلہ میں یکسانیت کی شرط کیوں رکھی گئی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اوپر جو اصول دیئے گئے ہیں وہ لین دین کے اصول کے تبادلہ یعنی پیسے کے بجائے جنس سے جنس کے تبادلہ سے متعلق ہیں مختلف صفات کی ایک ہی اشیائے تجارت میں ربوا الفاضل سے بچنے کا راستہ لین دین میں پیسے کا استعمال ہے۔ مسلم اور احمد نے مندرجہ ذیل حدیث ابوسعید خدری کے حوالے سے اس سلسلے میں بیان کی ہے۔

ایک دن حضرت بلال رضی اللہ عنہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ برنی کھجوریں (ایک اعلیٰ قسم کی کھجور) لائے۔ پیغمبر خدا نے دریافت فرمایا کہ یہ کھجوریں کہاں سے لائے۔ حضرت بلال رضؓ نے جواب دیا کہ میرے پاس کچھ کمتر درجہ کی کھجوریں تھیں جن کا تبادلہ

میں نے مساوی وزن کی ان بہتر کھجوروں سے کرلیا۔ پیغمبر خدا نے ارشاد فرمایا یہ تو قطعی ربوا ہے ایسا بالکل مت کرو بلکہ جب تم خرید نا چاہو تو اپنی کمتر کھجوریں کسی چیز (نقد) کے عوض فروخت کرو اور اُس سے جو قیمت تم کو وصول ہو اس سے بہتر قسم کی کھجوریں خرید لو۔"

اس طرح شریعت کا فیصلہ ہے کہ ایسی اشیاء کے تبادلہ کی صورت میں جو ایک ہی ہوں مگر ان کی صفات مختلف ہوں تو یا تو ان کا تبادلہ اسی ماہیت کی شئے سے بغیر اس کی قیمت کو زیر غور لائے ہوئے کیا جائے یا پھر ان کا تبادلہ ان کے بازاری نرخ کے مطابق روپیہ سے کیا جائے۔

عمر چھپرہ کے نزدیک ربوا الفاضل کا امتناع ایسی اجناسی لین دین کی تجارت کے پیشگی تدارک کے لئے ہے جس کے لئے نتیجہ میں ناجائز منافع حاصل ہو اس کے ساتھ زر نقد کو تجارت یا لین دین کا ذریعہ بنانے کی ہمت افزائی بھی کرنا ہے۔

ربوا النسیہ کا ارتکاب اس صورت میں ہوتا ہے اگر فوری تبادلہ کی شرط کی خلاف ورزی ہو یعنی اگر دو یکساں اشیاء کے تبادلہ میں کسی ایک کی ادائیگی میں تاخیر ہو جائے تو چونکہ اس تاخیر کے باعث وقفۂ انتظار میں اس شئے کی قیمت میں اضافہ کا امکان ہو سکتا ہے اس لئے ان کی طے شدہ متناسب قیمت میں ادائیگی یا حوالگی کی تاریخ تک فرق پیدا ہو جائے گا اس کا اطلاق مختلف النوع اشیائے تجارت پر ہوتا ہے۔

اس سے پہلے ہم سود سے متعلق بحث کو آگے بڑھائیں ہم کو قرآن پاک کی آیت کی روشنی میں تجارت اور ربوا کے فرق اور یکسانیت کا تجزیہ کر لینا چاہئے۔ قرآن کریم میں سورہ البقرہ میں فرمایا گیا ہے "وہ جو سود کھاتے ہیں قیامت کے روز نہ کھڑے ہوں مگر ایسے جیسے کھڑا ہوتا ہے وہ جسے آسیب نے چھو کر مخبوط بنا دیا ہو، یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے اور اللہ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود کو۔"

ابن حزم کے مطابق بیع (تجارت) اور ربوا (سود) میں یکسانیت صرف اس حد تک ہے کہ ان دونوں میں شئے کا تبادلہ شئے یا معاوضہ سے ہوتا ہے، تاہم محض ایسی تبادلہ ہی ایک معاہدہ کو جائز یا قانونی نہیں بنا دیتا اس کے لئے اور بھی باتیں قابل غور ہیں۔

بیع (تجارت) میں ایک تو خرید ہے اور دوسری ہے فروخت، جو ایک جائز معاشی عمل اور ایک سودمند کوشش ہے اس میں اشیاء کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے جیسے مال کا تبادلہ مال سے ہوتا ہے یا مال کا تبادلہ زر سے ہوتا ہے۔

ربوا کی بنیاد پر کئے گئے سودے میں اشیائے تبادلہ کے درمیان قیمت کے لحاظ سے کوئی قانونی یا اخلاقی رشتہ نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ اس میں پیسہ خود پیسہ میں اضافہ کے لئے استعمال ہوتا ہے خواہ یہ سودا طرفین کے باہمی سمجھوتے اور اصلاح سے ہوا ہو۔ اس سودے میں مال کی فروخت میں بغیر کسی معاشی جہت پیسہ کو اپنی قیمت میں اضافہ کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جسے قرآن کریم نے اتنی وضاحت سے پیش کیا ہے اور جس میں ملحد عربوں کے اس تصور کی نفی کی گئی ہے کہ بیع (تجارت) اور ربوا (سود) میں مماثلت ہے۔

بیع اور ربوا کے درمیان مودودی صاحب نے چار بنیادی اختلافات پیش کئے ہیں جن کی بنیاد پر دونوں کو ایک ہی سطح پر نہیں رکھا جاسکتا وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) تجارت میں خریدار اور دوکاندار دونوں برابری کی بنیاد پر تبادلہ کرتے ہیں۔ دوکاندار سے خریدار منافع حاصل کرتا ہے اپنے خریدے ہوئے مال پر جبکہ دوکاندار اپنی اس کاوش اور محنت کے بدلے میں منافع حاصل کرتا ہے جو وہ مال کے حصول کے لئے خریدار کے واسطہ صرف کرتا ہے۔ سود کے کاروبار میں قرض دینے والا اپنے دیئے ہوئے قرض کی رقم پر ایک مقررہ رقم زر اصل پر ایزاد کے ساتھ حاصل کرلیتا ہے لیکن مقروض کو اس روپیہ کے استعمال سے وقت یا وقفہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا جبکہ یہ ضروری بھی نہیں کہ اسے کوئی منافع حاصل ہو۔ اگر وہ یہ قرض اپنی گھریلو ضرورت کے لئے لیتا ہے پھر تو اسے کسی بھی طرح کا منافع یہاں تک کہ اسے ٹائم سے بھی فائدہ اٹھانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اور اگر وہ یہ قرض کسی کاروبار میں استعمال کرنے کے لئے لیا ہے تو بھی اسے معینہ مدت کے اندر نفع اور نقصان کا برابر کا خدشہ رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سودی کاروبار میں یا ربوا میں وہ پارٹی جو قرض دیتی ہے یقینی طور پر منافع میں رہتی ہے جبکہ مقروض پارٹی کو منافع حاصل کرنے کا موقع غیر یقینی ہوتا ہے۔

(۲) تجارت میں دوکاندار خریدار سے کتنا ہی منافع حاصل کرلے لیکن یہ منافع صرف

ایک ہی بار کا ہوتا ہے سودی کاروبار میں قرض خواہ اپنا سود اس وقت تک طلب کرتا رہتا ہے جب تک کہ زر اصل کی ادائیگی مکمل نہیں ہو جاتی۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ غیر ادا شدہ قرض پر سود کی رقم ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال بڑھتی چلی جاتی ہے اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ مقروض نے قرض کی رقم اپنے کاروبار میں لگا کر منافع حاصل کیا تب بھی اس بات کے امکانات بہت محدود ہیں کہ وہ قرض کی رقم سے منافع حاصل کرے۔ سودی کاروبار یا ربوا میں قرض خواہ امکانات اس تحدید کا کوئی سامنا کرنا نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس یہ قطعی ممکن ہوتا ہے کہ مقروض کی آمدنی کے تمام ذرائع، اس کی تنخواہ، اس کا اثاثہ یہاں تک کہ اس کے گھر کے برتن تک قرض خواہ کے مطالبات پورے کرنے سے قاصر ہیں۔

(۳) تجارت کے نقطۂ نظر سے جس لمحہ ایک شئے کا تبادلہ اس کی قیمت سے ہوتا ہے یہ سودا ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد خریدار اور دوکاندار کو کچھ نہیں دیتا۔ کرایہ کے کاروبار میں یہ سودا خواہ مکان کا ہو، زمین کا ہو یا کسی اور چیز کا، اصل اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور بعد میں مالک کو واپس کر دیا جاتا ہے۔ مالک کو کرایہ دار جو کرایہ کی رقم ادا کرتا ہے وہ اس چیز یا جگہ کو استعمال کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے بدلے میں کرتا ہے۔ ربوا کے سودے میں مقروض زر اصل کو خرچ کر دیتا ہے جو وہ بطور قرض حاصل کرتا ہے اور پھر یہ زر اصل سود کی رقم کے اضافہ کے ساتھ قرض خواہ کو واپس کرتا ہے۔

(۴) تجارت میں فرد اپنی محنت و مشقت سے یا اپنی مہارت اور ہنرمندی سے منافع حاصل کرتا ہے سود کے کاروبار میں فرد اپنی اندوختہ پونجی قرض کے طور پر دوسرے کو دیتا ہے اور بغیر کسی ذاتی کاوش یا محنت و مشقت یا بغیر کسی مہارت یا ہنرمندی کے اپنے مقروض کی آمدنی میں حصہ دار بن جاتا ہے۔ اگر یہ بھی کہا جائے کہ اس نے قرض دی رقم کو کمانے کے لئے جبکہ یہ رقم اس کے پاس نہیں تھی اس نے محنت کا وش، مشقت اور ہنرمندی سے کام لیا تھا تب بھی کسی جائز معاشی جدوجہد سے محروم کسی کاروبار میں پونجی لگانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اصطلاحی معنوں میں ربوا یا سود کے کاروبار میں لفظ پارٹنرشپ یا شریک استعمال

نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ پارٹنرشپ یا شریک جو ہوتا ہے وہ کاروبار میں نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سود کا کاروبار کرنے والا ایک ایسا پارٹنر یا شریک ہوتا ہے جو نفع یا نقصان کی ذمہ داری سے مبرّا ہوتا ہے خواہ اس کام کو کتنا ہی منافع کا امکان ہو، وہ صرف ربوا یا سود کا طلب گار ہوتا ہے جس کی شرط قرض کی رقم دیتے وقت واضح کردی تھی۔

چنانچہ تجارت اور ربوا کے درمیان یہ فرق بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ تہذیب وتمدن کی تعمیر وترقی میں تجارت ایک غالب عنصر کی شکل میں سامنے آتی ہے اور اس کے برعکس ربوا ایک تفریقی اور تخریبی کاروبار یا طاقت ہے جو معاشرہ کو اور انجام کار تہذیب وتمدن کا شیرازہ منتشر کردیتا ہے۔



بینک انٹرسٹ، سودی قرض
اور
ہندوستان کی شرعی حیثیت

از ——— مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، صدر مدرس دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

پہلے سوال کا جواب

ربا کی حقیقت

ربا کے لغوی معنی "اضافہ" کے ہیں، کتاب وسنت میں متعدد مواقع پر یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، ربا ایسے اضافہ کو کہتے ہیں جس کے مقابلہ میں معاملہ کے دوسرے فریق کی طرف سے کوئی عوض نہ ہو" وفی الشرع عبارۃ عن فضل مالا یقابلہ عوض فی معاوضۃ مال بمال[1] ابن اثیر کا بیان ہے: "الاصل فیہ الزیادۃ علی رأس المال من غیر تبایع"[2]، زیلعیؒ کہتے ہیں: ھو فضل مال بلا عوض فی معاوضۃ مال بمال[3] یہی تعریف کم وبیش دوسرے اہل علم نے بھی کی ہے۔ مگر اس تعریف میں ربا کی ایک خاص نوع ہی کو ملحوظ رکھا گیا ہے ——— ربا کی دو قسمیں ہیں۔ ربو فضل، ربو نسار۔

دو چیزیں جو ایک ہی جنس کی ہوں اور ان کا ذریعہ پیمائش بھی ایک ہی ہے، جس کو فقہاء احناف "قدر" سے تعبیر کرتے ہیں تو ایسی صورت میں خرید وفروخت کے معاملہ میں ایک کی طرف سے نقد اور دوسرے کی طرف سے ادھار کا معاملہ درست نہیں، اس کو "ربو نسار" کہتے ہیں۔

---

[1] عنایۃ علی ھامش الفتح ۶/۱۴۶، [2] النہایۃ ۰ [3] تبیین الحقائق ۴/۸۵۔

ربا کی دوسری قسم " ربا الفضل " ہے ، عام طور پر فقہاء نے ربا کی جو تعریف کی ہے وہ اسی نوع کی ہے یعنی فریقین میں سے ایک کی طرف سے ایسا اضافہ جس کے عوض دوسرے فریق کی طرف سے کچھ نہ ہو ـــــ اس ربا کی ایک صورت وہ تھی جو ایام جاہلیت میں مروج تھی، ایک شخص کسی سے قرض لیتا تھا، جب ادائیگی کا وقت آتا تو قرض دہندہ دریافت کرتا کہ ادا کروگے یا اس پر سود ادا کروگے چنانچہ مقروض مزید مہلت حاصل کرکے سود دینے کو تیار ہوتا اور قرض دہندہ مان لیتا۔" فکان الغریم یزید فی عدد المال ویصبر الطالب علیہ[1] " لیکن سود کی اس مروجہ صورت کے سدباب کے لیے شریعت نے دو ہم جنس چیزوں کی نقد خرید وفروخت میں بھی طرفین کی جانب سے برابری کو ضروری قرار دیا، اور کمی بیشی اور تفاضل کو حرام قرار دیا، اسی کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا " لا تبیعوا الدرھم بالدرھمین فانی اخاف علیکم الرما[2] "

سود کی اسی تعریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سود چاہے حاجاتی قرض پر لیا جائے یا تجارتی قرض پر، مروجہ اصطلاح کے مطابق دین استہلاکی ہو یا دین استثماری، وہ بہرصورت حرام ہے، کیونکہ حدیث اور فقہاء کی تصریحات سے سود کی جو تعریف اور حقیقت مستنبط ہوتی ہے، وہ ہر طرح کے ربا پر صادق آتی ہے ـــــ بعض حضرات کا یہ خیال کہ بینک وغیرہ جو لوگوں کی رقوم کو تجارتی اغراض کے لیے استعمال کرتا ہے، اس کی طرف سے ملنے والا نفع "سود" میں داخل نہیں، کیونکہ اس سے کسی غریب کا استحصال نہیں ہوتا، صحیح نہیں ہے اور اس کے چند وجوہ ہیں :

۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی تفریق کے بغیر ہر طرح کے قرض پر نفع کے حصول کو ناجائز قرار دیا ہے۔" کل قرض جرّ منفعۃ فھو ربا[3] "

۲۔ شریعت میں سرمایہ کار کے لیے تجارت سے نفع اٹھانے کی ایک ہی صورت "مضاربت" کی شکل میں مقرر ہے، جس میں سرمایہ کار نفع و نقصان کی اساس پر شریک ہوتا ہے ـــــ

---

[1] ۔ الجامع لاحکام القرآن ۳/۳۴۸ ، بدایۃ المجتھد ۔

[2] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اعلام الموقعین ۲/۱۰۰ - ۱۰۴ ۔

[3] ۔ اخرجہ الحارث بن ابی اسامۃ عن علی مرفوعا وجعلہ العزیزی فی السراج المنیر حسنا لغیرہ تکملہ فتح الملہم ا/۵۷۔

سرمایہ کار اپنے لیے بہر طور نفع مقرر کرلے اس صورت کو شریعت جائز نہیں رکھتی، اسی لیے "مخابرہ" سے منع کیا گیا، "مخابرہ" یہ ہے کہ مالکِ زمین اپنی زمین کاشتکار کو کاشت کے لیے دے اور اپنے لیے ایک مخصوص مقدار اس پیداوار کی متعین کرلے، جس کی کاشت وہ اس زمین میں کرے گا، تجارتی قرض پر سود حاصل کرنے میں بھی بعینہٖ یہی قباحت ہے۔

۳۔ یہ رائے اس اصول پر مبنی ہے کہ قرآن کے زمانہ نزول میں سود خوری کی جو کیفیت پائی جاتی تھی آیت ربا میں صرف اسی صورت کی ممانعت تسلیم کی جائے گی۔ یہ فقہاء کے اس اصول مقررہ کے خلاف ہے کہ نصوص میں ہمیشہ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ اس کے موقع ورود کا "العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص المورد" اگر قرآن وحدیث کے اوامر ونواہی میں اس عموم اور اطلاق پر عمل نہ کیا جائے تو دین بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ آج شراب اور مسکرات کی بعض ایسی انواع وجود میں آچکی ہیں کہ نزول قرآن کے وقت ان کا وجود نہ تھا، قمار اور جوئے کی بعض ایسی صورتیں رواج پاگئی ہیں کہ پہلے ان کا تصور بھی نہ رہا ہوگا۔ ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ اجنبی مرد وعورت کے مادہ حیات کے اختلاط کی شکل میں "زنا" کی ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے کہ ماضی میں کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا، تو کیا ان تمام معاملات میں اس اصل کا انطباق کیا جائے گا۔

۴۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ تجارتی قرضوں کا اس زمانہ میں رواج ہی نہیں تھا، ایسے قرضوں کا رواج تو تھا ہی اور بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام جاہلیت میں بعض قبائل تجارتی اغراض کے لیے سودی قرض بھی حاصل کرتے تھے۔ پس ان حالات میں ربا کی حرمت سے متعلق آیات وروایات کا اطلاق اور تجارتی وغیر تجارتی قرضوں میں کسی طرح کی تفریق سے گریز اس بات کا ثبوت ہے کہ ممانعت کا یہ حکم تجارتی قرضوں کو بھی شامل ہے۔[۱]

۵۔ حکم کی بنیاد حکمت پر نہیں ہوتی ہے بلکہ "علت" اور معاملہ کی ظاہری صورت پر ہوتی ہے۔ پس ربا کی تعریف جس معاملہ پر صادق آتی ہے وہ بہر حال ربا کہلائے گی، اس میں کسی

---

[۱] مولانا مودودی نے اپنی کتاب "سود" میں ایسی متعدد نظیریں پیش کی ہیں اور مولانا تقی عثمانی نے تکملہ فتح الملہم میں تفصیل سے ان روایات کی تخریج کی ہے، ملاحظہ ہو کتب مذکور ج ۱ ص ۵۷۱ — ۵۷۴۔

غریب کا استحصال ہوتا نہیں، یہی وجہ ہے کہ ظاہری شکل کے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے آپؐ نے اس معاملہ کو سود میں شامل نہیں قرار دیا، چنانچہ حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ خیبر کے بعض حضرات ایک صاع عمدہ کھجور دو اور تین صاع معمولی کھجور دے کر حاصل کیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا اور ارشاد ہوا کہ پہلے ان معمولی کھجوروں کو درہم کے ذریعہ فروخت کرلو اور پھر ان دراہم کے ذریعہ اس عمدہ کھجور کو خرید لو[1]

۶۔ "تجارتی قرض" کے متعلق یہ کہنا کہ اس میں استحصال نہیں ہوتا، صحیح نہیں ہے، تاجر کو اس سرمایہ کے استعمال میں نقصان بھی ہوسکتا ہے، نہ نفع نہ نقصان کی صورت بھی پیش آسکتی ہے، یا جو تناسب نفع کا مقرر کردیا ہے، عین ممکن ہے کہ خود اس کو اتنی آمدنی نہ ہو سکے، ان تمام صورتوں میں قرض دہندہ بہرطور نفع قبول کرے گا اور اس طرح یقیناً قرض گزندوں کا استحصال ہوگا۔

پس ربا ایسی متعین قدر زائد کا نام ہے جس کے مقابلہ معاملہ کے دوسرے فریق کی طرف سے کوئی عوض نہ ہو خواہ یہ قرض تجارتی اغراض کے لیے دیا گیا ہو یا وقتی ضروریات وحاجات کے لیے، اسی طرح ایسی تمام شکلیں جن میں قرض سے مالی نفع حاصل کیا جائے گو تعبیر بدل دیجائے "ربا" ہی کے حکم میں ہے، اسی لیے فقہاء نے مال رہن سے استفادہ کو حرام قرار دیا، اور رہن سے استفادہ اور قرض گزندہ کے استحصال کی ایک خاص صورت جس کو "بیع بالوفا" سے موسوم کیا جاتا تھا، فقہاء نے اس سے منع فرمادیا اور اس کو "رہن" کے حکم میں رکھا[2]

دوسرے سوال کا جواب

دارالحرب میں سود

اب ہمیں دارالحرب میں سود کے جواز و عدم جواز کے مسئلہ پر آنا چاہیے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ دارالحرب سے جو لوگ مستامن کی حیثیت سے عارضی طور پر دارالحرب

---

[1] ۔ صحیح مسلم ج ۲، باب بیع الطعام مثلاً بمثل۔

[2] ۔ ردالمختار ۴/۳۴۶

میں آئیں ان سے بھی سود لینا درست نہیں البتہ دارالاسلام سے جو مسلمان عارضی امان حاصل کرکے دارالحرب جائیں، وہ وہاں کے حربیوں سے سود لے سکتے ہیں[1]۔ گو وہ حربی مسلمان کیوں نہ ہوں[2] ولو اسلم الحربی فی دار الحرب ولم یهاجر الینا فکذلک الحکم عند ابی حنیفة[3] یہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کی رائے ہے[4]۔ جمہور فقہاء اس صورت میں بھی سود کو حرام قرار دیتے ہیں، یہی رائے احناف میں قاضی ابویوسفؒ کی ہے[5]۔ اور اس کے قائل امام مالکؒ[6] وشافعیؒ[7] اور احمدؒ[8] بھی ہیں۔ البتہ فقہاء مالکیہ میں ابن رشد اس کے جواز کے قائل نظر آتے ہیں اور حضرت عباس کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں[9]۔

مجوزین کے دلائل جو لوگ جواز کے قائل ہیں، ان میں امام محمدؒ نے السیر الکبیر[10] میں کاسانی نے بدائع الصنائع[11] میں اور سرخسی نے مبسوط[12] میں وضاحت سے اپنے دلائل پیش کیے ہیں، ان دلائل کا حاصل یہ ہے:

۱۔ مکحول نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً نقل کیا ہے۔ "لاربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب" (دارالحرب میں مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہوتا) ــــ یہ روایت گو مرسل ہے، اور مرسل روایات کی حجیت اور قبولیت محدثین کے درمیان متفق علیہ نہیں ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک ثقہ (جو خود بھی ثقہ ہی کی روایت کو قبول کرتا ہو) کی مرسل معتبر ہے[13]۔

۲۔ حضرت عباسؓ غزوہ بدر یا کم از کم فتح خیبر سے پہلے ہی مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے، مگر آپ نے ہجرت نہیں فرمائی، پھر ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع سے آپ نے اعلان فرمایا۔

۱۔ السیر الکبیر ۴/۱۴۹۳ فقرہ ۲۹۱۹۔ ۲۔ تبیین الحقائق ۴/۹۷،

۳۔ شرح النقایہ ۲/۵۹۔ ۴۔ وقال ابو یوسف لایجوز فی دار الحرب الامایجوز له فی دار الاسلام (بدائع الصنائع ۷/۱۳۲) ۵۔ المدونہ ۳/۲۶۹۔

۶۔ المجموع شرح مهذب ۹/۳۹۱، ۷۔ المغنی ۴/۴۷۔

۸۔ مقدمات ابن رشد مع المدونہ ۳/۲۸-۳۸، ۹۔ السیر الکبیر ۴/۱۳-۱۳۱۔

۱۰۔ بدائع الصنائع ۷/۱۳۲، ۱۱۔ المبسوط ۱۰/۹۵،

۱۲۔ المبسوط ۱۰/۹۵۔

ربا الجاھلیۃ موضوع واوّل ربا اضعہٗ	جاہلیت کا بار ختم کیا جاتا ہے اور پہلا ربا جو ختم
ربا العباس بن عبد المطلب فانہ	کرتا ہوں وہ عباس بن عبدالمطلب کا ہے کہ وہ
موضوع کلہ۔	کل کا کل ختم کیا جاتا ہے۔

گویا حجۃ الوداع کے واقعہ تک آپ نے حضرت عباس کے سودی کاروبار پر امتناع عائد نہیں فرمایا یہ اس لیے کہ مکہ دارالحرب تھا اور دارالحرب کے حربیوں سے سود لینا جائز تھا۔

۳۔ حربی کا مال معصوم اور قابلِ احترام نہیں اور حرمت مالِ معصوم کے لینے کی ہے، اس لیے حربی سے سود لینا جائز ہے۔

مانعین کے دلائل

۱۔ جو لوگ دارالحرب میں بھی سود کو حرام قرار دیتے ہیں، ان کی سب سے بڑی دلیل قرآن و حدیث کی وہ تاکیدات ہیں جو مطلقاً سود کو حرام قرار دیتی ہیں، اور مسلمان و کافر اور دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتیں، کہ جس طرح شراب نوشی اور زنا کی حرمت کی نصوص مطلق ہیں اور وہ بلا تفریق دارالاسلام اور دارالحرب میں یکساں حرام ہیں، اسی طرح سود کی حرمت کا حکم بھی عام اور مطلق ہونا چاہیے۔

۲۔ حربی امان لے کر دارالاسلام میں آئے تو جس طرح اس کے مال کو اس عہد کی وجہ سے معصوم تسلیم کیا جاتا ہے اور اس سے سود حاصل کرنا جائز نہیں، اسی طرح جب مسلمان امان لیکر دارالحرب میں داخل ہو تو اس عہد کی وجہ سے اس کے حق میں اس کا مال معصوم اور محفوظ ہو جائے گا۔

۳۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایک مشہور واقعہ کے مطابق قمار کے ذریعہ اونٹ حاصل کیے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ اونٹ لائے تو آپ نے ان کو صدقہ کر دینے کا حکم فرمایا، واخذ الخطر فجاء بہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال تصدق بہ[1]

۴۔ آپ نے رکانہ سے کشتی کی ہار جیت میں بکریوں کی شرط لگائی تھی، جب آپ نے تین بار شکست دے دی اور بکری آپ کو دے دی گئی تو آپ نے واپس فرما دی۔" فرد رسول اللہ الغنم علیہ[2]"

---

[1] ۔ السیر الکبیر ۴/۱۴۱۱ ، [2] ۔ حوالہ سابق ۴/۱۴۱۲۔

دلائل جواز پر ایک نظر

۱۔ جہاں تک مکحول کی روایت ہے تو اکثر اہل علم اور اہل فن نے اس کو قابل استدلال نہیں تسلیم کیا ہے، امام شافعیؒ کا بیان ہے "ھذا حدیث لیس له ثبات لاحجة فیه"[1]، خود عینیؒ کہتے ہیں: "ھذا حدیث غریب لیس له اصل مسند"[2]، ابن قدامہ لکھتے ہیں: "لم یرد فی صحیح ولا فی مسند ولا کتاب موثوق به"[3]
مرسل بے شک معتبر ہے لیکن قرآن مجید کی صریح آیت کثرت سے صحیح و صریح روایات اور دین کے اصول مسلّمہ کے خلاف محض ایک مرسل روایت ــــ جس کا قابل استدلال ہونا بھی اہل فن کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہے ــــ کیونکر راجح اور معتبر ہوسکتی ہے؟ اس لیے حق یہی ہے کہ اتنے واضح اور قوی دلائل پر اس حدیث کو ترجیح دینا مشکل ہے۔

یہ تو اس روایت کے ذریعہ ثبوت کا حال ہے، ربا کی حلت پر اس حدیث کی دلالت بھی قطعی اور صریح نہیں ہے، احناف کا استدلال اس امر پر موقوف ہے کہ روایت میں "لا" کو "نفی" کے معنی میں لیا جائے اور یہ مفہوم سمجھا جائے کہ مسلم اور حربی کے درمیان ربا ہوتا ہی نہیں ہے، ــــ لیکن اگر اس کو "نہی" اور ممانعت کے معنی میں لیا جائے تو معنی یوں ہوں گے کہ: "ربا مسلم اور حربی کے درمیان بھی ممنوع ہے" اس کو امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے معنی ہیں "لایباح الربا فی دار الحرب"[4] (دار الحرب میں ربا جائز نہیں) ابن قدامہ نے اس پر خود قرآن مجید کے طریق تعبیر سے استدلال کیا ہے کہ قرآن نے "فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج"[5] (بقرہ: ۱۹۷) میں "لا" کو اسی نہی اور ممانعت کے مفہوم میں استعمال کیا ہے[6] ــــ پس اگر اس مفہوم اور توضیح کو قبول کرلیا جائے تو یہ حدیث بھی جمہور کے حق میں ہے۔

۲۔ حضرت عباسؓ والے واقعہ سے استدلال بھی صحیح نظر نہیں آتا، مختلف اہل علم نے اس استدلال کا رد کیا ہے۔ ڈاکٹر نزیہ حماد (جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ) نے ان سب کو جمع کردیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ شرح النقایه ۲/۵۹، ۲۔ النهایه علی الهدایه ۳/۶۵۔
۳۔ المغنی ۳/۴۷، ۴۔ المجموع شرح المهذب ۹/۳۹۲۔
۵۔ بقرة ۱۹۷، ۶۔ المغنی ۳/۴۷۔

(الف) ممکن ہے کہ حضرت عباس کو خصوصی طور پر اس کی اجازت دی گئی ہو، مثلاً کسی مسلمان کے لیے عام حالات میں اظہار شرک اور اعلان کفر کی اجازت نہیں لیکن حضرت عباس کو مکہ میں خصوصی طور پر اس کی اجازت مرحمت فرمائی گئی، ظاہر ہے کہ سود کا لینا اظہار شرک سے کمتر ہے اس لیے اگر سود لینے کی اجازت ہو تو قطعاً عجیب نہیں۔

(ب) ہوسکتا ہے کہ حجۃ الوداع میں آپ کا اعلان اس باقیماندہ سود سے متعلق ہو جو حضرت عباس کے قبول اسلام سے پہلے کا ہو، کیونکہ قبول اسلام کے بعد بھی حضرت عباس کے سودی معاملات جاری رکھنے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، اور اگر قبول اسلام کے بعد بھی انھوں نے کاروبار جاری رکھا ہے تو عین ممکن ہے کہ ایسا لاعلمی اور ناواقفیت کی وجہ سے ہوا ہو، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع سے اس کو نافذ فرمایا ہے ——— یہ توجیہ امام سبکی نے کی ہے۔

(ج) ایام جاہلیت میں سود کی جو صورت رائج تھی وہ "سودی قرض" کی تھی، ادھار اور قرض کے معاملات میں ہی سود لیا جاتا تھا، اسلام نے نقد معاملات میں بھی ——— بہ شرطیکہ معاملہ دو ہم جنس اشیاء کے درمیان ہو سود اور کمی بیشی کو حرام قرار دیا، جس کو "ربا الفضل" کہا جاتا ہے، ممکن ہے کہ حضرت عباس "ربا الفضل" کو جائز سمجھتے رہے ہوں، اس لیے حرمت ربا کا حکم نازل ہونے کے بعد "ربا النسیہ" کو چھوڑ دیا ہو لیکن "ربا الفضل" پر عامل رہے ہوں، اسی پس منظر میں، حجۃ الوداع کے موقع سے آپ نے اس طرح کا اعلان فرمایا ہوگا۔

(د) سنہ ۹ھ میں آیت قرآنی "یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا مابقی من الربوا ان کنتم مؤمنین"[1] کے نزول تک سود کی قطعی حرمت کا حکم نہیں ہوا تھا۔ اس کا اندازہ دو واقعات سے کیا جاسکتا ہے ——— بنو ثقیف نے قبول اسلام کے وقت یہ شرط رکھی کہ وفد بنو ثقیف کی واپسی کے ایک ماہ بعد تک ان کو بتان باطل کے رکھنے کی اجازت دی جائے آپ نے اس کو رد فرمادیا۔ انھوں نے نماز معاف کرانی چاہی، آپ نے اس کو بھی قبول نہیں کیا، لیکن انھوں نے شرط لگائی کہ لوگوں کے ذمہ ان کی جو سودی رقوم باقی ہیں ان کو اس کے

---

[1] احکام التعامل بالربا بین المسلمین و غیر المسلمین ۲۸ - ۳۰۔

وصول کرنے کا حق حاصل ہوگا آپؐ نے ان کی اس شرط کو منظور فرمالیا۔

اسی طرح فتح مکہ کے بعد جب حضرت عتاب بن اسید کو آپؐ نے مکہ کا گورنر مقرر فرمایا تو ان کے سامنے یہ معاملہ آیا کہ بنو عمرو بن عمیر بن عوف کی سودی رقوم بنو مغیرہ کے ذمہ باقی تھیں چنانچہ اول الذکر نے اس کی ادائیگی کا مطالبہ کیا اور بنو مغیرہ نے اب کہ مسلمان ہو چکے تھے، ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت عتاب نے آپ کو اس قضیہ کی بابت خط لکھا، اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی:

یایها الذین اٰمنوا اتقوا الله وذروا ما	اے اہل ایمان! خدا سے ڈرو اور باقی ماندہ
بقی من الربوا ان کنتم مومنین، فان	سود سے باز آجاؤ، اگر تم واقعی اہل ایمان ہو، اگر
لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله ورسوله	ایسا نہیں کرتے ہو تو اللہ اور اس کے رسول سے
وان تبتم فلکم رؤس اموالکم	لڑنے کو تیار ہو جاؤ، ہاں، البتہ اگر تائب ہو جاؤ،
لا تظلمون ولا تظلمون۔	تو تم کو اصل سرمایہ واپس لینے کا حق ہے تاکہ نہ تم
(بقرہ: ۲۷۸ — ۲۷۹)	ظلم کرو اور نہ خود ظلم کا شکار ہو۔

پس اگر حضرت عباس نے حجۃ الوداع سے پہلے سود کا کاروبار جاری رکھا، تو اس بنیاد پر نہیں کہ دار الحرب میں حربیوں سے سود لینا جائز ہے بلکہ اس لیے کہ اس وقت تک سود کی حرمت کو قطعیت حاصل نہیں ہوئی تھی —— خود ڈاکٹر نزیہ نے اسی توجیہ کو بہتر سمجھا ہے اور اس کے مختلف وجوہ پیش کیے ہیں[1]

ان تاویلات کو قبول کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ حضرت عباس حجۃ الوداع کے واقعہ تک سود لیا کرتے تھے تو پھر یہ واقعہ خود احناف کی رائے کے لیے بھی مفید نہ ہوگا کیونکہ رمضان ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد اب مکہ دار الاسلام بن چکا تھا، تو گویا حضرت عباس نے دار الاسلام بننے کے بعد بھی سودی کاروبار جاری رکھا، حالانکہ یہ بالاتفاق حرام ہے۔

۳ - جہاں تک حربی کے مال کے معصوم نہ ہونے کی بات ہے تو خود فقہاء احناف "عہد" اور "امان" کو منجملہ اسباب عصمت کے تسلیم کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دار الاسلام میں

---

[1] احکام التعامل بالربا بین المسلمین، غیر المسلمین ۲۸ — ۳۰۔

مقیم "اہل ذمہ" سے سود لینا جائز نہیں، اور دار الاسلام میں امان لے کر آنے والے حربی "مستامن" سے سود لینا جائز نہیں۔ پس دار الحرب میں امان لے کر جانے والے مسلمان کا چونکہ دار الحرب کے تمام باشندوں سے بحیثیت اجتماعی "عہد" ہو چکا ہے اس لیے اس کے حق میں ان کے مال کو بھی معصوم ہونا چاہیے۔

ان کے علاوہ شراب وخنزیر کی فروخت کی اجازت، سود کی اجازت اور دوسرے عقود فاسدہ کی اجازت سے اس بات کا قوی احتمال ہے کہ حدود شرعیہ کی حرمت وشناعت کا جو تصور مسلمانوں میں ہے یا ہونا چاہیے، بتدریج وہ ختم ہوتا جائے، اور یہ اتنا بڑا مفسدہ ہے کہ تنہا اس کی حرمت کے لیے کافی ہے ـــــ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں امام ابو یوسفؒ کی رائے قوی نظر آتی ہے اور بعض اہل علم کے نزدیک امام ابو حنیفہؒ کے مقابلہ امام ابو یوسفؒ کی رائے دلیل کے اعتبار سے زیادہ قوی ہو تو امام ابو یوسف کی رائے پر بھی فتویٰ دیا جاتا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب

دار الحرب کسے کہتے ہیں؟

یہ بات اہل علم کے لیے محتاج اظہار نہیں کہ "دار الاسلام" اور "دار الحرب" کی اصطلاح خالص فقہی اصطلاح ہے، کتاب اللہ اور حدیث صحیح میں صراحت کے ساتھ یہ اصطلاحات ذکر نہیں کی گئی ہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ائمہ مجتہدین اور فقہاء متقدمین کے یہاں بھی عام طور پر حدود وقیود کے ساتھ ان اصطلاحات پر بحث نہیں کی گئی ہے۔ ان کی تحریروں سے محض یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جن ممالک پر مسلمانوں کو سیاسی بالادستی حاصل تھی، ان کو فقہاء "دار الاسلام" یا "دارنا" سے تعبیر کرتے ہیں، اور جن ممالک پر اہل کفر کا اقتدار تھا ان کو کہیں "دار الکفر" اور کہیں "دار الحرب" کہہ دیتے ہیں، اس عہد میں نظامہائے حکومت میں وہ تنوع غالباً نہیں تھا جو اب ہے، آج مختلف ممالک میں مذہبی اقلیت ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی پوزیشن میں جو تفاوت ہے اور فوجی وعسکری طاقت کے عالمی توازن میں عالم اسلام کا جو تنزل ہم نگاہ حسرت سے دیکھ رہے ہیں، اس زمانہ کے فقہاء ان سے دوچار نہیں تھے، اس لیے دار الاسلام اور دار الحرب ایسی زندہ حقیقتیں تھیں کہ ان کی منطقی تحدید اور اصطلاحی تعریف کی چنداں

ضرورت نہیں تھی۔

فقہاء متاخرین نے البتہ ان اصطلاحات پر بحث کی ہے اور متاخرین میں بھی شاید احناف ہی ہیں جن کی تحریروں میں اس موضوع پر خاص توجہ کی گئی ہے، کہ مسائل عصر سے اعتناء اور بدلتے ہوئے حالات و اقدار پر احکام شرعیہ کی تطبیق اور اس میں دقیق النظری، وسیع المشربی اور اعتدال و توازن احناف کا وہ وصف ہے کہ کم فقہاء اس میں ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں ـــــ غالبًا اس پر سب سے پہلے چھٹی صدی ہجری کے مشہور عالم ملک العلماء علاء الدین کاسانیؒ (م ۵۸۷ھ) نے گفتگو کی ہے۔ فرماتے ہیں، ہمارے اصحاب کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس مملکت میں احکام اسلامی کو غلبہ و ظہور حاصل ہو جائے وہ دارالاسلام ہے۔" لا خلاف بین اصحابنا فی ان دار الکفر تصیر دار الاسلام بظهور احکام الاسلام فیها"[1]

البتہ "دارالاسلام" "دارالکفر" کب بن جاتا ہے اس میں امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین کی رائیں مختلف ہیں۔

"واختلفوا فی دار الاسلام انها بماذا تصیر دار الکفر، قال ابو حنیفة انها لا تصیر دار الکفر الا بثلاث شرائط احدها ظهور احکام الکفر فیها والثانی ان تکون متاخمة لدار الکفر والثالث ان لا یبقی فیها مسلم ولا ذمی آمنا بامان الاول وهو امان المسلمین وقال ابو یوسف ومحمد انها تصیر دار الکفر بظهور احکام الکفر فیها"[2]

دارالاسلام میں کہ وہ کب دارالکفر بنے گا فقہاء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تین شرطوں سے دارالکفر بنے گا، ایک احکام کفر کا غلبہ، دوسرے دارالکفر سے اتصال، تیسرے کوئی مسلمان یا ذمی مسلمانوں کے ساتھ امان کی وجہ سے مامون نہ رہ سکے، قاضی ابو یوسف اور امام محمد نے کہا کہ محض احکام کفر کے غلبہ سے دارالاسلام دارالکفر بن جائے گا۔

بعد کے فقہاء عام طور پر الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ اسی کو نقل کرتے گئے ہیں، عالمگیری میں مزید توضیح کی گئی ہے کہ عملی طور پر دارالاسلام کے دارالحرب بننے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں: (۱) اہل کفر مملکت اسلامی کے کسی حصہ پر قابض ہو جائیں۔ (۲) کسی شہر، کسی علاقہ کے لوگ (العیاذ باللہ) مرتد ہو جائیں اور قوانین کفر جاری کر دیں۔ (۳) یا حکومت اسلامی کی بالادستی کو

---

[1] بدائع الصنائع ۷/۱۳۰۔ [2] بدائع الصنائع ۷/۱۳۰۔

قبول کرکے اسلامی مملکت میں رہنے والی غیر مسلم آبادی عہد شکنی کرے اور کسی حصہ پر غلبہ حاصل کرلے[1] ـــــ کاسانیؒ نے امام صاحب اور صاحبین کی دلیل بھی پیش کی ہے، صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ دار کی نسبت اسلام کی طرف اسی وقت درست ہوسکتی ہے جب کہ وہاں اسلام کا غلبہ ہو جیسے کہ جنت کو "دارالسلام" (جائے سلامتی) اور دوزخ کو "دارالبوار" (جائے تباہی) سے تعبیر کیا گیا ہے، اس لیے غلبہ وظہور ہی تنہا وہ سبب ہے جس کو "دارالاسلام" اور "دارالکفر" کی اساس قرار دیا جانا چاہیے ـــــ امام صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کی اس نسبت کا مقصود بعینہٖ اسلام اور کفر نہیں ہے بلکہ امن وخوف ہے، پس جہاں مسلمانوں کو مامون رہنے کے لیے نئی شہریت اور امان کی ضرورت ہو اور جو مملکت اسلامی سے متصل نہ ہو کہ مظلوم مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے وہ مداخلت کرسکے، ایسی صورت میں وہ ملک دارالکفر بن جائے گا[2] ـــــ یہاں یہ پہلو قابل لحاظ ہے کہ گویا کاسانیؒ کی تشریح کے مطابق جس ملک میں مسلمانوں کو امن حاصل ہو وہ دارالحرب نہیں ہے۔ فرماتے ہیں :

"ومعناه ان الامان ان كان للمسلمين فيها على الاطلاق والخوف للكفرة على الاطلاق فهي دار الاسلام وان كان الامان فيها للكفرة على الاطلاق فهي دار الكفر"[3]	مسلمانوں کو علی الاطلاق امن حاصل ہو اور کافروں کو خوف تو دارالاسلام ہے، اور ان کافروں کو علی الاطلاق امن اور مسلمانوں کو خوف ہو تو دارالکفر ہے۔

تاہم عالمگیری اور شامی وغیرہ میں اس مسئلہ میں صاحبین کی رائے کو قرین قیاس قرار دیا گیا ہے[4] ـــــ میرا خیال ہے کہ اگر واقعی اصحاب مذہب سے ان اصطلاحات کے بارے میں صراحت اور اختلاف منقول ہو، تو عجب نہیں کہ یہ اختلاف "اختلاف برہان" کے بجائے "تغیر زمان" کا نتیجہ ہو، اس کا اندازہ اس شرط سے ہوتا ہے جو امام ابوحنیفہؒ نے لگائی ہے کہ دارالحرب ہونے کے لیے ضروری ہوگا کہ "دارالاسلام" سے اس کا اتصال نہ ہو، گویا حضرۃ الامام کے عہد میں مملکت اسلامی کی دفاعی بالادستی اور عسکری قوت کے تحت یہ بات ناقابل تصور

۱۔ ھندیہ ۳/۲۳۲، ۲۔ بدائع الصنائع ۷/۱۳۱، ۳۔ ایضاً۔

۴۔ ھندیہ ۲/۲۳۲، ردالمحتار ۳/۲۵۳۔

تھی کہ ایک مملکت کافرہ جو اس کے پڑوس میں ہو، خود سری کا ثبوت دے، اس لیے وہ ایسی غیر اسلامی مملکتوں کو بھی دار الحرب کے زمرہ میں نہیں رکھتے ہیں، جب کہ صاحبین کے زمانہ میں خلافت اسلامی کی یہ پوزیشن باقی نہ رہی ہوگی، یا ایسے آثار پیدا ہو گئے ہوں گے جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہوں گے کہ آئندہ یہ صورت حال باقی نہ رہ سکے گی، اس لیے انھوں نے احکام اسلامی اور احکام کفر کے اجراء وغلبہ کو بنیاد بنایا ہوگا۔

اس کو اس سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ فقہاء متاخرین جو عام طور پر صاحبین کے ہم خیال ہونے کے باوجود بعض ایسے خطوں کو جہاں احکام کفر جاری وساری تھے، اس بنا پر بالقوہ دار الاسلام کے حکم میں رکھا ہے کہ مملکت اسلامی کی سرحدیں ان کو اس طرح گھیرے ہوئی تھیں کہ کسی بھی وقت دار الاسلام سے اس کا الحاق وانضمام عمل میں آسکتا تھا شامیؒ کا بیان ہے:

"وبهذا ظهر ان ما في الشام من جبل يتم الله بجبل الدروز وبعض البلاد التابعة له كلها دار الاسلام لانها وان كانت لها حكام درزا ونصارى ولهم قضاة على دينهم وبعضهم يعلنون بشتم الاسلام والمسلمين لكنهم تحت حكم ولاة امورنا وبلاد الاسلام محيطة ببلادهم من كل جانب واذا اراد ولي الامر تنفيذ احكامنا فيهم نفذها"[1]

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ شام میں جو جبل یتم اللہ، جبل دروز اور اس کی تابع بعض شہر دار الاسلام ہیں، کیونکہ گو وہاں دروز حکام ہیں یا نصاریٰ ہیں، ان کے مذاہب پر فیصلہ کرنے والے ان کے قضاۃ بھی ہیں، اور بعضے علی الاعلان اسلام اور مسلمانوں پر سب وشتم کرتے ہیں لیکن وہ ہمارے امراء کے تحت رہتے ہیں اور اسلامی شہر ہر طرف سے ان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، اور جب بھی ولی امران پر ہمارے احکام نافذ کرنا چاہے نافذ کر سکتا ہے۔

اس سے اس شبہ کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے کہ موجودہ مسلم ممالک ـــــ جہاں عموماً احکام اسلامی نافذ نہیں ہیں ـــــ کیوں کر دار الاسلام کہلا سکتے ہیں؟ کہ گو یہاں احکام اسلامی نافذ نہیں ہیں، لیکن سربراہ ملک کے لیے ایسا کرنا ممکن ہے اس لیے بالقوہ یہ دار الاسلام ہی متصور ہوگا ـــــ صاحبین رحمہا اللہ کے نقطہ نظر کے بارے میں یہ بات پیش نظر رکھی جانی چاہیے کہ ان

---

[1] ـ رد المحتار ج ۳، ص ۲۵۳ ۔

کے نزدیک احکام کفر کے اجرا و ظہور کا مطلب یہ ہے کہ کلیتۃً احکام کفر ہی نافذ ہوں، اگر احکام اسلامی بھی نافذ ہوں اور احکام کفر بھی، تو پھر یہ دار الحرب نہ ہوں گے۔" لواجریت احکام المسلمین واحکام اھل الشرك لاتکون دار الحرب[1]" اور احکام اسلام سے کس نوع کے احکام مراد ہیں؟ اس کا اندازہ درمختار کی اس صراحت سے ہوتا ہے، کہ جمعہ وعیدین وغیرہ کی اجازت اور ادائیگی بھی احکام اسلام کے اجراء کی علامت ہے۔" ودار الحرب تصیر دار الاسلام باجراء احکام اھل الاسلام فیھا کجمعة وعید[2]" گویا مذہبی عبادات کی علانیہ انجام دہی کا حق بھی منجملہ" اجرائے احکام اسلام" کے ہے۔

دار الکفر پر بحث کے دو گوشے

اب اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ ایا" دار" کی یہ تقسیم فقہاء نے اپنے زمانہ وحالات کے لحاظ سے کی ہے یا یہ قطعی تقسیم ہے — اس کے لیے دار الکفر پر دو پہلو سے غور کرنے کی ضرورت ہے، ایک اس کی خارجہ پالیسی اور مملکت اسلامی سے اس کے تعلقات کی نوعیت، دوسرے اندرون ملک اقلیت اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا سلوک، فقہاء نے جس زمانہ میں ان اصطلاحات پر بحث کی تھی، اس زمانہ میں مسلمان غیر مسلم ملکوں کے شہری بن کر بہت کم رہتے تھے، اور وہ ہجرت کر کے دار الاسلام منتقل ہو جاتے تھے، اس زمانہ میں نہ آج کی طرح قومیت کے فتنہ نے عالم اسلام میں سرایت کیا تھا۔ جس نے ایک مسلم ملک کا دروازہ دوسرے ملک کے مسلمانوں کے لیے بند کر دیا ہے، اور نہ وہ قانونی الجھنیں تھیں جو اس زمانہ میں تارکین وطن کو پیش آتی ہیں۔ دار الکفر میں مسلمانوں کا سفر عموماً تجارتی اغراض کے لیے ہوا کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ سبھی کتب فقہ میں دار الحرب میں جانے والے مسلمان مستامن اور تاجر کے احکام کی جو تفصیل ملتی ہے، دار الحرب کے مسلمان باشندے کے متعلق نہیں ملتی — اس لیے فطری بات ہے کہ فقہاء نے عام طور پر ان اصطلاحات میں دار الاسلام اور دار الکفر کے خارجہ تعلقات کو مد نظر رکھا ہے، جب کہ موجودہ حالات میں ہمیں داخلی صورتِ حال اور مسلمانوں کے ساتھ سلوک و برتاؤ کو سامنے رکھ کر غور کرنا ہے۔

---

[1] رد المحتار ج ۳، ص ۲۵۳ ، [2] درمختار علی ھامش الرد ج ۳، ص ۲۵۳

قرآن مجید کی ہدایات کی روشنی میں

قرآن مجید اپنے زمانہ نزول کے پس منظر کو سامنے رکھ کر کافروں کے دو گروہ کرتا ہے، ایک محاربین کا دوسرا معاہدین کا، ایک وہ جو اسلام کے خلاف برسرپیکار تھے، دوسرے وہ جن سے مسلمانوں کی نا جنگ اور بقاء باہم کا معاہدہ تھا، قرآن نے ایک سے زیادہ مواقع پر ان دونوں گروہوں کا ذکر کیا ہے، محاربین کے بارے میں کہا گیا :

قاتلوا فی سبیل اللہ الذین	خدا کی راہ میں ان لوگوں سے جہاد کرو جو تم سے
یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ	برسرجنگ ہوں، ہاں حد سے تجاوز نہ کرو کہ خدا
لایحب المعتدین ، واقتلوھم	حد سے گذرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور جہاں
حیث ثقفتموھم واخرجوھم	کہیں ان کو پاؤ قتل کرو جہاں سے انھوں نے
من حیث اخرجوکم والفتنۃ اشد	تم کو نکالا ہے تم ان کو نکالو کیونکہ فتنہ قتل سے زیادہ
من القتل ؀ (البقرۃ : ۱۹۱ — ۱۹۰)	سنگین شئی ہے۔

قرآن نے دوسرے موقع پر اس طبقہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا : "الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ" (محمد : ۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کی نگاہ میں محارب قوم وہ ہے جو مسلمانوں سے آمادۂ قتال ہو، اپنے ملک میں اسلامی تشخص کے ساتھ ان کو رہنے کی اجازت نہ دیتی ہو اور خدا کی راہ پر چلنے اور اس کی دعوت دینے سے روکتی ہو یعنی وہاں مسلمانوں کو مذہب پر چلنے اور اپنے مذہب کی طرف دعوت دینے کی آزادی حاصل نہ ہو۔

معاہدین کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے :

الا الذین عٰھدتم من المشرکین ثم	سوائے ان مشرکین کے جن سے تمھارا معاہدہ ہو
لم ینقصوکم شیئا ولم یظاھروا علیکم	پھر وہ تمھارے ساتھ عہد شکنی نہ کریں، اور تمھارے
احدا فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم	مقابلہ کسی کی مدد نہ کریں تو ان سے مدت معاہدہ
ان اللہ یحب المتقین۔ (توبہ : ۴)	تک عہد وفا کرو کہ خدا اہل تقویٰ کو پسند کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ معاہدین جب تک خود معاہدہ کو ختم نہ کریں یا معاہدہ شکنی نہ کریں مسلمانوں کے لیے روا نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا اقدام کریں جو اس معاہدہ کے منافی ہو، یہاں تک کہ اگر وہاں مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہو اور مسلمان مملکت اسلامی سے مدد کے طالب ہوں

تب بھی مسلمانوں کے لیے اس معاہدہ کی خلاف ورزی جائز نہیں :

"وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر الا علی قوم بینکم و بینهم میثاق" (انفال : ۷۲)

اور اگر وہ تم سے دین کے معاملہ میں مدد کے طالب ہوں تو تم پر ان کی مدد ضروری ہے سوائے اس قوم کے کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو۔

انہی معاہدین کی مملکت کو بعض فقہاء نے "دار العہد" یا "دار الصلح" سے تعبیر کیا ہے، قاضی ابوالحسن ماوردی فرماتے ہیں :

"تعتبر دارهولاء المصالحین دار عهد والصلح عند الشافعیة وبعض الحنابلة"[1]

شوافع اور بعض حنابلہ کے نزدیک ان مصالحین کا ملک دار العہد اور دار الصلح تصور کیا جاتا ہے

اور اس اصول کو سامنے رکھ کر فقہاء نے دونوں طرح کی غیر مسلم اقوام سے مصالحت کی اجازت دی ہے، ان سے بھی جو خراج؛ ورعوض ادا کریں اور ان سے بھی جو مملکت اسلامی کو کوئی خراج ادا نہ کریں، علامہ سمرقندی کہتے ہیں :

"وکذا الجواب فی الموادعة والصلح علی ترك القتال مدة بمال اوبغیر مال تجوز من الامام ان رای المصلحة"[2]

یہی حکم موادعت یعنی مال سے کر یا بغیر مال کے تاجنگ معاہدہ کرنے کا ہے، امام کی طرف سے ایسا معاہدہ درست ہے اگر اس میں مصلحت سمجھتا ہو۔

پھر جو مملکت کافرہ مسلمانوں کو خراج ادا کرے اس کے دار الاسلام ہونے پر اتفاق ہے، اور جس مملکت سے مساویانہ سطح کا معاہدہ ہوا اور وہ دار الاسلام کی باجگذار نہ ہو وہ ماوردی کے بیان کے مطابق اکثر فقہاء کے نزدیک دار الاسلام ہی کہلائے گا، اور بعض شوافع وحنابلہ کے نزدیک "دار العہد" سے موسوم ہوگا، غالبًا یہ اختلاف اس اصل پر مبنی ہوگا کہ جمہور کے نزدیک مسلمانوں کے اس ملک میں مامون ہونے کی وجہ سے یہ دار الاسلام کہلاتا ہوگا، اور جن حضرات کی نظر احکام اسلامی کے جاری ہونے پر ہوگی وہ اس کو دار الاسلام اور دار الحرب کے درمیان ایک نیا نظام سیاسی، "دار العہد" قرار دیتے ہوں گے۔

اس طرح خارجہ پالیسی اور تعلقات کے اعتبار سے دار کی تین قسمیں ہوئیں : "دار الاسلام"

---

[1] ۔ الاحکام السلطانیة، ص ۱۳۳ : بحوالة الفقه الاسلامی وادلته ۸

[2] ۔ تحفة الفقهاء ۳ / ۲۹۸۔

"دارالحرب" اور" دارالعہد"۔

عہد رسالت میں نظام ہائے مملکت

غیر مسلم ممالک میں مسلمان شہریوں کے ساتھ سلوک اور ان کے مذہبی اور بنیادی حقوق کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تین طرح کی مملکتیں ملتی ہیں، مکہ، مدینہ اور حبش، مکہ میں مسلمانوں کو مذہبی حقوق بالکل حاصل نہ تھے، نہ علانیہ عبادت کر سکتے تھے، اور نہ اپنے دین کی طرف دعوت دے سکتے تھے، یہاں تک کہ مسلمانوں کے لیے اپنے دین اور جان و مال کی حفاظت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ وہاں سے ہجرت کر جائیں، خود قرآن نے ان پر ہجرت کو فرض قرار دیا :

" والذین آمنوا ولم یهاجروا ما لکم من ولایتهم من شیء حتی یهاجروا" (انفال : ۷۲)	جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت نہیں کی تم پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں، جب تک کہ وہ ہجرت نہ کر جائیں۔

یہ وہی نظام مملکت تھا جس کو بعد کو فقہاء نے "دارالحرب" سے تعبیر کیا۔

مدینہ میں حکومت کی بنیاد گو مختلف اقوام کی بقاء باہم اور مذہبی آزادی کے اصول پر تھی خود امام محمد نے اس "موادعت" کا ذکر کیا ہے لیکن مسلمانوں کو سیاسی بالادستی حاصل تھی اس لیے یہ" دارالاسلام" کہلایا۔

حبش میں اقتدار کی باگ گو عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی، مگر مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل تھی، فقہاء نے عام طور پر اس نظام مملکت سے تعرض نہیں کیا ہے اور اس پر زیادہ بحث نہیں کی ہے، شاید ایسا اس لیے ہوا کہ ہجرت کے واجب ہونے کی وجہ سے بعد کے ادوار میں غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں نے آباد ہونے سے گریز کیا، اور اس وقت فقہاء کو اس پہلو پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، لیکن موجودہ حالات میں سیرت کا یہ گوشہ علماء کی خاص توجہ کا طالب ہے، غالباً اسی نظیر کو سامنے رکھ ماضی قریب کے علماء نے دار کی ایک نئی صورت "دارالامن" کا اختراع کیا ـــــ پس داخلی حالات اور مسلمانوں کے مذہبی حقوق کے لحاظ سے دار کی تین قسمیں ہوئیں، دارالاسلام، دارالحرب، دارالامن۔

دارالاسلام : وہ مملکت ہے جہاں مسلمانوں کو ایسا سیاسی موقف حاصل ہو کہ وہ تمام احکام اسلامی کے نفاذ پر قادر ہوں "ان دارالحرب تصیر دارالاسلام بشرط واحد وهو

اظہار حکم الاسلام فیہا"

دارالحرب :- وہ مملکت کافرہ ہے، جہاں کافروں کو امن حاصل ہو اور مسلمان شہری امن سے محروم ہوں، جیساکہ کاسانی کا قول گذرچکا ہے، نیز وہاں مسلمان مذہبی حقوق وعبادات اور جمعہ وعیدین وغیرہ کی علانیہ انجام دہی سے قاصر ہوں، جیساکہ درمختار میں "اجراء احکام اسلام" کا مفہوم گذرچکا ہے ـــــــ رہ گیا دارالاسلام سے متصل نہ ہونا تو جیساکہ اوپر عرض کیا گیا کہ یہ ایسی شرط ہے جو اس زمانہ کے خاص تناظر وحالات میں رکھی گئی تھی موجودہ حالات میں جیساکہ عالم اسلام کو فوجی اور عسکری بالادستی حاصل نہیں رہی، یہ شرط قابل عمل باقی نہیں رہی ہے۔

دارالامن :- وہ ملک ہے جہاں کلید اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو لیکن مسلمان مامون ہوں، مسلمان دعوت دین کا فریضہ انجام دے سکتے ہوں، اور ان اسلامی احکام کو جن کے نفاذ کے لیے اقتدار ضروری نہ ہو، پر عمل کرسکتے ہوں ـــــــ اگر ملک کا کوئی غیر مسلم باشندہ کسی مسلمان پر شخصی طور پر تعدی کرے تو یہ اس کے دارالامن رہنے کے منافی نہیں، جیساکہ دارالعہد کے کسی شخص کی دارالاسلام میں داخل ہوکر رہزنی کرنے کو "دارالعہد" کے دارالحرب قرار دیئے جانے کا سبب نہیں قرار دیا گیا۔ "واذا وادع الامام اهل الحرب فخرج رجل من تلك الدار تقطع الطريق في دار الاسلام واخاف السبيل فاخذه المسلمون فليس هذا بنقض منه للعهد[1]" اسی طرح فرقہ وارانہ فسادات اور بلوے جن میں غیر مسلموں کا ایک گروہ غیر آئینی طور پر مسلمانوں سے قتل وقتال کے درپے ہو جاتا ہے، کسی ملک کے دارالامن ہونے کے مغائر نہیں۔ "وكذلك العدد منهم اذا فعلوا ذلك ولم يكونوا اهل منعة فهذا والواحد سواء[2]" ہاں اگر آئینی اور قانونی طور پر مسلمانوں کو امن وسلامتی نہ ہو اور ان کے جان و املاک کو مباح قرار دیا گیا ہو تو اب یہ ملک دارالحرب کے زمرہ میں آجائے گا۔ جیساکہ سربراہ قوم کی اجازت سے حملہ آور ہونے والی معاہد قوم کو فقہاء نے حربی کے حکم میں رکھا ہے

"وان كانوا خرجوا باذن مليكهم فقد نقضوا جميعا العهد فلا باس بقتلهم وسبيهم حيثما وجدوا[3]"

حقیقت یہ ہے کہ "دارالامن" کے مسلمان باشندے اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ

---

[1] السیر الکبیر ٥/١٦٩٥، [2] حوالہ سابق، [3] حوالہ سابق، ص ١٦٩٦۔

تعلقات میں انھیں اصول وضوابط کے پابند ہوں گے جن کے پابند ایک مسلمان ملک کے شہری دوسری معاہد قوم کے افراد کے ساتھ سلوک و برتاؤ میں ہیں، اس لیے کہ جس طرح دارالاسلام معاہدین سے بحیثیت ملک، بقاء باہم اور ایک دوسرے کی سلامتی اور آزادی کا عہد کرتا ہے، اسی طرح دارالامن میں مسلمان اپنی ہم سایہ قوموں سے ایک ہی ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے باہمی سلامتی اور امن و آزادی کا معاہدہ کرتے ہیں۔

"دارالامن" کے احکام میں ہم "قانون امان" اور "استیمان" سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ "امان" اور "استیمان" کی حیثیت مستقل شہریت اور توطن کی نہیں ہے، بلکہ سفر اور عارضی قیام کی اجازت کی ہے، اور مستامن اور امان دینے والے افراد کے درمیان تعلقات کی نوعیت مساویانہ نہیں ہوتی بلکہ ایک کی حیثیت شہری کی ہوتی ہے اور دوسرے کی مسافر کی، جب کہ "دارالامن" میں مسلمان اور کافر کے درمیان تعلقات مساویانہ سطح کے ہوتے ہیں اور دونوں اسی ملک کے شہری قرار پاتے ہیں، لیکن ایک دوسرے کی جان و مال کے احترام، حفاظت و سلامتی اور اپنے مذہب پر قائم رہنے کے حق کے اعتبار سے ان کے حقوق یکساں حیثیت کے حامل ہیں۔

دارالاسلام اور دارالحرب کے احکام

دارالامن چونکہ دارالکفر ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کو یہاں امن اور مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے اس لیے اس پر نہ دارالحرب کے تمام احکام جاری کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی پوری طرح دارالاسلام کے حکم میں رکھا جا سکتا ہے۔ دار کی ان مختلف صورتوں میں مسلمان باشندوں کا کیا رول ہو؟ اس کے لیے یہاں ان احکام کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو فقہاء نے دار الاسلام اور دارالحرب کے ذکر کیے ہیں۔

دارالاسلام کے درج ذیل احکام ہیں:

۱۔ اسلام کے تمام شخصی اور اجتماعی قوانین کا نفاذ۔

۲۔ دارالکفر کے مہاجرین کی آبادکاری۔

۳۔ دارالحرب میں پھنسے ہوئے کمزور مسلمانوں (مستضعفین) کی اعانت (نساء)

۴۔ جہاد اور اسلامی سرحدات کی توسیع کی سعی۔

دارالحرب کے درج ذیل احکام ہیں:

۱۔ یہاں اسلام کا قانون جرم وسزا جاری نہ ہوگا۔ "الحدود والقود لایجری فیہا"[1] البتہ امام مالک کے نزدیک دار الحرب میں بھی حدود جاری ہوں گی۔ "تقام الحدود فی دار الحرب عند مالک خلافا للثلاثۃ"[2]

۲۔ دار الحرب کے دو مسلمانوں کے درمیان بھی کسی معاملہ میں نزاع پیدا ہو جائے تو دار الاسلام کا قاضی اس کا فیصلہ نہیں کرے گا۔ "ولو اختصما فی ذلک فی دارنا لم یقض القاضی بینہما بشیٔ"[3]

۳۔ دار الحرب کے باشندوں سے اسلحہ کی فروخت درست نہ ہوگی۔ "لاینبغی ان یباع السلاح من اہل الحرب"[4]

۴۔ دار الحرب کے کسی باشندہ کو دار الاسلام میں ایک سال تک قیام کی اجازت نہیں دی جائے گی سوائے اس کے کہ وہ وہاں کی شہریت کا طالب ہو۔ "اذا دخل الحربی الینا مستامنا لم یکن ان یقیم فی دارنا سنۃ ویقول لہ الامام ان اقمت تمام السنۃ وضعت علیک الجزیۃ"[5]

۵۔ دار الحرب میں لوہے کی کان دریافت ہو یا ایسی چیزیں جن سے اس ملک کی دفاعی قوت میں اضافہ ہوتا ہو تو مسلمان ماہرین کے لیے کان کنی، اور ایسی مفید صنعتی معلومات — اور ٹکنالوجی کی منتقل درست نہ ہوگی۔ "ولو اصاب المستامن معدن حدید فی دار الحرب فانہ یکرہ لہ ان یعمل فیہ ویستخرج منہ الحدید"[6]

۶۔ دار الحرب کے مسلمان باشندوں پر واجب ہے کہ وہ وہاں سے ہجرت کر جائیں — البتہ مختلف لوگوں کے حالات کے اعتبار سے ابن قدامہ نے دار الحرب کے مسلمان باشندوں کی تین قسمیں کی ہیں۔

اول :۔ وہ جن پر ہجرت واجب ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے دار الحرب میں اپنے ایمان

---

[1]۔ رد المحتار ۳/۲۵۳، بدائع الصنائع ۷/۱۳۱۔

[2]۔ ملخصًا : الفقہ الاسلامی وادلتہ ۶/۳۹۱، [3]۔ السیر الکبیر ۳/۱۳۸۶۔

[4]۔ ہدایۃ ۴/۵۴۳، باب المستامن، [5]۔ ہدایۃ ۲/۵۶۶۔

[6]۔ السیر الکبیر ۳/۱۳۸۸، ولا غیر ذلک مما یتقون بہ علی المسلمین فی الحرب، ۳/۱۳۸۶۔

کا اظہار ممکن نہ ہو، اور وہ واجبات دین کی ادائیگی سے قاصر ہوں، نیز وہ ہجرت کرنے پر قادر بھی ہوں، جس کا سورہ انفال (آیت ۱۰) میں حکم دیا گیا ہے۔

دوم :- وہ لوگ جو بیماری، خواتین اور بچوں یا حکومت کے جبر و دباؤ کی وجہ سے ہجرت پر قادر نہ ہوں، ہمارے زمانہ میں دوسرے ملکوں میں شہریت حاصل کرنے میں جو دقتیں حاصل ہیں وہ بھی منجملہ انہی اعذار کے ہیں، ایسے لوگوں پر ہجرت واجب نہیں، اور یہی حضرات

"الا المستضعفین من الرجال والنساء والولدان لا یستطیعون حیلة ولا یھتدون سبیلا"

کے مصداق ہیں۔

سوم :- وہ لوگ جو دار الحرب میں اپنے اسلام کا اظہار کر سکتے ہوں، فرائض دین کو ادا بھی کر سکتے ہوں اور ہجرت پر بھی قادر ہوں۔ ایسے لوگوں کے لیے ہجرت کرنا محض "مستحب" ہے جیسا کہ حضرت عباس نے ایمان لانے کے بعد مکہ سے ہجرت نہیں فرمائی، اور حضرت نعیم نحام نے اپنی قوم بنو عدی کی خواہش پر قبول اسلام کے بعد بھی ایک عرصہ تک ہجرت نہیں کی[۱]

۷۔ مسلمان زوجین میں سے ایک دار الحرب سے دار الاسلام ہجرت کر جائیں، یا دار الاسلام سے منتقل ہو جائیں اور دار الحرب میں توطن اختیار کر لیں تو "تباین دارین" کی وجہ سے دونوں میں تفریق ہو جائے گی[۲]

۸۔ دار الحرب میں کافر زوجین میں سے ایک اسلام قبول کر لیں تو مسلمانوں کے نظام قضا کے فقدان کی وجہ سے دوسرے فریق پر اسلام کی پیش کش نہ کی جائے گی، بلکہ تین حیض گذرنے کے بعد از خود زوجین میں تفریق ہو جائے گی۔ جب کہ دار الاسلام میں دوسرے فریق پر اسلام پیش کیا جائے گا اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کر دے تب دونوں میں تفریق عمل میں آئے گی[۳]

۹۔ امان حاصل کر کے جانے والے مسلمان تجار دار الحرب کے باشندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اسلام کے مالی قوانین کے پابند نہ ہوں گے، ہاں یہ ضروری ہوگا کہ ان کے

---

[۱] ملخصًا : از المغنی مع الشرح الکبیر ۱۰/۵۱۴ ، [۲] ھدایۃ ۲/۳۴۷ ۔
[۳] ھدایۃ ۲/۳۴۶ ۔

ساتھ دھوکہ دہی نہ کریں[1] چنانچہ اگر مسلمان تجار حربیوں سے شراب، یا خنزیر یا مردار خرید کر کے اس کی قیمت حاصل کرلیں یا قمار یا جوئے کے ذریعہ مال حاصل کریں تو یہ اس کے لیے حلال ہوگا: "المسلم الذی دخل دارالحرب بامان اذا باع درھما بدرھمین او باع خمرا او خنزیرا او میتۃ او قامرھم واخذ المال یحل[2]"

اسی اصول کی بنیاد پر دارالحرب میں حربیوں سے سود لینے کی بھی اجازت دی گئی ہے، البتہ یہ رائے امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کی ہے، جمہور کی رائے اس کے خلاف ہے، جیسا کہ اوپر گذر چکا۔

۱۰۔ بنیادی اور اصولی طور پر دارالحرب کے باشندوں کی جان اور مال معصوم نہیں ہے یہاں تک کہ دارالحرب میں رہنے والا مسلمان بھی، اس کے حکم سے مستثنیٰ نہیں ہیں ابن نجیم کا بیان ہے ——

وحکم من اسلم فی دارالحرب ولم یھاجر کالحربی عند ابی حنیفۃ لان مالہ غیر معصوم عندہ[3]	اور اس شخص کا حکم جو دارالحرب میں مسلمان ہوا اور ہجرت نہیں کی حربی کا ہے امام ابوحنیفہ کے نزدیک، اس لیے کہ اس کا مال امام صاحب کے نزدیک معصوم نہیں ہے۔

دارالحرب میں مقیم مسلمانوں کی جان کو بھی غیر معصوم تسلیم کیا گیا ہے، ابوبکر جصاصؒ لکھتے ہیں:

"لا قیمۃ لدم المقیم فی دارالحرب بعد اسلامہ قبل الھجرۃ الینا[4]"	قبول اسلام کے بعد بھی جو دارالحرب میں مقیم ہوں، ان کے ہجرت کر کے ہمارے یہاں آنے سے پہلے ان کے خون کی کوئی قیمت نہیں۔

اس بنا پر دارالحرب میں مقیم کسی مسلمان کو دوسرا مسلمان قتل کر دے اور وہ دارالاسلام میں بھاگ آئے تو یہاں اس پر قانون قصاص جاری نہ ہوگا۔ ہاں مسلم مملکت میں جو غیر مسلم آباد ہوں جن کو "ذمی" کہا جاتا ہے اسی طرح وہ حربی جو امان لے کر دارالاسلام میں داخل ہوئے ہوں، ان کی جان و مال کفر کے باوجود معصوم متصور ہوں گے۔ اسی لیے ان سے سودی کاروبار وغیرہ درست نہیں ہوگا[5]

---

[1]۔ السیر الکبیر ۱۳۸۶/۴، [2]۔ حاشیہ شہاب الدین شبلی علی تبیین الحقائق ۹۷/۴۔

[3]۔ البحر الرائق ۱۴۷/۵، [4]۔ احکام القرآن للجصاص ۲۹۷/۲، [5]۔ بدائع الصنائع ۱۳۲/۷۔

۱۱ ۔ دارالحرب میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے بہت سے ایسے احکام میں ناواقفیت کا اعتبار ہے کہ دارالاسلام میں انہی میں ناواقفیت کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔

غور کیا جائے تو دارالحرب کے یہ احکام تین اصولوں پر مبنی ہیں۔

اول:۔ یہ کہ دارالحرب، دارالاسلام کی حدود ولایت سے باہر ہے۔

دوم:۔ یہ کہ دارالحرب کے باشندے اسلام کے خلاف محارب اور برسرپیکار ہیں، اس لیے ان کو جانی و مالی نقصان پہنچانا اصولی طور پر درست اور جائز ہے۔

سوم:۔ دارالحرب میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے احکام اسلامی سے ان کا بے خبر ہونا ایک گونا قابل عفو ہے۔

دارالامن کے احکام انہی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے دارالامن کے احکام متعین کرنے ہوں گے، جہاں اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ یہ دار دارالاسلام کی حدود ولایت سے باہر ہوتا ہے، لیکن یہ ملک آئینی طور پر اسلام کے خلاف محارب نہیں ہوتا اور مسلمانوں کو مذہبی اور دعوت و تبلیغ کی آزادی ہوتی ہے —— لہٰذا دارالامن کے احکام حسب ذیل ہوں گے۔

۱ ۔ دارالامن میں اسلامی حدود و قصاص جاری نہ ہوں گے۔

۲ ۔ دارالامن کے مسلمانوں اور باشندوں کے معاملات دارالاسلام کی عدالت میں فیصل نہ ہوسکیں گے۔

۳ ۔ یہاں کے مسلمان باشندوں پر ہجرت واجب نہیں ہوگی۔

۴ ۔ یہاں کی دفاعی قوت میں اضافہ اور مدد مسلمانوں کے لیے درست ہوگا، جیسا کہ صحابہ نے شاہ حبش نجاشی کی ان کے دشمنوں کے خلاف مدد کی تھی۔ بشرطیکہ وہ کسی مسلم ملک سے برسرپیکار نہ ہو۔

۵ ۔ احکام شرعیہ سے ناواقفیت اور جہل کے معاملہ میں جس طرح دارالحرب کے مسلمانوں کو معذور سمجھا جائے گا، اس طرح ان کو معذور نہیں سمجھا جائے گا۔

۶ ۔ زوجین میں سے ایک دارالامن سے دارالاسلام میں چلے جائیں تو ان کے درمیان محض "تباین دار" کی وجہ سے تفریق واجب نہ ہوگی، کیونکہ صلح و امن کی فضا کی وجہ سے آمد و رفت اور حقوق زوجیت کی تکمیل ممکن ہے۔

۷۔ زوجین میں سے ایک اسلام قبول کرلیں تو تفریق میں وہی قانون نافذ ہوگا جو دارالحرب کا ہے کیونکہ دارالاسلام کے قاضی کو اختلاف دار کی وجہ سے ولایت حاصل نہیں ہے، اور خود اس ملک میں مسلمانوں نے باہمی تراضی سے قاضی مقرر کیا ہے تو اس کو صرف مسلمان ہی پر ولایت حاصل ہے، دوسرا فریق جو حالت کفر میں ہے اس پر "قاضی المسلمین" کی ولایت ثابت نہیں۔

۸۔ جیسے دارالاسلام میں رہنے والے "ذمی" اور دارالحرب سے آنے والے "مستامن حربی" کی جان ومال معصوم ہیں اور غیر اسلامی طریقوں سود، قمار، شراب وخنزیر کی فروخت وغیرہ کے ذریعہ ان کے مال کا حصول جائز نہیں، اسی طرح "دارالامن" کے دوسرے باشندوں کے ساتھ معاہدہ امن کی وجہ سے ان کے جان ومال بھی معصوم ہیں، اور ان غیر شرعی طریقوں پر ان کا حصول جائز نہیں۔

موجودہ دور کے غیر مسلم ممالک

موجودہ دور میں جو غیر مسلم ملکتیں ہیں، ان میں بعض تو وہ ہیں جو اسلام یا مطلقاً مذہب کی معاند ہیں، جہاں نہ مذہبی تشخصات کے ساتھ مسلمان زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ اسلام کی دعوت دے سکتے ہیں، جیسے کمیونسٹ بلاک کے ممالک یا بلغاریہ وغیرہ، دوسری قسم کے ممالک وہ ہیں جہاں مغربی طرز کی جمہوریت رائج ہے، جن میں یا تو سلطنت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور تمام قومیں اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہوتی ہیں، جیسے خود ہمارا ملک ہندوستان ہے، یا سلطنت کا ایک مذہب ہوتا ہے لیکن دوسری مذہبی اقلیتیں بھی اپنے مذہبی معاملات میں آزاد ہوتی ہیں، اور ان کو اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کی اجازت ہوتی ہے، جیسے امریکہ، برطانیہ وغیرہ، ایک آدھ ملک ایسے بھی ہیں جہاں قدیم بادشاہت باقی ہے، لیکن وہاں بھی مذہبی اقلیتوں کو مذہبی حقوق حاصل نہیں۔

میرے خیال میں پہلی نوع کے ممالک یعنی کمیونسٹ ممالک "دارالحرب" کے زمرہ میں ہیں گو بعض کمیونسٹ ممالک میں مذہبی آزادی اور اظہار رائے وغیرہ کے حقوق میں ایک گونہ نرمی پیدا کی گئی ہے، تاہم اب بھی وہ دارالحرب ہی ہیں، اس کے علاوہ جو ممالک ہیں وہ بھی "دارالامن" میں شمار کیے جاسکتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ مختلف ملکوں میں مذہبی حقوق کے معاملہ میں ایک گونہ تفاوت بھی پایا جاتا ہے   ہندوستان ان ممالک میں ہے جس

کے "دارالامن" ہونے میں کوئی شبہ نہیں، جمہوری نظام کی وجہ سے مسلمان اس ملک کے اقتدار میں شامل ہیں، عبادت اور عقیدہ وضمیر کی آزادی کے معاملہ میں ان کو وہی حقوق حاصل ہیں جو اکثریتی فرقہ کو حاصل ہے، دعوت وتبلیغ کی اجازت بہت سے مسلم ممالک سے زیادہ یہاں ہے۔ شخصی قوانین جتنے ان کے محفوظ ہیں اکثریتی فرقہ کے بھی نہیں ہیں۔ سلطنت کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہے، رہ گئے فرقہ وارانہ فسادات اور ان میں بعض طبقوں کی طرف سے تعدی کا پایا جانا جو قانون ملکی کے لحاظ سے ایک غیر آئینی فعل ہے اور جرم ہے، تو پہلے وضاحت کی جا چکی ہے کہ یہ کسی ملک کے "دارالامن" ہونے کے مغائر نہیں، اس لیے یہاں خرید وفروخت اور دوسرے مالی قوانین میں احکام شرعیہ کی پیروی ضروری ہوگی، اور مسلمانوں کے لیے "سود" حرام ہوگا۔

چوتھے سوال کا جواب

بینک انٹرسٹ کا مصرف

بنک سے حاصل ہونے والا نفع قرض پر حاصل کیا جانے والا نفع ہے، لہذا "ربا" ہے، اس نفع کا بنک میں چھوڑنا ایک سودی کاروبار میں مزید تعاون ہے اور غالباً ایسی رقوم کا استعمال کبھی ایسی مدات میں ہوتا ہے جن کے ذریعہ کفر کو تقویت پہنچتی ہے، اس لیے بطریق "استحسان" اس کا نکال لینا واجب ہے ——— سرکاری اور غیر سرکاری بنک دونوں کا حکم مساوی ہے، کیونکہ غیر سرکاری بنک سے ملنے والا سود "افراد" سے وصول کیا جاتا ہے، اور سرکاری بنک کے واسطہ سے پوری قوم سے سود وصول کیا جاتا ہے، گو وہ خود بھی اس کا ایک فرد ہے، لیکن پوری قوم کے مقابلہ اس کا "وجود" اتنی قلیل نسبت رکھتا ہے کہ یہ دوسروں ہی سے سود حاصل کرنے کے حکم میں ہے۔ اس سلسلہ میں حد سرقہ وغیرہ کے بعض احکام سے جن میں بیت المال کی چوری پر حد سرقہ کا نفاذ عمل میں نہیں آتا ——— غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہیے اس لیے کہ "حدود" معمولی شبہات کی وجہ سے معاف کردی جاتی ہیں، جب کہ ربا کا معمولی "شبہ" دعوا الربا والريبة" کے تحت اس کو حرام کردیتا ہے۔

بعض بزرگوں نے اس رقم کا مصرف فقراء ومساکین کو قرار دیا ہے اور اس کی دلیل میں یہ بات کہی گئی ہے کہ مالِ حرام جسے اس کے مالک تک پہنچانا ممکن نہ ہو، فقہاء نے اسے واجب

التصدق قرار دیا ہے جیسا کہ عالمگیری اور شامی وغیرہ کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے ——— اس سلسلہ میں تفصیل یوں ہے کہ مدات آمدنی چار ہیں :

۱ - زکوٰۃ وعشر جن کا مصرف خود قرآن نے متعین کر دیا ہے۔

۲ - مال غنیمت اور زمین سے نکلنے والی کانوں اور دفینوں کا خمس، ان کا مصرف یتامیٰ، مساکین اور مسافرین ہیں۔

۳ - تیسرے خراج وجزیہ اور معاہدہ کے تحت غیر مسلم ممالک واقوام و مملکت اسلامی میں اجنبی ممالک سے آنے والے تجار سے لیا جانے والا ٹیکس - یہ رقم رفاہی امور مثلاً سرحدوں کی حفاظت، قلعوں کی تعمیر، راستے میں حفاظتی چوکیوں کے قیام، پلوں کی تعمیر اور نہروآب رسانی کے نظم، مسافر خانے اور مسجدوں کی عمارت اور سرکاری ملازمین کی تنخواہ نیز اساتذہ وطلبہ کے وظائف پر خرچ کی جائے گی۔

۴ - چوتھے مال لقطہ اس سے غریب مریضوں کے اخراجات، دوا و معالجہ، تجہیز وتکفین اور بے روزگار اور بے سہارا لوگوں کے اخراجات وغیرہ پورے کیے جائیں گے۔[۱]

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ قتال اور جنگ کے بغیر جو مال بیت المال کو حاصل ہو ——— وہ مسلمانوں کے مصالح عامہ پر خرچ کیا جائے گا، جیسے سرحدوں اور قلعوں کی تعمیر اور قاضی وغیرہ کی تنخواہ[۲]۔ صاحب درمختار نے بیت المال کی حاصل ہونے والی آمدنی اور اس کے مصارف کے سلسلہ میں محمد بن شحنہ کے چند اشعار نقل کیے ہیں، جس میں "ضوائع" یعنی لقطہ، لاوارث کے متروکہ یا متروکہ کا ایسا حصہ جس کا کوئی حقدار نہ ہو کا مصرف یوں بیان کیا گیا ہے۔ ؎

ورابعها فمصرفه جهات تساوى النفع فيها المسلمون

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مصالح مسلمین میں لقطہ وغیرہ کو خرچ کیا جا سکتا ہے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ یہی رائے امام فخر الاسلام بزدوی کی ہے کہ یہ آمدنی مساجد، سرحدات، مسافر خانے اور پلوں کی تعمیر میں بھی صرف کی جا سکتی ہے[۳]۔ محمد ابن شحنہ کے ان اشعار کے نقل کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود صاحب درمختار کا رجحان بھی اسی طرف ہے، عالمگیری کی عبارت میں لقطہ کی آمدنی کو تکفین میت میں استعمال کی اجازت دی گئی ہے، اور اسے طحاوی کی طرف منسوب

---

[۱] - هندیه ۱/ ۱۹۰ - ۱۹۱ - [۲] هدایه ۲/ ۶۰۰، مکتبہ تھانوی دیوبند - [۳] - ردالمحتار ۲/ ۵۸ -

کیا گیا ہے ـــــ ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ لقطہ اور اس طرح کی دوسری آمدنی جس کا کوئی مالک موجود نہ ہو ایسے مدات میں بھی خرچ کی جا سکتی ہے، جس میں تملیک نہ پائی جاتی ہو، شامی نے گو بزدوی کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے اور زیلعی اور صاحب ہدایہ کی نقل کو ترجیح دی ہے کہ یہ رقم فقراء پر خرچ کی جائے گی، لیکن زیلعی سے جو مصارف نقل کیے گئے ہیں، ان میں تکفین میت بھی ہے، اور یہ بات محتاج تشریح نہیں کہ میت کی تجہیز و تکفین فقہاء کے نزدیک تملیک کا حکم نہیں رکھتی۔ اسی طرح علامہ سرخسی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام لقطہ سے حاصل ہونے والی آمدنی کو مضاربت کے لیے دے سکتا ہے، اور قرض پر لگا سکتا ہے[۱] ان نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے، یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بنک انٹرسٹ کو عام رفاہی کاموں میں خرچ کرنے کی اجازت ہونی چاہیے، اس میں شبہ نہیں کہ مال لقطہ وغیرہ کو بعض فقہاء نے فقراء پر صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن وہ اس اصل پر مبنی ہے کہ صدقہ کرنے کا مقصود اصل مالک سا مان کو ثواب پہنچاتا ہے۔" ان الملتقط له ان يتصدق بها بعد التعريف على ان يكون ثوابها لصاحبها ان اجاز وان ابى فله الضمان على المتصدق "[۲] جب کہ بنک انٹرسٹ کے خرچ کرنے کا مقصد محض مال حرام کو اپنی ملکیت سے نکالنا ہے، یہی وجہ ہے کہ " لا صدقة فى غلول " کے تحت اس مال میں صدقہ اور ثواب کی نیت کرنا بھی جائز نہیں ہے، جلال الدین سیوطی نے بھی ایسے مال کو جس کا مالک معلوم نہ ہو، کا مصرف مسلمانوں کی عام مصالح قرار دیا ہے۔" فاما عند الياس فالمال حينئذ للمصالح لانها من جملة اموال بيت المال ما جهل مالكه "[۳] اسی لیے میری رائے ہے کہ بنک انٹرسٹ تمام رفاہی کاموں میں خرچ کیا جا سکتا ہے، البتہ مساجد کی تعمیر میں اس کا استعمال اس کی حرمت و عظمت کے خلاف ہے، اس لیے اس سے منع کیا جائے گا۔

پانچویں سوال کا جواب
سود لینے اور دینے میں فرق ہے!

فقہاء کے یہاں عام قاعدہ تو یہ ہے کہ جن چیزوں کا لینا جائز نہیں ان کا دینا بھی جائز نہیں، " ما حرم اخذه حرم اعطاءه " البتہ اگر اپنے آپ سے کسی ضرورت کے دفع کرنے یا

۱۔ المبسوط ۱۱/۴، ۲۔ المبسوط ۴/۴، ۳۔ الاشباہ والنظائر للسیوطی، ۱۲۴۔

اپنے کسی جائز حق کے حاصل کرنے کے لیے کبھی ضرورت دامنگیر ہو تو فقہاء نے اس کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ کیا ہے، مثلاً جان و مال کی حفاظت اور سلطان و امیر کو عدل و برابری پر آمادہ کرنے کے لیے رشوت دینے کی اجازت دی گئی ہے، "الرشوة لخوف على ماله اونفسه اوليسوى امره عند سلطان اوامير"[1] اور اسی اصل پر ابن نجیم نے سود لینے اور دینے میں فرق کیا ہے، کہ سود لینا کسی طرح جائز نہیں، لیکن حاجتمندوں کے لیے سود دینا جائز ہے "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح"[2] موجودہ حالات میں واقعی بعض دفعہ ایسی ضرورتیں پیش آتی ہیں کہ سودی قرض کا حصول ایک ضرورت بن جاتا ہے۔

چھٹے سوال کا جواب

سودی قرض کب جائز ہے؟

ابن نجیمؒ نے لکھا ہے: "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" کہ اصحاب حاجت کے لیے سودی قرض لینے کی گنجائش ہوتی ہے۔

یہاں علامہ ابن نجیمؒ نے حاجت کی بنا پر سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے، اور کہا ہے کہ یہ منجملہ ان حاجات کے ہے جو ضرورت کا حکم رکھتی ہے، اصولیین کی اصطلاح میں حاجت ایسی چیز کو کہتے ہیں کہ جس پر شریعت کے مقاصد خمسہ میں سے کسی مقصد کا وجود موقوف تو نہ ہو لیکن اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو مشقت اور حرج پیدا ہو جائے "واما الحاجيات معناها انها مفتقر اليها من حيث التوسع و رفع الضيق المؤدى فى الغالب الى الحرج والمشقة اللاحقة بفوت المطلوب"[3] —— یہ حاجات بعض اوقات "ضرورت" کے حکم میں تسلیم کی جاتی ہیں، اور جیسے ضرورت کی بنا پر ناجائز بقدر ضرورت جائز ہو جاتا ہے، اسی طرح حاجت کی بنا پر بھی فقہاء احکام میں سہولت پیدا کرتے ہیں، سیوطی کا بیان ہے "الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت اوخاصة"[4] —— آگے سیوطیؒ نے حاجت کی بنا پر ناجائز کے جائز ہونے کی جو مثال دی ہے ان میں یہ بھی ہے کہ امام نوویؒ نے مقصد تعلیم کے لیے عورت کے غیر محرم کے سامنے ہونے کی

---

[1] - الاشباہ والنظائر للسیوطی، ۲۸۱ - [2] - الاشباہ والنظائر مع الغمز ج ۱/ ۲۹۲ -

[3] - الموافقات ۲/۵ - [4] - الاشباہ والنظائر للسیوطی، ۱۸۰ -

اجازت دی ہے۔ چنانچہ علامہ سبکیؒ کا قول نقل کیا ہے۔

"قد کشفت کتب المذاهب فانما یظهر منها جواز النظر للتعلیم فیما یجب تعلمه وتعلیمه کالفاتحة"[1]	میں نے کتب مذاہب پر نظر ڈالی جس سے ایسا ہوتا ہے کہ ایسے امور کی تعلیم و تعلم کے لیے جو شرعاً واجب کا درجہ رکھتے ہیں جیسے سورہ فاتحہ، غیر محرم کو دیکھنا جائز ہے۔

گو خود سیوطی کو اس سے اتفاق نہیں تاہم اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات فقہاء نے معمولی مشقت کو بھی "حاجت" کے تحقق اور حکم میں تخفیف اور توسیع کے لیے کافی سمجھا ہے فقہاء کی آراء سامنے رکھی جائیں تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اشخاص و افراد کے لیے جس درجہ کی مشقت کو گوارا کیا گیا ہے، اگر اس سے امت کے اجتماعی حالات متعلق ہو جائیں اور وہ "عموم بلوی" کا درجہ اختیار کرلے تو وہی مشقت احکام میں تخفیف اور سہولت کا باعث بن جاتی ہے، جیسا کہ فقہاء نے ضرورت عامہ کو سامنے رکھ کر "خیار نقد ثمن" "خیار غبن فاحش اور بعض مشائخ بلخ و بخارا نے بیع بالوفاء کے جواز کا فتویٰ دیا ہے[2]۔ اسی طرح خلاف قیاس بعض فقہاء نے "ضمان درک" کو جائز رکھا ہے[3] ——— یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ افراد و اشخاص کے لیے بھی حاجت اور مشقت کو کوئی ایسا بے لچک پیمانہ نہیں رکھا جا سکتا جو سب کے لیے مساوی ہو بلکہ لوگوں کے حالات، عادات اور مختلف علاقوں کے عرف و رواجات اور ضروریات کو سامنے رکھ کر ہی حاجت اور مشقت کا تعین کرنا ہوگا، فقہاء کے یہاں اس کی نظیریں موجود ہیں، مثلاً حاجی کے لیے زاد و راحلہ کا مسئلہ ہے، ابن ہمام نے لکھا ہے "یعتبر فی حق کل انسان مایصلح معه بدنه، اسی طرح کی بات نفقہ وغیرہ کے متعلق فقہاء نے لکھی ہے ——— پس اس سے اصولی طور پر یہ بات منقح ہوتی ہے کہ:

(الف) عام حالات میں محض معیار زندگی کی بلندی اور خوب سے خوب تر کی تلاش کے پیش نظر سودی قرض لینا جائز نہیں۔

(ب) ضرورت یعنی ایسے حالات میں جب کہ کھانے، کپڑے، علاج وغیرہ کی بنیادی ضروریات

---

[1] - الاشباہ والنظائر للسیوطی، ۱۸۱۔ [2] - الاشباہ مع الحموی ۱/۲۵۷۔

[3] - الاشباہ والنظائر للسیوطی، ۱۸۰۔

کی فراہمی کے لیے سودی قرض کے سوا چارہ نہ رہے اور فاقہ مستی کی نوبت ہو تو سودی قرض لینا جائز ہے۔

(ج) حاجت کے تحت بھی یعنی جب سودی قرض نہ لینے کی شکل میں شدید مشقت یا ضرر کا اندیشہ ہو تو بھی سودی قرض لینے کی گنجائش ہوگی، جیسے غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کے لیے اس پر مجبور ہو یا انکم ٹیکس وغیرہ کے ناواجبی قانون سے بچنے کے لیے ایک قانونی ضرورت بن گئی ہو۔

(د) مشقت کے معاملہ میں ایسی صورتوں میں جو اجتماعی بن گئی ہوں، نسبتاً زیادہ تخفیف برتی جا سکتی ہے۔

(ہ) اشخاص و افراد کے لیے سودی قرض کب حاجت بن جاتا ہے اور کب نہیں؟ اس کا اندازہ ان کے شخصی حالات اور ان کے علاقے اور خاندان کے معیار زندگی سے کیا جائیگا۔

ساتویں سوال کا جواب
ترقیاتی قرضے

جیسا کہ معلوم ہوا ہے کہ ایسے ترقیاتی قرضوں میں اصل مقصود نفع کمانا نہیں ہوتا بلکہ عوام کے لیے بنیادی ضروریات اور روزگار کی فراہمی مقصود ہوتی ہے، اس لیے اگر اس پر دیے جانے والے قرضے کو دفتری اخراجات اور ضروریات پر محمول کیا جائے تو مناسب محسوس ہوتا ہے، جیسا کہ مولانا مفتی نظام الدین صاحب حال مفتی دارالعلوم دیوبند کا رجحان ہے[1] ـــــ تاہم یہ بات اس لیے تشفی بخش نہیں معلوم ہوتی ہے کہ سودی قرضوں پر وصول کی جانے والی شرح قرض کی مقدار کے لحاظ سے اور اسی تناسب سے کم و بیش ہوتی ہے۔ اگر یہ دفتری اجرت ہوتی تو ضرور تھا کہ یہ فرق نہ پایا جاتا کیونکہ رقم پچاس ہزار ہو یا پانچ ہزار دفتری کارروائی میں وقت اور محنت یکساں لگتی ہے ـــــ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کو رشوت والے مسئلہ پر ایک درجہ میں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ رشوت دینے والا بھی اپنے ایک حق جائز کو حاصل کرنے کے لیے رشوت دیتا ہے اور سودی قرض لینے والا بھی سرکاری خزانوں پر اپنے حق فرض کی وصولی کے لیے سود

---

[1] - نظام الفتاویٰ ج ۱،

دینے پر مجبور ہے تاہم چونکہ ان دونوں حقوق میں بہت تفاوت ہے اس لیے کہ حکومت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مرفہ الحال لوگوں کو مزید معاشی خوشحالی کے لیے قرض دیتی چلی جائے، اس لیے اس قرض کو بھی ایسی صورت کے ساتھ مشروط رکھا جانا چاہیے کہ کاروبار کا بقا اور تحفظ اس کے بغیر دشوار ہو جائے۔

آٹھویں سوال کا جواب

سود کا تحقق اس وقت ہوگا جب ایک طرف سے ایسا "فضل" ہو کہ دوسری طرف سے اس کا کوئی عوض نہ ہو۔ لہٰذا یہ صورت سود میں داخل نہ ہوگی۔

نویں سوال کا جواب

غیر ملکی درآمدات برآمدات پر سود

ربا قرض پر نفع حاصل کرنے کا نام ہے مذکورہ صورت میں مثلاً پانچ سو روپے کی ایک چیز کسی ملک سے چلتی ہے اور دوسرے ملک میں سو روپے کے اضافہ کے ساتھ اس کی قیمت چھ سو روپے ہوگی اور اس دوسرے ملک میں خریدار نے چھ سو روپے میں حاصل کر لیا تو یہ میرے نزدیک اس سامان کی اصل قیمت ہے، سود نہیں، کیونکہ پہلے دیئے ہوئے کسی قرض پر نفع نہیں ہے، اسی طرح جو مال باہر بھیجا جائے اس کی قیمت اندرون ملک پانچ سو مخصص ہو اور بیرون ملک چھ سو میں وصول کیا جائے تو یہ بائع کی طرف سے زیادۃ فی الثمن ہے، نہ کہ سود۔

دسویں سوال کا جواب

سرکاری بنک میں چونکہ ایک جہت یہ ہے کہ اس پر تمام جمہور کا حق ہے ایک درجہ میں قرض حاصل کرنے کا بھی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے امام کو بیت المال سے قرض دینے کا حق دیا ہے[1] اس لیے اس سے سودی قرض حاصل کرنے کا معاملہ دوسرے بنکوں کے

---

[1] تبیین الحقائق ۳/ ۲۰۷۔

مقابلے میں نسبتاً خفیف اور کمتر ہے۔

گیارھویں سوال کا جواب

ہاں اگر سرمایہ کار قرض خواہ کی توجہ دور کرتا ہے اور اضافہ کے ساتھ واپس لیتا ہے تب تو یہ سود ہی ہے، پس اگر ٹرک کا حصول اس کے لیے حاجت کا درجہ رکھتا ہو اور انکم ٹیکس کے قانون سے بچنے کے لیے سودی قرض حاصل کرنا پڑے یا قانونی طور پر حصول کے لیے بھی رشوت دینی پڑے، تو اس کی اجازت ہونی چاہیے —— نیز اگر سرمایہ کار براہ راست مالکان ٹرک کو قیمت ادا کرے اور قبضہ کرکے خریدار کے حوالہ کرے تب تو یہ معاملہ سود میں داخل نہ ہوگا۔" بیع مرابحہ" کے قبیل سے ہوگا۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

جواب ضمیمہ سوالات ۲ء

۱۔ مذکورہ صورت میں صورت حال یہ ہے کہ مالکان اراضی کو حکومت نے ابتداءً جو قیمت ادا کی ہے وہ اس کے بحیثیت "ثمن" قبول کرنے پر راضی نہیں ہے، اس لیے ثمن ابھی متعین ہی نہیں ہوتی ہے، عدالت جس وقت رقم کا تعین کرتی ہے ادائیگی کا حکم دیتی ہے، اسی وقت دراصل ثمن مقرر ہوتی ہے —— لہٰذا خیال ہے کہ عدالت نے جو رقم مقرر کی اور اس پر جو شرح سود عائد کیا ہے، ان سب کے مجموعہ کو "ثمن" تصور کیا جائے اور اس کو جائز سمجھا جائے۔

۲۔ " زرعی ترقیاتی قرضوں" کی جو صورت لکھی گئی ہے، فقہی اعتبار سے اس پر شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اجرت کے لیے فقہاء کے نزدیک اجرت کی قطعی مقدار کا متعین ہوجانا ضروری ہے اس کے بغیر اجرت مجہول اور غیر متعین تصور کی جاتی ہے، اور چونکہ ایسی صورت میں عام طور پر نزاع پیدا ہوجاتی ہے اس لیے احتیاطاً فقہاء اس صورت کو منع کرتے ہیں، تاہم ایسی جہالت اور عدم تعیین اگر معاشرہ میں مروج ہوجائے اور باعث نزاع نہ بنتی ہو تو اس کو بھی گوارا کیا جا سکتا ہے، اس سلسلہ میں خاتم المحدثین علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی یہ تحریر خصوصیت سے لائق مطالعہ ہے۔

"وقد یکون الفساد لمخافۃ التنازع" کبھی نزاع کے اندیشے سے معاملہ فاسد ہوتا ہے

ولا يكون فيه شيئ آخر يوجب الاثم فذلك ان لم يقع فيه التنازع جاز عندي ديانة وان بقي فاسدا قضاءً لارتفاع علة الفساد وهي المنازعة[1]

لیکن اس میں کوئی دوسرا سبب گناہ نہیں ہوتا ایسے معاملات میں اگر نزاع کی نوبت نہ آئے تو میرے نزدیک دیانۃً یہ معاملہ جائز رہے گا گو قضاءً فاسد رہے گی، کیونکہ فساد کی اصل علت یعنی نزاع نہیں پائی گئی۔

لیکن مشکل ہے کہ قرض کی مقدار پر اس کے تناسب سے اجرت کا حصول اور مدت ادائیگی میں اضافہ کے ساتھ اس پر اضافہ اپنی ظاہری شکل کے لحاظ سے بعینہٖ سود ہے، اور بظاہر کوئی مناسب تاویل نظر نہیں آتی، اس لیے یہ ہے تو سود ہی، البتہ عام اصول کے مطابق بوقت "خافت" استفادہ کیا جا سکتا ہے، اور چونکہ یہ اسکیم حکومت کی طرف سے ہے، اس لیے بہ نسبت پرائیوٹ کمپنیوں کے اس سے استفادہ کا معاملہ خفیف ہے۔

۳۔ کسی اضافہ کے سود ہونے اور نہ ہونے اور اس کی وجہ سے حرمت وحلت کا تعلق تنہا لینے والے کی نیت سے نہیں ہے، بلکہ دینے والے کی نیت اور معاملہ کی ظاہری صورت سے بھی ہے اس لیے یہ صورت سود ہی کے حکم میں ہے اور ناجائز ہے۔

۴۔ مذکورہ صورت میں ۱۹۶۵ء کی رقم کی مدت خرید میں ۲۴ سال کی مدت میں جو کمی واقع ہوئی ہے اور جس کا اندازہ سونے کی قیمت میں تفاوت سے کیا جا سکتا ہے، اتنی مقدار اس کے لیے جائز ہوگی، ۶ فیصد سالانہ کی شرح سود کا جتنا حصہ اس سے زیادہ ہو وہ سود ہی کے حکم میں ہے، اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو "بنک انٹرسٹ" کا ہے۔

هذا ما عندي والله اعلم۔

---

[1] ۔ فیض الباری ۳/۲۵۸، کتاب البیوع ۔

موجودہ سودی بینکنگ نظام
اور
معاشی مسائل کا حل

از ———— حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

موجودہ دور میں لین دین اور تجارتی معاملات بڑی حد تک سُود پر چل رہے ہیں کیونکہ تجارت و زراعت کا انحصار عام طور پر بینکوں پر ہو گیا ہے۔ جو تمام کے تمام سودی کاروبار پر مبنی ہیں۔ حکومت کے ترقیاتی منصوبوں میں عوام کی ترقی و خوشحالی کے لیے بہت سے شعبے قائم کیے گئے ہیں جس کے ذریعہ بینک قرض دیتا ہے اور اس پر برائے نام سود وصول کرتا ہے۔ چھوٹی صنعتوں سے لیکر بڑے بڑے فیکٹری پلانٹوں تک میں حکومت قرض دیتی ہے اور غیر مسلم اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اقتصادی میدان میں ترقی کر رہے ہیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے اہم مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر مسلمان بینک کے ترقیاتی منصوبوں سے فائدہ اٹھاتا ہے تو سود کی لعنت اس کے لیے رکاوٹ کا باعث بنتی ہے اور اگر اس سے دُور رہنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی اقتصادی و معاشی زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان ہی پیچیدگیوں کو سامنے رکھ کر اسلامی فقہ اکیڈمی کے پیش کردہ سوالات کا نمبروار جواب تحریر کیا جا رہا ہے۔

(۱)

(الف) ربوا کی تعریف

اموالِ ربویہ معصوم متقوم واجب الضمان میں عقدِ معاوضہ کیا جائے اور کسی ایک جانب زیادتی ہو تو اس کو ربوا کہتے ہیں۔ اور بعض علماء نے یہ تعریف کی ہے کہ وہ حقیقی یا حکمی زیادتی جو

معاوضات میں کسی عوض کے بغیر مشروط ہو۔ مثلاً چاندی کا ایک روپیہ دے کر اس کے عوض میں چاندی کے دو روپے لیے جائیں تو اس میں حقیقی زیادتی پائی جاتی ہے۔ اور چاندی کے عوض چاندی برابر مگر اُدھار فروخت کی جائے تو اس میں حکمی زیادتی پائی جاتی ہے۔ اور قرض انتہار کے لحاظ سے معاوضہ ہے۔ لہٰذا اس میں نفع لینا حرام ہے۔ اور ہدیہ وغیرہ میں معاوضہ وغیرہ کا ذکر نہیں ہوتا اس لیے وہاں زیادتی حلال ہے اور بغیر شرط کے کچھ لیا دیا جائے۔ اس کا ربوا سے کوئی تعلق نہیں وہ احسان و تبرع ہے۔

(ب) ربوا کا دائرہ

یوں تو منصوص طریقہ پر چھ چیزوں کے ہم جنس لین دین کے بارے میں کمی زیادتی یا اُدھار معاملہ ہونے پر حدیث میں صراحت کے ساتھ حکم لگایا گیا ہے۔[1]

سونا سونے کے بدلہ میں، چاندی چاندی کے بدلہ میں، گیہوں گیہوں کے بدلہ میں، جَو جَو کے بدلہ میں، چھوارا چھوارے کے بدلہ میں، نمک نمک کے بدلہ میں لیا دیا جائے تو دونوں طرف برابر ہونا ضروری ہے اور ہاتھ در ہاتھ یعنی نقد معاملہ ہونا ضروری ہے کسی ایک طرف کمی یا زیادتی ہوگئی یا اُدھار معاملہ کر لیا تو یہ دونوں صورتیں ربوا کی ہو جائیں گی۔[2]

جس نے زیادہ دیا یا زیادہ مانگا اس نے سود کھایا۔ اور اس میں زیادہ لینے والا اور دینے والا دونوں سود کے گناہ میں برابر شریک ہوں گے۔ الآخذ والمعطی فیہ سواء۔

لیکن ائمہ مجتہدین نے اشیاء مذکورہ سے علت کا استنباط کر کے دوسری اشیاء میں بھی ربوا کا حکم جاری فرمایا ہے۔ حضرات شوافع رحمہم اللہ نے کھائی جانے والی چیزوں میں طعم اور نقود میں ثمنیت کو علت قرار دیا ہے۔ حضرات موالک رحمہم اللہ نے قوت اور ادّخار کو علت مانا ہے۔ حضرات احناف علیہم الرحمۃ کے نزدیک قدر اور جنس علت ہے۔ قدر سے مراد وہ چیزیں ہیں جو کیل کر کے یا وزن کر کے بکتی ہیں۔ یعنی خرید و فروخت میں دونوں جانب کیلی یا دونوں جانب

---

[1] الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل یداً بید۔

[2] فمن زاد أو استزاد فقد ربا۔

وزنی ہوں یا دونوں طرف جنس بھی ایک ہو یعنی ایک طرف گیہوں ہوں تو دوسری طرف بھی گیہوں ہوں۔ پس جس وقت قدر اور جنس ہر دو میں اتحاد ہوگا تو برابری اور نقد ہونا ضروری ہے۔ ورنہ سُود ہو جائے گا۔

اگر بدلین کے درمیان قدر اور جنس میں اتحاد نہیں مثلاً صرف قدر میں اتحاد ہو لیکن جنس دونوں کی مختلف ہوں جیسے جَو کی بیع گیہوں کے ساتھ کہ یہ دونوں کیلی ہیں مگر جنس میں اختلاف ہے۔ یا صرف جنس میں اتحاد ہو اور وہ دونوں قدری نہ ہوں جیسے کپڑے کی بیع کپڑے کے ساتھ تو ان دونوں صورتوں میں نقد معاملا کرنا کمی بیشی کے ساتھ جائز لیکن ادھار ناجائز اور ربوا ہے[1]

اور جہاں قدر اور جنس میں سے کوئی ایک چیز بھی نہ پائی جائے جیسے کپڑا چائے کے ساتھ فروخت کیا تو وہاں ربوا کی کوئی صورت نہیں پائی جائے گی کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا اور ادھار بیچنا دونوں طرح درست ہے۔

علاوہ ازیں ربوا کا دائرہ کچھ اور بھی پھیلا ہوا ہے۔ مثلاً قرضدار اپنے قرض خواہ کو کچھ ماہانہ یا روزانہ (علاوہ ادائیگی قرض) یا کوئی مقدار شرط کے مطابق دے۔ یا اس شرط پر سو روپے قرض دے کریں ۱۱۰ (ایک سو دس) روپے وصول کروں گا تو یہ بھی کل قرض جر نفعا فھو ربوا کے تحت ربوا ہوگا۔ اسی طرح مرتہن اگر راہن سے کچھ پائے یا شئی مرہون سے فائدہ اٹھائے تو یہ بھی ربوا ہے۔ نیز ایک شریک (پارٹنر) دوسرے شریک کا نفع متعین کر دے اور تمام فوائد اور نقصانات کا خود مستحق بن جائے تو یہ صورت بھی ربوا میں داخل ہوگی۔ بیوع فاسدہ میں بھی ربوا کی صورت پائی جاتی ہے۔ مقروض اگر قرض کے دباؤ میں کوئی ہدیہ پیش کرے یا کوئی منفعت کی چیز پیش کرے تو اس کا قبول کرنا بھی ربوا میں شامل ہے۔

(۲)

دارالحرب میں سُودی معاملات

یہ مسئلہ ہمارے ائمہ احناف کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ دارالحرب میں کافروں سے جو معاہد نہ ہوں اور اس حربی سے جو مسلمان ہو کر

---

[1] فاذا اختلف الاجناس فبیعوا کیف شئتم اذا کان یدا بید۔

دار الحرب میں رہتا ہو اور دار الاسلام کی طرف ہجرت نہ کرے ایسے لوگوں سے سود لینا ان کی رضامندی سے بغیر کسی غدر اور خیانت کے مُباح ہے۔ نیز اس کے علاوہ تمام عقود فاسدہ اور قمار کے ذریعہ حاصل شدہ مال بھی لینے کی گنجائش ہے۔ لیکن مال کی اباحت سے عقود فاسدہ و باطلہ و قمار کا معاملہ کرنے کی اباحت ثابت نہیں بلکہ اس عقد کے باعث وہ گنہگار ہو گا۔ المسلم ملتزم بحکم الاسلام حیث مایکون۔ چنانچہ خیانت، دھوکہ، رشوت، ذخیرہ اندوزی، قمار وغیرہ کا معاملہ کرنا معصیت سے خالی نہیں۔ لیکن اگر ایسا کر لیا تو حاصل شدہ رقم مُباح رہے گی۔ (شامی ج ۲)

اور علامہ شامی نے کافی کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ اگر دار الحرب میں حربیوں کے ہاتھ ایک درہم دے کر دو درہم کے عوض نقد ہو یا ادھار جس طرح بھی بیع کی، خمر، خنزیر یا میتہ کے عوض بیع کی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ دار الحرب میں مسلمان کے لیے حربیوں کا مال ان کی رضا سے لینا درست ہے۔[1]

جس قدر نصوص آئی ہیں وہ سب مال محترم و معصوم کے ساتھ مخصوص ہیں اور دار الحرب میں حربی کا مال محترم و معصوم نہیں ہوتا۔ پس غدر و خیانت اور دھوکہ کے بغیر تمام وجوہ و اسباب سے اس کو حاصل کرنے کی گنجائش ہے۔[2]

---

[1] ۔ لقوله علیه السلام لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب۔ قال فی الهدایة لان مالهم مباح فی دارهم فبأیّ طریق اخذه المسلم اخذ مالا مباحا اذا لم یکن فیه غدر بخلاف المستأمن منهم لان ماله صار محظورا بعقد الامان (هدایة ج ۲ ص ۸۶)
وفی کافی للحاکم وبایعهم الدرهم بدرهمین نقدًا او نسیئةً او بایعهم بالخمر والخنزیر والمیتة فلا بأس لان له ان یاخذ اموالهم برضاهم فی قولهما — ولا یجوز شیئ من ذلك فی قول ابی یوسفؒ (شامی ج ۲ ص ۳۵۴ باب المستامن)
وفی شرح السیر الکبیر — ثم قد علم ان الربوا لا یجری بین المسلم والحربی فی دار الحرب (ج ۳ ص ۱۱۲) — ولو کان المسلم فی منفعة المسلمین فکلم الحربی من حصنه وعامله بهذه المعاملات الفاسدة فیما بین المسلمین فان ذلك لا یجوز۔ وقد بینّا ان کثیرًا من مشائخنا یقولون بالجواز ههنا لان مال الحربی مباح فی حق المسلم (شرح سیر کبیر ج ۳ ص ۲۳۶)

[2] ۔ المطلقات یراد بما لها المال المحظور بحق مالکه ومال الحربی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن امام ابویوسف اور ائمہ ثلاثہؒ یہ فرماتے ہیں کہ دارالحرب میں کسی مسلم اصلی سے یا ذمی سے یا اس حربی سے (جو اسلام لاکر ہجرت کے بعد دارالحرب کی طرف لوٹ گیا ہو) سود لینا یا کسی کو سود دینا بالاتفاق حرام ہے لقولہ تعالیٰ یایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وذروا مابقی من الربوا ان کنتم مؤمنین۔ دوسری آیت میں ہے وما اٰتیتم من ربًا لیربو فی اموال الناس الخ تیسری آیت میں ہے ولا تمنن تستکثر چوتھی آیت میں ہے واحل اللہ البیع وحرم الربوا۔ یہ قرآنی آیات قطعی اور عام ہیں جو ہر زمان ومکان کے لیے ہیں۔

سود کی حرمت چونکہ نص قطعی سے ثابت ہے احل اللہ البیع وحرم الربوا۔ اور جو شخص سود سے احتراز نہ کرے اس کے متعلق اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان و اشتہار ہے فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ۔ علاوہ ازیں امام اعظم ابوحنیفہؒ نے لاتاکلوا الربوا والی آیت کو قرآن کی سب سے زیادہ خوفناک آیت فرمایا ہے جیسا کہ صاحب مدارک التنزیل علامہ نسفیؒ نے لکھا ہے کان ابوحنیفۃ رضی اللہ عنہ یقول ھی اخوف آیۃ فی القرآن حیث وعد اللہ المؤمنین بالنار المعدۃ للکافرین ان لم یتقوہ فی اجتناب محارمہ (مدارک التنزیل ج ۱ ص ۱۴۱) سود کھانے والے، کھلانے والے، سودی کھاتہ لکھنے والے، اس کی گواہی دینے والے سب پر لعنت آئی ہے۔ ان کا حشر آسیبی اور پاگلوں کی طرح بتایا گیا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر احتیاط اسی میں ہے کہ حضرت امام ابویوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ کے قول کو اختیار کیا جائے اور حضرات طرفین کے قول پر مطلقاً سود لینے کی اجازت نہ دی جائے۔ نیز جب کفار بنی اسرائیل کے لیے واخذھم الربوا وقد نھوا عنہ کہ کر ممانعت کی گئی اور نجران کے کفار کے ساتھ مالم یحدثوا حدثا اویاکلوا الربوا کی شرط لگا کر صلح کی گئی تو مسلمانوں کے لیے سود لینا کیونکر حلال ہو سکتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم ہند نے بھی دارالحرب میں کافر حربی غیر معاہد سے سود لینے کی اباحت کا قول لکھنے کے بعد عام طور پر سود لینے کے جواز کا فتویٰ دینے سے منع فرمایا ہے۔

باقی رہا دارالحرب میں سود دینے کا مسئلہ۔ تو سود دینا نہ تو حضرات طرفین کے یہاں

(بقیہ حاشیہ صــــ) لیس بمحظور الالتوقی العذر ونحوذلک فی البنایۃ شرح الھدایۃ للعینی ص ۷۵۰۔

جائز ہے نہ حضرت امام ابویوسف اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز ہے۔ بلکہ سب ہی ائمہ کرام کے نزدیک بالاتفاق سُود دینا ناجائز اور حرام ہے جیسا کہ منحۃ الخالق ج ۶ ص ۱۲۶ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے[1]

(۳)

دارالحرب اور دارالاسلام

وہ ملک جس میں امام المسلمین کا حکم جاری و نافذ ہو اور اس کی قوت قہریہ کے تحت ملکی نظام چلتا ہو تو اس ملک کو دارالاسلام کہا جائے گا۔ اور اگر اس میں کافروں کے بڑوں کا حکم جاری ہو اور اقتدار اعلیٰ کافر کو حاصل ہو اور اس کی قوتِ قہریہ کے تحت ملک کا نظام چلتا ہو تو وہ ملک دارالحرب ہے۔

اور جامع الرموز میں ہے کہ دارالحرب وہ کہلاتا ہے جس میں مسلمان کافروں سے خوفزدہ ہوں خواہ اس میں مسلمان اور ذمی پہلے امان کے ساتھ مامون ہوں یا نہ ہوں۔ خواہ اسلام کے بعض شعائر ادا ہو رہے ہوں یا نہ ادا ہو رہے ہوں۔ اسی طرح کفر کے شعائر اعلانیہ ادا کیے جارہے ہوں یا نہ ادا کیے جارہے ہوں[2]

---

[1] فالظاهر ان الاباحة تفيد نيل المسلم الزيادة وقد الزم اصحاب الدرس ان مرادهم من حِلِ الربوا والقمار ما اذا حصلت الزيادة للمسلم نظرًا الى العلة وان كان اطلاق الجواب خلافه والله تعالىٰ اعلم ۔ (منحة الخالق ج ۶ ص ۱۲۶)

[2] وفي الكافي ان المراد بدار الاسلام بلاد يجري فيها حكم امام المسلمين ويكون تحت قهره ۔ وبدار الحرب بلاد يجري فيها امر عظيمها وتكون تحت قهره ۔ وفي جامع الرموز دار الحرب ماخافوا فيه من الكافرين وقال في المفتيين اذا اجروا فيها احكام الشرك فانها تصير دار الحرب سواء كانت متصلة بدار الحرب اولم تكن يبقى فيه مسلم او ذمي آمنًا بالامان الاول اولم يبق — وقال بعضهم ان لايبقى فيه مسلم ولا ذمي آمنًا بالامان السابق سواء ترك بعض شعائر الاسلام اولا وسواء اعلن شعائر الكفر اولا — وقال بعضهم اجرى اهل الحرب في بلدة من بلاد اهل الاسلام (بقيه حاشيه اگلے صفحه پر)

بہرحال کسی شہر یا ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کا مدار محض غلبہ وشوکت اور نظامِ احکام پر ہے اگر وہاں مسلمانوں کا غلبہ ہے تو وہ دارالاسلام ہے اور کفار ومشرکین کا غلبہ ہے تو وہ دارالحرب ہے۔ اگر کسی جگہ مسلمان بھی رہتے ہوں لیکن انھیں اقتدار اعلیٰ اور غلبہ وشوکت حاصل نہ ہو تو اسے دارالاسلام نہیں کہہ سکتے۔ ورنہ جرمنی، فرانس، روس اور چین کو بھی دارالاسلام کہا جائیگا۔ اسی طرح جمعہ وعیدین کفار ومشرکین کی اجازت سے ادا کیے جانے پر بھی اسے دارالاسلام نہیں کہیں گے۔ جس طرح دارالاسلام میں ذمی کفار اپنی تمام رسوم آزادی سے ادا کریں تو اسے دارالحرب نہیں کہیں گے۔ دارالحرب میں اگر حقیقۃً مسلمانوں کی جان و مال اور دین محفوظ ہو تو وہ دارالحرب ہوتے ہوئے دارالامان بھی کہا جاسکتا ہے۔ دارالحرب والوں سے صلح ومسالمت شرعاً جائز ہے اور مسالمت کی صورت میں امن قائم رکھنا ضروری ہوجاتا ہے۔ اس بنیاد پر اسے دارالامان کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ هكذا يستفاد من ردالمحتار باب الاستيمان۔

(۴)

موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت

مذکورہ بالا تعریف کی بنیاد پر بہت سے علماء کرام اور مشائخ عظام نے انگریزی دور میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا ہے جیسے حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، حضرت مولانا فضل حق خیرآبادیؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا غلام دستگیر قصوریؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ وغیرہم۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اسلامی احکام بطور غلبہ یہاں جاری نہیں ہیں بلکہ محکومانہ اور عاجزانہ اسلامی احکام پر عمل ہو رہا ہے۔ یہاں اقتدار اعلیٰ نصاریٰ کو حاصل ہے اور دارالحرب کے جس قدر شرائط فقہاء نے بیان کیے ہیں وہ سب یہاں پائے جاتے ہیں۔ یہاں عدل وانصاف، جان و مال کا تحفظ اور مذہبی آزادی نہیں ہے کفر کو شان وشوکت

(بقیہ حاشیہ ص) احکام اهل الحرب تصیر دارالحرب کیف ماکان (فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۲ ص ۵۸۴ خط کشیدہ تعریف کو شاہ عبدالعزیزؒ نے راجح قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۱۱۶)

اورغلبہ حاصل ہے۔ اسلام کا پرچم سرنگوں اور کفر کا پرچم بلند ہے۔ جب انگریزی دَور کے ہندوستان کو ان حضرات نے دارالحرب قرار دیا تو آج کا موجودہ ہندوستان انگریزی دَور کے مقابلہ میں بدسے بدتر ہے۔ دوڈھائی ہزار فرقہ وارانہ فسادات اور حکومت کا ایک فریق بن کر مسلمانوں کی نسل کشی اس کی بین دلیل ہے۔ قدم قدم پر بے جا تعصب اور اہانت وتذلیل کا بازار بھی واضح مثال ہے۔ یہ بدرجۂ اولیٰ ان حضرات کے یہاں دارالحرب کہلانے کا مستحق ہے۔

علمائے کرام کا دوسرا طبقہ وہ ہے جنھوں نے انگریزی دَور میں ہندوستان کی حیثیت دارالاسلام کی قرار دی ہے جیسے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی، حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی وغیرہم۔ یہ حضرات اکابر یہ دلیل پیش فرماتے ہیں کہ ہندوستان انگریزوں کی عملداری سے پہلے متفق علیہ طور پر دارالاسلام رہا ہے۔ یعنی ساڑھے چھ سو سال تک یہاں مسلمانوں کی حکومت اور انھیں اقتدار اعلیٰ حاصل رہا ہے۔ غیر مسلم یہاں ذمی کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اب دارالاسلام کن چیزوں سے دارالحرب ہوتا ہے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ جب وہاں حسب ذیل تین چیزیں پائی جائیں تو دارالاسلام پر دارالحرب کا اطلاق ہوگا ورنہ وہ دارالاسلام ہی رہے گا۔[1]

---

[1] لا یصیر دارالاسلام دار حرب الا بامور ثلاثۃ باجراء احکام اہل الشرک۔ و باتصالہا بدارالحرب و بان لا یبقیٰ فیہا مسلم او ذمی آمنًا بالامان الاول علی نفسہ (درمختار) وقالا بشرط واحد لا غیر وہو اظہار حکم الکفر وہو القیاس (عالمگیری و شامی) وظاہرہ انہ لو اجریت احکام المسلمین و احکام اہل الشرک لا یکون دارالحرب (شامی) وفی سیر الاصل لا فی البشر ان دار الاسلام لا تصیر دارالحرب مالم یبطل جمیع ما صارت بہ دار الاسلام لان الحکم اذا ثبت لعلۃ فما بقی من العلۃ شیئ یبقی ببقائہ۔ وفی المنشور۔ دار الاسلام باجراء احکام الاسلام فما بقی علاقۃ من علائق الاسلام یترجح جانب الاسلام و ذکر الحلوانی انہ انما یصیر دارالحرب باجراء احکام الکفر وان لا یحکم فیہا بحکم من احکام الاسلام وان یتصل بدار الحرب وان لا یبقی مسلم ولا ذمی آمنًا بالامان الاول فاذا وجدت الشرائط کلہا صارت دارالحرب وعند تعارض الدلائل و الشرائط یبقی ما کان او یترجح جانب الاسلام احتیاطًا (رد المحتار ص)

۱ - اہل شرک کے احکام اس طرح جاری ہوں کہ اسلام کے احکام میں سے کوئی حکم وہاں باقی نہ رہے۔

۲ - اس کے متصل (پڑوسی ملک) دارالحرب ہو۔

۳ - وہاں کوئی مسلمان یا ذمی امان اول کے ساتھ باقی نہ رہے۔

حضرات صاحبین کے نزدیک فقط کفر کے احکام کے ظہور وشیوع سے وہ دارالحرب بن جاتا ہے اور علامہ استروشی نے اپنی فصول میں ابوالیسر سے نقل کیا ہے کہ دارالاسلام اس وقت تک دارالحرب نہ ہوگا جب تک کہ وہ سب امور باطل نہ ہوجائیں جن کی جہت سے وہ دارالاسلام ہوا تھا اور علامہ اسبیجابی نے اپنی مبسوط میں اسی طرح ذکر کیا ہے اور امام ناصرالدین نے منشور میں لکھا ہے کہ دارالاسلام چونکہ احکام اسلام کے جاری ہونے کے سبب سے دارالاسلام ہوا ہے۔ اس لیے جب تک اسلام کے متعلقات میں سے کوئی چیز باقی رہے گی جانب اسلام کو ترجیح دی جائے گی۔ (کذا فی حاشیہ الطحطاوی) رہا اتصال کا مسئلہ تو ہندوستان کو بعض جانب سے دارالحرب کے ساتھ اتصال ہے اور بعض جانب سے دارالاسلام کے ساتھ اتصال ہے۔ غرض مکمل اتصال اس کو دارالحرب کے ساتھ نہیں ہے۔ اور یہاں جس طرح کفر کے احکام جاری ہیں۔ اسلام کے احکام روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج، قربانی، جمعہ وعیدین، مدارس ومساجد کی تعمیر، دینی جلسے وغیرہ امور بھی جاری ہیں اور ان امور کے جاری ہونے سے اسے دارالاسلام کا ہی حکم دیا جائے گا[۱]

مجموعۃ الفتاوی ج ۱ ص ۲۴۶ میں ہے۔

"لیکن بلاد ہند جو قبضہ نصاریٰ میں ہے دارالحرب نہیں ہے ان میں کافر سے سود لینا جائز نہیں ہے۔"

اور اسی کتاب کے ج ۲ ص ۱۷۰ میں ہے۔

"ہندوستان دارالحرب نہیں ہے بلکہ دارالاسلام ہے۔ چنانچہ ان عبارات فقہیہ سے واضح ہوتا ہے، الی قولہ پس یہ بلاد (ہند) دارالحرب نہ ہوں گے نہ بمذہب امام نہ بمذہب صاحبین۔"

اور اسی کتاب کے ج ۲، ص ۲۴۵ میں ہے۔

۱۰۔ کما فی الدر المختار ودار الحرب یصیر دار الاسلام باجراء احکام اھل الاسلام فیھا کجمعۃ وعید ان بقی فیھا کافر اصلی وان لم یتصل بدار الاسلام (در)

" والصحیح انہ (ای ملک الانجلیز دارالاسلام ولم یصر دارالحرب الی الآن)"۔

حضرت مولانا عبدالباریؒ نے اپنی تائید میں نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی کی عبارت "مجموعہ رسائل ہجرت و قربانی گاؤ" صـ۳۳ میں اس طرح نقل فرمائی ہے۔

"ہندوستان ٹونا و ریاستِ اسلامیہ خصوصًا نزد امام اعظم دارالحرب نیست الی قولہ فی الحال مختار و فتوی مشاہیر فقہاء حنفیہ ہند مثل علماء دہلی و رام پور و بھوپال ہمیں است کہ ملکت ہند خصوصًا ریاستہائے اسلامیہ آں دارالاسلام است نہ دارالحرب۔ بعض معاصرین نوشتہ اند الاحتیاط ان نجعل ھذہ البلاد دارالاسلام وان کانت السلاطین فی الظاھر ھؤلاء الشیاطین و اللہ اعلم"۔

بعض علمائے محققین کی یہ تحقیق ہے کہ ہندوستان من کل الوجوہ نہ دارالحرب ہے نہ دار الاسلام بلکہ بین بین ہے جیسا کہ حبشہ تھا کیونکہ حبشہ اگر دارالحرب ہوتا تو وہاں جانے کا نام ہجرت نہ ہوتا۔ اور اگر دارالاسلام ہوتا تو وہاں سے آنے کا نام ہجرت نہ ہوتا۔ دونوں حیثیتوں سے دونوں ہجرتیں صحیح قرار دی گئی ہیں اور اس قسم کے لوگ اصحاب الہجرتین کہلاتے ہیں واللہ اعلم۔

مگر یہ قول زیادہ قوی نہیں معلوم ہوتا کیونکہ حبشہ دارالحرب ہوا اور امن کی وجہ سے وہاں ہجرت ہوئی ہو پھر وہاں سے مدینہ دارالاسلام کی طرف ہجرت ہوئی اس لیے انھیں ذوالہجرتین کہا گیا۔

غرض ان حضرات اکابر کے قول کے مطابق موجودہ ہندوستان بھی دارالاسلام ہے کیونکہ اسلامی احکام اب بھی بہت سے جاری ہیں۔

(۵)

بینک سے سودی رقم لینے کا شرعی حکم

پہلے ص۲ میں "دارالحرب میں سودی معاملات" کے عنوان کے تحت مفصل بحث آچکی ہے کہ جو علماء و مشائخ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک بینک سے سُود لینے کی گنجائش ہوگی اور جو اکابر اسے دارالاسلام مانتے ہیں ان کے نزدیک بینک سے سُود لینا ناجائز و حرام ہوگا۔ اور اختلاف کی صورت میں احتیاط کرنا یقینًا اولیٰ اور بہتر ہے۔

سرکاری بینکوں میں اور ان بینکوں میں جن کے مالک غیر مسلم ہوں روپے جمع کرنا جائز نہیں وہ لوگ اس روپے سے مالی استفادہ کرتے ہیں اور اس کے منافع کو اسلام اور مسلمانوں کی

تخریب پر خرچ کرتے ہیں نیز ان کے سارے کاروبار سودی لین دین پر چلتے ہیں لہٰذا ان بینکوں میں روپے جمع کرنا اعانتِ معصیت ہے لیکن آج کے دَور میں جب کہ بڑی رقموں کا گھر پر رکھنا خطرہ سے خالی نہیں۔ انتہائی مجبوری کی حالت میں الضرورات تبیح المحظورات کے تحت صرف بغرض حفاظت بینک میں جمع کرنے کی گنجائش دی گئی ہے۔ لیکن جمع کرنے کے بعد اس کا سود نہ لینا اور بینکوں میں چھوڑ دینا بھی جائز نہیں۔ بعض اکابر کا خیال ہے کہ بینک سے ملی ہوئی سودی رقوم کو مسلمانوں کے یا عام پبلک کے اجتماعی مقاصد اور رفاہی امور میں صرف کر دینا چاہیے جیسے سڑک، پل، مسافر خانہ وغیرہ کی تعمیر میں صرف کر دیا جائے۔ اور یہ حضرات عالمگیری ج۲ ص۲۱ کے اس جزئیہ سے استدلال فرماتے ہیں۔ وما اوجف المسلمون علیہ من اموال اھل الحرب بغیر قتال یصرف فی مصالح المسلمین۔ ونحو ذلک فی رد المحتار ج ۳، ص ۲۵، وشرح السیر الکبیر ص ۱۴، ۱۸۸، ۲۲۴۔

جب کہ دوسرے علماء و اکابر رفاہ عام میں یا مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں خرچ کرنے کو ناجائز قرار دیتے ہیں وہ حضرات فقہاء کے اس اصول کو سامنے رکھتے ہیں کہ بینک سے ملی ہوئی رقم سود، حرام اور مالِ خبیث ہے۔ اور مالِ خبیث میں پہلا درجہ یہ ہے کہ جہاں سے مال خبیث حاصل ہوا ہے اگر مالک یا اس کا وارث موجود ہے تو اس کی طرف واپس کر دیا جائے ورنہ پھر واجب التصدق ہے یعنی بلا نیتِ ثواب اس کے وبال سے بچنے کے لیے انتہائی غریب مفلوک الحال یا مقروض پریشان حال کو بلا کسی عوض دیدیا جائے لہٰذا اس کا اولین مصرف یہ ہے کہ اگر ہمارے اوپر سرکار کی طرف سے کوئی غیر شرعی ٹیکس مثلاً سیل ٹیکس، انکم ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، جنگی ٹیکس، کسٹم ٹیکس، موت ٹیکس، پیدائش ٹیکس وغیرہ لاگو ہو یا گورنمنٹ کے سُود کی ادائیگی ذمہ میں ہو تو اس میں دیدیا جائے تاکہ حکومت کے ٹریزری (خزانہ) میں پہنچ جائے اور مالِ حرام جہاں سے آیا تھا وہیں چلا جائے۔ اور اگر کوئی ایسی صورت نہیں تو پھر فقراء و مساکین پر بلا نیتِ ثواب تصدق کر دی جائے۔ کما فی الفتاوی البزازیۃ — فیرد علی اربابھا ان علموا والا تصدق بہ علی الفقراء (فتاوی بزازیۃ۔ فی ھامش الھندیۃ ج ۶ ص ۳۵۵)

(۶)

بینک کو سود دینا

پہلے تحریر کیا جاچکا ہے کہ دارالحرب میں کافر حربی کو سود دینا بالاتفاق سب ہی ائمہ کرام کے نزدیک ناجائز و حرام ہے جیسا کہ منحۃ الخالق ج ۶، ص ۱۲۶ کی عبارت حوالہ میں آچکی ہے وہاں ص۲۴ پر ملاحظہ کرلی جائے۔ یہی حکم بینک کو بھی سود دینے کا ہوگا۔ البتہ اگر بینک کے واسطے کے بغیر تجارت دشوار ہو جائے اور سرکاری قانونی مجبوریوں میں پھنس جائے اور بغیر سودی قرض لیے کوئی کاروبار کرنا یا کاشت کرنا مشکل ہو جائے جیسا کہ ہندوستان کا حال ہے تو شرعی ضرورت و مجبوری کے تحت مثل رشوت دینے کے اس کی بھی گنجائش ہوگی۔

(۷)

ترقیاتی اسکیموں کے لیے سودی قرض لینا

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مسلمان کی ترقی اور کامیابی قرآن اور حدیث کے احکام کی پابندی اور حرام اور لعنت کے کاموں سے اجتناب میں ہے۔ حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر مال جمع کرنے اور تجارت کو فروغ دینے میں ہرگز مسلمان کی کامیابی اور ترقی نہیں ہے۔ اگر سودی کاروبار سے غیر قومیں اقتصادی میدان میں ترقی کر رہی ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی ان ہی روشں پر چلنے لگیں تو علماء ربانیین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قوم کو اس کے مہلک نتائج سے آگاہ کریں بلا کسی تذبذب کے صاف طور پر بتائیں کہ سودی کاروبار کے ذریعہ مسلمان کبھی ترقی نہیں کرسکتا ہے حدیث پاک میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے۔

ان الربوا وان کثر فان عاقبته تصیر الی قل۔ سود بظاہر زیادہ مقدار میں نظر آتا ہے لیکن اس کا انجام کمی اور بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی طرح سودی کاروبار سے مال بھی محفوظ نہیں رہ سکتا ہے کیونکہ ارشاد ربانی ہے یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات۔ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ آج کے بگڑے ہوئے معاشرے میں اگر دوسری قوموں کی ترقیات سے متاثر ہو کر مسلمان کے لیے مطلقاً حرام کی راہیں کھول دی گئیں تو ہمارا انجام نہایت خطرناک ہوگا۔ علمائے بنی اسرائیل کی طرح ہم لعنت کے مستحق ہوں گے اور ملت

اسلامیہ کو سخت ترین دھکا لگے گا اور بڑے خسارہ کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس سیل رواں میں اگر ہم سب ہی بہ پڑیں تو قہر خداوندی کے مستحق اور اس کی نصرت وحمایت اور نماز ودعا کی قبولیت سے محروم ہوجائیں گے۔ اس لیے نصوص قرآنی اور احادیث نبویہ کی روشنی میں سودی کاروبار کو مسلمان کے مال کی حفاظت یا اس کی ترقی کا ذریعہ تجویز کرنا اور محض سرمایہ دار بننے اور اقتصادی میدان میں ترقی کرنے کے لیے سودی لین دین کی اجازت دینا قطعاً جائز نہیں بلکہ یہ تو قرآن وحدیث کا مقابلہ کرنے کے مرادف ہوگا۔

ہاں فقہائے کرام نے ان مسلمانوں کے لیے جو واقعی غریب اور محتاج ہیں جن کا کام قرض لیے بغیر نہیں چل سکتا اور بغیر سود کے کہیں سے اسے قرض نہیں ملتا۔ اور سودی قرض نہ لینے کی صورت میں اس کی جان وعزت یا اس کے بال بچوں کی جان کی ضیاع اور بے عزتی کا قوی اندیشہ ہے تو شدید ضرورت شرعی اور انتہائی کس مپرسی اور مجبوری کی حالت میں جزوی طور کر ایسے شخص کے لیے سود پر قرض لینے کی گنجائش دی ہے لیکن مارکیٹ میں غیر مسلموں کے دوش بدوش چلنے یا سرمایہ دار بننے کی غرض سے، نیز اسراف یعنی اَللے تللے خرچ کرنے، ناز ونعمت حاصل ہونے، خوشحالی، ترفہ اور جاہ طلبی کی نیت سے، اور دولت وثروت کی ریس کھیلنے کے ارادہ سے ہرگز جائز نہیں چنانچہ الاشباہ والنظائر میں فن اول کے پانچویں قاعدہ میں ہے۔

یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح۔ اسی طرح کا مضمون قنیہ، بغیہ اور حموی میں بھی ہے۔

علاوہ ازیں ایک دوسری صورت فقہاء نے یہ بھی لکھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان مستامن دارالحرب میں آئے اور یہاں اگر کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے اور وہ اپنی ضرورت کے لیے دارالحرب میں سودی لین دین کا معاملہ کرے تو اس کے لیے شرعی اسباب کے پیش نظر بعض قول پر گنجائش نکل سکتی ہے لیکن اس سے تجاوز کر کے ہر ایک کے لیے عام ضابطہ بنا لینا' اور تمام مسلمانوں کے لیے جواز کی راہ نکال لینا قطعاً درست نہیں۔ یہ جادۂ حق کو چھوڑ کر شیطان کے نقش قدم پر چلنے کے مرادف ہوگا۔ ارشاد ربانی ہے: ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل۔

اور ایک دوسری جگہ ہے۔

ولا تتبعوا خطوات الشیطان۔

(۸)

ایسا قرض جس میں چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی ہو

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حکومت بینک کے واسطے سے جو قرض دیتی ہے تو اپنے دیے ہوئے سرمایہ پر کچھ چھوٹ بھی دیتی ہے۔ مثلاً کسی کو پچاس ہزار قرض دے اور اس میں پانچ ہزار کی چھوٹ دیدی یعنی معاف کر دیا صرف پینتالیس ہزار اصل رقم قرار دے کر قسط وار معہ سود وصول کرتی ہے۔ پس اگر کل ادائیگی معہ سود مجموعہ پچاس ہزار کے اندر یا مساوی ہے تو سود کا نہ ہونا بالکل ظاہر اور یقینی ہے۔ سود اور ربوا کی تعریف یہاں صادق نہیں آتی۔ اور سود دینے کا وجود بھی یہاں نہیں ہے۔

(۹)

مال کی برآمد میں سود لینا

حتی الامکان مسلمان کو ایسی تجارت نہ کرنی چاہیے جس میں سود دینا یا لینا پڑے کیونکہ سودی کاروبار بڑا خطرناک ہے۔ عام طور پر لوگ مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی اور افلاس کا بہانہ لیتے ہیں۔ حالانکہ جب ربوا کی حرمت کی آیت نازل ہوئی ہے اس وقت مسلمانوں میں افلاس آج سے کہیں زیادہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کا اٹل حکم نازل ہوگیا کہ سب چھوڑ دو ورنہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اشتہارِ جنگ ہے۔ جب متعاقدین کی کفر کی حالت کا سود وصول کرنا جائز نہیں رکھا گیا تو پھر اسلام کی حالت میں سودی معاملہ کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ البتہ شرعی ضرورتیں اور قانونی مجبوریاں اس سے مستثنیٰ ہوں گی۔

(۱۰)

سرکاری بینک اور شخصی بینک

جہاں تک سود کی رقم لینے کا تعلق ہے تو سرکاری بینک ہو یا شخصی مگر غیر مسلم مالک ہو، یا مسلم اور غیر مسلم کا مشترک ہو۔ ان تینوں قسم کے بینکوں میں سود کی رقم کو چھوڑ دینا اور وصول نہ کرنا ہرگز جائز نہیں ورنہ یہ لوگ وہ رقم مسلم دشمنی، مسلم تخریب کاری کے امور میں خرچ کر دیتے

ہیں اور اگر شخص بینک غیر مسلم مالک ہو یا مسلم مملکت میں ہو تو وہاں سود وصول نہ کرنا اور بینک میں چھوڑ دینا ضروری ہے۔

(۱۱)

سرمایہ کار کمپنی سے سرمایہ حاصل کرنا

مروجہ طریقہ کار میں بہرحال سود دینا ہوتا ہے۔ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی کیونکہ اصل رقم کی قسط وار ادائیگی سود کے ساتھ شرعاً ناجائز و حرام ہے۔ البتہ اس کے جواز کی یہ صورت نکل سکتی ہے کہ ٹرک یا ٹریکٹر وغیرہ جو کچھ بھی لینا ہے کمپنی معہ سود پورے پورے پیسے حساب لگا کر خریدار کو ایک ہی مرتبہ بتادے یعنی پوری مجموعی رقم کو ثمن قرار دے اور اس کی ادائیگی کی قسط مقرر کردے تو بیع کا یہ طریقہ کار شرعاً درست ہوگا۔



دار الحرب میں ربوا کی شرعی حیثیت

(از) ——— مولانا اعجاز احمد اعظمی مدرسہ ریاض العلوم گورینی - جونپور

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله سيد المرسلين (اما بعد)
ربوا کی تعریف فقہاء نے ان الفاظ سے کی ہے۔

الربوا في الشرع عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض في معاوضة مال بمال (حاشیہ ہدایہ ص ۶۱ ج ۳)	ربوا شریعت کے نزدیک وہ فاضل مال ہے، جس کا معاوضۃ المال بالمال میں کوئی عوض نہ ہو۔

اس تعریف کا اطلاق اس پر بھی ہے کہ (۱) کسی نے اضافہ کی شرط کے ساتھ قرض کا معاملہ کیا ہو اور اس پر بھی ہے (۲) کسی مثلی چیز کا تبادلہ اسی کی ہمجنس سے اضافہ کی شرط کے ساتھ کیا ہو، پہلی صورت کو فقہاء "ربوا النسئہ" اور دوسری کو "ربوا الفضل" کہتے ہیں۔

ربوا کی یہ تعریف امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام ابو یوسف ——— چند ضمنی قیود کے ساتھ ——— علی الاطلاق تسلیم کرتے ہیں کہ معاوضہ مالیہ جہاں کہیں ہو، جب اس کا کوئی ایک فریق مسلمان ہو، اس میں اضافہ کی شرط سے ربوا کا تحقق ہو جائے گا۔ لیکن امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک اس میں ایک اور شرط کا اعتبار کیا گیا ہے، وہ یہ کہ دونوں فریق کا مال "مال معصوم" ہونا چاہیے۔ اگر کسی ایک کا مال معصوم نہیں ہے تو اس میں ربوا کا وجود نہ ہو گا۔ گو صورۃً ربوا محسوس ہو، امام علاء الدین ابو بکر بن مسعود کاسانی اپنی مشہور تالیف بدائع الصنائع میں تحریر فرماتے ہیں۔

واما شرائطجریان الربا فمنہا ان یکون البدلان	ربوا کے تحقق کے لئے چند شرطیں ہیں۔ ایک شرط یہ ہے کہ
معصومین فان کان احدھا غیر	بدلین معصوم ہوں اگر کوئی ایک بدل معصوم نہ ہو تو ربوا
معصوم لایتحقق الربا عندنا وعند ابی	کا تحقق نہ ہوگا، ہمارے نزدیک اور امام ابو یوسف کے
یوسف ھذا لیس بشرط ص ۱۹۲ ج ۵	نزدیک یہ شرط نہیں ہے۔

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ ربوا کی شرعی حقیقت علی الاطلاق ہر اس معاوضہ مالیہ میں جس کے اندر اضافہ خالی عن العوض کی شرط لگائی گئی ہو نہیں پائی جاتی۔ اس کے لئے کچھ شرطیں ہیں۔ ان شرائط کے بغیر گو کہ صورۃً ربوا معلوم ہو، مگر شریعت کی نظر میں اسے ربوا نہیں سمجھا جائے گا۔ صاحب بدائع نے اس کے لئے چند شرطیں ذکر کی ہیں، پہلی شرط وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ بدلین کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ معصوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مال شرعاً کسی کی ملک ہو اور اس پر دوسرے کو دست اندازی کی اجازت نہ ہو۔

حربی کا مال

فقہاء لکھتے ہیں کہ حربی کا مال معصوم نہیں ہوتا۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں، اور تمام ہی فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے کہ

ان مال الحربی لیس بمعصوم بل ھو مباح فی نفسہ	حربی کا مال معصوم نہیں ہے بلکہ وہ فی نفسہ مباح ہے۔

حربی کے مال کے معصوم نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں حق تعالیٰ نے مال غنیمت کو اہل اسلام کے حق میں حلال قرار دیا ہے، اور مال غنیمت اہل حرب کا وہ مال ہے جو ان سے جنگ میں حاصل کیا گیا ہو۔ اگر وہ مباح نہ ہوتا تو اس پر ملکیت بھی ثابت نہ ہوتی۔

اموال میں اباحت

اس میں نکتہ یہ ہے کہ اموال میں اصل اباحت ہے اگو کہ بعض لوگوں نے توقف کو ترجیح دی ہے، یعنی انھیں حرام یا حلال کچھ نہ کہا جائے جبتک کوئی دلیل شرعی حلت و حرمت کی نہ مل جائے۔ لیکن علامہ شامی نے امام ابن ہمام کی کتاب التحریر سے نقل کیا ہے کہ

المختار الاباحۃ عند جمہور الحنفیۃ	عام حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک مختار اباحت ہے اور
والشافعیۃ وفی شرح اصول البزدوی	علامہ اکمل کی شرح اصول بزدوی میں ہے کہ ہمارے

للعلامۃ اکمل قال اکثر اصحابنا واکثر اصحاب الشافعی ان الاشیاء التی یجوز ان یرد الشرع باباحتہا وحرمتہا قبل ورودہ علی الاباحۃ

اور شافعیہ کے اکثر اصحاب نے فرمایا ہے کہ جن چیزوں کی حلت و حرمت شریعت میں وارد ہو سکتی ہے وہ ورود شریعت سے پہلے اباحت پر ہیں۔

۱۶۱ / ج ۲

غرض اموال میں اباحت اصل ہے، جبتک شریعت انھیں کسی خاص فرد یا جماعت کے ساتھ مختص کرکے دوسروں کے لئے ناقابل دست اندازی نہ قرار دیدے، البتہ جب اس پر کسی کا شرعاً قبضہ اور ملکیت ثابت ہو جائے تب وہ مال معصوم اور محظور بن گیا۔

عصمت کی بنیاد

اب اس پر غور کرنا ہے کہ مال میں عصمت اور احراز کب اور کہاں پیدا ہوتا ہے ؟ اس سلسلے میں فقہاء کی تصریحات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ احراز کا تعلق کسی کے قبضے میں آجانے سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق دار الاسلام میں آجانے سے ہے شرح سیر کبیر میں امام سرخسی تحریر فرماتے ہیں۔

وفقہہ فی ھذا کلہ ان العصمۃ المقومۃ انما تثبت بالاحراز بالید لا بالدین وتمام الاحراز بالید انما یکون بمنعۃ المسلمین او بدارہم وبدون ھذہ العصمۃ لا یخرج المال من ان یکون محلا للاغتنام ص ۱۱۳۴ / ج ۳

ان سب کی بنیاد یہ ہے کہ عصمت متقومہ احراز بالید سے ثابت ہوتی ہے احراز بالدین سے نہیں، اور احراز بالید کی تکمیل یا تو منعۂ اسلام سے ہوگی یا دار الاسلام سے، اور اس عصمت کے بغیر مال، محل غنیمت ہونے سے محفوظ نہ ہوگا۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں

وانما تثبت العصمۃ فی حق الاحکام بالاحراز والاحراز بالدار لا بالدین (مبسوط) ص ۵۸ / ۱۴

عصمت احکام کے حق میں عصمت احراز سے ثابت ہوتی ہے، اور احراز کا تعلق دار سے ہے دین سے نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حربی کا مال دار الحرب میں مال معصوم نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی اصلی اباحت پر ہے، جو اہل اسلام کے لئے مال غنیمت بن سکتا ہے، اور معلوم ہے کہ مالِ غنیمت بنص قرآنی حلال وطیب ہے۔

فکلوا مما غنمتم حلالا طیبًا — پس جو کچھ تمہیں مال غنیمت ملا اسے کھاؤ کہ وہ حلال وطیب ہے

واضح رہے کہ یہ مسئلہ یعنی یہ کہ مال حربی دار الحرب میں معصوم نہیں ہوتا۔ مختلف فیہ نہیں ہے، متفق علیہ ہے، ورنہ اگر وہ مال معصوم ہو تو مال غنیمت بننے کا محل نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے فقہائے تصریح فرمائی ہے کہ مسلم مستامن یا معاہد کے لئے حربی کا مال دھوکہ، خیانت اور چوری سے لینا تو جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ امان اور عہد کی خلاف ورزی ہے، اور یہ درست نہیں، ورنہ اس کا مال فی نفسہ مباح ہے کسی اور ذریعے سے جس میں اس کی رضا پائی جائے، اس کا لینا درست ہے، اسی طرح مسلم غیر مستامن اور غیر معاہد کے لئے حربی کا مال کسی بھی طرح حاصل کرنا درست ہے۔ خواہ اس کی رضا ہو یا نہ ہو، چنانچہ شرح سیر کبیر میں ہے کہ

ولو کان المسلم الخارج من دار الحرب	اگر کوئی مسلمان اہل حرب کا قیدی تھا، اور کسی طرح
اسیرا فیہم ــــــــ والمسالۃ بحالہا۔	وہاں سے بچ کر کچھ مال لیکر بھاگ نکلا اور دارالاسلام
فان کان خرج الی دار الاسلام	میں آگیا، تو جو کچھ وہ اپنے ساتھ لایا ہے وہ سب
فجمیع ما اخرج سالم لہ لانہ ما کان	اسی کا ہے، کیونکہ وہ ان میں مستامن نہ تھا، بلکہ وہ
مستامنا فیہم بل کان مقہورا وکان متمکنا	مجبور مقہور تھا، اور اگر اس کا بس چلتا تو وہ انہیں
من قتلہم واخذ اموالہم لو قدر علی ذلک فلما	قتل بھی کرسکتا تھا اور مال بھی لے سکتا تھا۔ پس
احرز من اموالہم یکون طیبا لہم ص ۱۱۲۳ ج ۴	جب کچھ مال لیکر آگیا تو اس کے لئے وہ جائز ہے۔

حربی کے مال کا حصول

اگر اہل حرب سے کوئی مصالحت اور معاہدہ ہو، یا کوئی فرد خاص دار الحرب میں امان لیکر گیا ہو تو اس صورت میں ان سے غدر یا خیانت یا چوری تو حرام ہے مگر ان کی رضامندی سے کوئی مال لے لینا جائز ہے، خواہ اس کی تحصیل کا طریقہ کچھ بھی ہو، کیونکہ اس جگہ تملیک مال میں طریقۂ تحصیل مؤثر نہیں ہے، بلکہ مال مباح پر قبضہ مؤثر ہے، اگر اس موقع پر طریق تحصیل عقود فاسدہ ہوں، تو وہ کالعدم ہیں بشرح کبیر میں ہے۔

قد بینا ان للمستامن فی دار الحرب	ہم بیان کرچکے ہیں کہ دار الحرب میں مستامن کے لئے
ان یاخذ مالہم بای وجہ یقدر علیہ	درست ہے کہ ان کے مال کو جس طرح پر ممکن ہو
بعد ان یتحرز عن الغدر ولیس لہ	لے سکتا ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ غدر نہ ہو، تاہم

ان يدلس لهم العيب فيما يبيعه منهم مما يجوز
مثله في دار الاسلام او لا يجوز لان فيه معنى الغدر ۱۳۸٦

اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے مال کے عیب کو
ان سے چھپا کر بیچے کیونکہ اس میں غدر کا معنی پایا جاتا ہے

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ

فلو ان اهل دار من دار الحرب وادعوا اهل الاسلام فدخل اليهم مسلم وبايعهم الدرهم بالدرهمين لم يكن بذلك باس لان بالموادعة لم تصر دارهم دار الاسلام وانما يحرم على المسلمين اخذ مالهم بغير طيب انفسهم لما فيه من الغدر الذي هو حرام فاذا استرضاهم بهذه المعاملة فقد انعدم معنى الغدر ولهذا طاب له ما اخذ ۔ ص ۹۰

اگر دار الحرب والوں نے اہل اسلام سے مصالحت کر رکھی ہو، اور وہاں کوئی مسلمان داخل ہوا اور انکے ہاتھ ایک درہم کو دو درہم کے عوض فروخت کیا تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے، کیونکہ مصالحت کی وجہ سے دار الحرب دار الاسلام نہیں بن گیا۔ اور مسلمانوں پر ان کا مال ان کی رضامندی کے بغیر لینا حرام ہے کیونکہ اس میں معاہدہ کی خلاف ورزی ہے لیکن ان کی رضامندی اس معاملہ سے حاصل کر لی ہو تو خلاف ورزی کا معنی باقی نہیں رہا۔ پس جو کچھ وہ حاصل کرے گا حلال ہے۔

مبسوط میں ہے ج ۲۰ ص ۵۵

وهذا لان مال الحربي مباح ولكن المسلم بالاستيمان ضمن لهم ان لا يخونهم وان لا ياخذ منهم الا بطيبة انفسهم فهو يتحرز عن الغدر بهذه الاسباب ثم يتملك المال عليهم بالاخذ لا بهذه الاسباب وهذا لان فعل المسلم يحمل على احسن الوجوه واحسن الوجوه ما قلنا

مبسوط ج ۱۴ ص ۵۰

مال حربی مباح ہے، لیکن مسلمان نے ان کی امان حاصل کرکے یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ ان کے ساتھ خیانت نہ کرے گا، اور نہ ان کی رضا کے بغیر کوئی چیز لے گا پس وہ ان اسباب (عقود فاسدہ) کے ذریعے غدر سے احتراز کر رہا ہے پھر اسے مال کی ملکیت جو حاصل ہو رہی ہے، وہ قبضہ سے ہے، ان اسباب سے نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمان کے فعل کو اچھے محمل پر رکھنا چاہیے۔ اور بہتر محمل وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا۔

اسی بنا پر امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے ارشاد کی روشنی میں حربی سے جو مال بصورت عقد ربوا حاصل کیا گیا ہے گو وہ بظاہر ربوا ہے مگر درحقیقت وہ مال مباح پر اس کے

مالک کی رضامندی سے قبضہ ہے، ایسی صورت میں وہ لینے والے کے لئے بالکل جائز ہے۔ اس قبضہ اور ملکیت میں عقد ربوا موثر نہیں ہے، پس ثابت ہوا کہ وہ محض نظر بظاہر ربوا ہے، حقیقت ربوا سے اس کا کوئی علاقہ نہیں، علامہ کاسانی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

ولهما ان مال الحربي ليس بمعصوم بل هو مباح في نفسه الا ان المسلم المستامن منع من تملكه من غير رضاه لما فيه من الغدر والخيانة فاذا بذله باختياره ورضاه فقد زال هذا المعنى فكان الاخذ استيلاء على مال مباح غير مملوك وانه مشروع مفيد للملك كالاستيلاء على الحشيش والحطب وبه تبين ان العقد ليس بتملك بل هو تحصيل شرط التملك وهو الرضا لان ملك الحربي لا يزول بدونه وما لم يزل ملكه لا يقع الاخذ تملكا لكنه اذا زال فالملك للمسلم يثبت بالاخذ والاستيلاء لا بالعقد فلا يتحقق الربا لان الربا اسم لفضل يستفاد بالعقد ص ۱۹۲ ج ۵ بدائع الصنائع۔

طرفین کی دلیل یہ ہے کہ حربی کا مال معصوم نہیں ہے بلکہ وہ فی نفسہ مباح ہے، مگر مسلم مستامن اس کی رضامندی کے بغیر اس کا مالک نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں دھوکہ اور خیانت ہے، جب اس نے اس کی رضامندی اور پسندیدگی حاصل کرلی تو یہ بات زائل ہوگئی، اب اس کا لینا مال مباح پر تسلط حاصل کرنا ہے جو مشروع ہے اور مفید ملک ہے، جیسے لکڑی اور گھاس کا حاصل کرنا۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ یہ معاملہ تملک نہیں ہے، بلکہ شرط تملک کی تحصیل ہے اور وہ رضامندی ہے، کیونکہ حربی کی ملکیت اس کے بغیر زائل نہ ہوگی، اور جبتک اس کی ملکیت زائل نہ ہو مسلمان کا لینا ملکیت نہ پیدا کرے گا، پھر جب حربی کی ملکیت زائل ہوگئی، تو مسلم کے لئے قبضہ کے بعد ملکیت ثابت ہوگئی۔ اور یہ ملکیت قبضہ سے ہے، نہ کہ عقد سے پس ربوا کا تحقق نہیں ہوا کیونکہ ربوا اس فضل (اضافہ) کو کہتے ہیں جو عقد کے نتیجے میں حاصل ہوا ہو۔

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دارالحرب میں ربوا کی حلت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، ربوا خواہ کہیں ہو، حرام ہے، اور نص قطعی کی رو سے حرام ہے، اس میں نہ کسی کا اختلاف ہے اور نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ نصوص صریحہ سے اس کی حرمت ثابت ہے، اختلاف جو کچھ ہے اس میں ہے کہ ربوا کا مصداق کیا ہے؟ جو کچھ ربوا کے دائرہ میں آئے گا وہ حرام ہے، خواہ وہ دارالاسلام میں ہو، یا دارالحرب میں، اور جو ربوا کے دائرہ سے خارج ہے اسے حرام کہنے کی کوئی وجہ نہیں الا یہ کہ کوئی اور وجہ حرمت

پائی جائے۔

ائمہ کے درمیان ایسا اختلاف صرف اسی ایک مسئلہ میں نہیں ہے، ربوا کی دوسری قسم جس کو فقہاء ربوا الفضل سے تعبیر کرتے ہیں، جس کا تذکرہ اس حدیث میں ہے کہ

عن عبادة بن الصامت: قال: قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم الذھب بالذھب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواء بسواء یداً بید فاذا اختلف ھذہ الاصناف فبیعوا کیف شئتم اذا کان یداً بید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سونا سونے کے عوض چاندی چاندی کے عوض گیہوں گیہوں کے عوض، جو، جو کے عوض کھجور کھجور کے عوض، نمک نمک کے عوض برابر اور نقداً نقد بیچو، ہاں جب اصناف بدل جائیں تو جس طرح چاہو بیچو، مگر نقد ہو۔

(رواہ الستہ الا البخاری (فتح القدیر ص ۱۴۷))

"ربوا الفضل" کے سلسلے میں ان چھ چیزوں کی تصریح احادیث میں وارد ہے، ان کے علاوہ اور چیزوں میں بھی ربوا ہو سکتا ہے یا نہیں، تو مجتہدین اس پر متفق ہیں کہ اور چیزوں میں بھی ربوا کا تحقق ہو سکتا ہے لیکن اس کے لئے معیار اور بنیاد کیا ہے، اس میں ائمہ کا اختلاف ہے، حنفیہ نے قدر و جنس کو معیار مانا۔ شافعیہ نے طعم و ثمنیت کو جنس کے اتحاد کے ساتھ علت قرار دیا مالکیہ نے اقتیات و ادخار کو علت مانا۔ چونکہ ان حضرات کے درمیان استخراج علت میں اختلاف ہوا، اس لئے ربوا کے مصداق میں بھی اختلاف ہوا۔ چنانچہ اگر لوہا، لوہے کے عوض بیچا جائے تو امام صاحب اس میں کمی بیشی کو جائز نہیں قرار دیں گے کہ ربوا ہو جائے گا۔ اور امام شافعیؒ کم و بیش کو جائز کہیں گے کیونکہ اس میں نہ طعم ہے اور نہ ثمنیت اسی طرح اور بھی بہت سی چیزوں میں اختلاف پیدا ہو گا۔ بلکہ ظاہریہ کے نزدیک تو ان چھ چیزوں کے علاوہ کسی چیز میں ربوا کا تحقق ہے ہی نہیں، اس لئے ان کے ماسوا ان کے نزدیک ہر چیز میں کم و بیش کے ساتھ مبادلہ جائز ہے۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ لوہے میں امام شافعیؒ کے نزدیک ربوا حلال ہے، یا ان چھ چیزوں کے علاوہ میں ظاہریہ کے نزدیک سود جائز ہے؟ ہرگز نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ ان چیزوں میں ان کے نزدیک ربوا کا تحقق ہوتا ہی نہیں، حالانکہ بظاہر ربوا معلوم ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح امام صاحب کے نزدیک دار الحرب میں حربی اور مسلم کے درمیان سود کا تحقق ہوتا ہی نہیں، یہ نہیں کہ دار الحرب میں سود جائز ہے، یہ بات قطعاً نہیں ہے؛

اسی بات کی تعبیر حضرت مکحول کی حدیث مرسل میں کی گئی ہے۔

عن مکحول ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا ربا بین اھل الحرب واظنہ قال: وبین اھل الاسلام اخرجہ البیہقی من طریق ابی یوسف من بعض المشیخۃ عن مکحول (اعلاء السنن ج۱۴ ص۳۲۲)

حضرت مکحول (تابعی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل حرب کے درمیان۔ اور میرا گمان ہے کہ فرمایا۔ اور اہل اسلام کے درمیان ربوا نہیں ہے۔

حضرت مکحول کی یہ روایت سابقہ استدلال کی تائید اور مسئلہ کی نوعیت کو واضح کرتی ہے، براہ راست اس سے استدلال خدشہ سے خالی نہیں ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ صاحب بدائع الصنائع نے اس روایت کو استدلال میں نہیں پیش کیا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا معاملہ

اسی طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں تصریح موجود ہے کہ وہ مسلمان ہونے اور سود کی تحریم کے باوجود اہل مکہ سے سودی نوعیت کا کاروبار کرتے تھے، نیز طائف کے بعض قبائل سے بھی ان کا اس نوعیت کا معاملہ تھا۔ اور معلوم ہے کہ یہ دونوں جگہیں دار الحرب تھیں، فتح مکہ کے بعد جب مکہ شریف دار الاسلام بن گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تمام سود منسوخ کر دئے، اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اہل حرب سے دار الحرب میں ربا کی نوعیت کا معاملہ کرنا درست ہے۔ تفصیل شرح سیر کبیر ج۴ ص۱۳۸۹ اور اعلاء السنن ج۱۴ ص۳۲۲ میں مذکور ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مسئلہ کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ دار الحرب میں سود جائز ہے، سود تو کسی حال میں جائز نہیں ہے، اصل صورت حال یہ ہے کہ دار الحرب میں جو مال حربی سے لیا جاتا ہے اس پر شرعاً سود کا اطلاق ہوگا یا نہیں؟ اس مسئلہ کا تعلق اجتہاد سے ہے، نصوص قطعیہ میں اس کی تصریح نہیں۔ حدیث مکحول اور حربی کے مال کی شرعی حیثیت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ اس پر سود کا اطلاق نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ مال مباح ہے، جو محل ربوا نہیں ہے، پس اس میں ربوا کی گنجائش نہیں ہے۔

مسئلہ مذکورہ میں ایک قید کا جائزہ

بعض اکابر علماء نے لکھا ہے کہ دار الحرب میں حربی سے اس بظاہر سودی معاملہ کا جواز صرف

اس مسلمان کے لئے ہے جو دار الاسلام کا باشندہ ہو۔ اور امان لے کر دار الحرب میں آیا ہو۔ خود دار الحرب کے باشندہ کے لئے اس کی اجازت نہیں ہے، لیکن اس قسم کی کوئی تصریح کتب فقہ میں نظر سے نہیں گزری، نہ ان حضرات نے اس کا کوئی حوالہ دیا، صرف اتنی بات ہے کہ کتب فقہ میں مفہوم مخالف معتبر ہوتا ہے، اور کتب فقہ میں صراحتہً مسلم مستامن کا ذکر ہے، جو دار الاسلام سے آیا ہو، اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ ایسا کوئی مسلمان جو دار اسلام سے نہ آیا ہو، بلکہ خود دار الحرب کا باشندہ ہو، اس حکم سے خارج ہوگا۔ لیکن گزارش ہے کہ کہیں بھی مفہوم مخالف کا اعتبار اس وقت ہوگا، جب کہ اس کے خلاف کی صراحت نہ ہو، اور اگر کسی جگہ اس مفہوم مخالف کا خلاف صراحتہً موجود ہو تو پھر مفہوم مخالف کا اعتبار کسی کے نزدیک کہیں نہ ہوگا۔ ہم جب اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو حضرت عباسؓ کا معاملہ سامنے آتا ہے کہ وہ مکہ کے ہی باشندے تھے، اور وہیں رہ کر ربوی نوعیت کا معاملہ کرتے تھے، نیز حدیث مکحول کا اطلاق بھی یہی چاہتا ہے کہ اس میں مسلم دار الحرب اور مسلم مستامن کے درمیان فرق نہ ہو[1]۔ البتہ یہ بات بالاتفاق ہے کہ مسلم کا مسلم سے سود لینا اور دینا دار الحرب میں بھی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے مابین وہ سود ہی ہوگا۔

کافر حربی کو سود دینا

ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ کافر حربی سے دار الحرب میں سود کے نام پر لی ہوئی رقم تو حلال ہے، کیونکہ اس پر شرعاً سود کا اطلاق نہیں ہوتا ملحقہ کیا انھیں سود دینا بھی جائز ہوگا؟ اور اسی سلسلے میں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ سود دینے اور سود لینے میں یکساں حرمت اور معصیت ہے۔ یا کچھ فرق بھی ہے؟ اس سوال پر غور کرنے سے پہلے یہ قاعدہ یاد کر لینا چاہیئے کہ جس چیز کی حرمت براہ راست قرآن کریم سے ثابت ہو، اور جس چیز کی حرمت خبر واحد سے ثابت ہو، فقہاء دونوں کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن قطعی الثبوت ہے، اور حدیث ظنی الثبوت، قرآن کا منکر کافر ہوگا، اور حدیث کا منکر کافر نہیں ہے،

---

[1] بدائع الصنائع میں اس کی تصریح موجود ہے کہ اگر مسلمان دار الحرب کا باشندہ ہے تو بھی اسکے حربی سے ربوی معاملہ کرنا جائز ہے۔ وکذا الک لوکان اسیرا فی ایدیہم او مسلم فی دار الحرب ولم یہاجر الینا فعاقدھم بیا (اسے جاز) ج ۷ ص ۱۳۲

اسی طرح دونوں کے آثار میں بھی فرق ہوگا، ایک کی معصیت بڑھی ہوگی، اور دوسرے کی معصیت اس کے مقابلے میں ہلکی ہوگی، ایک میں اباحت کی کوئی گنجائش نہ ہوگی بجز حالت اضطرار کے، اور دوسرے میں حالت اضطرار سے کم پر بھی گنجائش مل سکتی ہے، بہرحال دونوں حرمتوں میں فرق ہوگا۔ اب غور کرنا چاہیے کہ سود کی تحریم جن آیتوں میں بیان کی گئی ہے، ان کا تعلق سود لینے سے ہے یا دینے سے، ارشاد ہے۔

ان الذین یاکلون الربا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطه الشیطن من المس۔	جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ (قیامت کے دن) جب کھڑے ہوں گے تو اس طرح جیسے کوئی ایسا شخص جس کو شیطان نے مخبوط الحواس کر دیا ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربا۔	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو ربوا باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

یمحق اللہ الربا ویربی الصدقات۔	اللہ تعالیٰ ربا کو مٹاتا ہے، اور صدقات کو بڑھوتری بخشتا ہے

اور فرمایا

یا ایہا الذین آمنوا لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفۃ	اے ایمان والو! دگنا تگنا کر کے ربوا نہ کھاؤ۔

اور ارشاد ہے

واخذھم الربا وقد نھوا عنہ۔	اور ان کے ربوا لینے کی وجہ سے حالانکہ انھیں اس سے منع کیا گیا تھا۔

ان سب آیات میں سود لینے اور کھانے کا تذکرہ ہے، دینے کے باب میں آیات خاموش ہیں، البتہ ایک جگہ مطلق ربوا کو حرام کہا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

واحل اللہ البیع وحرم الربوا	اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربوا کو حرام کیا ہے

لیکن اس میں بھی غور کرنے سے اصالۃً سود لینے ہی کی حرمت معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ معنی مصدری میں ہے، یعنی زیادہ کرنا، اور ظاہر ہے کہ زیادہ کرنے کی شرط آخذ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، غرض سود دینے کے سلسلے میں قرآن ساکت ہے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ

لینا اس وقت تک نہ پایا جائے گا جبتک دینے کا وجود نہ ہوگا، تاہم دینے میں مجبوری بھی ہوسکتی ہے، غالبًا اسی لئے قرآن میں اس سے تعرض نہیں ہوا۔ البتہ حدیث نے اس کی شرح کردی ہے، چنانچہ ارشاد ہے۔

لعن اللہ آکل ربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء۔	اللہ نے سود کھانے اور کھلانے والے کاتب اور شاہد سب پر لعنت کی ہے۔ (مسلم شریف)

دلائل شرعیہ سے سود لینے اور دینے کی حرمت ثابت ہے، مگر دونوں میں فرق ہونا ناگزیر ہے، کیونکہ ایک کی حرمت قرآن سے ثابت ہے، اور ایک کی حدیث سے، ہم سواء کی شرح میں ملاعلی قاری صاحب مرقات لکھتے ہیں کہ

ھم سواء ای فی اصل الاثم وان کانوا مختلفین فی قدرہ۔ مرقات ج ۳ ص ۳۰۴	یہ سب برابر ہیں یعنی اصل معصیت میں اگرچہ اس کی مقدار میں فرق ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے فتاویٰ میں تحریر ہے کہ

وتحقیق اینست کہ دادن سود بالتبع حرام است کہ مال کسے نمیگیرد، بلکہ مال خود میدھد و مال خود دادن گویا نقصان خود باشد خصوصًا برائے دفع حاجت ودفع ظلم مباح است، پس وجہ حرمت دراں ھمیں دو چیز است یکے آنکہ غیر را حرام می خوراند مثل دادن رشوت بقاضی وحاکم، دوم آنکہ باعث ترویج ایں معاملہ در دار الاسلام می شود ولہذا دادن سود بنابر اضطرار دار الاسلام ھم جائز داشتہ اند غرضیکہ در گرفتن ودادن فرق بسیار است اگرچہ اصل در در تعرمعہ شریک اند ـ فتاوی عزیزی ج ۲ ص ۱۰	تحقیق یہ ہے کہ سود دینا بالتبع حرام ہے، کیونکہ وہ کسی کا مال تو لیتا نہیں، بلکہ خود اپنا مال دیتا ہے، اور اپنا مال دوسرے کو دینا۔ خواہ اس میں اپنا نقصان ہی ہو بالخصوص دفع حاجت اور دفع ظلم کے لئے، بالکل مباح ہے، پس سود دینے میں حرمت کی وجہ یہی دو چیزیں ہیں، ایک یہ کہ غیر کو حرام کھلانا لازم آتا ہے جیسے قاضی یا حاکم کو رشوت دینا، دوسرے یہ کہ دارالاسلام میں سود کی معاملہ کی ترویج کا سبب بنتا ہے، اسی بنا پر حالت اضطرار میں دارالاسلام بھی سود دینے کو جائز قرار دیتے ہیں، غرض سود لینے اور سود دینے میں فرق ہے، گو کہ اصل گناہ میں دونوں شریک ہیں۔

اب اس مسئلہ پر غور کیجئے کہ دارالحرب میں حربی سے ربوٰ کے نام پر مال لینا اگر جائز ہے، تو دینے کا کیا حکم ہے؟ حدیث مکحول پر نظر کرنے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سود دینے کی بھی گنجائش

ہے، لیکن اگر اس کی ابتدائی بنیاد یعنی مال حربی کی اباحت پر غور کیا جائے تو صرف سودی نوعیت کا اضافہ لینے کی گنجائش نکلتی ہے، دینے کی نہیں، کیونکہ حربی کا مال مباح ہے، مسلمان کا نہیں۔ چنانچہ صاحب فتح القدیر لکھتے ہیں کہ۔

لا يخفى انه انما يقتضي حل مباشرة العقد اذا كانت الزيادة ينالها المسلم والربا اعم من ذلك اذ يشمل ما اذا كان الدرهمان من المسلم ومن جهة الكافر وجواب المسألة بالحل عام في الوجهين وكذا القمار قد يفضي الى ان يكون المال الخطر للكافر بان يكون الغلب له فالظاهر ان الاباحة تفيد نيل المسلم الزيادة وقد التزم الاصحاب في الدرس ان مرادهم من حل الربا والقمار ما اذا حصلت الزيادة للمسلم نظرا الى العلة وان كان اطلاق الجواب خلافه

ص ۱۴۸ / ج ۶

یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اس دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ جب اضافہ مسلمان کو حاصل ہو رہا ہو، اس وقت یہ عقد ربوا جائز ہو، جبکہ (لا ربوا بین الحربی والمسلم میں) ربوا کا لفظ عام ہے، وہ اس صورت کو بھی شامل ہے جبکہ دو درہم مسلمان کی جانب سے ہوں، اور اس کو بھی جبکہ وہ دونوں کافر کی جانب سے ہوں، اسی طرح قمار میں بھی شرط کا مال کافر کو بھی حاصل ہو سکتا ہے، جبکہ اس کی جیت ہو جائے۔ اور اباحت والی دلیل اس بات کا فائدہ دیتی ہے کہ اضافہ مسلمان کو حاصل ہو، اور ہمارے علماء نے درس میں اس کا التزام کیا ہے کہ ربوا اور قمار کی حلت سے وہی صورت مراد ہے جبکہ اضافہ مسلمان کو حاصل ہو، جیسا کہ علت کا تقاضا ہے۔ اگرچہ جواب کا اطلاق اس کے خلاف ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتویٰ

شاہ صاحب سے کسی نے سوال کیا ہے کہ

سود دادن بحربیان درست است یا نہ؟

اہل حرب کو سود دینا درست ہے یا نہیں؟

شاہ صاحب نے جواب تحریر فرمایا۔

عبارات کتب فقہ عام واقع شدہ اند، دادن وگرفتن را شامل اند مثلاً لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب وقاضی ثناء اللہ پانی پتی

کتب فقہ کی عبارتیں عام واقع ہوئی ہیں، دینے اور لینے دونوں کو شامل ہیں، مثلاً لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب اور قاضی ثناء اللہ صاحب

ودرسالہ وتوجیہہ دادن سود نیز نوشتہ اند این وقت فقیر را یاد نیست لیکن اینقدر ظاہر است کہ گرفتن سود از حربیان باین وجہ حلال است کہ مال حربی مباح است، اگر در ضمن آن نقض عہد نباشد وحربی چون خود بخود بدہد بلا شبہ حلال خواہد بود۔ ودادن سود بحربیان باین وجہ حلال است کہ خورانیدن حرام بمسلمانان درست نیست وآنہا حرام خوار اند، اگر چیزے بطریق سود دادہ خواہد شد بیش ازین نیست کہ حرام خواہند خورد والمتیان ہر چند کہ کافر حرام خوار باشند، در دار الاسلام دادن سود از جہت حرام است کہ ترویج معاملہ سود در دار الاسلام می شود ودر دار الحرب این ہر دو علت مفقود است پس مباح باشد وتحقیق اینست کہ دادن سود بالتبع حرام است۔

فتاوی عزیزی ص ۲۹ ج ۱

پانی پتی نے ایک رسالہ میں سود دینے کی توجیہ لکھی ہے فقیر کو اس وقت یاد نہیں ہے، لیکن اس قدر ظاہر ہے کہ اہل حرب سے سود لینا اس وجہ سے حلال ہے کہ مال حربی مباح ہے، اگر اس کے ضمن میں نقض عہد نہ ہو، اور حربی جب خود بخود دیتا ہے تو بلا شبہ حلال ہے، اور اہل حرب کو سود دینا اس وجہ سے حلال ہے کہ مسلمانوں کو حرام کھلانا درست نہیں ہے اور اہل حرب تو حرام خود ہیں ہی، اگر کوئی چیز انہیں بطریق سود دی گئی تو بیش برین نیست کہ حرام کھائے گا۔ رہا یہ کہ ذمیوں کو سود دینا کیوں جائز نہیں تو اگرچہ وہ حرام خور ہیں، لیکن انہیں سود دینے سے دار الاسلام میں سودی معاملہ کی ترویج ہوگی۔ جو جائز نہیں، اور دار الحرب میں یہ دونوں علتیں مفقود ہیں، پس مباح ہے، اور تحقیق یہ ہے کہ سود دینا (اصالۃً نہیں) تبعاً حرام ہے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ

لیکن مسلمان را باید کہ دادن سود بحربی احتیاط کند بے ضرورت ندہد۔ ص ۳۳ ج ۱

لیکن مسلمان کو چاہیئے کہ حربی کو سود دینے میں احتیاط کرے، بے ضرورت نہ دے۔

ایک اشکال اور اس کا حل

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور استفتاء اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کا جواب نقل کر دیا جائے، جو ایک اشکال کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔۔

سوال: بعضے از علماء امامیہ پورب بجوانا فتوی دادہ

پورب کے بعض امامیہ علماء نے انگریزوں سے

از انگریزان فتوی بیع هند ومد فتوی دیده ام
که اگر کفار دار الاسلام استیلا یابند دار الحرب
نمی شود و بر یک روایت مختلف برائے جز نفع
عمل کردن و از نصوص دیگر که در عدم جواز
موالات کفار وارد است کناره کردن و با ایشان
مصاحبت و موافقت نمودن همان حکم دارد که
افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض
معهذا در فتح این باب معامله بعمل خواهد
آمد و رفته رفته از کفار هند بلکه مابین
مسلمین هم در اخذ ربوا مضائقه نخواهند ماند۔

اخذ ربوا کا فتویٰ دیا ہے حالانکہ فتاویٰ میں یہ بھی
دیکھا ہے کہ اگر کفار دار الاسلام پر تسلط حاصل
کرلیں جب بھی وہ دار الحرب نہیں ہوتا، اور
ایک اختلافی روایت کی بنیاد پر تحصیل نفع کی
خاطر عمل کرنا اور دوسری نصوص۔ جو کفار سے
موالات کے عدم جواز کے سلسلے میں وارد ہیں۔
اعراض کرنا اور ان کے ساتھ مصاحبت وموافقت
کرنا یہی حکم رکھتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے افتؤمنون ببعض
الکتاب وتکفرون ببعض علاوہ ازیں اخذ ربوا کا دروازہ
کھل جائے گا تو پھر اس میں تساہل واقع ہوگا، رفتہ رفتہ
لوگ کفار ہند سے بلکہ خود مسلمانوں کے درمیان
سودی معاملہ کا رواج ہو جائے گا۔

یہ اشکال جیسے اس وقت تھا۔ آج بھی ہے، بلکہ آج تو یہ مسئلہ زیادہ سنگین صورت اختیار کر گیا ہے، تاہم شاہ صاحب نے اس کا جواب عنایت فرمایا ہے، وہ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

جواب مفاسد یکه در تجویز اخذ ربوا از
حربیان مرقوم شده بود واقع گشت ،
اباحت اصلی این معامله مبحوث عنها
است، و معهذا مفاسد یکه درین مرقوم
شده اکثر آن مفاسد منقوض است بجهاد کفار
که متضمن ست قتل رجال و نهب اموال
و سبی ذراری و تخریب عمارات و احراق
اشجار و زراعات را و ظاهر است که این
عمل با مسلمین در نهایت قبیح است
و متضمن بودن این معامله مفاسد دیگر
را چیزے دیگر است، کلام دران نیست

اہل حرب سے اخذ ربوا کے باب میں جو مفاسد
تحریر کئے گئے معلوم ہوئے۔ یہاں اس
معاملہ کی اصلی اباحت مبحوث عنہ ہے، معہذا
اکثر مفاسد جو یہاں لکھے گئے وہ اس لئے
قابل قبول نہیں کہ کفار کے ساتھ جہاد اس سے
زیادہ مفاسد کو متضمن ہے، مثلاً قتل رجال،
غارت گری اموال، گرفتاری اولاد تخریب عمارات،
اور احراق اشجار و زراعات وغیرہ، ظاہر ہے کہ
یہ عمل مسلمانوں کے ساتھ انتہائی قبیح ہے (اور
جہاد میں مسلمان ان امور کا نشانہ بنتے ہیں)
اس معاملہ کا دوسرے مفاسد کو متضمن ہونا

بلکہ برفرض خلو از یں مفاسد است والا صلات بلکہ مستحبات وضروریات بسبب مجاورہ مفاسد کسوت حرمت بپوشند چہ جائے ایں مسئلہ کہ متفق علیہا نیست مخصوص بعلماء حنفیہ است، وآنچہ مرقوم شدہ کہ دارالاسلام گاہے دارالحرب نمی شود قول مرجوح است وصحیح آنست دارالاسلام دارالحرب می شود۔ صـ۱۱

دوسری چیز ہے، اس میں کلام نہیں ہے، بلکہ اس تقدیر پر گفتگو ہے کہ مفاسد سے خالی ہو، ورنہ مباحات بلکہ مستحبات تک مفاسد کے تضمن کی وجہ سے حرام ہو جاتے ہیں، چہ جائیکہ یہ مسئلہ جو کہ متفق علیہ بھی نہیں ہے علماء احناف کے ساتھ مخصوص ہے، اور یہ جو لکھا کہ دارالاسلام کبھی دارالحرب نہیں بنتا قول مرجوح ہے واضح یہ کہ دارالاسلام دارالحرب بن جاتا ہے۔

دیگر ائمہ کا مسلک

اب تک کی گفتگو امام ابوحنیفہ اور امام محمد علیہما الرحمہ کے مسلک کی روشنی میں تھی۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیگر ائمہ امام مالکؒ امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے مسلک کا بھی مطالعہ کر لیا جائے۔ کتب احناف میں امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ کا مسلک کا ذکر کیا ہے کہ ـــــــ اور یہی مسلک تینوں ائمہ کا ہے ـــــــ ان کے نزدیک دارالحرب میں حربی سے سود لینا، سود ہی ہے اس لئے جائز نہیں ہے، ان کے مسلک کا حاصل یہ ہے کہ حربی کا مال گو کہ مباح ہے، مگر چونکہ مسلمان کے حق میں عقد ربوا حرام ہے خواہ کہیں بھی ہو، اور کسی کے ساتھ ہو، مانا کہ دارالحرب میں حربی سے ربوی معاملہ کے ذریعے حاصل کیا ہوا مال اس کی رضامندی سے لیا گیا ہے مگر دیکھنا چاہئے کہ یہ تحصیل مال عقد ربا کی وجہ ہے، کھلی بات ہے کہ کافر حربی اپنا مال جو مسلمان کے حوالے کر رہا ہے، وہ اس لئے کر رہا ہے کہ دونوں کے درمیان لین دین کا ایک معاملہ ہو رہا ہے، وہ اسی لین دین پر رضامند ہے، اس کی رضا اس کے علاوہ اور کسی بنیاد پر نہیں ہے، کیا وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اس کا مال مسلمان کے لئے مباح ہے، اور وہ اسے لے سکتا ہے! جب یہ بات نہیں ہے تو یہ تاویل کہ مسلمان اس کی رضامندی سے مال مباح پر قبضہ کر رہا ہے تاویل بعید ہے، وہ اس تحصیل میں موثر اور عامل نہیں ہے موثر عقد ربوا ہی ہے، جو کہ ناجائز ہے، مبسوط میں ہے۔

والمعنى فيه ان المسلم من اهل دار الاسلام فهو ممنوع من الربا بحكم الاسلام ولا يجوز ان يحمل فعله على اخذ مال الكافر بطيبة نفسه لانه قد اخذ بحكم العقد ولان الكافر غير راض بلغذ هذا المال منه الا بطريق العقد منه ولو جاز هذا في دار الحرب لجاز مثله في دار الاسلام بين المسلمين على ان يجعل الدرهم بالدرهم والدرهم الآخر هبة مبسوط ج ۱۴ ص ۵۶

وجہ یہ ہے کہ دارالاسلام کا مسلمان ربا سے ممنوع ہے بحکم اسلام اور یہ جائز نہیں ہے کہ اس کے اس معاملہ کو اس پر محمول کیا جائے کہ اس نے کافر کا مال اس کی رضا سے لیا ہے، کیونکہ اس نے یہ بحکم عقد لیا ہے، اور اس لئے کہ کافر کی رضا اس مال کے دینے پر بحکم عقد ہی ہوئی ہے، اور اگر یہ دار الحرب میں جائز ہو، تو اس جیسا معاملہ دارالاسلام میں بھی جائز ہونا چاہئے کہ ایک درہم ایک درہم کے عوض میں ہو، اور دوسرا درہم ہبہ کیا جائے۔

اس مسلک کے لحاظ سے دار الحرب میں ربوا کا معاملہ کرنا ناجائز ہے، جیسے دارالاسلام میں، اس سے مال کی حیثیت و نوعیت کے فرق سے کوئی اختلاف نہیں واقع ہوتا عقد ربوا علی الاطلاق حرام ہے۔

دلیل کے لحاظ سے طرفین (امام صاحب و امام محمد) کا مسلک قوی ہے، اور اجراء عمل کے لحاظ سے امام ابو یوسف کا مسلک احوط ہے کہ اس سے بہت سے مفاسد سے حفاظت رہتی ہے۔

(۲)

ہندوستان کی شرعی حیثیت؟ دار الحرب یا دار الاسلام

اس سلسلے میں دو باتیں قابل غور ہیں۔

(۱) دار الحرب اور دار الاسلام کی تعریف کیا ہے؟ کیا دار الاسلام کبھی دار الحرب بن سکتا ہے، اگر بن سکتا ہے تو کب؟

(۲) ہندوستان اپنے موجودہ نظام حکومت کے لحاظ سے جہاں حکومت کی تشکیل میں کافر اور مسلمان دونوں دخیل ہیں اور جہاں دستوری اعتبار سے دونوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں، کیا دار الحرب ہے یا دار الاسلام؟

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی تحریر فرماتے ہیں کہ۔

بباید دانست کہ مدار بودن بلدة و ملکے
دارالاسلام و دارالحرب بر غلبہ اسلام
وغلبہ کفار است وبس لہذا ہر موضع کہ
مقہور تحت حکم مسلمین است آنرا بلاد اسلام
گفتہ خواہد شد قال فی جامع الرموز کتاب الجہاد جلد ۴
دار الاسلام مایجری فیہ حکم
امام المسلمین ودار الحرب مایجری
فیہ امور رئیس الکافرین کما
فی الکافی وذکر فی الزاہدی انہا
ماغلب فیہ من المسلمین وکانوا فیہ
آمنین ودار الحرب ماخافوا فیہ من
الکافرین۔ تالیفات۔ رشیدیہ ص۶۵۵

جاننا چاہیے کہ کسی شہر اور ملک کے دارالاسلام
اور دارالحرب ہونے کا مدار غلبہ اسلام اور غلبہ کفار
پر ہے اور بس' اس لئے ہر وہ جگہ جو مسلمانوں کی
حکومت کے ماتحت ہو وہ دارالاسلام کہی جائیگی۔
جامع الرموز کتاب الجہاد ج ۴ میں ہے۔
دارالاسلام وہ ہے جہاں مسلمانوں کے
حاکم کا فرمان جاری ہو اور دارالحرب وہ ہے
جس میں کافروں کے سردار کا حکم چلتا ہو، ایسا ہی
کافی میں ہے' اور زاہدی میں ذکر کیا ہے کہ
جس جگہ مسلمانوں کا غلبہ ہو وہ دارالاسلام ہے
اور جس جگہ کفار سے مسلمان خائف ہوں وہ
دارالحرب ہے۔

یہ اور اس طرح کی عبارات تمام کتب فقہ میں مذکور ہیں' جن کا حاصل یہ ہے کہ دارالاسلام ہونا اس پر موقوف ہے کہ وہاں مسلمانوں کا حاکم ہو، اس کا غلبہ واقتدار ہو، اور مسلمان اپنے احکام کو بطور اقتدار کے ادا کرتے ہوں، اس کے برخلاف جہاں کفار کا غلبہ ہو، ان کے احکام بے دغدغہ چلتے ہوں' اور مسلمان اپنے احکام ان کی رواداری' بے تعصبی یا ان کی اجازت سے ادا کرتے ہوں وہ جگہ دارالکفر یا دارالحرب ہے، کسی جگہ صرف مسلمانوں کے آباد ہونے سے مسئلہ میں کوئی تفاوت نہیں آتا۔

دارالاسلام کب دارالحرب بنتا ہے

کسی بھی دارالحرب کے دارالاسلام بننے کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہاں اسلام کے احکام بطور غلبہ کے جاری ہو جائیں۔

لاخلاف بین اصحابنا فی ان دار الکفر
تصیر دار اسلام بظہور احکام

ہمارے علماء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف
نہیں ہے کہ دارالکفر اس وقت دارالاسلام

الاسلام فیہا بدائع ص۱۳۰ج۷ | بن جاتا ہے جب اس میں اسلام کے احکام کا غلبہ ہو جائے

لیکن یہ کہ دار الحرب دار الاسلام کب بنتا ہے، اس میں امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف ہے۔

قال ابو حنیفۃ انہا لا تصیر دار الکفر الا بثلاث شرائط احدھا ظہور احکام الکفر فیہا، والثانی ان تکون متاخمۃ لدار الکفر والثالث لا یبقی فیہا مسلم او ذمی آمنا بالامان الاول وھو امان المسلمین۔

امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ دار الاسلام تین شرطوں سے دار الکفر بنتا ہے ایک احکام کفر کا غلبہ، دوسرے یہ کہ کسی دار الکفر سے متصل ہو، تیسرے یہ کہ اس میں کوئی مسلمان یا ذمی سابقہ امان کی بنیاد پر نہ ہو یعنی مسلمانوں کے امان کی بنیاد پر۔

لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں کہ۔

انہا تصیر دار الکفر بظہور احکام الکفر فیہا (حوالہ بالا) دار الاسلام کفر کے احکام کے غلبہ کے بعد دار الکفر بن جاتا ہے"

اصل یہ ہے کہ دار الاسلام پر جب کفار کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ وہاں سے اسلام کا غلبہ زائل ہو جائے تو وہ ملک دار الحرب ہو گیا، اور اگر کفار کا غلبہ تو ہوا، مگر بعض حیثیات سے اس میں اسلام کا غلبہ باقی ہے تو اس کو اب بھی دار الاسلام کہا جائے گا۔ اتنی بات پر سب کا اتفاق ہے، البتہ اس میں اختلاف ہوا ہے کہ غلبۂ اسلام کے بالکل زائل ہو جانے کی علامت کیا ہے، تو صاحبین نے یہ فرمایا کہ جب احکام کفر علی الاعلان جاری ہو گئے۔ اور اسلام کے احکام مغلوب ہو گئے، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام کا غلبہ ختم ہو گیا۔ لیکن امام صاحب اس کے ساتھ مزید دو باتیں اور فرماتے ہیں، ایک یہ کہ دار الحرب سے اس کی سرحد متصل ہو، کیونکہ اگر اس سے دار الاسلام کی سرحد متصل ہو گی تو وہاں سے ہر وقت امداد کی گنجائش ہو گی، اور یہ توقع قوی ہو گی کہ مسلمانوں کا پھر غلبہ ہو جائے۔ اور دوسرے یہ کہ کوئی شخص ذمی یا مسلمان سابقہ امان کے ساتھ باقی نہ ہو، کیونکہ مسلمانوں کے سابقہ دئے ہوئے امان کی بنیاد پر اگر کوئی ہو گا تو اس کا صاف مطلب ہو گا کہ ابھی کسی قدر غلبہ مسلمانوں کا باقی ہے، حاصل ان دونوں شرطوں کا وہی ہے کہ غلبہ اسلام بالکل ختم ہو چکا ہو۔

مولانا گنگوہی جامع الرموز سے نقل فرماتے ہیں کہ

الثانی اتصال بدار الحرب بحیث لا یکون بینہما بلدۃ من بلاد الاسلام ما یلحقہم المدد منہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دوسرے اس کا دار الحرب کے ساتھ ایسا متصل ہونا کہ کوئی شہر اسلامی شہروں میں سے درمیان میں حائل نہ رہے، جس سے مسلمانوں کو مدد پہونچ

. . . . دوم ایں کہ غرض از شرط اتصال وانقطاع ہموں قوت است کہ درصورت اتصال مددبرائے مغربیہ مسلوحہ نمی رسد بخلاف صورت انقطاع از دارِ حرب کہ لحوق مدد می تواند پس ہنوز قوت اسلام باقی است تالیفات رشیدیہ $\frac{\text{۶۶۳-۶۶۵}}{\text{ج}}$ ۔

دوسری بات یہ کہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہونے کی جو شرط امام صاحب نے لگائی ہے اس کا مطلب بھی وہی غلبہ و قوت ہے کیونکہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہونے کی صورت میں مسلمانوں کو مدد نہیں پہونچ سکتی بخلاف اس صورت کے کہ دارالحرب سے انقطاع ہو تو مسلمانوں کو استخلاص دارالاسلام میں مدد کے پہونچنے کا زیادہ احتمال ہے، اس لئے ابھی تک اسلام کی قوت باقی سمجھی جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب ہر طرح اسلام کا غلبہ کسی ملک سے ختم ہو جائے تو وہ دارالکفر بن گیا ورامام صاحب نے جو شرطیں متعین کی ہیں وہ اسی کی علامات ہیں۔ امام صاحب اور صاحبین کا مقصود ایک ہی ہے یعنی مسلمانوں کے غلبہ و قوت کا وجود اگرچہ بعض وجوہ سے ہو، اس کے دارالکفر بننے سے مانع ہے، لیکن علماء اسلام میں سے کوئی شخص بھی اس کا قائل نہیں ہے کہ کفار کے ملک میں اگر کوئی ان کی صریح اجازت سے، یا ان کی چشم پوشی کی وجہ سے شعائر اسلام کا اظہار کرے تو یہ ملک دارالاسلام ہو جائے گا۔ حاشا و کلا، کیونکہ یہ خیال تفقہ سے بالکل دور ہے۔ (ملخصاً از تالیفات رشیدیہ بعنوان علام فی دارالحرب طلاالاسلام)

ہندوستان کی موجودہ حالت

اب رہا یہ مسئلہ کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں ؟ تو یہ معلوم ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہ ملک از ابتداء تا انتہا دارالکفر تھا۔ مسلمان جن جن علاقوں کو فتح کر کے اپنی حکومت قائم کرتے گئے وہ دارالاسلام بنتے گئے، تاہم پورا ملک (جس کا اطلاق ۱۹۴۷ء سے پہلے موجودہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش پر ہوتا تھا) مکمل مسلمانوں کے قبضے میں نہیں آیا تھا، کتنے رجواڑے اور ریاستیں ایسی تھیں جو غیر مسلم حکمرانوں کے زیرِ نگیں تھیں، وہ کبھی مصالحت کر کے مسلمان بادشاہوں سے اپنی ریاست بچائے رہتے تھے، اور کبھی موقع پاتے تو جنگ و جدال بھی کرتے، اس وقت پورا ملک ایک اکائی نہ تھا۔ مختلف ریاستیں

تھیں، کچھ ہندو ریاستیں اور کچھ مسلمان ریاستیں، مغل دور حکومت میں بعض ریاستیں باجگذار تھیں اور بعض خود مختار! اس قسم کی ہندو ریاستیں تو دار الاسلام بن نہیں سکیں، ہاں جہاں تک مسلمانوں کی حکومت تھی وہ حصہ دار الاسلام تھا۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی کی مغل حکومت کا سقوط ہوا اس کے بعد پورے ملک پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا، البتہ کچھ رجواڑے اور کچھ مسلم ریاستیں، انگریزوں سے صلح کرکے اپنے وجود کو باقی رکھے ہوئے تھیں، اسلامی ریاستوں میں بھوپال، رام پور، حیدرآباد، ٹونک، بھاول پور وغیرہ مشہور ریاستیں تھیں، اس دور میں جہاں جہاں انگریزوں کا قہرا تسلط ہوا، ان کے سلسلے میں علماء کا اختلاف تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی تو ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ہندوستان کو دار الحرب قرار دے چکے تھے چنانچہ فرماتے ہیں کہ۔

دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست وحکم رؤسا نصاریٰ بے دغدغہ جاری ست ومراد از اجراء احکام کفر این ست کہ در مقدمہ ملک داری وبندو بست رعایا واخذ خراج وباج وعشور اموال تجارت وسیاست قطاع الطریق وسراق وفصل خصومات وسزا سے جنایات کفار بطور خود حاکم باشند، اگر بعضے احکام اسلام را مثل جمعہ وعیدین واذان وذبح بقرہ تعرض نکنند نکردہ باشند لیکن اصل الاصول ایں چیزہا نزد ایشاں ہبا وہدر است، زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمایند وہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر ودر نواح نمیتوانند آمد برائے منفعت خود واردین ومسافرین وتجار منع مخالفت نمی نمایند اعیان دیگر مثل شجاع الملک وولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد

اس شہر میں امام المسلمین کا حکم قطعاً نہیں چلتا اور رؤسا نصاریٰ کا حکم بے دغدغہ جاری ہے، اور احکام کفر کے اجراء سے مراد یہ ہے کہ ملک داری [illegible] انتظامات، محصول وخراج کی وصولی، اموال تجارت پر ٹیکس، چوروں ڈاکوؤں کی سزا دہی، مقدمات کے فیصلوں اور جرائم کی سزائیں کفار بطور خود حاکم ہوں، اگر اسلام کے بعض احکام مثلاً جمعہ وعیدین اور اذان اور گائے کے ذبیحے سے تعرض نہ کریں تو کیا ہوا۔ ان چیزوں کی اصل الاصول تو ان کے نزدیک محض بے حقیقت ہے کیونکہ مساجد کو بے تکلف گرا دیتے ہیں، اور کسی مسلمان یا ذمی کی مجال نہیں ہے ان کی اجازت کے بغیر اس شہر یا اس کے اطراف میں آسکے، وہ اپنی منفعت کے واسطے آنے والوں اور مسافر وتاجر کی مخالفت نہیں کرتے، دوسرے اکابر مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کے حکم کے بغیر ان شہروں میں قدم

داخل نمیشوند شمار میں شہر تا کلکتہ عمل نصاری ممتد است از ایں در چپ و راست مثل حیدرآباد و لکھنؤ و رامپور احکام خود جاری نکردہ اند بسبب مصالحہ و اطاعت مالکان آں ملک ج۱ ص۳۱ فتاوی عزیزیہ

نہیں رکھ سکتے، اس شہر (دہلی) سے کلکتہ تک نصاری کی عملداری ہے ہاں دائیں بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ، رامپور میں اپنے احکام کو اس لئے جاری نہیں کیا کہ وہاں کے والیان نے ان سے صلح اور ان کی اطاعت کر رکھی ہے۔

یہ بات ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے لکھی گئی ہے، جبکہ مغلوں کا نام بھی باقی تھا لال قلعہ کے دائرہ میں ہی سہی ان کی حکومت کا چراغ جل رہا تھا۔ پھر سن مذکور کے بعد تو حالت اور دگرگوں ہوگئی، حضرت مولانا گنگوہی ان لوگوں میں ہیں جو ۱۸۵۷ء کے جہاد میں بنفس نفیس شریک تھے اس وقت کے اور اس کے بعد کے حالات کے وہ صرف عینی شاہد نہیں بلکہ براہ راست انقلاب و تداول ایام کا تجربہ رکھتے تھے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

چوں ایں مسئلہ محقق شد اکنوں حال ہندوستاں را خود غور فرمایند کہ اجرائے احکام کفار نصاریٰ دریں جا بچہ قوت و غلبہ هست کہ اگر ادنیٰ کلکٹر حکم کرد کہ در مساجد جماعت ادا نکنید ہیچ کس از امیر و غریب قدرت نشود کہ ادائے آں نماید و ایں ادائے جمعہ و عیدین و حکم بقواعد فقہ کہ می شود محض بقانون ایشاں است کہ در رعایا حکم جاری کردہ اند کہ ہر کس حسب دین خود دست سرکار را بوے مزاحمت نیست۔

تالیفات رشیدیہ ص۶۶۶

اور جب یہ مسئلہ (کلی طور پر) محقق ہو چکا تو اب ہندوستان کی حالت پر خود غور کر لیں کہ اس جگہ کفار نصاریٰ کے احکام کا اجراء کس غلبہ و قوت کے ساتھ ہے کہ اگر کوئی ادنی کلکٹر یہ حکم کردے کہ مساجد میں جماعت نہ ادا کرو تو کسی امیر و غریب کی مجال نہیں کہ ادا کر سکے، اور یہ جو کچھ ادائے جمعہ و عیدین اور عمل (بعض) قواعد فقہیہ پر ہو رہا ہے محض ان کے قانون کی وجہ سے ہے کہ انھوں نے یہ حکم جاری کر دیا ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب میں آزاد ہے، سرکار کو اس سے کوئی مزاحمت نہیں۔

اور سلاطین اسلام کا دیا ہوا امن جو یہاں کے رہنے والوں کو حاصل تھا۔ اب اس کا کہیں نام و نشان نہیں۔ کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ ہمیں جو امن شاہ عالم نے دیا تھا آج بھی ہم اسی امن کے ذریعے مامون بیٹھے ہوئے ہیں، بلکہ امن جدید کفار سے حاصل ہوا ہے، اور اسی نصاری کے دئے ہوئے امن کے ذریعہ تمام رعایا ہندوستان میں قیام پذیر ہے۔

رہا اتصال بدار الحرب سو یہ ممالک واقالیم عظیمہ کے لئے شرط نہیں ہے، بلکہ گاؤں اور شہر وغیرہ کے لئے شرط ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہاں سے مدد پہونچنا آسان ہے، کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر شاہ کابل یا شاہ روم کی طرف سے مدد پہونچ جائے تو کفار کو ہندوستان سے نکال سکتے ہیں؟ حاشا وکلا۔ بلکہ ان کا اخراج ہندوستان سے سخت مشکل ہے بہت بڑے جہاد اور عظیم الشان سامان کی ضرورت ہے۔

بہرحال تسلط کفار کا ہندوستان پر اس درجہ ہے کہ کسی وقت بھی کفار کا تسلط کسی دارالحرب پر اس سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور شعائر اسلامیہ جو مسلمان یہاں ادا کرتے ہیں، وہ محض ان کی اجازت سے ہیں، ورنہ مسلمانوں سے زیادہ عاجز کوئی رعایا نہیں، ہندوؤں کو بھی ایک درجہ رسوخ حکومت میں حاصل ہے، مسلمانوں کو وہ بھی نہیں، البتہ ریاست ٹونک اور رامپور اور بھوپال وغیرہ کہ وہاں کے حکام باوجود مغلوب ——— کفار ہونے کے اپنے احکام کو جاری رکھتے ہیں، ان کو دارالاسلام کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم (تالیفات رشیدیہ ص۶۶۸)

جو صورت حال انگریزی دور حکومت میں تھی، اگر اس وقت ہندوستان دارالحرب تھا، تو اب ظاہر ہے کہ اس میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں آئی ہے، جس کی بنیاد پر اسے دارالاسلام قرار دیا جا سکے[1]، پہلے انگریزوں کو غلبہ حاصل تھا۔ اب اکثریت کو قوت حاصل ہے، اقلیت کا کام صرف اس قدر ہے کہ کسی پلڑے میں اپنا وزن ڈال کر اسے ذرا وزنی بنادے، اور اس کے عوض میں کچھ دستوری حقوق سے مستفید ہوے۔ مسلمان جو کچھ اسلامی احکام پر عمل کر لیتے ہیں وہ بربنائے غلبہ وقوت نہیں ہے، بلکہ ملک کا دستور سیکولر ہے اس میں ہر اقلیت کو تحفظ دیا گیا ہے، اسی تحفظ سے اہل اسلام استفادہ کرتے ہیں۔ یہی وہ تحفظ ہے جسے فقہاء امان سے تعبیر کرتے ہیں ایسا تحفظ دارالاسلام میں غیر مسلموں کو بھی ملتا ہے، اس صورت حال میں ہندوستان کا دارالحرب ہونا متعین ہے۔

پھر دارالحرب یا دارالکفر کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جو بالفعل اہل اسلام سے برسر پیکار ہو یا آمادہ جنگ ہو، دوسرے وہ جس کی مسلمانوں سے صلح ہو، اور مسلمان وہاں ان کے امان کے تحت رہتے یا آتے جاتے ہوں، اس دوسری قسم کو "دارالموادعۃ" کہہ سکتے ہیں لیکن

---

[1] بلکہ پہلے جو اسلامی ریاستیں کسی حیثیت سے اپنا وجود بچا کر دارالاسلام قائم کئے ہوئے تھیں، اب وہ سب فنا ہو چکی ہیں۔

ہے وہ بھی دارالحرب ہی۔ علامہ سرخسی تحریر فرماتے ہیں۔

ولو ان اهل دار من اهل دارالحرب وادعوا اهل الاسلام فدخل اليهم مسلم وبايعهم الدرهم بالدرهمين لم يكن بذلك باس لان بالموادعة لم تصر دارهم دار الاسلام ص ۱۳۹۲ / ج ۴

اگر کسی دارالحرب والوں نے اہل اسلام سے مصالحت کر لی، پھر وہاں کوئی مسلمان گیا اور ان سے ایک درہم کے عوض دو درہم کی بیع کی تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ مصالحت سے دارالحرب دارالاسلام نہیں بن جاتا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندوستان مسلمانوں کے حق میں دارالحرب کی دوسری قسم بنتا ہے، یہاں کے غیر مسلموں سے غدر خیانت اور سرقہ تو جائز نہیں، لیکن ان کی رضامندی سے ان کے اموال کو عقود فاسدہ (جن میں ربوی معاملات بھی داخل ہیں) کے تحت حاصل کرنا امام صاحب اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔



سوالنامہ
کے
جوابات

اس تفصیلی گفتگو کے بعد سوالنامہ میں درج سوالوں کے جواب طرفین کے قول کی روشنی میں تحریر کیے جاتے ہیں۔

(۱) ربوا کی شرعی حقیقت، اور اس کا دائرہ بیان کیا جا چکا۔

(۲) دار الحرب میں غیر مسلم حربی سے عقود فاسدہ جن میں ربوی معاملات بھی داخل ہیں۔ درست ہیں، اور ان کے ذریعہ حاصل کیا ہوا مال درحقیقت ایک مباح مال پر بغیر غدر و خیانت اور بغیر غصب و سرقہ کے قبضہ ہے، اور اس سے ملکیت جائز ہو جاتی ہے عقود فاسدہ بظاہر نظر ہیں، فی الحقیقت موثر نہیں ہیں۔

(۳) دار الحرب اور دار الاسلام کی تعریف اور شرائط کی تفصیل بیان ہو چکی، ہندوستان بحالت موجودہ دار الحرب یعنی دار الموادعۃ ہے۔

(۴) بینکوں کی نوعیت کیا ہے؟ اور ان میں جمع شدہ رقم کی حیثیت کیا ہے؟ ان دو سوالوں کی تعیین کے بعد جواب دیا جا سکتا ہے۔

(الف) اگر بینک سرکاری ہے، اور جو رقم اس میں جمع کی گئی ہے، وہ قرض ہے، رقم جمع کرنے والے کی اس بینک کے کاروبار میں شرعاً شرکت نہیں ہے، تو اس کی اضافہ کی ہوئی رقم پر سود کا اطلاق نہ ہوگا۔

(ب) اسی صورت حال میں اگر رقم جمع کرنے والے کی بینک کے کاروبار میں شرعاً شرکت ہے، مثلاً یہ کہ وہ نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہے، تو چونکہ ہر شریک دوسرے کا وکیل ہوتا ہے، اور وکیل کا عمل موکل کا عمل متصور ہوتا ہے، تو بینک جو سودی کاروبار بلا امتیاز مسلم و غیر مسلم سب کے ساتھ کر رہا ہے، اس کی اس میں عملاً شرکت ہوگی۔ اس

صورت میں بینک میں اس طرح کی رقم جمع کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی سود وصول کرنا جائز ہے۔

ج ۔ بینک اگر غیر سرکاری ہے، اور اس میں کلاً یا جزءً مسلمان شریک ہیں، تو اس سے سود لینا ناجائز ہے، اور اگر اس میں سب غیر مسلم ہیں اور رقم جمع کرنے والے کی شرکت نہ ہو تو جائز ورنہ ناجائز۔

(۵) سود لینا اور دینا دونوں گناہ ہے، لیکن دونوں میں فرق ہے، غیر اسلامی ملک مثلاً ہندوستان میں مواقع حاجت پر سود دینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

(۶) حتی الامکان دارالحرب میں بھی سودی قرضوں سے بچنا چاہیے، خود مسلمانوں کے باہمی سودی قرضے تو بالکل ناجائز ہیں الا فی حالۃ الاضطرار، البتہ غیر مسلم فرد یا کمپنی، یا سرکاری بینک سے حاجت شدیدہ کے موقع پر سودی قرضہ لیا جا سکتا ہے۔

(۷) حکومت کی ترقیاتی اسکیموں سے استفادہ کرنا درست ہے۔

(۸) حکومت اگر کسی قرض پر چھوٹ دیتی ہو، اور سود بھی عائد کرتی ہو، تو اگر چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی یا اس سے زیادہ ہو، تو بالکل درست ہے، اور کم بھی ہو تب بھی گنجائش ہے۔

(۹) غیر ممالک سے تجارت کرنے کی صورت میں سود کا مسئلہ ایک مجبوری ہے، وہ جائز ہے۔

(۱۰) گزر چکا۔

(۱۱) کچھ افراد یا کمپنیاں جو سرمایہ کاری کرتی ہیں، اگر وہ غیر مسلم ہیں، تو ان سے معاملہ کرنا جائز ہے، ورنہ نہیں۔

یہ سارے جوابات امام صاحب اور امام محمد علیہما الرحمۃ کے قول کی روشنی میں تحریر کئے گئے ہیں، اور اس میں بھی وہ تشریح قبول کی گئی ہے، جو شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے کی ہے۔

لیکن مسلمانوں کی غفلت اور دین سے دوری کا جو حال ہے، عجب نہیں کہ اس طرح کے مسائل سے ان میں جرأت بڑھ جائے گی اور وہ صریح ناجائز اور حرام معاملات کے مرتکب ہو جائیں، اس لئے اس مسئلہ پر اچھی طرح غور کر لینا چاہئے۔

ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف کے قول کی روشنی میں سوال میں مذکور شق کو مستثنیٰ کر کے کوئی معاملہ صحیح نہیں ہوگا شق میں چونکہ چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی ہے اس لئے اصل قرض کی ادائیگی ہوگی وہ بہرحال جائز ہے۔ البتہ اس میں مزید یہ بات بھی واضح کر دی جائے کہ بینکوں میں جمع شدہ رقم کا سود نکال کر غرباء و مساکین کو بلا قصد ثواب تقسیم کر دیا جائے۔

واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

ضمیمہ سوالنامہ ②

جناب سید امین الحسن صاحب رضوی نے ضمیمہ سوالنامہ ۲ میں چند صورت مسائل لکھ کر جو سوالات اٹھائے ہیں ان میں سوال ۱ اور سوال ۲ میں شرعاً سود کا اطلاق نہیں ہوتا۔

۱۔ قانون اراضی کے مسئلے میں ظاہر ہے کہ مالک زمین نے نہ کوئی قیمت ابھی وصول کی ہے، نہ گورنمنٹ کو کوئی قرض دیا ہے، گورنمنٹ نے اس کی زمین کی جو قیمت متعین کی ہے، اس پر اسے اعتراض ہے، وہ اس کی چارہ جوئی عدالت میں کرتا ہے۔ قاضی دوبارہ اس کی قیمت متعین کرتا ہے، اور ایک خاص مقدار پر بنام سود کچھ اضافہ کرکے فیصلہ کرتا ہے، یہ ساری رقم قیمت میں محسوب ہوگی، ربوا کا اطلاق یہاں سرے سے نہیں ہے کہ عدم جواز کا سوال پیدا ہو۔

۲۔ فوجی کے مسئلے کا بھی یہی حال ہے، اس کو جتنی رقم ملنی چاہیے تھی نہیں ملی، اس نے عدالت سے رجوع کیا، عدالت نے اسکے حق میں فیصلہ دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ کچھ اور رقم بھی بنام سود دلوائی۔ یہ خالص تبرع ہے، اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔

۳۔ فلاحی ریاست کے تصور کے تحت حکومت جو قرض تقسیم کرتی ہے، یہ بلاشبہ سودی قرض ہے، اس سود کا نام اگر بدل دیا جائے تو اس کی حقیقت نہیں بدل جائے گی، جیسے مذکورہ بالا دونوں مسائل میں ایک خاص رقم کو سود کہہ دینے سے وہ سود نہیں ہوجاتی۔ اس قرض کا حکم اصل مقالہ میں بیان کیا جا چکا ہے۔

۴۔ انڈین آئیل کارپوریشن کی جو صورت رضوی صاحب نے ذکر کی ہے، وہ کسی قدر مبہم ہے، تاہم اس کی صورت نہ مضاربت کی بنتی ہے اور نہ شرکت کی، کیونکہ بظاہر تحریر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالکان حصص اپنی متعین سود کی رقم بہرحال پا جاتے ہیں، خواہ کارپوریشن کو نفع ہو یا نقصان! ان کی شرکت نفع نقصان کسی میں نہیں، قرض لینے کارپوریشن کو نفع اس کے اندازہ سے زیادہ ہوا جب بھی وہ اتنا ہی سود دے گا جتنا طے ہوچکا ہے، یا نفع اندازہ سے کم ہوا جب بھی اسی مقدار میں سود ادا کرے گا، اس میں بیش وکم نہ ہوگا، اگر یہی صورت حال ہے تو حصص کی فروخت محض نام ہی نام ہے، درحقیقت یہ قرض ہے، جو مالکان حصص نے دئے ہیں۔ اور اسی قرض پر سود وصول ہو رہا ہے اسے حاصل کرنا طرفین کے نزدیک درست ہے امام ابو یوسف کے نزدیک نہیں۔

مسئلہ سود
(سوالات کے جوابات)

از ——————— جناب شمس پیرزادہ، ادارہ دعوت القرآن بمبئی

(۱)

ربا کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کا دائرہ کیا ہے؟

قرآن کریم سے ربا کی یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ وہ قرض اور ادھار لین دین کی صورت میں زر اصل (رأس المال) پر ادائیگی میں تاخیر کی بنا پر اضافہ ہے جو صریح ظلم ہے اور اس کی حرمت اتنی شدید ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان لوگوں کے خلاف جو ربا سے باز آنا نہیں چاہتے اعلانِ جنگ کیا گیا ہے۔

فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله ورسوله. وان تبتم فلكم رؤس اموالكم لاتظلمون ولاتظلمون. (البقرة : ۲۷۹)

قرآن نے ربا کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے اس لیے مہاجنی سود (USUARY) اور تجارتی سود جس کا ذریعہ بنکیں ہیں دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور بنک کے سود کو قرآن کے حرام ٹھہرائے ہوئے ربا سے مستثنیٰ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ بنک کا سود جب زر اصل پر مدت کے مقابلہ میں اضافہ ہے تو وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین ربا قرار پایا۔ شرح کے کم زیادہ ہونے سے اس کی خباثت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

رہا ربا کا دائرہ تو قرآن نے ربا النسیۃ کو حرام قرار دیا ہے لیکن حدیث نے ذریعہ کے طور پر ربا الفضل کو بھی حرام ٹھہرایا ہے۔ بخاری کی حدیث ہے:

الذهب بالذهب ربا الاهاء وهاء والبر بالبر ربا الاهاء وهاء والشعير بالشعير ربا الاهاء وهاء والتمر بالتمر ربا الاهاء وهاء.

دوسری حدیث میں ہے :

لاتبیعوا الذهب بالذهب الا سواء بسواء والفضة بالفضة الا سواء بسواء وبیعوا الذهب بالفضة والفضة بالذهب کیف شئتم۔ (بخاری کتاب البیوع)

ربا کی یہ حقیقت فقہاء کے اقوال اور علماء کی آراء سے بھی واضح ہے۔

علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں :

وفی الشریعة الربا هو الفضل الخالی عن العوض المشروط فی البیع لما بینا ان البیع الحلال مقابلة مال متقوم بمال متقوم فالفضل الخالی عن العوض اذا دخل فی البیع کان ضد مایقتضیه البیع فکان حراما شرعًا واشتراطه فی البیع مفسد للبیع کاشتراط الخمر وغیرها۔ (المبسوط للسرخسی ج ۱۲، ص ۱۰۹)

علامہ جصاص فرماتے ہیں :

واسم الربا فی الشرع یعتوره معان احدها الربا الذی کان علیه اهل الجاهلیة والثانی التفاضل فی الجنس الواحد من المکیل والموزون علی قول اصحابنا . . . . . . والثالث النسأ وهو علی ضروب منها فی الجنس الواحد من کل شئ لایجوز بیع بعضه ببعض نسأ سواء کان من المکیل اومن الموزون اومن غیره۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۱، ص ۵۵۲)

الفقة علی المذاهب الاربعة میں ربا کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے :

اما فی اصطلاح الفقهاء : فهو زیادة احد البدلین المتجانسین من غیر ان یقابل هذه الزیادة عوض۔ (الفقه علی المذاهب الاربعة ج ۲، ص ۲۴۵)

علی الطنطاوی فرماتے ہیں :

فزیادة مال الانسان بمرور الزمان من غیر عمل منه، هو الربا۔

(فتاوی علی الطنطاوی ص ۱۳۳)

السید سابق فرماتے ہیں :

الربا فی اللغة : الزیادة، والمقصود به ههنا : الزیادة علی رأس المال قلت او کثرت۔ (فقه السنة ج ۳، ص ۱۳۱)

دارالافتاء ریاض کے رکن عبداللہ بن سلیمان بن منیع فرماتے ہیں :

فالربا بعبارة مختصرة هو الزيادة فى غير مقابلة عوض غير مشروع او كما قال شيخ الاسلام ابن تيمية رحمه الله فى مجموع فتاواه وحرم الربا لانه متضمن للظلم فانه اخذ فضل بلا مقابل له ۔ فكل معاملة استهدفت هذه الزيادة بصفة مباشرة وكانت وسيلة اليها فهى معاملة ربوية وبالتالى فهى محرمة لان زيادة احد العوضين على الآخر فى غير مقابلة مشروعة تعتبر من اكل اموال الناس بالباطل ۔ (الورق النقدى ص ۱۳۲)

اور فاضل مؤلف کرنسی نوٹ میں ربا کے جاری ہونے کے بارے میں فرماتے ہیں :

فانا ارى ان الورق النقدى ثمن قائم بذاته له حكم النقدين الذهب والفضة فى جريان الربا بنوعيه فيه ۔ (الورق النقدى ص ۱۴۹)

اور مولانا محمد مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں :

" اور اصطلاح شریعت میں ایسی زیادتی کو ربا کہتے ہیں جو بغیر کسی مالی معاوضہ کے حاصل کی جائے الربا فى اللغة الزيادة والربا فى الآية كل زيادة لا يقابلها عوض (احكام القرآن ابن العربى) . . . . . . ربا کی حقیقت جو نزول قرآن سے پہلے بھی سمجھی جاتی تھی یہ تھی کہ قرض دے کر اس پر نفع لیا جائے ۔" (جواہر الفقہ ج ۲ ص ۳۲)

ربا کی وضاحت انگریزی میں سعودی عرب مونیٹری ایجنسی کے ایکونومک ایڈوائزر جناب ایم عمر چھاپرا صاحب نے اپنی کتاب " ٹوورڈز اے جسٹ مونیٹری سسٹم " میں اس طرح کی ہے :

> 'Riba literally means increase, addition, expansion or growth. It is, however, not every increase or growth which has been prohibited by Islam. In the Sharia'h, riba technically refers to the 'premium' that must be paid by the borrower to the lender alongwith the principal amount as a condition for the loan or for an extension in its maturity. In this sense, riba has the same meaning and import as (jurists) without any exception. The term riba is, however, used in the Shari'ah in two senses. The first is riba al-nasi'ah and the second is riba al-fadl.'

Contd...

(Towards a just Monetry System by M. Umer Chapra Published by The Islamic Foundation, 223 London Road, Leicester, U.K. page 56)

دراصل ربا کی شرعی حقیقت کے بارے میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس کے وسیع دائرہ میں ہر قسم کا سود شامل ہے خواہ اس کا تعلق اس قرض سے ہو جو شخصی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دیا گیا ہو یا جو پیداواری اور تجارتی مقاصد کے لیے دیا گیا ہو، قرض لینے والا فرد ہو یا ادارہ یا حکومت، شرح کم ہو یا زیادہ اور سود مہاجنی ہو یا بنک کا اور بنک پرائیویٹ ہو یا سرکاری نیز سود دینے والا غیر مسلم ہو مسلم اس سے سود کی حرمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور ہر حال میں یہ ربا ہی رہتا ہے۔

(۲)

کیا دارالحرب میں سودی معاملات حقیقۃً سود قرار نہیں دیئے جا سکتے

دارالحرب میں سودی معاملات کے جواز کے لیے قرآن و سنت میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ قرآن نے بغیر کسی استثناء کے ربا کو حرام ٹھہرایا ہے جس کا ہر مسلمان پابند ہے خواہ وہ دارالاسلام میں رہتا ہو یا دارالحرب میں اور خواہ مسلمان سے معاملہ ہو یا غیر مسلم سے۔ یہود البتہ اس بات کے قائل تھے کہ غیر قوموں سے سود لینے میں کوئی حرج نہیں ہے چنانچہ بائبل میں ہے:

" تو پردیسی کو سود پر قرض دے تو دے پر اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا "

(استثناء : ۲۳ : ۲)

اور قرآن ان کی امیوں کے معاملہ میں بدمعاملگی پر گرفت کرتے ہوئے کہتا ہے:

ذلك بانهم قالوا ليس علينا في الاميين سبيل۔ (آل عمران : ۷۵)

اسی طرح حدیث میں بھی ربا کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں ہے جو دارالحرب میں مسلم اور حربی کے درمیان ربا کو جائز قرار دیتی ہو۔

جمہور فقہاء بھی دارالحرب میں سود کو جائز قرار نہیں دیتے البتہ بعض احناف جواز کے قائل ہیں، مبسوط میں ہے:

وان بايعهم المستامن اليهم الدرهم بالدرهمين نقدا او نسيئة او

بايعهم فى الخمر والخنزير والميتة فلاباس بذلك فى قول ابى حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى ولايجوز شئ من ذلك فى قول ابى يوسف رحمه الله - لان المسلم ملتزم احكام الاسلام حيثما يكون ومن حكم الاسلام حرمة هذا النوع من المعاملة . (المبسوط للسرخسى ج ۱۰، ص ۹۵)

اس کتاب میں ایک جگہ مزید صراحت ہے :

ذكر عن مكحول عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا ربابين المسلمين وبين اهل الحرب فى دارالحرب - وهذا الحديث وان كان مرسلاً فمكحول فقيه ثقة والمرسل من مثله مقبول وهو دليل لابى حنيفة ومحمد رحمهما الله فى جواز بيع المسلم الدرهم بالدرهمين من الحربى فى دارالحرب - و عند ابى يوسف والشافعى رحمهما الله لا يجوز وكذلك لوباعهم ميتة او قامرهم واخذ منهم مالا بالقمار فذلك المال طيب عند ابى حنيفة ومحمد رحمهما الله خلافا لابى يوسف والشافعى رحمهما الله - وحجتهما حديث ابن عباس رضى الله عنهما انه وقع للمشركين جيفة فى الخندق فاعطا بذلك للمسلمين مالا فنهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ولامعنى يقول من يقول كان موضع الخندق من دارالاسلام لانا نقول عندكم هذا يجوز بين المسلم والحربى الذى لا امان له سواء كان فى دارالاسلام او فى دارالحرب- والمعنى فيه ان المسلم من اهل دارالاسلام فهو ممنوع من الربا بحكم الاسلام حيث كان - (المبسوط للسرخسى ج ۱۴، ص ۵۶)

علامہ سرخسی کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ دارالحرب میں سود کے جواز کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور امام محمد کا استدلال نہایت کمزور ہے اور ایک مرسل روایت کا انہوں نے سہارا لیا ہے جب کہ امام ابویوسف اور امام شافعی عدم جواز کے قائل ہیں۔ مکحول کی جس روایت کو جواز کی تائید میں پیش کیا گیا ہے اس کا صحیح احادیث کی معروف کتابوں میں کہیں وجود نہیں ہے۔ ایک مرسل اور غریب روایت کو جو قرآن وسنت کے واضح تصدیق کے بالکل خلاف ہو استدلال میں پیش کرنا بہت عجیب ہے ۔ایک شدید حرمت والی چیز کو ایسی کمزور روایت کی بناپر ہرگز حلال نہیں ٹھہرایا جا سکتا ۔لیکن تعجب ہے کہ ہدایہ میں اس کو بالکل جائز قرار دیا گیا

ہے۔ ملاحظہ ہو :

(ولا بين المسلم والحربي في دار الحرب) خلافا لابي يوسف والشافعي رحمهما الله لهما الاعتبار بالمستامن منهم في دارنا ولنا قوله عليه السلام لاربا بين المسلم والحربي في دار الحرب ولان مالهم مباح في دارهم فبای طريق اخذه المسلم اخذ مالا مباحا اذا لم يكن فيه غدر بخلاف المستأمن منهم لان ماله صار محظورا بعقد الامان۔ (هداية ج ۳ ص ۵۳)

ہدایہ کی اس دلیل سے تو دارالحرب میں مسلم اور حربی کے درمیان قمار، لاٹری اور دوسرے بیوع فاسدہ کے لیے بھی جواز کی صورت نکل آتی ہے اور جب ایک مسلمان ایک حربی کے ہاتھ مردار اور خون فروخت کرے گا تو اخلاقی لحاظ سے اسے کس سطح پر اترآنا ہوگا اور اس کے کیا اثرات غیر مسلموں پر مرتب ہوں گے ؟ کیا یہ باتیں اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں! فقہاء کے ان شاذ اقوال کی تردید ابن قدامہ نے بڑی خوبی سے کی ہے۔ فرماتے ہیں :

ويحرم الربا في دار الحرب كتحريمه في دار الاسلام — وبه قال مالك والاوزاعي وابو يوسف واسحق ۔ وقال ابو حنيفة : لايجرى الربا بين مسلم وحربي في دار الحرب ، وعنه في مسلمين اسلما في دار الحرب لاربا بينهما — لما روى مكحول عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال لاربا بين المسلمين واهل الحرب في دار الحرب ، ولان اموالهم مباحة وانما حظرها الامان في دار الاسلام ، فمالم يكن كذلك كان مباحا ۔

ولنا : قول الله تعالى (وحرم الربا) وقوله (۲ : ۲۷۵ الذين ياكلون الربا لا يقومون الا كما يقوم الذى يتخبطه الشيطان من المس) وقال تعالى (۲ : ۲۷۸ يايها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا مابقى من الربا) وعموم الاخبار يقضى تحريم التفاضل وقوله ، من زاد او ازداد فقد اربى ، عام — وكذلك سائر الاحاديث ۔ ولان ماكان محرمًا في دار الاسلام كان محرما في دار الحرب ، كالربا بين المسلمين — وخبرهم مرسل لانعرف صحته — ويحتمل انه اراد النهي عن ذلك : ولايجوز ترك ماوردبتحريمه القرآن وتظاهرت به السنة — وانعقد الاجماع على تحريمه بخبر مجهول ، لم يرد في صحيح

ولا مسند ولا كتاب موثوق به وهو مع ذلك مرسل محتمل۔ (المغنی ج ۴ ص ۴۵)

رہی یہ بات کہ اموال اہل حرب معصوم ہیں تو یہ بات علی الاطلاق صحیح نہیں بلکہ کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ قرآن نے جہاد کے موقع پر مالِ غنیمت اور فے کو جائز ٹھہرایا ہے اور یہ مال مجاہدین حکومت کی تحویل میں دیتے ہیں جس کی تقسیم شرعی ضابطہ کے مطابق عمل میں آتی ہے۔ لیکن حربی سے سود لے کر ایک مسلمان اپنی جیب گرم کرتا ہے نیز وہ حصولِ مال کا ایک فاسد اور حرام طریقہ اختیار کرتا ہے جب کہ مالِ غنیمت معروف اور جائز طریقہ پر حاصل کیا جاتا ہے۔

حدیث سے بھی ثابت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانۂ جاہلیت کے سود کے بقایاجات کو ساقط قرار دیا۔ اگر حربی سے سود لینا جائز ہوتا تو لوگوں کو اجازت دی جاتی کہ وہ اپنے سودی بقایاجات وصول کرلیں۔

ان حقائق کے پیشِ نظر دارالحرب میں مسلم اور حربی کے درمیان ربا کے جواز کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اور چونکہ لوگ اس سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اس لیے اس کی سختی کے ساتھ تردید ہونی چاہیے اور اتنے اہم مسئلہ میں جس میں قرآن وسنت ناطق ہیں کسی امام اور کسی فقیہ کے قول کو جب کہ وہ نصوص صریحہ سے متصادم ہو کوئی اہمیت نہیں دینا چاہیے۔

(۳)

کیا ہندوستان دارالحرب ہے؟

دارالاسلام اور دارالحرب قرآن وسنت کی اصطلاحات نہیں بلکہ فقہاء کی اصطلاحات ہیں۔ انھوں نے اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر جس ملک میں اسلام کے احکام جاری تھے اس کو دارالاسلام قرار دیا اور جس ملک کا اقتدار کافروں کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے اسلام کے احکام جاری نہیں ہو سکتے تھے اور جو دارالاسلام سے برسرِ جنگ ہوتا تھا دارالحرب قرار دیا۔ البتہ اس وقت بھی بعض ایسے ممالک پر جو دارالحرب کے دائرہ میں آتے تھے مگر دارالاسلام کی حکومت سے صلح اور موادعت کے تعلقات ہونے کی بنا پر دارالحرب کے تمام احکام منطبق نہیں کیے گئے۔

علامہ سرخسی فرماتے ہیں :

لانهم اهل الحرب وان كانوا موادعين - الاترى انهم بعد مضى المدة يعودون حربا للمسلمين۔ (المغنى ج ۱۰ ص ۸۹)

اور مغنی میں حربی تاجروں سے تعرض نہ کرنے کی استثنائی صورت بیان ہوئی ہے:

واذا دخل حربى فى دار الاسلام بغير امان نظرت فان كان معه متاع يبيعه فى دار الاسلام وقد جرت العادة بدخولهم الينا تجارا بغير امان لم يعرض لهم۔ (المغنى ج ۸ ص ۳۰۳)

دار الحرب کا اطلاق اپنے معنی کے لحاظ سے ایسے ممالک ہی پر ہونا چاہیے جو دار الاسلام سے برسرِ جنگ ہوں۔ رہے دوسرے غیر اسلامی ممالک تو ان کے لیے دار الکفر کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے مگر فقہی کتب میں خاصا الجھاؤ پایا جاتا ہے اور دار الاسلام اور دار الکفر کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ملتی۔

رہا موجودہ ہندوستان تو وہ ایک سیکولر اسٹیٹ ہے جس کی غالب اکثریت غیر مسلم ہے اور اقتدار اصلاً اسی کے ہاتھ میں ہے اس لیے وہ دار الاسلام نہیں ہے مگر چونکہ مسلمانوں کو نہ صرف مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی ایک حد تک آزادی حاصل ہے بلکہ دستور کی رو سے وہ اقتدار میں بھی شریک ہیں اور عملاً ان کی حیثیت شریکِ اقتدار اور شریکِ حکومت کی ہے مزید برآں یہ مسلمانوں کی کثیر آبادی والا ملک ہے جو دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے اور یہاں مسلمان ایک ہزار سال تک حکومت بھی کر چکے ہیں نیز ان کے بے شمار دینی شعائر بھی موجود ہیں اس لیے اس پر دار الحرب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ہمیں حالات، دینی مقاصد، ملی ضرورتوں اور اجتماعی مجبوریوں کو سامنے رکھتے ہوئے شرعی احکام کے انطباق کے سلسلہ میں قرآن و سنت سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگی اور مختلف مسائل میں اجتہاد بھی کرنا ہوگا۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ انبیاء علیہم السّلام ایک طویل عرصہ اپنے ملک میں دعوتی کش مکش میں گزارتے رہے ہیں اور شدید مخالفت اور عناد کے باوجود انھوں نے اور ان کے ساتھی اہلِ ایمان نے کافروں کی جان و مال سے کوئی تعرض نہیں کیا اور یوسف علیہ السّلام کی مثال تو بہت واضح ہے۔ وہ جب مصر کے مختار بن گئے تو اس ملک کی پوزیشن نہ دار الاسلام کی تھی اور نہ دار الحرب کی۔ دار الاسلام کی اس لیے نہیں کہ بادشاہ کا قانون

دہاں جاری تھا اور دارالحرب اس لیے نہیں کہ بادشاہ نے اللہ کے رسول کو اپنے ملک کا مختار بنادیا تھا۔ معلوم ہوا کہ دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان کی بھی بعض صورتیں ممکن ہیں۔

(۴)

بنک سے ملنے والا سود شرعاً کیا حکم رکھتا ہے اور لینے کے بعد اسے کس مصرف میں صرف کیا جائے؟

بنکوں میں جمع شدہ رقوم پر جو سود ملتا ہے اس کا لینا جائز نہیں ہے کیونکہ سود سود ہے اور اس کا لینا خواہ وہ کسی غرض سے ہو جائز نہیں۔ بنک میں رقوم جمع کرنے کے لیے دو قسم کے کھاتے کھولے جاتے ہیں۔ ایک کرنٹ اکاؤنٹ (CURRENT ACCOUNT) دوسرا سیونگ اکاؤنٹ (SAVING ACCOUNT) کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقوم پر بنک کوئی سود نہیں دیتا اس لیے اسی کو ترجیح دی جانی چاہیے۔ سیونگ اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقوم پر بنک سود دیتا ہے۔ یہ سود اگر بنک ہی کو چھوڑ دینا ممکن ہو تو یہی صورت اختیار کی جانی چاہیے کیونکہ سود کھاتے دار کی اپنی رقم نہیں ہے وہ صرف رأس المال لینے کا حق دار ہے لہٰذا اس بات کی کوئی ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ بنک اس سود کی رقم کو کس مصرف میں لاتا ہے۔ لیکن اگر سود وصول کرنا ہی پڑا تو پھر اس کا مصرف وہی ہے جو صدقہ کا مصرف ہے یعنی فقراء کی اعانت۔

سرکاری بنکوں اور غیر سرکاری بنکوں سے سود لینے کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر سرکاری بنکوں کے سود کو جائز قرار دیا جائے تو سرکاری لاٹری کو بھی جائز قرار دینا پڑے گا۔ اس سلسلہ میں یہ دلیل کوئی دلیل نہیں کہ حکومت عوام کی ہے اس لیے سرکاری بنکیں زر اصل پر جو کچھ زائد رقم دیں وہ سود نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا عطیہ ہے لیکن اسلام میں مال دینے کا طریقہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر مال پاکیزہ طریقہ سے دیا جائے تو وہ جائز بھی ہے اور اس کے اخلاقی اثرات بھی اچھے ہوتے ہیں اور اگر وہی مال ناپاک طریقہ سے دیا جائے تو ناجائز بھی ہوتا ہے اور اس کے اخلاقی اثرات بھی بُرے مرتب ہوتے ہیں۔ سود کے طور پر دی جانے والی رقم بہرحال

جائز نہیں ہو سکتی خواہ باپ بیٹے کو دے، شوہر بیوی کو دے یا حکومت اپنے شہریوں کو دے۔

پرائیویٹ بنکوں کے سود کے بارے میں دار الحرب کا سہارا لینا بھی صحیح نہیں۔ اوپر دلائل کے ساتھ اس کی تردید کی جا چکی ہے مزید برآں ان بنکوں کے شیئر ہولڈر مسلم اور غیر مسلم دونوں ہوتے ہیں اس لیے یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ سود غیر مسلموں کی جیبوں سے آتا ہے بلکہ دونوں کی جیبوں سے آتا ہے اس لیے معاملہ کی نوعیت مسلم اور "حربی" کے درمیان نہیں بلکہ مسلم اور مسلم کے درمیان بھی ہے۔

(۵)

سود لینے اور دینے کے حکم میں کوئی فرق کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

سود کا لینا بھی حرام ہے اور دینا بھی حرام اور لینے اور دینے والے دونوں گناہ میں شریک ہیں۔ اس کے باوجود سود لینے اور دینے میں یہ بنیادی فرق ہے کہ سود لینا بجائے خود (بالذات) حرام ہے لیکن سود دینے کی حرمت سد ذریعہ کے طور پر ہے۔ قرآن نے سود کا لینا حرام ٹھہرایا جو اصلاً حرام ہے اور حدیث نے سد ذریعہ کے طور پر سود کا دینا بھی حرام ٹھہرایا۔ اسی بنا پر ربا الفضل کو بھی حرام قرار دیا۔ اور جو چیز سد ذریعہ کے طور پر حرام ہو وہ بعض صورتوں میں رفع حرج کی غرض سے جائز ہو سکتی ہے۔ علامہ رشید رضا نے اپنے فتاویٰ میں علامہ ابن قیم کی کتاب "اعلام الموقعین" کی درج ذیل عبارت نقل کی ہے:

واما ربا الفضل فابیح منه ماتدعو الیه الحاجة کالعرایا۔۔۔۔۔۔ فان ماحرم سد الذریعة اخف مما حرم تحریم المقاصد

اس کے بعد اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ رشید رضا فرماتے ہیں:

یوضحه ان تحریم ربا الفضل انما کان سد الذریعة کما تقدم بیانه وما حرم سد الذریعة ابیح للمصلحة الراجحة کما ابیحت العرایا من ربا الفضل۔ (فتاویٰ الامام محمد رشید رضا، ج ۲، ص ۵۲۹ – ۵۳۱)

غیر اسلامی ملک میں پورا نظام معیشت سود کی بنیاد پر چلتا ہے اس لیے سود دینے کی واقعی مجبوریاں ہو سکتی ہیں اور یہ مجبوریاں جب عام طور سے پیش آ رہی ہوں تو مسئلہ افراد کا نہیں بلکہ معاشرہ کا ہو جاتا ہے اس لیے ان مجبوریوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سود دینے کی حد تک واقعی مجبوریوں کا لحاظ کرنا ہوگا۔

(۶)

کیا سودی قرضے لینے کی کسی حال میں شرعاً گنجائش ہے؟

سوال نمبر ۵ کے جواب میں جو دلائل پیش کیے گئے ان کی بنا پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں سودی قرضے لینے کی شرعاً گنجائش ہے۔ اصولی طور پر تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ رفع حرج کے لیے سودی قرضے حاصل کرنے کا جواز ہے لیکن یہ افراد کا کام ہے کہ وہ اپنے حالات کا صحیح جائزہ لیں اور اس اصول کا استعمال وہیں کریں جہاں ناگزیر ہو۔

واقعی مجبوریوں کی ایک مثال تو یہ ہے کہ موجودہ حالات میں بڑے شہروں میں رہائشی مکانوں کا حصول ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ ایک کمرہ حاصل کرنے کے لیے لاکھوں روپے پگڑی دینا پڑتی ہے۔ دوسری طرف حکومت کا ہاؤسنگ بورڈ مکانات تعمیر کرکے آسان قسطوں پر جن میں سود شامل ہوتا ہے قرعہ اندازی کے ذریعہ درخواست دہندگان کو مکانات الاٹ کرتا ہے۔ اب جس کے پاس پگڑی دینے کے لیے یا نیا فلیٹ خریدنے کے لیے لاکھوں روپیہ موجود نہیں ہے وہ کیا کرے؟ کیا وہ اپنے بال بچوں کو فٹ پاتھ پر ڈال دے؟ یہ اتنا بڑا حرج ہے کہ اس کو رفع کرنے کے لیے قسطوں پر ملنے والے مکان یا اس کے لیے سودی قرض لینے کو جائز کیے بغیر چارۂ کار نہیں ہے۔

اسی طرح بے روزگار لوگوں کو بنک آٹو رکشا قسطوں میں ادائیگی کی شرط پر دلواتا ہے جس میں سود شامل ہوتا ہے۔ مفلوک الحال لوگ متبادل صورت نہ ہونے کی بنا پر اگر اس اسکیم سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو انھیں اس کی اجازت ہونی چاہیے۔

اسی طرح چھوٹے موٹے کارخانہ داروں کو بھی بعض صورتوں میں بنک سے سودی قرض حاصل کرنے کی واقعی مجبوری ہوسکتی ہے مثلاً یہ کہ اگر وہ بنک سے قرض نہ لیں تو کارخانہ بند کردینا پڑے اور مزدور بے کار ہوکر رہ جائیں۔

(۷)

حکومت کی ترقیاتی اسکیموں کے تحت دیئے جانے والے سودی قرضے

حکومت ترقیاتی اسکیموں کے لیے جو سودی قرضے دیتی ہے اس کا حکم عام سودی قرضوں

ہی کی طرح ہے۔ اس کا لینا واقعی مجبوری یعنی حرج کو دور کرنے کی حد تک جائز ہے۔

(۸)

اگر حکومت کسی قرض پر چھوٹ بھی دیتی ہو اور سود بھی عائد کرتی ہو تو ایسے قرض کا حکم

اگر حکومت کسی قرض پر کوئی چھوٹ (SUBSIDY) بھی دیتی ہو اور اس پر سود بھی عائد کرتی ہو تو چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی ہونے کی صورت میں اس قرض کا لینا جائز ہوگا کیونکہ اس صورت میں درحقیقت کوئی سود دینا نہیں پڑتا بشرطیکہ قرض پر عائد ہونے والے سود کے چھوٹ کے مساوی ہونے کی مدت کے اندر اسے لوٹا دیا جائے۔ اس قسم کے قرضے کم آمدنی والوں کو بمبئی میں بھی حکومت سرکاری بنکوں کے ذریعہ جاری کرتی رہی ہے مگر کچھ عملی دشواریوں کی وجہ سے اس کا خاطر خواہ فائدہ مستحقین کو نہیں پہنچا۔

(۹)

غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں جو سود لینا اور دینا پڑتا ہے اس کا شرعی حکم

غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں اگر سود ادا کرنا پڑتا ہے تو یہ بھی واقعی مجبوری کی تعریف میں آتا ہے۔ ضمناً شامل ہونے والی اس غیر شرعی چیز کی بنا پر تجارت کو معطل نہیں قرار دیا جاسکتا جس طرح پاسپورٹ کے لیے فوٹو کے لازمی ہونے کی بنا پر سفر حج اور دوسرے جائز اور ضروری اسفار کو ناجائز نہیں قرار دیا جاسکتا اگرچہ سفر کرنے والا فوٹو کی حرمت کا قائل ہو۔

رہا بیرونی ممالک سے تجارت کی صورت میں سود کا ملنا تو اگر اسے وصول کرنا ہی پڑا ہو تو اس کو ذاتی استعمال میں نہیں لانا چاہیے بلکہ صدقہ کے مصرف میں لانا چاہیے یعنی فقراء و مساکین کو دینا چاہیے۔ تقرب کی نیت سے نہیں بلکہ حرام مال سے بری الذمہ ہونے کی غرض سے۔

(۱۰)

پرائیویٹ بنک اور سرکاری بنک کیا دونوں کا حکم قرض لے کر سود ادا کرنے کے بارے میں یکساں ہے؟

پرائیوٹ بنک جس کے مالک افراد ہوتے ہیں اور سرکاری بنک جو حکومت کی ملکیت

ہیں دونوں میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے کہ قرض لے کر ان کو سود ادا کردیا جائے سود سود ہے۔ نہ افراد کو ادا کیا جائے یا حکومت کو۔ اصل میں سودی قرض ایک عقد فاسد ہے اور عقد فاسد کسی فرد کے ساتھ کیا جائے یا حکومت کے ساتھ اس کی حرمت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ رہی مجبوری کی صورت تو اس کا ذکر اوپر ہوا۔

(۱۱)

پرائیویٹ سرمایہ کاروں سے تجارت کی ترقی کے لیے سود کی بنیاد پر سرمایہ حاصل کرنا

سرمایہ کاری کی پرائیویٹ کمپنیاں ہوں یا سرکاری بنک صنعت و تجارت کی محض ترقی کے لیے سود کی بنیاد پر سرمایہ حاصل کرنے کو جائز نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اولاً یہ صورت نہ اضطرار کی ہے اور نہ حاجت کی۔ ثانیاً سودی سرمایہ میں خیر و برکت نہیں ہوتی (مجبوری کی صورت میں جو سودی قرضے لینا پڑتے ہیں وہ چونکہ کراہت کے ساتھ لیے جاتے ہیں اس لیے ان کا معاملہ مختلف ہے)۔ ثالثاً سود دینے کی حرمت کا احساس مٹتا چلا جاتا ہے، اور رابعاً سرمایہ کاری چھوٹے تاجروں کے بجائے بڑے بڑے تاجروں کی طرف ہوتا ہے۔ دولت سرمایہ کاروں کے ہاتھ میں کھیلنے لگتی ہے اور وہ پوری معیشت پر چھا جاتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی گرانی کا بھی بہت بڑا سبب سودی سرمایہ ہے۔ جو بڑے بڑے تاجروں اور صنعت کاروں کو محض اپنا کاروبار پھیلانے کے لیے دیا جاتا ہے۔

الجوابات متعلقہ سوال نامہ ۲

"مسئلۂ ربوا"

از ـــــــــــ مولانا زبیر احمد قاسمی

(۱) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الذہب بالذہب والفضۃ بالفضۃ .... مثلاً بمثل سواء بسواء یداً بید اخرج مسلم ایضا وزاد بعد قولہ "یداً بید" "فمن زاد فقد اربیٰ وفی روایتہ والفضل ربوا"۔

ان جیسی مشہور روایتوں کی روشنی میں فقہاء کرام ربوا کی تعریف یوں کرتے ہیں ـــــ "ھو الفضل المستحق لاحد المتعاقدین فی المعاوضۃ الخالیۃ عن عوض شرط فیہ" ہدایہ ثالث وغیرہ

اس کے ساتھ تحقق ربوٰا کی کچھ شرطوں کا بیان کرتے ہیں، فقہ حنفی کے مطابق ان شرطوں کا لحاظ کرتے ہوئے ربوٰا کی جامع تعریف یوں کی جاسکتی ہے "متحد الجنس والقدر" مالِ معصوم کا ہر وہ قدر زائد جو کسی عقد معاوضہ میں مشروط طور پر خالی عن العوض ہو کر عاقدین میں کسی کا حق تسلیم کرلیا جائے وہ ربوا شرعی اور حرام قطعی ہے۔ مسلمانوں کے حق میں اس کی حرمت کا دائرہ ہر زمان اور ہر مکان کو محیط ہے۔ "یاایہا الذین اٰمنوا لاتاکلوا الربوا" "احل اللہ البیع وحرم الربوا" "یاایہا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وذروا مابقی من الربا ان کنتم مؤمنین فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ" جیسی محکم نص قطعی کے اطلاق وعموم کا تقاضہ یہی ہے

(۲) دارالاسلام کے ساتھ جس دار کفر کی جنگ ومحاربت اور چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہو یا متوقع ہو ایسے دارالحرب کے حربی کافر چونکہ غدراً قہراً بقدر استطاعت ہر ممکن طریقہ سے مسلمانوں کے مال لوٹنے اور لینے میں کوئی باک نہیں رکھتے اور موقعہ ملنے پر مسلمانوں کے جان ومال کو برباد کیا کرتے ہیں یا اس طرح کے خطرات مظنون ہوتے ہیں اس لئے ہمارے خیال میں آیت قرآنی "فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ" اور "ان عاقبتم فعاقبوا بمثل ماعوقبتم بہ"

پر نظر رکھ کر اگر کوئی مسلمان بلا امن حاصل کئے چوری چھپے کسی طرح دار الحرب چلا جائے اور بشمول ربوا کسی بھی عقد فاسد حتی کہ سرقہ وغصب کے ذریعہ حربی کا مال حاصل کر کے دار الاسلام تک بچا کر لے آئے تو درحقیقت بلا غدر ایک مباح الاصل غیر مضمون اور غیر معصوم مال پر یک گونہ استیلاء ہو جائے گا اور بطریق فئے جائز کہا جا سکتا ہے اور ہماری سمجھ کے مطابق صرف یہی وہ ایک صورت ہے جس میں بظاہر معاملہ ربوا عقود فاسدہ یا سرقہ وغصب ہونے کے باوجود درحقیقت مال ماخوذ کے غیر معصوم، غیر متقوم، غیر مضمون اور مباح الاصل ہونے کی بنیاد پر اسے شرعاً ربوا وغیرہ نہیں کہا جا سکتا۔

اس کے علاوہ کسی بھی صورت میں حربی کا مال بشمول ربوا کسی بھی عقد حرام کے ذریعہ لینا جائز نہیں، سلف وخلف جمہور علماء وفقہاء کی یہی رائے ہے اور دلائل کے اعتبار سے اقرب الی الصواب بھی ہے۔ احناف میں سے حضرت امام ابو یوسف فرماتے ہیں "لایجوز للمسلم فی دار الحرب الاما یجوز له فی دار الاسلام" (بدائع الصنائع ص۱۳۲ ج۷)

صرف اس ایک حدیث لاربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب" سے استدلال کیسے صحیح ہو سکتا ہے جسے علامہ ابن ہمام "هذا الحديث غريب" اور امام شافعی علیہ الرحمۃ "هذا الحديث ليس بثابت ولا حجة" (فتح القدیر ص۱۷۸ ج۶) فرماتے ہیں پھر حرف نفی "لا" کے للنہی اور للنفی دونوں ہونے کا احتمال ہے اور "اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال" مشہور قاعدہ ہے۔ اسی طرح سیغلبون فی بضع سنین" کی قرآنی پیشن گوئی پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے شرط لگانے اور قمار کے واقعہ سے یا حضرت عباس رض کے معاملہ ربوا سے بھی استدلال مجروح ومخدوش ہی ہے، باخبر حضرات ان سے متعلقہ بحثوں، تاویلات وتوجیہات اور اس کے اندر مخفی احتمالات جو ناشی عن دلیل ہیں اس سے ناواقف ہرگز نہ ہوں گے۔ ان محتمل دلائل کو حدیث وقرآن کے محکم نصوص کے سامنے لانا بہرحال حقیقت کی ترجمانی نہیں ہے۔ قرآن نے واخذهم الربوا وقد نهوا عنه میں اہل کتاب کو اپنے ہی دار میں جو دار اسلام یقیناً نہیں تھا اخذ ربوا کی بنیاد پر مستحق عذاب کہا ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصاریٰ نجران کو متنبہ کیا تھا "من اربی فلیس منا" اور مجوس ہجر کو دھمکایا تھا "اما ان تدعوا الربوا او تاذنوا بحرب من الله ورسوله" کیا ایسی محکم اور شدید وعید کی موجودگی میں ایک مسلمان کے لئے کبھی اور کہیں بھی حلت ربوا کی گنجائش نکل سکتی ہے؟

سارے ائمہ کا اتفاق اور امت کا اجماع ہے اگر کوئی حربی کافر دارالاسلام میں امن حاصل کرکے داخل ہو تو اس کی جان اور مال معصوم ہو جاتا ہے چنانچہ اگر وہ اپنی رضامندی سے بھی مسلمان کے ساتھ عقد فاسد کرے تب بھی مسلمانوں کے لئے عقد فاسد کے ذریعہ اس کافر کا مال حاصل کرنا جائز نہیں کہ یہ غدر ہے، خلافِ امن ہے ــــ لیکن جب ایک مسلمان حربی سے امن حاصل کرکے دارالحرب جاتا ہے تو حضرت امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک حربیوں کا مال اصلاً مباح اور غیر مضمون اور غیر معصوم ہی رہتا ہے اس لئے غدر کے بغیر ہر طرح اس کا مال حاصل کرنا جائز رہے گا۔ کیا حربی جو مسلمان کو امن دیتا ہے تو وہ اس تصور و یقین کے ساتھ دیتا ہے کہ اس عقد استیمان کے بعد بھی مسلمان ہمارے مال کو مباح و غیر معصوم سمجھ کر برباد کرے گا اور کرسکتا ہے نہیں اس سے ہمہ وقت ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہئے ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ اس یقین و اعتماد کے ساتھ مطمئن ہوکر اسے امن دیتا ہے کہ جب تک یہ ہمارے یہاں رہے گا ہمارے جان و مال سے ہماری غفلت کی حالت میں بھی تعرض نہیں کرے گا بلکہ احترام کرے گا نہیں کسی طرح کا نقصان پہونچانے کی کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا، جذبۂ عداوت نہیں بلکہ خیر خواہانہ جذبہ کے ساتھ رہے گا اور وہ مسلمان امن حاصل کرکے حربیوں کے اس اعتماد و یقین کی گویا تصدیق کرتا ہے اس کے باوجود اگر یہ مسلمان مستامن عقد حرام کے ذریعہ بظاہر حربیوں کی رضامندی سے اس کے مال کا نقصان کر رہا ہے تو اسے درحقیقت خلاف عہد اور غدر کیوں نہیں کہا جائے گا۔

فقہاء لکھتے ہیں "الکفار مخاطبون بالحرمات" (بدائع ج۷ ص۱۳۲) تو اگر حربی کافر اپنی جہالت اور سفاہت سے اس عقد حرام پر راضی ہو جائے تو کیا مسلمان کے لئے کسی کی جہالت و سفاہت سے غلط فائدہ اٹھانا اور نقصان پہونچانا ظلم و غدر نہیں کہا جائے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ کسی مستامن کے مال و جان کی عصمت اور اس سے تعرض کرنے کی حرمت میں دار کو دخل نہیں بلکہ عقد امن کو دخل ہے چنانچہ حربی بلا امن حاصل کئے اگر دارالاسلام میں داخل ہو جائے تو اس کی جان اور مال غیر معصوم اور مباح ہی رہتا ہے اور عقد امن کے بعد جانی و مالی عصمت طرفین کے لئے حاصل ہو جاتی ہے اس لئے حربی مستامن دارالاسلام میں آئے یا مسلم مستامن دارالحرب میں جائے ہر جگہ دونوں کو ایک دوسرے کے جان و مال سے تعرض کرنا جائز نہیں اور غدر کہا جاتا ہے۔

اب بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حربی مستامن جب دارالاسلام میں آتا ہے تو اس کی رضامندی کے باوجود عقد حرام کے ذریعہ اس کے مال حاصل کرنے کو تعرض حرام اور غدر کہدیا جاتا ہے گویا رضا ر حربی نے اس عقد حرام کو تعرض ممنوع اور غدر ہونے سے نہیں نکالا لیکن جب مسلم مستامن دارالحرب جاتا ہے اور حربی کی رضامندی سے عقد حرام کے ذریعہ اس کا مال حاصل کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ غدر نہیں گویا رضا ر حربی دارالحرب میں اس عقد حرام کو تعرض ممنوع اور غدر ہونے سے نکال دیتی ہے، اس فرق کی کوئی معقول وجہ نہیں ــــ جبکہ رضا ر حربی دونوں جگہ موجود ہے اور عقد امن جس سے عصمت اور تعرض کی حرمت طرفین کے لئے پیدا ہوتی ہے وہ بھی دونوں شکلوں میں پایا جاتا ہے۔

اس لئے میرا خیال یہی ہے کہ اس مسئلہ میں امام ابو یوسف اور دگر حضرات ائمہ رحمہم اللہ کی رائے ہی کو قبول کر لینا چاہئے اور دارالحرب دارالاسلام کی تفریق کئے بغیر علی الاطلاق ربوٰا شرعی کو حرام قرار دیا جائے۔ البتہ دیانت قضا کے حکم مختلف کی روشنی میں ہو سکتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے قول کو باب قضا میں داخل کیا جائے اور کہا جائے کہ اگر کوئی مسلم مستامن دارا لحرب میں جاکر برضار حربی بشمول ربوا عقود فاسدہ کے ذریعہ مال حاصل کرے گا تو اسے قاضی شریعت فاسق و فاجر مان کر مردود الشہادہ نہیں کہے گا اس پر ضمان اتلاف اور مال کی واپسی کا فیصلہ نہیں کرے گا لیکن دیانۃً از روئے فتویٰ کسی مسلمان کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب

(۳) یہ تو ایک حقیقت مسلمہ ہے کہ "الکفر ملۃ واحدۃ" اس لئے پوری دنیا مذہب و ملت کے اعتبار سے دو ہی قوم اور دو ہی جماعتوں میں منقسم ہو سکتی ہے مسلم، کافر، اور فقہاء لکھتے ہیں لان البقعۃ تنسب الینا اوالیھم باعتبار القوۃ والغلبۃ (المبسوط للسرخسی ص۱۰۳ ج۱۰) اس لئے دار کی بنیادی طور پر تو دو ہی قسمیں نکل سکتی ہیں "دارالاسلام، دارالکفر" جس کو ایک حدیث میں "ارض عدو" سے تعبیر کیا گیا ہے " لا تسافروا بالقرآن الی ارض العدو" (فتح القدیر ص۳۴۰ ج۵) مبسوط کی مذکورہ عبارت سے دونوں داروں کی یہ تعریف واضح ہو رہی ہے کہ جہاں مسلمانوں کو قوت و غلبہ حاصل ہو وہ دارالاسلام ورنہ دار کفر کہا جائے گا۔ اب اس کے بعد دارالاسلام کے ساتھ صلح و امن کے معاہدہ ہونے اور نہ ہونے کے اعتبار سے اس دار کفر کو کبھی دارالحرب تو کبھی دارالامن یا دار العہد والصلح کہا جاتا ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر زید حماد استاد جامعہ ام القری مکہ مکرمہ اپنی تالیف "احکام التعامل بالربا بین المسلمین وغیرالمسلمین" میں علامہ ابن قیم کی مشہور تصنیف "احکام اہل الذمۃ ج۲ ص۴۷۵" کے حوالہ سے دارکفر کی یہ تقسیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اننا لو تتبعنا خصائص دار الحرب و مقوماتها فی کلام الفقهاء لوجدنا انها تتحقق عند اجتماع وصفین احدهما ان تکون الغلبة فیها والسلطة والمنعة لاحکام الکفر، والثانی ان تکون فی حالة حرب واقعة او متوقعة مع دار الاسلام" یعنی اگر ہم کلام فقہاء میں دارالحرب کی خصوصیات اور اس کے بنیادی اوصاف کا تتبع کریں گے تو دیکھیں گے کہ جب کسی دار میں دو وصف کا اجتماع ہوتا ہے تب ہی فقہاء اسے دار حرب کہتے ہیں ایک احکام کفر و شرک کا شیوع و ظہور اور غلبہ و تسلط ہونا دوسرے بحالت موجودہ یا آئندہ دارالاسلام کے ساتھ اس کی جنگ کا متوقع ہونا ـــــ چند صفحات کے بعد اسی احکام اہل الذمہ ص۴۷۵ ج۲ کے حوالہ سے علامہ ابن قیم کا قول نقل کرتے ہیں "الکفار اما اهل حرب واما اهل عهد، واهل العهد ثلاثة اوصاف، اهل ذمة، اهل هدنة واهل امان، وقد عقد الفقهاء لکل صنف بابا فقالوا باب الهدنة، باب الامان، باب عقد الذمة، ولفظ الذمة والعهد یتناول هؤلاء کلهم فی الاصل وکذلک لفظ الصلح"

اس کے بعد علامہ ابن قیم ذمہ وصلح کے معنی بیان کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں "اهل الهدنة فانهم صالحوا المسلمین علی ان یکونوا فی دارهم سوا کان الصلح علی مال اوغیر مال لا تجری علیهم احکام الاسلام کما تجری علی اهل الذمة لکن علیهم الکف عن محاربة المسلمین وهؤلاء یسمون اهل العهد واهل الصلح واهل الهدنة"

اس تفصیل کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ کفار یا تو محارب ہوں گے یا معاہد۔ پھر اگر یہ عہد دارالاسلام کی شہریت مستقل قیام اور ادا جزیہ پر ہو تو ذمی ورنہ مستامن کہلائیں گے۔ لیکن اگر اپنے دارکفر میں ہوتے ہوئے باہمی امن و آشتی اور ایک دوسرے سے عدم تعرض کا معاہدہ ہو تو یہ اہل ہدنہ، اہل صلح اور اہل امن کہلائیں گے جس پر ذمیوں کی طرح احکام اسلام کا اجراء تو نہیں ہوگا مگر ان پر مسلمانوں کے ساتھ محاربہ و تعرض سے باز رہنا لازم رہے گا۔

اس تفصیل کا حاصل یہی نکلا کہ بنیادی طور پر "دار" دو قسموں میں منحصر ہے البتہ دارکفر کی دو مختلف حیثیتوں کے سبب ذیلی طور پر دو قسمیں بن جاتی ہیں ایک دارالحرب اور دوسری دارالصلح والعہد یا دارالامن کی" اور ظاہر ہے کہ دارالحرب کے حربیوں کی جان یا اس کا مال

فی نفسہ مباح غیر مضمون ہوگا اس سے تعرض کرنا ممنوع نہیں ہوگا، لیکن دارالامن دار العہد والصلح کے کفار کی جان یا مال سے تعرض کرنا معاہدہ کے بعد مستلزم غدر و خیانت ہونے کے سبب شرعاً ممنوع رہے گا اور یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ معاہدہ کے نتیجہ میں جان و مال کی عصمت اور تعرض کی حرمت طرفین کے لئے ثابت ہوتی ہے۔ یہاں یہ بحث تقریباً غیر متعلق ہے کہ کوئی دارالحرب، دارالاسلام، یا کوئی دارالاسلام، دارالحرب" کب بن جاتا ہے اور اس کے کیا شرائط ہیں، تاہم کوئی حرج نہیں اگر مختصراً اتنا کہہ دیا جائے کہ حضرات صاحبینؒ کے نزدیک کسی دارالحرب کے دارالاسلام بننے کے لئے صرف اتنا ضروری اور کافی ہے کہ قہراً فتح کے بعد وہاں مسلمانوں کو ایسا غلبہ و تسلط اور قوت حاصل ہو جائے کہ احکام اسلام جاری ہو جائیں اس کے اجراء میں کفار کی طرف سے کوئی رکاوٹ ممکن نہ ہو، لیکن امام ابوحنیفہؒ تین شرطوں کے ساتھ مشروط کرتے ہیں ــــ اجراء احکام شرعیہ، اس دار کے مقیم مسلمانوں کے لئے ثبوت امن اور اس کا دارالاسلام سے اتصال۔

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں "دار الحرب تصیر دار الاسلام باجراء و ثبوت الامن للمقیم من المسلمین و کونہا متاخمۃ لدار الاسلام علی قولہ و علی قولہما بالاول فقط (فتح القدیر ج۵ ص۳۲۳)"

علامہ سرخسی لکھتے ہیں "ھذا دلیل ان الامام اذا افتتح بلدۃ و صیرھا دار الاسلام باجراء احکام الاسلام فانہ یجوز تقسیم الغنائم فیہا و قد طال مقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بخیبر بعد الفتح و اجری احکام الاسلام فیہا فکانت من دار الاسلام (مبسوط ج۱۰ ص۱۹)۔

سرخسی کی یہ روایت حضرات صاحبین کی رائے کے عین مطابق ہے۔

بعینہ اسی طرح کا اختلاف رائے "کسی دارالاسلام کا دارالحرب بننے کے متعلق ہے، صاحبین صرف احکام شرک کے غلبہ و ظہور کے بعد دارالاسلام کا دارالحرب بن جانا تسلیم کر لیتے ہیں مگر امام ابوحنیفہؒ بدلی ہوئی شکل میں انہیں تین شرطوں کے ساتھ مشروط کرتے ہیں کہ دارالاسلام پر جب کفار کو فتح حاصل ہو جائے اور یہ مفتوحہ علاقہ دوسرے دارالحرب سے متصل بھی ہو اس کے بیچ کوئی دوسرا دارالاسلام نہ ہو اور اس مفتوحہ دار میں کوئی مسلم یا ذمی اپنے ایمان یا امن کے ساتھ مامون نہ ہوں اور احکام کفر و شرک کا غلبہ و ظہور ہو جائے تب وہ دارالحرب قرار دیا جائے گا۔"

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اختلاف دراصل کوئی اساسی اور بنیادی نہیں ہے اتنی بات تینوں حضرات کے درمیان تقریباً متفق علیہ ہے کہ دار کی تبدیلی کا اصل مدار قہر و قوت اور غلبہ و

تسلط کی تبدیلی ہے اب اس کے بعد حضرات صاحبین حکم اسلامی، یا حکم کفر و شرک کے اجراء اور ظہور و شیوع کو قوت و شوکت اور غلبہ و تسلط کی تبدیلی کی دلیل تسلیم کر لیتے ہیں مگر امام ابو حنیفہؒ قہر تام اور محکم و پائیدار غلبہ و تسلط پر اسے موقوف رکھتے ہیں اور چونکہ غلبہ و تسلط کا احکام اور قوت و شوکت میں تمامیت کی شان ان تین شرطوں کے بغیر ممکن نہیں اس لئے محض اجراء احکام شرع یا احکام کفر سے دار کی تبدیلی کے قائل نہیں۔ علامہ سرخسی کی درج ذیل طویل عبارت اس پر نص صریح ہے۔

والحاصل ان عند ابی حنیفة رحمه الله انما تصیر دارهم دار حرب بثلاث شرائط احدها ان تكون متاخمة ارض الشرك ليس بينها و بين ارض الحرب دار المسلمين والثانی ان لا يبقیٰ فيها مسلم آمن بايمانه ولا ذمی آمن بامانه والثالث ان يظهروا احكام الشرك فيها، وعن ابی يوسف ومحمد رحمهما الله اذا اظهروا احكام الشرك فيها فقد صارت دارهم دار الحرب، لان البقعة انما تنسب الينا او اليهم باعتبار القوة والغلبة فكل موضع ظهر فيه احكام الشرك فالقوة فی ذالك الموضع للمشركين فكانت دار حرب وكل موضع كان الظاهر فيه حكم الاسلام فالقوة فيه للمسلمين ولكن ابوحنيفةؒ يعتبر تمام القهر والقوة، لان هذه البلدة كانت من دار الاسلام محرزة للمسلمين فلا يبطل ذالك الاحراز الا بتمام القهر من المشركين وذالك باستجماع الشرائط الثلاث لانها اذا لم تكن متصلة فاهلها مقهورة باحاطة المسلمين (مبسوط ص۱۱۴)

لیکن ان بحثوں سے قطع نظر موجودہ ہندوستان کو بہرحال دار الحرب نہیں کہا جا سکتا زیادہ سے زیادہ یہ ایک دار کفر ہے اور جمہوریت دستوری یا قانونی طور پر تمام شہریوں کے لئے مختلف انداز کی ضمانت و معاہدہ کی بنیاد پر اسے دار الامن، دار العہد والصلح کہا جائیگا جس کے احکام کی طرف مختصراً اشارہ اوپر گذر چکا ہے۔

(۴) جن بنکوں کا نظام سود لینے دینے پر مبنی ہو ان میں بغرض انتفاع رقم جمع کرنا ہی جائز نہیں کہ یہ مال غیر کے اکل باطل اور تعاون فی الاثم والعدوان کو مستلزم ہے ہاں ضیاع مال کے خطرات اور سرقہ و غصب وغیرہ کے متوقع ضرر کو دفع کرنے کی نیت سے ان بنکوں میں روپے جمع کرنا ضرورتاً جائز کہا جا سکتا ہے اس کے بعد اس پر ملنے والے سود کو لینا بنیادی طور پر صحیح نہیں۔ اگر کسی قومی اور دینی مصالح کی بنیاد پر لے لیا جائے

توبلانیت ثواب غربار ومساکین پر واجب التصدق ہوگا تاکہ کسی طرح مال حرام سے ذمہ فارغ ہو جائے۔

(۵) سود کا لینا تو حرام لعینہ ہے اور دینا حرام لغیرہ جس کا ارتکاب بوقت حاجت شرعی جائز ہو جاتا ہے، فقہ کا مشہور جزئیہ "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" اس کی دلیل ہے۔ باقی رہا حاجت شرعیہ کی شکل میں مجبوریوں کے تحقق کا سوال تو یہ اسلامی غیر اسلامی ہر دو ملکوں میں بھی ہو سکتا ہے اور دونوں کا حکم یکساں ہی ہوگا۔

(۶) شریعت اسلامیہ میں حاجت اس صورت حال کو کہا جاتا ہے جس میں قدرتی طور پر اتفاقاً ذہنی وجسمانی اذیت سے سابقہ پڑ جائے یا مال قلیل کے ضیاع کا خطرہ لاحق ہو جائے ایسی صورت میں حرام لغیرہ کے ارتکاب کی شرعاً اجازت مل جاتی ہے اور اسی حرام لغیرہ کا ایک فرد سود دینا بھی ہے۔

درمختار میں ضرورت وحاجت حرج ومشقت وغیرہ اعذار کی تفصیل اور اس کا حکم دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے معاش کی تنگی اور حقوق لازمہ کی ادائیگی پر بظاہر اسباب عدم قدرت کے سبب ذہنی وجسمانی اذیت وتکلیف سے دوچار ہو یا اپنے مال کی حفاظت کے لئے مثلاً مزید کچھ مال کی ضرورت محسوس ہو اور کسی دوسرے بے غبار جائز طریقے سے فی الحال مال حاصل کر کے ضیاع کے خطرہ میں آئے ہوئے مال کی حفاظت کا کوئی راستہ نہ ہو تو ایسی صورت میں یقیناً سودی قرض لینا جائز کہا جائے گا۔

(۷) بے شک قانونی طور پر ترقیاتی منصوبوں کے لئے قرضوں کی مختص رقم سے استفادہ کا حق عام ہندوستانیوں کی طرح ہر مسلمان کو حاصل ہے اور ایسی صورت میں بظاہر اپنا حق وصول کرنے کے لئے رشوت کی طرح سود دینے کا بھی جواز محسوس ہوتا ہے مگر قابل غور یہ نکتہ ہے کہ شریعت اسلام مال ودولت کی کثرت اور معاشرتی طور پر مفروضہ ترقیات اور رہن سہن کی اونچی سطح اور اسے بلند سے بلند تر کرنے کی فکر و خواہش کو کسی نظر سے دیکھتی ہے اور اس کی کس حد تک حوصلہ افزائی کرتی ہے اس کے ساتھ حکومت کے خزانے میں طیب وخبیث کے امتیاز کے بغیر کیسے کیسے مال جمع ہوا کرتے ہیں یہ بھی پیش نظر رہے کیا ایسی صورت میں محض تجارت وصنعت وحرفت کی ترقی کے

لئے جو کوئی شرعی حاجت نہیں ایک حرام لغیرہ کے ارتکاب اور سودی قرضہ لینے کی اجازت دی، جاسکتی ہے؛ میرا خیال یہی ہے کہ حضرت عمرؓ کے مشہور قول "دعوا الربا والريبة" کی روشنی میں اس کا بھی حال عام سودی قرضوں کی طرح ہوگا اور اسے جائز نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں! بوقت حاجت دفع حاجت کی حد تک تعمیر مکان کے لئے استقراض بالربح کا استثناء کیا جاسکتا ہے، واللہ اعلم

(۸) ہاں یہ شکل جو ایک ہی معاملہ قرض سے متعلق ہے جس میں چھوٹ دینے اور سود لینے کا تناسب مساوی ہوتا ہے اور محض صورۃً زمانی طور پر چھوٹ دینے اور سود لینے میں تقدم و تاخر ہوتا ہے لیکن حقیقتاً انجام و نتیجہ کے اعتبار سے مستقرض یا مقرض کسی کے پاس کوئی قدر زائد خالی از عوض ہوکر نہیں رہ پاتا، یقیناً جائز ہونا چاہئے کہ "الفضل ربوا" کا تحقق نہیں ہوا۔

(۹) یہاں دو صورتیں ہیں ایک تجارت کی محض ترقی کیلئے سودی قرض لینے کی اس کا حکم جواب کے ضمن میں معلوم ہوگیا کہ صحیح نہیں دوسری صورت ہے اپنی ترقی یافتہ تجارت کا کوئی کاروبار درآمد برآمد کی شکل میں غیر ممالک کے ساتھ کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ کاروبار تو ممنوع نہیں "فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ" سے اس کی اجازت مل رہی ہے اب اگر ان غیر ممالک سے تجارت کے دوران کسی بین الاقوامی تجارتی ضابطہ کے تحت سود دینا پڑے تو اپنے مال کو نقصان سے بچانے کے لئے اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس کاروبار کے اندر بھی تو ترقی تجارت ہے اور محض ترقی تجارت کیلئے سود دینے کو پہلے ناجائز کہا جاچکا ہے، فقہ کے مشہور قاعدہ "کم من شئ یثبت ضمناً لایثبت قصداً" سے اس شبہ کا دفع ہوسکتا ہے۔ بہرحال یہ شق تو ہمارے خیال میں جائز ہونی چاہئے، لیکن دوسری شق جس میں سود ملتا ہے تو وہ سود لینا صحیح نہیں، بقدر سود حاصل شدہ رقم کو واجب التصدق ہی کہا جائے گا۔ واللہ اعلم

(۱۰) بینک کے مالک افراد و اشخاص ہوں یا حکومت، کسی بھی بینک سے بلا حاجت شرعیہ سودی قرض لینا جائز نہیں کہا جاسکتا۔

(۱۱) سوال میں درج ذیل تفصیل کے مطابق اپنی صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے بلا حاجت شرعیہ پرائیویٹ سرمایہ کاروں سے بھی سودی قرض لینا جائز نہیں کہا جاسکتا۔

ہاں اگر وہ سرمایہ کار بذات خود مثلاً ٹرک وغیرہ خریدے اور اصل قیمت پر حساب کے مطابق ممکنہ سود کی رقم کو اصل قیمت میں ضم کرکے مجموعہ کے بدلے وہ ٹرک کسی خواہش مند کے حوالہ کرے اور پھر کل رقم قسط وار وصول کرے تو یہ صورت ایک جواز کی ہوسکتی ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

ضمیمہ سوال نمبر ۱

بعض معاملات جو سودی معاملات کہے جاتے ہیں

کیا وہ بہ اعتبار شرع بھی سودی معاملات ہیں

(۱) ——— سید امین الحسن رضوی فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ہمدرد تغلق آباد نئی دہلی

سود کو اسلام نے مطلقاً حرام قرار دیا ہے، یہ بات شبہ کی ادنیٰ ترین رمق سے بھی پاک ہے دوسری بات یہ کہ سود خواہ مفرد ہو یا مرکب خواہ وہ جسے انگریزی میں (INTEREST) کہا جاتا ہے یا وہ جسے انگریزی کا لفظ (USUARY) ہے، اپنی تمام صورتوں میں حرام ہے، شرح سود کی کمی بیشی یا شرائط ادائیگی میں سختی یا سہولت کے عوامل سے سود کی مطلق حرمت پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتے، اسلام کی نظر میں یہ اتنا سنگین گناہ ہے کہ اس کی طرح کا وسیع الاطراف گناہ کوئی اور نہیں، یعنی سود کا لینے والا دینے والا سودی معاملے کی دستاویز لکھنے والا اور اس پر گواہ بننے والا، سب کو یکساں درجہ کا گناہ ہوگا، مزید یہ بات بھی اہم ہے کہ اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کو بعض شرائط کے تحت خنزیر پالنے، کھانے، شراب کشید کرنے اور استعمال کرنے حتیٰ کہ اپنے منادر و کلیسا بنا کر شرک جیسا شریعت کی نظر میں ناقابل معافی گناہ کرنے تک کی آزادی شریعت عطا کرتی ہے، لیکن نہیں اجازت ہے تو ان غیر مسلموں کو آپس میں سودی لین دین کرنے کی خواہ وہ اہل ذمہ ہوں یا معاہد ومستامن۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سود اپنی ہر شکل میں مطلقاً حرام ہے، اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں، لیکن شبہ مجھے ان معاملات کے بارے میں ہے جنہیں تو سودی معاملہ کہا جاتا ہے لیکن مجھے اطمینان نہیں کہ وہ بہ اعتبار شرع بھی سودی معاملات کہلائے جا سکتے ہیں، میری معروضات کی بنیاد یہ اصول ہے کہ سود وہ ہے جو بہ اعتبار شرع سود ہو نہ کہ وہ جسے لوگ سود کہتے ہوں، اور اسی طرح ہر وہ معاملہ سودی معاملہ ہوگا جو بہ اعتبار شرع سودی معاملہ ہو خواہ دنیا اسے سود نہ کہے، میں چند مثالوں سے اپنے مدعا کو واضح کرتا ہوں۔

۱۔ پورے ہندوستان میں قانون حصول اراضی (LAND ACQUISITION ACT) نافذ ہے اس قانون کے تحت حکومت کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی بھی جائداد غیر منقولہ مثلاً اراضی، باغات، مکانات وغیرہ کو جب چاہے مفاد عام کی ضرورت کے پیش نظر مالک جائداد کی رضامندی کے بغیر بہ ادائیگی معاوضہ حاصل کر سکتی ہے۔ عملی طور پر اس کی دو صورتیں ہیں؛ پہلی تو یہ کہ حکومت پہلے اس بات کو مشتہر کرتی ہے کہ فلاں جائداد مفاد عامہ کے پیش نظر حکومت حاصل کرنا چاہتی ہے جن لوگوں کو اس پر ادعائے ملکیت ہو وہ رجوع ہوں اور اس جائداد کی بازاری قیمت کے بارے میں اپنا تخمینہ پیش کریں؛ اس کے بعد افسر متعلقہ چند رہنما اصولوں کی روشنی میں اس جائداد کی قیمت متعین کرتا ہے اور وہ رقم مالک کو پیش کی جاتی ہے اور پھر حکومت اس جائداد کو اپنے قبضہ میں لیتی ہے اگر مالک جائداد اس رقم سے غیر مطمئن ہو تو وہ درخواست دیتا ہے کہ تعین قیمت کے لئے معاملہ سپرد عدالت کر دیا جائے؛ پھر عدالت تحقیقات کا عمل شروع کرتی ہے اور شہادت لے کر خود قیمت کا تعین کرتی ہے۔ عدالت جس کا تعین کرتی ہے، وہ اگر حکومت کی تعین کردہ مالیت سے زیادہ ہو تو عدالت یہ بھی حکم دیتی ہے کہ اس کی متعین کردہ قیمت اور حکومت کی مقررہ کردہ قیمت میں جتنا فرق ہے اس قیمت پر اس مدت کے لئے چھ فیصد سالانہ کی شرح سے سود بھی ادا کیا جائے۔ جو مقدمہ کے سپرد عدالت ہونے کے بعد سے عدالت کے فیصلے تک اور اس کے نقل میں حکومت کی طرف سے بقیہ رقم مالک جائداد کو ادا ہونے تک گزرے، یہ مدت بالعموم دو یا تین سال ہوتی ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ حکومت کو اگر جائداد کے حاصل کرنے کی فوری ضرورت ہوتی ہے تو حکومت صرف ایک اعلان جاری کر کے جائداد پر فوراً قبضہ کر لیتی ہے اور بعد کو اس جائداد کے مالکوں کو طلب کرتے اور ان سے اس جائداد کی مالیت کا تخمینہ حاصل کرتے اور پھر خود جائداد کی مالیت کا تعین کرنے کا عمل شروع کرتی ہے جس کے مکمل ہونے تک دو سال کا عرصہ گزر ہی جاتا ہے، اس کے بعد افسر بالآخر متعلقہ مالیت کا تعین کرتا ہے تو قانوناً یہ لازم ہے کہ جائداد پر قبضہ کئے جانے والی تاریخ سے مالیت کا تعین کئے جانے کی تاریخ تک کے عرصہ کے لئے اس پوری قیمت پر چھ فیصد سالانہ شرح سے سود بھی قیمت میں شامل کرے اس کے بعد عدالت سے رجوع کرنے کا وہی عمل بھی ہو سکتا ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس جائداد کی اصل قیمت پر یہ جو زائد رقم بعنوان "سود" قانوناً دی جاتی ہے کیا وہ شریعت کی نگاہ میں بھی سود اور نتیجۃً حرام ہے؟ ایک تو یہ کہ اس پورے معاملہ میں نہ

تو معروف معنی میں راس المال ہے اور نہ ہی قرض کا کوئی عنصر۔ دوسرے یہ کہ اس معاملہ کی مذکورہ اول صورت میں یعنی جبکہ حکومت نے جائیداد پر قبضہ کر لیا ہو اور بعد کو تعین قیمت کا عمل شروع کر کے سال دو سال بعد قیمت ادا کرے، تو کیا بعنوان سود دیے جانے والی اس اضافی رقم کو مالک جائیداد کی اپنی ملکیت سے حق انتفاع سے اس مدت کے لئے محروم رہنے کا معاوضہ نہیں سمجھا جا سکتا، مان لیجئے کہ ایک اسلامی حکومت میں ایسا ہی حصول اراضی کا قانون نافذ ہو بس اس فرق کے ساتھ کہ موجودہ قانونی اضافہ کو سود لینا اور بعنوان سود ادا کرتا ہے۔ اسلامی حکومت کا قانون اسی اضافہ رقم کو حق انتفاع واستفادہ سے محرومی کا معاوضہ کہے تو کیا اسلامی حکومت کے قانون کے تحت اس عنوان سے یعنی بعنوان ہرجانہ دیا جانے والا اضافہ سود نہ ہوگا اور حکومت کے لئے اس کا دینا اور مالک جائیداد کے لئے اس کا لینا جائز ہوگا؟

اگر جواب اثبات میں ہو تو وہی اضافہ رقم جو موجودہ قانون کے تحت بعنوان "سود" دی جاتی ہے، وہ اپنی عین میں سود نہیں ہے اور اس کا لینا بھی جائز ہونا چاہئے، اس معاملے کی اوپر مذکورہ صورت دوم کے بارے میں بھی بعنوان "سود" دی جانے والی زائد رقم کے تعلق سے بھی میرے شبہے کی یہی بنیاد ہے کہ آج جو قیمت مالک جائیداد کو ادا کی گئی لیکن ایک عرصہ بعد عدالت نے اس کو غیر واجبی قرار دے کر اس میں اضافہ کر دیا اور اضافہ شدہ رقم اور پہلی دی ہوئی رقم کے فرق پر چھ فیصد سالانہ کی شرح سے سود کے عنوان سے دلوائی تو کیا بہ عنوان "سود" دلائی گئی اس زائد رقم کو حقیقی وصول طلب رقم اور اس کے استفادہ سے اس عرصہ میں محروم رہنے کا معاوضہ یا ہرجانہ قرار نہیں دیا جا سکتا اور اگر کوئی اسلامی حکومت اپنے قانون میں اس زائد رقم کو معاوضہ یا ہرجانہ قرار دے کر ادا کرنے کی گنجائش رکھے تو علماء اسے شرعاً سود قرار دے کر اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دیں گے؟

مذکورہ بالا مثال میں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس صورت میں قرض کا عنصر موجود نہیں ہے، جو سود کی تقریباً تمام ہی صورتوں میں موجود ہوتا ہے۔

۲۔ (دوسری مثال)۔ فلاحی ریاست کے تصور کے تحت حکومت کی طرف سے کاشتکاروں کو زرعی ترقیاتی قرضے دیے جاتے ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ ہو تاکہ ملک کی بڑھتی ہوئی غذا کی ضروریات کی تکمیل ہو سکے اور دوسرے ملکوں سے غلہ درآمد کرنے کی ضرورت نہ رہے اور نتیجۃً بیرون زرمبادلہ کی بچت ہو وغیرہ۔ یہ قرضے مثلاً سینچائی کی غرض سے کنویں

کھودنے ٹیوب ویل لگانے اور ٹریکٹر وغیرہ خریدنے کے لئے دیئے جاتے ہیں اور ایک مقررہ شرح سود کے ساتھ قسطوں پر واپس لئے جاتے ہیں ان قرضوں کے لئے وصول ہونے والی درخواستوں کی تنقیح سے لے کر درخواست گزار کو رقم کی ادائیگی اور پھر اس کی بالاقساط واپس وصولی تک کے عمل میں متعدد سرکاری اعمال کی کارکردگی شامل ہوتی ہے اور بحیثیت مجموعی اس شعبے کے نظم کے لئے حکومت کو خاصے مصارف برداشت کرنے ہوتے ہیں، جبکہ ان قرضوں کو دینے سے حکومت کا مقصد نفع کمانا ہرگز نہیں ہوتا۔

میرا سوال یہ ہے کہ ان معاملات میں حکومت اپنے راس المال پر مدت کے معاوضے میں جو اضافہ رقم ایک متعین شرح سے بعنوان سود وصول کرتی ہے اس کی بجائے اگر وہ اس زائد رقم کو انتظامی مصارف قرار دے کر وصول کرے جبکہ فی الواقع واقعی اس معاملہ میں حکومت پر مصارف کا اچھا خاصا بوجھ پڑتا ہی ہے تو کیا راس المال پر وہ اضافہ شرعاً جائز ہوگا اور مسلمانوں کے لئے اس نظم کے تحت قرض لینا اور کچھ اضافے کے ساتھ واپس کرنا مباح ہوگا؟

اگر جواب اثبات میں ہے تو کیوں نہ اسی پر موجودہ صورت معاملہ کو قیاس کرتے ہوئے بعنوان "سود" وصول کی جانے والی رقم کو انتظامی مصارف سمجھ کر مباح قرار دیا جائے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ عرض کردوں، چند برس ہوئے کہ ایشیائی ترقیاتی بینک (ASIAN DEVELOPMENT BANK) کے ایک ڈائریکٹر جو پاکستانی تھے میری گفتگو ہو رہی تھی انہوں نے مجھے بتایا کہ بعض مسلم ملکوں کی حکومت نے بینک سے نمائندگی کی کہ یہ بینک چونکہ سود پر قرض دیتا ہے اس لئے اس بینک سے سود لینے پر ان کے ملک کے مسلمانوں کے ایک طبقہ کو اعتراض ہے اس پر بینک نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ راس المال پر اضافہ کو بجائے سود کے انتظامی مصارف (SERVICE CHARGE AND ADMINISTRATIVE) کا عنوان دے گا جبکہ بینک کا نظام جوں کا توں باقی رہے گا۔

۲۔ انڈین آئل کارپوریشن مرکزی حکومت کا ایک تجارتی ادارہ ہے اسے اندرون ملک نکلنے والے پٹرول اور گیس وغیرہ فروخت کی اجارہ داری حاصل ہے اور اس میدان میں کوئی اس کا حریف نہیں ہے اس کارپوریشن میں کچھ رقم حکومت کی لگی ہوئی ہے اور کچھ رقم پبلک کی ہے جو اس کارپوریشن کے حصص (SHARE) فروخت کرنے کی شکل میں کارپوریشن کو ملی ہے اس مشترک سرمایہ سے یہ کارپوریشن اپنا کاروبار کرتا ہے لیکن کارپوریشن کے حصص مضاربت

کے اصول پر فروخت نہیں کیے جاتے بلکہ کارپوریشن انہیں ایک متعین شرح سے حصص کی مالیت پر سود ادا کرنے کے اقرار سے فروخت کرتا ہے اور ختم سال پر اسی شرح سے حصص کے مالکوں کو سود ادا کر دیا جاتا ہے یہ کارپوریشن سال کے ختم ہونے پر سال بھر کے نفع و نقصان کا میزانیہ بھی تیار کر کے مشتہر کرتا ہے میرا یہ سوال ہے کہ اگر ایک مسلمان اس کارپوریشن کے حصص کے خریدتے وقت دل میں یہ نیت رکھے کہ وہ اسلامی اصول، مضاربت کے تحت سرمایہ کاری کر رہا ہے اور ختم سال پر جب کارپوریشن کا بیلنس شیٹ (BALANCE SHEET) اس کے سامنے آئے گا تو اگر اسے پتہ چلے کہ کارپوریشن کو اس سال خسارہ ہوا ہے تو وہ اس کے حصص پر بعنوان سود ملنے والی رقم نہیں لے گا، اور اگر منافع ہوا لیکن باعتبار حصہ رسدی اس سے کم ہوا جتنا کارپوریشن بشکل سود مقررہ اس سے ادا کر رہا ہے تو وہ صرف اتنا ہی بطور منافع قبول کرے گا۔ جتنا باعتبار حصہ رسدی اس کے حصہ میں آنا چاہئے تو کیا اس نیت کے ساتھ ایک مسلمان کا ان حصص کو خریدنا اور منافع اور نقصان کے میزانیہ کی روشنی میں وہ عمل کرنا جس کا میں نے ذکر کیا، جائز ہوگا؟

۴۔ اس سال کی آخری ماہ جولائی یا آغاز اگست میں ہندوستان کے ایک فوجی محمد یونس کے معاملہ کا اخبارات میں چرچا ہوا تھا۔ یہ صاحب ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ میں محاذ پر زخمی ہو گئے تھے اور ایسے زخمی ہوئے تھے کہ فوجی خدمت کے اہل نہیں رہے چنانچہ انہیں خدمت سے سبکدوش (DISCHARGE) کر دیا گیا لیکن وہ واجبات جو از روئے ضوابط ایسی صورت میں محکمہ فوج سے وصول شدنی قرار پائے تھے ادا نہیں کیے گئے، محمد یونس اس بارے میں مختلف محکمہ جاتی سطحوں پر کوشش کرتے رہے اور ہر جگہ ناکام ہو کر وہ بالآخر عدالت میں رجوع ہوئے اور عدالت نے ان کے حق میں فیصلہ دیکر اس رقم کا تعین کیا جو حکومت انہیں ادا کرے اور ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ ۱۹۶۵ء سے تاریخ ادائیگی تک یعنی تقریباً چوبیس سال کی مدت کے لئے حکومت اس رقم پر چھ فیصد سالانہ کی شرح سے سود بھی مزید ادا کرے۔

اس معاملہ میں یہ بات بھی ظاہر ہے کہ محمد یونس کو ادا شدنی جس رقم کا تعین عدالت نے ۱۹۸۹ء میں کیا وہ رقم اصلاً محمد یونس کو ۱۹۶۵ء میں واجب الادا تھی لیکن حکومت کی غفلت کی وجہ سے ۲۴ سال تک وہ اس رقم سے استفادہ کرنے سے محروم رہے اور اس عرصہ میں مختلف سطحوں پر اپنے جائز حق کے حصول کے لئے کوشش کرتے رہے اور بالآخر عدالت میں رجوع ہونے کے سلسلہ میں جو مالی زیر باری دقت اور توانائی کاریاں اور ذہنی پریشانی میں وہ مبتلا رہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر ایسا معاملہ کسی اسلامی حکومت میں پیش آئے اور وہاں بھی شخص متعلقہ کو اتنے طویل مراحل سے ناکام گزرنے کے بعد بالآخر قاضی کی عدالت سے انصاف ملے اور قاضی یہ حکم دے کہ اصل واجب الادا رقم کے علاوہ ایک متعین رقم حکومت اس شخص کو بطور حرجانہ یا تاوان مزید ادا کرے تو کیا وہ زائد رقم باعتبار شرع سود قرار دی جائیگی ؟

اگر جواب نفی میں ہو تو کیا محمد یونس کو جو زائد رقم اس معاملہ معلومہ میں عدالت نے بعنوان سود دلوائی ہے اس کو حرجانہ پر قیاس کر کے اس کے حق میں جائز قرار نہیں دیا جا سکتا ۔؟



ضمیمہ سوال ۲
کے جوابات

جناب سید امین الحسن رضوی نے جن چند مثالوں کے ذریعہ یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ ان صورتوں کا جائزہ لے کر فیصلہ کیا جانا چاہئے کہ آیا واقعتہً یہ صورتیں شرعی نقطۂ نظر سے بھی بابِ ربوا میں داخل ہیں یا نہیں ؟

① اوران صورتوں کی جو تفصیلات پیش کی ہیں ان کی روشنی میں گو بعض صورتیں جزوی طور پر شرعاً باب ربوا سے خارج قرار دی جا سکتی ہے۔ تاہم ان صورتوں کو کلی انداز سے علی الاطلاق جائز کہنا بھی مشکل ہے، مثلاً

مثال اول ـــــ حصول اراضی کے ملکی قانون کے تحت حکومت کبھی جائیداد غیر منقولہ پر مفاد عام کے تحت قبضہ کرتی ہے تو اس کی قیمت مالک جائیداد کو دینے کی عملاً دو صورتیں ہوتی ہیں۔

پہلی وہ صورت جس میں افسران **متعلقہ اپنے طور پر** کچھ اصولوں کی روشنی میں جائیداد کی قیمت متعین کرتے ہیں اور مالک کی رضامندی کی پرواہ کئے بغیر اس متعینہ قیمت کی ادائیگی کر کے جائیداد پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد مالک جائیداد اس شرح ثمن سے غیر مطمئن ہونے پر عدالت سے رجوع کرتا ہے اور عموماً دو تین سالوں کے بعد عدالت سابقہ متعینہ ثمن میں مزید اضافہ کا فیصلہ کرتی ہے اور حکومت پر لازم کرتی ہے کہ وہ اس قدر اضافہ شدہ ثمن کی مزید ادائیگی کرے اور ساتھ ہی مقدمہ کے سپرد عدالت ہونے کے بعد سے فیصلۂ عدالت تک اور فیصلہ کے بعد اگر اضافہ شدہ رقم کی ادائیگی میں حکومت تاخیر کرے گی تو اضافہ شدہ ثمن کی ادائیگی ہونے تک جتنی مدت گذر چکی ہے یا گذرے گی اس کے عوض فیصلہ اتنا سالانہ شرح کے مطابق سود بھی ادا کرے۔

اب غور طلب بات یہی ہے کہ کیا بنام سود دی جانے والی یہ رقم شرعاً سود کہلا سکتی ہے؟ تو میرا خیال یہ ہے کہ جب شرعی طور پر اپنی جگہ یہ بات طے شدہ اور متفقہ ہے کہ کسی مقروض یا مدیون سے اجل و میعاد کے عوض نفع اور دین و قرض سے کسی قدر زائد کا حاصل کرنا جسے "ربا جاہلیہ" اور "ربا القرآن" کہا جاتا ہے وہ باجماع امت سود اور حرام ہے اس میں کبھی کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ ہم کسی کو قرض دیں یا عقد مبادلہ کریں اور طے شدہ ثمن بذمہ مشتری دین رہ جائے دونوں صورتوں میں اس قرض اور دین سے زائد لینا ہمارے لئے جائز نہیں سودِ حرام کہلائے گا۔

اب غور کریں کہ اس مثال کی مذکورہ بالا پہلی صورت میں دو حالتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، ایک فیصلہ عدالت سے پہلے کی دوسری فیصلہ کے بعد کی، اور دونوں کا حکم مختلف ہوسکتا ہے۔

قبل فیصلہ فریق واحد یعنی مالک کے عدم تراضی کے سبب اس کے اور حکومت کے درمیان گویا جائیداد کی بیع تام ہی نہیں ہوئی اور نہ کوئی ثمن برضاء طرفین متعین ہوسکا۔ نتیجتاً حکومت کے ذمہ جائیداد کی ثمن واجب الاداء ہی نہ بن سکی اور حکومت، مالک جائیداد کی درحقیقت مدیون بھی نہ ہوسکی، نہ مالک جائیداد بائع ہوا نہ حکومت مشتری، ہاں عدالت جس دن فیصلہ کرتی ہے اور ثمن میں اضافہ کرکے قیمت متعین کرتی ہے اس دن وہ جائیداد مبیع ہوتی ہے مالک بائع بنتا ہے اور حکومت مشتری، اور آج اس کی قیمت و ثمن حکومت کے ذمہ بطور دین لازم ہوتی ہے اس طرح مقدمہ سپرد عدالت ہونے سے فیصلہ ہونے کی میعاد تک جو رقم بنام سود میعاد و اجل کے عوض دینے کا حکم ہوتا ہے اسے شرعاً سود کہنا مشکل ہے کیونکہ فیصلہ سے پہلے کوئی عقد ملا یہ نہیں نہ کوئی دائن ہے نہ کوئی مدیون، بلکہ اس پوری رقم کو جائیداد کی مکمل ثمن و قیمت قرار دیا جاسکتا ہے اور مالک کے لئے لینا اس کا جائز ہوسکتا ہے۔

لیکن دوسری حالت فیصلہ کے بعد والی، اس میں ظاہر ہے کہ فیصلہ عدالت کے بعد حکومت مدیون ہوچکی اس لئے اب اس کے بعد اضافہ شدہ ثمن کی ادائیگی میں اگر تاخیر ہوئی اور اس مدت تاخیر کے لئے بنام سود رقم دلائی گئی تو یہ رقم ایک مدیون سے بعوض میعاد و اجل مقدار دین سے زائد لینا دینا یقیناً ہوگا اور شرعی نقطۂ نظر سے بھی اس

اضافی رقم کو لازماً سود اور حرام کہنا ہوگا۔

اسی طرح مثال کی دوسری صورت جس میں حکومت کسی جائیداد پر فوری قبضہ کرلیتی ہے اور دو تین سالوں کے بعد اس کی ثمن کا تعین ہوتا ہے۔ یہاں بھی قبل تعیین ثمن بیع و شراء کا تحقق نہیں کوئی دین کسی کا کسی کے ذمہ نہیں۔ اگر مالک جائیداد اس متعین کردہ شرح قیمت کو اپنی جائیداد کی مناسب قیمت تسلیم کرلے تو بعد تسلیم بیع ہوگئی اب جو بھی رقم بنام ثمن یا قبل تسلیم گذری ہوئی مدت کے عوض بنام سود دی جائے گی اسے اصل ثمن قرار دے کرلے سکتا ہے۔ یہاں سود کا شرعاً تحقق نہیں ہوگا کیونکہ بنام سود ملنے والی رقم کو کسی مدیون سے بعوض میعاد لینا دینا نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں تسلیم سے پہلے نہ کسی عقد مداینہ کا وجود تھا نہ کوئی دین ہے اور نہ کوئی مدیون، لیکن اگر مالک اس متعینہ ثمن کو تسلیم نہ کرکے، عدالت سے رجوع کرے تو پھر جائیداد پر قبضہ کے دن سے فیصلہ عدالت تک کے تمام میعاد کے عوض بنام سود دی جانے والی رقم کو اصل قیمت میں ضم کیا جا سکتا ہے اور اس کا لینا سود کا لینا نہیں کہا جائے گا کیونکہ فیصلہ عدالت کے پہلے نہ دین ہے نہ کوئی مدیون، مالک جائیداد نے افسران متعلقہ کی کچھ مدت کے بعد متعین کردہ ثمن کو جب تسلیم نہیں کیا تو بیع تام نہ ہوسکی اور ثمن حکومت کے ذمہ دین نہ بن سکا —— ہاں! فیصلہ کے بعد حکومت مدیون بن جائے گی اس لئے فیصلہ کے بعد والی مدت کے عوض بنام سود دی جانے والی رقم پھر یقیناً ایک مدیون سے زائد از دین بعوض میعاد و اجل لینا کہلائے گا جو شرعاً سود اور حرام ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ یہ مثال اپنی دو صورتوں میں من وجہ حد جواز میں آسکتی ہے مگر من وجہ باب ربوا میں داخل ہے یہ صحیح ہے کہ اس مثال میں کسی قرض کا عنصر موجود نہیں مگر دین کا عنصر پایا جاتا ہے اور سود شرعاً قرض و دین دونوں میں متحقق ہوا کرتا ہے، بنام سود والی رقم کو حق انتفاع سے محروم رہنے کا معاوضہ بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ منافع ہمارے یہاں غیر مضمون ہیں جن کے اتلاف پر ہمارے یہاں حرجانہ و تاوان دلانا صحیح نہیں۔

اس لئے ہمارا خیال ہے کہ علی الاطلاق اس صورت کو بھی جائز نہیں کہا جائے، شخصی و انفرادی طور پر اگر کوئی کسی مسلک کے مطابق اتلاف منافع کا سبب ضمان سمجھ کر یہ رقم لے لے تو یہ اس کا ذاتی عمل ہوگا جو ممکن ہے کسی فتویٰ کے مطابق جائز بن جائے۔ واللہ اعلم

مثال دوم ـــــ کاشتکاروں کو زرعی ترقیاتی قرضے دیئے جاتے ہیں اور اس قرض پر میعاد واجل کے عوض زائد رقم بعنوان سود وصول کی جاتی ہے اس اضافی رقم کو انتظامی مصارف قرار دے کر باب ربوا سے خارج کرنا بھی ممکن نہیں، یہ بھی شرعاً سود حرام ہی ہے صرف نام بدل دینے سے شئی کی حقیقت نہیں بدل جاتی ـــــ ہر درخواست گذار اور مدیون سے حاصل کردہ اضافی رقم کو "انتظامی مصارف" اس وقت کہنا صحیح ہوگا جبکہ اسکی مقدار متعین ہوتی اور قرض کی مقدار کم ہوتی یا زیادہ پھر بالاقساط ادائیگی قرض کی مدت طویل ہوتی یا قصیر، اس اضافی رقم کی مقدار میں کوئی کمی زیادتی نہ ہوتی لیکن فی الواقع ایسا ہرگز نہیں ہوتا بلکہ قرض کی مدت اور مقدار ادائیگی کی کمی بیشی سے یہ اضافی رقم بھی کم وبیش ہوتی رہتی ہے۔ یہ انتظامی مصارف دراصل سرکاری عملوں کی اجرت عمل ہوا کرتی ہے جسے اصولاً متعین ہونا چاہیئے۔ یہ کیا کہ اگر کوئی ایک لاکھ قرض لے کر پانچ سال میں بالاقساط ادا کرے تو اس سے کل اضافی رقم مثلاً ایک ہزار لیا جائے اور دوسرا پچیس ہزار ہی قرض لے لیکن پندرہ سالوں میں بالاقساط ادا کرے تو اس سے مثلاً دو ہزار لیا جائے ظاہر ہے کہ ایسا یقیناً ہوتا ہے جو مدت و میعاد ہی کا عوض ہو سکتا ہے، اجرت عمل کہنا مشکل ہے یہ بھی نتیجتاً مالی استحصال ہے جو ظلم و عدوان ہے اس لئے ہمارے خیال میں یہ شکل بھی بعوض میعاد مدیون سے زائد از قرض نفع لینا ہے اور یقیناً سود ہے۔ واللہ اعلم

مثال سوم ـــــ "انڈین آئیل کارپوریشن" جو حکومت اور حصص کے خریدار پبلک کے مشترک سرمایہ سے کاروبار کرتا ہے، لیکن مضاربت کے اصول کے مطابق منافع کو ربع ثمن یا فیصد اتنا، کی شکل میں مشاع نہیں رکھتا بلکہ ایک متعین شرح سے حصص کی مالیت پر بنام سود نفع دینے کا اقرار و معاہدہ کرتا ہے، تو اگرچہ اختتام سال پر وہ نفع و نقصان کا میزانیہ بھی شائع کرے تب بھی کسی مسلمان کے لئے اسلامی اصول مضاربت کے تحت سرمایہ کاری کرنے کی محض نیت کرنے سے اس کے حصص کی خریداری اور شرعی مضاربت کے اصول کے خلاف کئے جانے والے کسی کاروبار میں شرکت جائز نہیں ہو سکتی، کیونکہ ختم سال پر کارپوریشن کا جب "بیلنس شیٹ" اس کے سامنے آئے گا اور مثلاً خسارہ کا علم ہوگا اور بالفرض اس خسارہ کو محیط بالمنافع سمجھ کر یہ شخص اپنے حصہ پر معاہدہ کے تحت ملنے والی بعنوان سود متعینہ رقم سے دست بردار ہو جائے تو اپنی رضامندی سے اس کی یہ

دست برداری کسی فعل محظور کو بظاہر مستلزم نہ ہونے کے سبب جائز ہی بن جائے۔ لیکن اگر منافع ہونے کا علم ہوا مگر اس نے محسوس کیا کہ یہ منافع کم ہے اور ہر حصہ دار کو حسب معاہدہ متعینہ رقم بعنوان سود دینے سے کارپوریشن کا نقصان ہوگا۔ اسلئے ہم اتنا ہی منافع لیں جتنا باعتبار "حصہ رسدی" اسے ملنا چاہیئے، تو سوال یہ ہوگا کہ جب معاہدہ میں کسی "حصہ رسدی" کا وجود ہی نہیں تو اب یہ شخص منافع میں اپنے حصہ رسدی کا تعین کس حساب سے کرے گا، حسب معاہدہ کارپوریشن کو خسارہ ہو یا منافع، پھر منافع کم ہوں یا زیادہ، بہرحال حصص کے خریدار کو ایک متعینہ رقم ملنا طے ہے، اگر یہ بات ہوتی کہ پورے منافع کا ½ یا کسی کو ⅓ تفاوت حصص کے اعتبار سے ملے گا تب تو حصہ رسدی کا حساب ممکن اور آسان تھا لیکن بحالت موجودہ ہماری سمجھ کے مطابق اس حصہ رسدی کا حساب لگانا اور تخمینہ کرنا عالم تصور کی بات ہوسکتی ہے حقیقت کی دنیا میں اس کا وجود ممکن نہیں۔

اس کے علاوہ شریعت اسلامیہ کے ضابطہ کے مطابق مضارب یعنی مثلاً کارپوریشن اس کا ذمہ دار ہوتا ہے کہ اگر منافع زیادہ ہوں تو اس میں بھی سارے حصہ دار کو بقدر حصص حصہ ملنا چاہیے جبکہ عملاً ایسا نہیں ہوتا بلکہ کارپوریشن زیادتی منافع کی صورت میں بھی بس وہی متعینہ رقم حصہ دار کو دے کر بقیہ تمام ہی منافع پر قابض ہوجاتا ہے جو مالی استحصال ہے ظلم وعدوان ہے اسلام کے اصول عدل کے خلاف ہے، مسلمانوں کا ایسے کاروبار میں شرکت کرنا تعاون فی الاثم والعدوان کی بنیاد پر ہرگز صحیح نہیں کہا جاسکتا محض حسن نیت سے کوئی امر محظور جائز نہیں بن سکتا۔ واللہ اعلم

مثال چہارم ——— کوئی سرکاری یا پرائیویٹ ملازم ریٹائر ہونے یا کسی بنا پر ملازمت سے سبکدوش کئے جانے کے وقت اپنی سابقہ خدمات اور عمدہ کارگذاریوں کے صلہ میں حکومت کے ضابطہ وقانون یا باہمی معاہدہ کے مطابق کچھ رقم خاص کا مستحق ہوتا ہے لیکن حکومت یا پرائیویٹ ادارہ اپنی غفلت سے اس حق کی ادائیگی میں دیر یا ٹال مٹول کرتا ہے صاحب حق اپنے حق کی وصولیابی کے لئے عدالت سے رجوع کرتا ہے، اور ایک عرصہ کے بعد عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ اتنی رقم بطور واجب الاداء حق اور اتنی رقم گذرے ہوئے میعاد واجل کے عوض بطور سود ادا کیا جائے اور وہ اب ادا کی جاتی ہے۔

ہمارے خیال میں یہ ایسی صورت ہے جس میں وہ ملازم حسب قانون ومعاہدہ کچھ رقم

کا صرف مستحق ہوتا ہے قبضہ میں آئے بغیر اس کا مالک نہیں بنتا۔ اور شرعاً سود اپنی مملوکہ رقم کے ذریعہ بعوض میعاد واجل نفع حاصل کرنے کو کہا جاتا ہے۔ یہاں نہ قرض کا عنصر ہے نہ دین کا، اور نہ کسی مملوکہ رقم سے بعوض میعاد انتفاع کا۔

اس لئے اس صورت میں تمام ہی ملنے والی رقم کو خواہ بعنوان واجب الادا حق ہو یا بعنوان سود، اپنا حق سمجھ کر لے سکتا ہے شرعاً سود کا تحقق نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم

اور اگر آج کے کرنسی کاغذی نوٹوں کی شرعی حیثیت واضح اور متفق علیہ ہو جائے تمام علماء ان نوٹوں کی قدر وقیمت اور مالیت و قوت خرید کے اعتبار کئے جانے کو تسلیم کرلیں تب تو ایسے حقوق و مطالبات جس کی ادائیگی وقت وجوب کے طویل عرصہ کے بعد ہو رہی ہو اور جس مدت کے دوران ان نوٹوں کی قدر و مالیت اور قوت خرید میں محسوس طور پر تفاوت فاحش ہو جاتا ہے بظاہر صورتی زیادتی کے باوجود درحقیقت مساوی ہونے کی بنیاد پر بلاشبہ جائز کہے جا سکتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب ھذا ما عندی والعلم عند اللہ



سود کا مسئلہ

از: ـــــــــــــــ مولانا خلیل الرحمن عُمری
ڈاکٹر عبداللہ جولم عُمری
جامعہ دار السلام عمرآباد

فقہ کی اصطلاح میں ربا کی یوں تعریف کی گئی ہے۔

"زیادۃ احد البدلین المتجانسین من غیر ان یقابل ھذہ الزیادۃ عوض"[1]

ربا کی دو قسمیں ہیں، ربا الدیون اور ربا البیوع،

علامہ ابن رشد فرماتے ہیں: "اتفق العلماء علی ان الربا یوجد فی شیئین فی البیع وفیما تقرر فی الذمۃ من بیع او سلف او غیر ذلک"[2]

اما ربا الدیون وھو المعروف بربا النسیئۃ فھو الماخوذ لاجل تاخیر قضاء دین مستحق الی أجل جدید، سواء کان الدیون ثمن مبیع ام قرضا"[3]

ایسی رقم زمانۂ جاہلیت میں "ربا" کہلاتی تھی: علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں:

والربا الذی کانت العرب تعرفہ وتفعلہ انما کان قرض الدراھم والدنانیر الی اجل بزیادۃ علی مقدار ما استقرض علی ما یتراضون بہ"[4]

علامہ رازی فرماتے ہیں:

اما ربا النسیئۃ فھو الامر الذی کان مشہورا متعارفا فی الجاھلیۃ، وذلک انھم کانوا یدفعون المال علی ان یاخذوا کل شہر قدرا معینا ویکون

۱۔ الفقہ علی المذاھب الاربعۃ ۲۴۰/۲ ۲۔ بدایۃ المجتہد ۱۰۶/۲
۳۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳۳/۴ ۴۔ احکام القرآن ۴۶۵/۱

برأس المال باقيا ثم اذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فان تعذر عليه الاداء زادوا في الحق وفي الاجل"(۱)

ربا کی دوسری قسم ربا البیوع کے تعلق سے ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی لکھتے ہیں:

"واما ربا البيوع فهو على نوعين، ربا النسيئة، وربا الفضل، اما ربا النسيئة في البيوع فهو بيع ربوي بربوي نسيئة، وربا الفضل هو بيع ربوي بمثله مع زيادة في احد المثلين"(۲)

ربا مطلقاً حرام ہے۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں:

"والربا بجميع انواعه حرام بالاتفاق سوى ما روى من خلاف عن ابن عباس في ربا الفضل، وقد نقل عنه انه رجع عن قوله"(۳)

ربا کی حرمت پر چند آیات و احادیث:

(الذين ياكلون الربا لا يقومون الا كما يقوم الذى يتخبطه الشيطن من المس، ذلك بأنهم قالوا انما البيع مثل الربوا، واحل الله البيع وحرم الربا) الآية(۴)

(يا ايها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقي من الربا ان كنتم مومنين)(۵)

"عن جابر قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه، وقال: (هم سواء)"(۶)

"عن ابي سعيد قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم (الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل يدا بيد، فمن زاد أو استزاد فقد اربى، الآخذ والمعطى فيه سواء)"(۷)

"عن عمر بن الخطاب قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم (الذهب بالورق ربا الا هاء وهاء، والبر بالبر ربا الا هاء وهاء، والشعير بالشعير ربا الا هاء وهاء، والتمر بالتمر ربا الا هاء وهاء)"(۸)

---

(۱) التفسير الكبير ۷/۸۵ (۲) الفقه الاسلامي وادلته ۴/۶۷۷ (۳) نيل الأوطار ۵/۲۰۳ (۴) البقرة ۲۷۵ (۵) البقرة ۲۷۸ (۶) رواه مسلم (۷) رواه احمد والبخاري (۸) متفق عليه۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن نے جس ربا کو حرام قرار دیا ہے اس سے مراد صرف زمانۂ جاہلیت کا ربا ہے۔ بلکہ زمانۂ جاہلیت کے سودی لین دین کو حرام قرار دینے کے ساتھ ساتھ قرآن ان تمام قسم کے لین دین کو بھی حرام قرار دیتا ہے۔ جنہیں احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ "العبرۃ بعموم اللفظ لا بخصوص السبب"

شیخ محمد عبدالواحد غانم لکھتے ہیں:

"الاولی والاوجب ان تکون دلالۃ اللفظ القرآنی مشتملۃ لجمیع المعانی الاخری التی نبہ الیہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سواء کانت معروفۃ من قبل اوغیر معروفۃ۔ لیصیر اللفظ القرآنی بعد ذلک شاملاً المعنی القدیم والمعانی الاخری التی وردت فی احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"[1]

علماء اس بات پر متفق ہیں کہ احادیث کی رو سے ربا کا تحقق اصناف ستہ (ذھب، فضہ، بر، شعیر، تمر، ملح) کی خرید و فروخت میں اس وقت ہو جاتا ہے جب کوئی صنف کسی ہم صنف کے بدلے زیادتی کے ساتھ بیچی جائے یا ادھار بیچی جائے، یا کوئی صنف غیر صنف کے بدلے ادھار بیچی جائے۔

البتہ اصناف ستہ کے علاوہ دوسری صنفوں کے اندر تحقق ربا کی بابت اختلاف ہے۔

۱ ربا صرف اصناف مذکورہ میں محصور ہے۔ ——————— (ابن حزم)

۲ اصناف مذکورہ کے ساتھ وہ چیزیں بھی شامل ہیں جو اصناف مذکورہ کی علت میں شریک ہوں۔ ——————— (جمہور علماء)

---

[1] مجلۃ المجمع الفقہی ۱۰۵

پھر جمہور علماء نے تحدید علت کے سلسلے میں اختلاف کیا ہے۔

(نقدین میں علت ربا)

۱ نقدین (ذھب وفضہ) میں صرف وزنی علت ہے۔ (ابوحنیفہ واحمد فی احدی الروایتین)

۲ نقدین میں ثمنیت علت ہے۔ مالک احمد فی روایۃ شافعی)

اس دوسرے قول کی تائید علامہ ابن تیمیہ نے بھی کی ہے:

والاظھر ان العلۃ فی ذلک ھی الثمنیۃ لا الوزن "(۱)

ابن القیم فرماتے ہیں۔

"وھذا ھو الصحیح بل الصواب، فانھم أجمعوا علی جواز اسلامھما فی الموزونات من النحاس والحدید وغیرھا. فلو کان النحاس والحدید ربویین لم یجز بیعھما الی اجل بدراھم نقدا، فان ما یجری فیہ الربا اذا اختلف جنسہ جاز التفاضل فیہ دون النسأ، والعلۃ اذا انتقضت من غیر فرق موثر دل علی بطلانھا. وایضا فالتعلیل بالوزن لیس فیہ مناسبۃ، فھو طرد محض، بخلاف التعلیل بالثمنیۃ، فان الدراھم والدنانیر اثمان المبیعات، والثمن ھو المعیار الذی بہ یعرف تقویم الاموال." (۲)

بقیہ اصناف منصوصہ (بر، شعیر، تمر، ملح) کی علت کے سلسلے میں فقہاء کے مندرجہ ذیل اقوال ہیں:

۱۔ ان علۃ ربا الفضل فیھا الاقتیات والادخار، وعلۃ النساء مجرد الطعم لا علی وجہ التداوی (ای کونہ مطعوما لآدمی) وھو قول المالکیۃ

۲۔ ان العلۃ فیھا کونھا مطعومۃ بدون تفریق بین ربا الفضل وربا النسیئۃ وھذا قول الشافعی فی الجدید وروایۃ عن احمد۔

۳۔ ان علۃ ربا الفضل فیھا کونھا مکیلۃ مع اتحاد الجنس وعلۃ ربا النسیئۃ کونھا مکیلۃ او متحدۃ الجنس. وھو رای ابی حنیفۃ واحمد فی روایۃ۔

۱۔ مجموع الفتاویٰ ۲۹/۴۷۱

۲۔ اعلام الموقعین ۲/۱۵۶

۷۔ ان العلة فيها هي الطعمية مع الكيل او الوزن، اى كونها مطعومة موزونة او مكيلة. وهو قول الشافعي في القديم واحمد في رواية[1]

سوال

سود دار الحرب میں بھی حرام ہے کیونکہ آیت ربا (احل الله البيع وحرم الربوا) اور دوسری آیات واحادیث جو حرمتِ سود پر دال ہیں ان میں زمان ومکان کی قید کے بغیر عموم پایا جاتا ہے علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

"ويحرم الربا في دار الحرب كتحريمه في دار الاسلام. وبه قال مالك والاوزاعي وابو يوسف والشافعي واسحاق وقال ابو حنيفة: لا يجري الربا بين مسلم وحربي في دار الحرب"[2]

"وعنه (ابي حنيفة) في مسلمين اسلما في دار الحرب لا ربا بينهما، لما روى مكحول عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال (لا ربا بين المسلمين واهل الحرب في دار الحرب) ولان اموالهم مباحة، وانما حظرها الامان في دار الاسلام فما لم يكن كذلك كان مباحا ولنا قول الله (وحرم الربوا) عام، ولان ما كان محرما في دار الاسلام كان محرما في دار الحرب وخبرهم مرسل لا نعرف صحته"[3]

وقال الزيلعي عن هذا الخبر" غريب، واسند البيهقي في المعرفة في كتاب السير عن الشافعي قال، قال ابو يوسف: انما قال ابو حنيفة هذا لان بعض المشيخة حدثنا عن مكحول عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه قال (لا ربا بين اهل الحرب) اظنه قال (واهل الاسلام) قال الشافعي: وهذا ليس بثابت ولا حجة فيه"[4]

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۲۰۰، ومجلة البحوث الاسلامية ص ۰۰ شمارہ [illegible] وشمارہ ۱۵ ۱۴۰۷ھ

۲۔ المطبق، الهداية ۳/۷۰

۳۔ المغني ۴/ ۴۶-۴۷

۴۔ نصب الراية ۴/ ۴۴

علامہ سید عروج احمد قادری فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک ربا و قمار ہر ملک میں حرام قطعی ہے، وہ دار الحرب ہو یا دار الاسلام یا کچھ اور، اس مسئلہ میں طرفین کا مسلک نہ صرف نصوص شرعیہ کے خلاف ہے بلکہ خود اصول فقہ حنفی کے مسلمات کے خلاف بھی ہے۔ اور یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اس مسلک کی بنیاد پر کوئی فیصلہ یا کوئی فتویٰ میرے لیے قابل تسلیم ہو"

مزید لکھتے ہیں:

جہاں اجتہادی مسائل و احکام کا تعلق ہے۔ امام اعظم اور امام محمد بن حسن رحمہا اللہ کا درجہ تو بہت بلند ہے۔ ہم تو علامہ شامی جیسے متاخرین فقہاء کے مجرد اقوال پر بھی عمل کر لیتے ہیں لیکن جہاں نصوص قطعیہ کا معاملہ ہو وہاں بڑے سے بڑے امام کا بھی مجرد قول ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ ان کے پاس یقیناً کوئی دلیل ہوگی، عقیدت کا غلو یا ائمہ کو معصوم عن الخطاء قرار دینے کے مترادف ہے۔"(۱)

س ۳:

دار الحرب اور دار الاسلام کی تعریف میں ڈاکٹر زحیلی لکھتے ہیں:

"دار الحرب: هي البلاد التي ليس للمسلمين عليها ولاية وسلطان، ولا تقام فيها أكثر شعائر الإسلام. والحربي من بيننا وبين بلاده عداوة وحرب"(۲)

ڈاکٹر جمیل عبد اللہ مصری لکھتے ہیں:

"قسم الإسلام الأرض إلى قسمين، دار الإسلام، وهي الديار التي تسودها شريعة الإسلام وتقام فيها حدوده، وإن كان جل أهلها من غير المسلمين، الثاني دار الحرب، وهي الأرض التي تسود فيها شرائع غير شريعة الله وإن كان جل أهلها من المسلمين. والواقع أنه ليس في الدنيا اليوم أرض فيها الإسلام إلا القليل، وبذلك نضطر إلى اللجوء إلى المفهوم الجغرافي للعالم الإسلامي"(۳)

۱۔ عشر و زکوٰۃ اور سود کے چند مسائل، ص ۱۱۲۔۱۱۳

۲۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳۹/۸

۳۔ حاضر العالم الاسلامی وقضایاه المعاصرة ۱۳/۱

علامہ محمد رشید رضا فرماتے ہیں:

"دار الحرب بلاد غیر المسلمین وان لم یحاربوا، وکانت القاعدۃ (ان کل من لم یعاھدنا علی السلم یعد محاربا)"[1]

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں:

"دستوری قانون کی رو سے اسلام دُنیا کو دو حصّوں پر تقسیم کرتا ہے۔ ایک دارالاسلام دوسرے دارالکفر، دارالاسلام وہ علاقہ ہے۔ جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور اس حکومت میں اسلامی قانون بالفعل نافذ ہو، یا حکمرانوں میں اتنی قوت ہو کہ اس قانون کو نافذ کرسکیں۔ اس کے مقابلے میں جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں اور اسلامی قانون نافذ نہیں وہ دارالکفر ہے۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"دستوری قانون کے نقطۂ نظر سے دارالاسلام کا مقابل دارالکفر بمعنی علاقۂ غیر یا (FOREIGN TERRITORY) ہی ہوسکتا ہے۔ حرب یا غیر حرب کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ جو ممالک اسلامی سلطنت سے صلح رکھتے ہوں وہ بھی دارالکفر ہیں۔"

پھر مولانا نے دارالکفر کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں۔ اور آخری قسم (محاربین) کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"جن سے مسلمانوں کی بالفعل جنگ ہو، اصلی حربی یہی ہیں، انھیں کے دار کو تعلقات خارجیہ کے قانون میں دارالحرب کہا جاتا ہے۔"

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"چونکہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جتنے دارالکفر اسلامی سلطنت سے متصل تھے وہ عموماً دارالحرب ہی رہتے تھے۔ اس لئے بعد کے فقہاء نے دارالکفر کو دارالحرب کا ہم معنی سمجھ لیا۔"[2]

خلاصہ یہ کہ ہندوستان دستوری اعتبار سے نہ دارالاسلام ہے اور نہ دارالحرب، کیوں کہ اس میں نہ تو شریعت اسلامی کی تطبیق ہوتی ہے اور نہ ہی دارالاسلام سے برسرپیکار ہے اسلئے دارالکفر ہے۔ البتہ دارالکفر کی کئی قسمیں ہیں جن میں ایک قسم کی سکولر حکومت بھی ہے۔

۱۔ تفسیر المنار ۶/ ۴۰۰ ۲۔ سود، ص ۲۸۸، ۳۸۹، ۲۹۹

بینکوں میں جمع شدہ رقوم پر جو سود ملتا ہے وہ حرام ہے، اسے لے کر اپنے کسی مصرف میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

اب اسے بینک میں چھوڑ دیا جائے یا کسی دوسرے مصرف میں صرف کیا جائے تو اس سلسلے میں علماء کے دو اقوال ہیں:

۱ بینک ہی میں چھوڑ دیا جائے۔

۲ اسے لے کر فقراء و مساکین کو دیدیا جائے یا کسی رفاہ عام میں خرچ کیا جائے۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی ایک استفتار کا جواب دیتے ہیں۔

"الاخ الذی یسأل عن فوائد البنوک هل یاخذها ام لا؟ اجیبه بان فوائد البنوک لا تحل له ولا یجوز اخذها ولا یجزیه ان یزکی عن ماله الذی وضعه فی البنک، فان هذه الفائدة حرام ولیست ملکا له ولا للبنک نفسه. فی هذه الحالة ماذا یصنع بها؟ اقول: ان الحرام لا یملک، ولهذا یجب التصدق به کما قال المحققون من العلماء. بعض الورعین قالوا بعدم جواز اخذه ولو للتصدق، علیه ان یترکه او یرمیه فی البحر، ولا یجوز ان یتصدق بخبیث، ولکن هذا یخالف القواعد الشرعیة فی النهی[1] عن اضاعة المال وعدم انتفاع احد به لا بد ان ینتفع به احد۔۔۔۔ اذا ما دام هو لیس مالکا له جاز له اخذه والتصدق به علی الفقراء والمساکین او یتبرع به لمشروع خیری او غیر ذلک کما یری المودع انه فی صالح الاسلام والمسلمین۔۔۔"

پھر فرمایا:

"وهل یترک تلک الفوائد للبنک لانها محرمة علیه؟ لا یترکها لان هذا یقوی البنک الذی یتعامل بالربا، ولا یاخذها لنفسه وانما یاخذها و یتصدق بها فی ای سبیل من سبل الخیر"[2]

۱۔ فی الاصل (لا یخالف)، ولعله خطا مطبعی۔ [2] فتاوی معاصرہ ص: ۵۲۶

علامہ شیخ ابن باز تحریر فرماتے ہیں:

"لا باس بأخذها لصرفها فی المشاریع الخیریة کمساعدة الفقراء والغربة ونحو ذلك. لا لیتملکها او ینتفع بها. بل هی فی حکم المال الذی یضر ترکه بالمسلمین مع کونه من مکسب غیر جائز. فصرفه فیما ینفع المسلمین اولی من ترکه للکفار لیستعینون به علی ما حرم الله"(١)

ش ٥:

سود لینے اور دینے میں فرق یہ ہے کہ سود لینے کی مجبوری کبھی نہیں ہوسکتی۔ بخلاف سود دینے کے کہ انسان سود دینے پر کبھی مجبور ہوسکتا ہے۔

مولانا عروج احمد قادری لکھتے ہیں:

"انسان سود لینے کے لئے مجبور نہیں ہوتا جبکہ سود دینے والا بسا اوقات سود دینے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجبوری کی حالت میں سود دینے کی رخصت ہے۔ لیکن سود لینے کی رخصت کسی حال میں بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی مسلمان مجبور ہوجائے تو مجبوری کی حالت میں سودی قرض لے سکتا ہے لیکن مسلمان کو یہ فیصلہ آخرت کے عذاب کو سامنے رکھ کر کرنا چاہئے کہ وہ سودی قرض لینے کے لئے واقعی مجبور ہے یا نہیں۔"(٢)

ش ٦

مجبوری کی حالت میں سود دینا جائز ہے۔ مجبوری کا فیصلہ ہر شخص اپنے حالات کے لحاظ سے خود کرے گا، مثلاً اہل وعیال کے لئے واجب روزی روٹی، یا ایسے مریض کے علاج کیلئے جس کے بچنے کی امید علاج کے بغیر ممکن نہ ہو یا مرض بڑھ جانے کا خدشہ ہو تو ایسا شخص مجبور ہے، اور وہ سودی قرض لے سکتا ہے۔

ش ١٠

سودی لین دین کسی بھی حکومت یا فرد کے لئے جائز نہیں ہے۔ کیونکہ آیت ربا عام ہے اس لئے دونوں طرح کے بینک سے سود پر قرض لینا جائز نہ ہوگا۔

---

(١) الفتاوی ١، ١٤٩ (٢) عشر وزکوٰۃ اور سود کے چند مسائل ص ١٢٥

سؔ

مذکورہ بیع ممنوع ہے۔ حدیث میں آتا ہے (لا تبع ما لیس عندك)

متعلقہ مسئلہ کی مزید وضاحت لجنہ دائمہ للبحوث العلمیۃ والافتاء کے اس جواب سے ہوتی ہے جو لجنہ کی طرف سے مندرجہ ذیل استفتار پر دیا گیا تھا:

س: طلب مني شخص ان اشتري له سيارة وقدم لي مبلغا من قيمتها والباقي على الاقساط الشهرية بحيث احصل على مكسب يقرب من ثلثة آلاف ريال، علما بأني اعرف هذا المكسب قبل عقد البيع والشراء كما ان استمارة السيارة تسجل باسم طالب ذلك الشراء ابتداء، فما حكم ذلك؟

ج: اذا اشتريت السيارة وقبضتها، ثم بعتها على شخص الى اجل معلوم بثمن زائد عن ثمنها الحال، فهذا جائز لعموم قوله تعالى (يا ايها الذين امنوا اذا تداينتم بدين الى اجل مسمى فاكتبوه) الآية

اما اذا بعتها عليه قبل ان تقبضها لم يجز ذلك، لان النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع السلع قبل قبضها. وهكذا لو اتفقت معه على ان تبيعه سيارة معلومة قبل ان تشتريها، فبعد الاتفاق على الثمن والربح تذهب وتشتريها باسمه كما ذكرت في السوال فهذا لا يجوز، لقوله صلى الله عليه وسلم (لا تبع ما ليس عندك)"(۱)

مذکورہ فتویٰ مندرجہ ذیل علماء کرام کے دستخط سے جاری ہوا ہے۔

۱۔۔۔ شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز، رئیس اللجنہ

۲۔۔۔ شیخ عبد اللہ بن قعود، عضو

۳۔۔۔ شیخ عبد اللہ بن غدیان، عضو

---

(۱) مجلۃ البحوث الاسلامیہ ص ۱۵ فتویٰ ۱۴۰۱ تاریخ ۱۱/۱۱/۱۴۰۱ھ شمارہ ۱۸، ۱۴۰۷ھ

بینک انٹرسٹ

از ——— محمد رضوان القاسمی
ناظم دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

۱ — ربا، مالی لین دین میں ایک طرف سے ایسے مشروط اضافہ کا نام ہے کہ دوسرے فریق کی جانب سے اس کا کوئی عوض نہ ہو، ہدایہ میں ہے، هو الفضل المستحق لاحد المتعاقدين في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه (ہدایہ ج ۳ ص ۸۰)

۲ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دار الحرب میں سود لینا درست ہے۔ اکثر فقہاء اور امام ابو یوسف کے نزدیک جائز نہیں، قرآن مجید کے عموم اور احادیث کے عموم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اس لئے علماء ہند میں حضرت مولانا تھانویؒ نے حرمت کو ہی ترجیح دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

آیت تحریم ربوا میں ارشاد ہے یا ایها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقي من الربوا ان كنتم مؤمنين ، اور ظاہر ہے کہ اس بقیہ ربوا کا معاملہ جس وقت ہوا ہے لینے والے، دینے والے سب حربی تھے تو تحریم کے بعد اگر حربی سے ایسا معاملہ جائز ہوتا اور وہ رقم حلال ہوتی تو اس کا ترک کرنا کیوں فرض ہوتا، یہ نص قطعی ہے، ثبوتاً بھی، دلالۃً بھی، اور طرفین کی دلیل یا خبر واحد ہے یا قیاس جو کہ ظنی ہیں اور قطعی کی تقدیم کا وجوب ظنی پر اجماعی ہے .... یہ تو اس دلیل میں ثبوتاً کلام ہے اور دلالۃً یہ احتمال ہے کہ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں لا ربوا بين المسلم والحربي ——— اس میں احتمال ہے کہ یہ نفی نہی کے لئے ہو، جیسا قرآن مجید میں لا رفث ولا فسوق ولا جدال في الحج میں بعینہ یہی معنی ہیں۔ چونکہ حربی کے مال کے غیر معصوم ہونے سے شبہ اسکے جواز کا ہو سکتا تھا، حضور نے اس جواز کی نفی فرمادی ہو۔ چنانچہ کتب فقہیہ میں اس قسم کی عبارت اس معنی میں وارد ہے، ففي الدر المختار عقيب الروايات والمذكورة فلو هاجر الينا ثم عاد اليهم فلا ربوا اتفاقا جوهرة في رد المحتار ۲ ی

لایجوز الربوا معہ فهو نفي بمعنى النهي كما في قوله فلا رفث ولا فسوق فافهم
جب ابو یوسفؒ کے اس قول کا قوی ہونا ثابت ہو گیا تو اس پر عمل ہوگا۔

(امداد الفتاوی ج ۳ ص ۱۵۷-۱۵۸)

۳ــــ دار الحرب کے لئے فقہاء نے تین شرطیں رکھی ہیں، اول یہ کہ احکام شرک وہاں مکمل طور پر نافذ ہو جائیں۔ دوسرے اس سے متصل کوئی مسلمان ملک موجود نہ ہو۔ تیسرے مسلمان کو اس حکومت کافرہ کے قیام کے بعد امان اور موجودہ اصطلاح میں شہریت حاصل کرنی پڑی۔ (شامی ج ۳ صفحہ ۲۵۳) دار الاسلام وہ ہے جہاں اسلامی احکام نافذ ہوا کریں۔ موجودہ زمانہ میں اکثر جمہوری ممالک وہ ہیں کہ ان اصطلاحات کے لحاظ سے نہ دار الاسلام ہیں نہ دار الحرب، اس لئے بعد کے علماء نے "دار" کی تقسیم میں توسع سے کام لیا ہے۔ حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"پھر دار الکفر کی بنیادی و اصولی طور پر چار قسمیں ہیں (۱) دار الحرب یا دار المحاربہ، (۲) (۲) دار المعاہدہ والمسالمہ (۳) دار الامن۔ (۴) دار الشر والفساد، اس لئے کہ دار الاسلام کا محاربہ دار الکفر سے ہوگا یا نہیں اگر ہوگا تو اسکا نام دار الحرب یا دار المحاربہ ہوگا اور اگر محاربہ نہ ہوگا تو دو حال سے خالی نہیں۔ آپس میں ان دونوں داروں اور ان کی حکومتوں میں معاہدہ ومسالمہ ہوگا یا نہیں، اگر معاہدہ یا مسالمہ ہوگا تو اس کو دار المعاہدہ یا دار المسالمہ کہیں گے، اور اگر معاہدہ ومسالمہ نہ ہوگا تو پھر دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو اس ملک کے مسلم باشندے اور اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون ومحفوظ رہتے ہوں گے یا مامون ومحفوظ نہ رہتے ہوں گے۔ اگر مامون ومحفوظ رہتے ہوں۔ جیسے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ملک حبش تو اس ملک کو دار الامن کہا جائے گا۔ اور اگر اس ملک کے مسلم باشندے یا اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون ومحفوظ نہ رہتے ہوں تو اس ملک کو دار الشر والفساد کہا جائے گا۔ جیسے فتح مکہ سے پہلے مکہ مکرمہ۔ ــــــــــ نظام الفتاوی، ج ۲، ص ۱۲-۱۱-۲۱۰)

پس ہندوستان "دار الحرب" نہیں بلکہ "دار الامن" ہے اور بحیثیت دار الحرب یہاں سود لینا جائز نہیں۔
۴ــــ فقہاء کے اس اصول کے تحت کہ جہاں دو نامناسب صورتوں میں ایک کا انتخاب کرنا پڑے وہاں نسبتاً کمتر کو قبول کیا جائے گا اور "اهون البليتين" کو اختیار کیا جائے گا۔ بنک میں جمع شدہ

رقوم کا انٹرسٹ نکال لیا جائے تاکہ مخالف اسلام مقاصد میں اس کا استعمال نہ ہو سکے۔ عالمگیریہ میں ہے:

وعلیہ دیون ومظالم جھل اربابھا وایئس من علیہ من معرفتھم فعلیہ التصدق

بقدرھا من مالہ ——————— جلد ۵ ص ۳۸۵

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب نے بھی اپنے رسالہ "اشیاع الکلام فی مصرف الصدقۃ فی المال الحرام"
میں۔ اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ——————— (جواہر الفقہ، ج ۲، صفحہ ۲۸۲)

۵ــــ سود لینا بہر حال حرام ہے، سود دینا ضرورتاً جائز ہے۔ علامہ ابن نجیم مصری فرماتے ہیں کہ
ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح اور بے شک غیر اسلامی ممالک میں بعض دفعہ ایسی صورتیں پیدا ہو سکتی
ہیں کہ سودی قرض کا حصول اس کے لئے ضروری ہو جائے۔

۶ــــ سودی قرض لینا جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس پر مجبور ہو۔ یعنی اس کے بغیر وہ فاقہ کشی سے مجبور ہو
یا اس طرح کی کوئی اور مجبوری درپیش ہو، جس کو فقہاء ضرورت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح اگر
ایسی صورت حال سے دوچار ہو کہ سودی قرض نہ لینے کی صورت میں وہ شدید مشقت میں مبتلا ہو
جائے جس کو حاجت کہا جاتا ہے۔ تب بھی سودی قرض لینے کی گنجائش ہے۔ یہ مجبوری معاشی بھی ہو
سکتی ہے اور قانونی بھی۔ اس لئے انکم ٹیکس کے بعض قوانین کے تحت بھی سودی قرض کا حصول مجبوری
بن جاتا ہے۔

۷ــــ فقہاء نے جس طرح اپنے حق جائز کے حصول کے لئے رشوت دینے کی اجازت دی ہے۔ اسی
طرح ایسے [illegible] قرضوں کے حصول کا معاملہ دوسرے سودی قرضوں کے حصول کے مقابلہ خفیف ہے
مگر معمولی اسباب و وجوہ کے تحت اس کی اجازت دینا صحیح نظر نہیں آتا، کیونکہ حکومت پر قرض
دینے کا حق اس درجہ کا نہیں، جس درجہ کا حق مقدمہ کے ایک فریق کا اپنی مملوکہ شئی پر ہوتا ہے۔
اور وہ اس کے حاصل کرنے کے لئے رشوت دیتا ہے۔

۸ــــ چونکہ سود "فضل خالی عن العوض" کا نام ہے یہاں بحیثیت مجموعی قرض خواہ کو ایسا فضل ادا
نہیں کرنا پڑتا، اس لئے یہ صورت جائز ہوگی۔

۹ــــ اس صورت میں بھی وہی حکم جاری ہوگا جو ۶ میں لکھا جا چکا ہے، بربنائے حاجت سود
ادا کرنا درست ہوگا۔ جو سود ملتا ہے اگر وہ اس کو وصول نہ کرے اور وہ رقم غیر ملکی تاجر کے پاس
رہے تو سود نہ لے، اگر اس کو وصول کرنے پر مجبور ہو تو اس کو صدقہ کر دے۔

۱۰ــــ سود چاہے افراد سے لیا جائے یا افراد کے ایک مجموعہ سے۔ بہر حال سود ہے۔ اس لئے دونوں

کے حکم میں کوئی فرق نہیں۔

١١ مذکورہ صورت بھی بہرحال سودی قرض کی ہے اور سودی قرض کا حصول حاجت وضرورت ہی کے تحت درست ہے۔ لہٰذا یہ صورت ــ جو حاجت واضطرار سے خالی ہے جائز نہیں

جوابات ضمیمہ سوال ۲

١ــــ فیصلے تک عدالت سود کے ساتھ جو مجموعی رقم دلواتی ہے۔ وہ سود نہیں ہے۔ بلکہ زمین کی اصل حیثیت مقصور ہوگی کیونکہ اب تک مالک زمین کسی قیمت پر راضی نہیں ہوا تھا۔ کہ وہ قیمت حکومت کے ذمہ "دین" ہو، اور یہ اضافہ اس دین پر سود قرار پائے۔

۲ــــ یہ زائد رقم چونکہ قرض کی مقدار اور اس کی مدت ادائےگی کے تناسب سے ہی لی جاتی ہے۔ اس لئے سود میں داخل ہے۔

۳ــــ تجارت وسرمایہ کاری میں "نفع" کی تعین ہی وہ چیز ہے جو کسی معاملہ کو "مضاربت" کی حد سے نکال کر "ربا" میں داخل کر دیتا ہے۔ اس لیے مذکورہ صورت بھی سود میں داخل ہے۔

۴ــــ شرعاً تعزیر بالمال جائز نہیں ہے۔ اس لئے سود والی رقم واجب التصدق ہے۔ البتہ حکومت کو جس وقت یہ رقم ادا کرنی چاہیئے تھی اور اب جس وقت وہ اس رقم کو ادا کر رہی ہے۔ روپے کی قدر کے کم ہو جانے کی وجہ سے جو "اضافہ" اسے ملنا چاہیئے سود کے نام سے ادا کی جانے والی رقم کا اتنا حصہ اسکے لیے جائز ہوگا۔

سُود کی شرعی حیثیت

از ـــــــــ مفتی عزیزالرحمٰن مدنی، دارالافتاء بجنور

حامداً و مصلیاً۔ امابعد

اردو زبان میں جس چیز کو سود کہا جاتا ہے، عربی میں اسکو ربا کہتے ہیں، جس کے معنی بڑھوتری اور زیادتی کے آتے ہیں۔ یہ لغوی معنی ہیں ربوۃ ٹیلے کو کہا جاتا ہے جو آس پاس کی زمین سے ابھرا ہوا ہو۔ شرعی اعتبار سے بھی یہی معنی مفہوم ہوتے ہیں۔

۱۔ وفي الشرعي عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض في معاوضة۔ (روح)

۲۔ هو فضل مال خال عن العوض في معاوضة مال بمال۔ (مدارك)

لیکن حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے سود کے بارے میں جو اسرار بیان فرمائے ہیں اس سے سود یا ربا کی نہایت جامع تعریف حاصل ہوتی ہے۔

سود ایسا منافع جو بلا استحقاق بلا معاوضہ بلا تراضی خاص صرف مہلت کے مقابلہ میں حاصل ہو۔ ـــــــــ حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۳، ج ۲

ربا کی ضد بخس اور تنقیص ہے ـــــــــ مظہری ص ۴۰۱، ج ۱

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی آخری آیات میں ارشاد فرمایا ہے:

۱ـــ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت میں ایسا کھڑا ہوں گے جیسے آسیب زدہ ہوتا ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ دنیا میں کہا کرتے تھے کہ سود بھی ایک بیع ہے۔ حالانکہ بیع کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ پس جسکے پاس اللہ تعالیٰ کی یہ نصیحت آئی اسکے لئے ما سلف ہی ہے اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ اور جس نے پھر دوبارہ یہ حرکت کی (سودی خوری کی) وہی لوگ دوزخی ہیں۔ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

لہ صرف کہنے پر یہ وعید ہے لہ یعنی جو کچھ ہو چکا وہ معاف ہے

۲۔ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے۔ اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کفار اثیم کو دوست نہیں رکھتا۔[ئه]

۳۔ ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور مابقی سود کو چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ اگر تم ایسا نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول کا تمہارے لئے اعلان جنگ ہے۔ اگر تم نے توبہ کرلی تو تمہارے لئے بقدر راس المال ہی ہے تم نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

۴۔ ایک دوسری سورہ میں ارشاد فرمایا ہے:
ایمان والو! بڑھتا چڑھتا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

سود کی حرمت

مندرجہ بالا آیات سے سود کی حرمت قطعیت کے ساتھ ثابت ہے اور بقول قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی یہ نص غیر مجمل ہے۔ اشکال صرف بعض صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ ورنہ قطعیت میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ اسلامی تہذیب اور معاشرت کا شعار ہے جسمیں ترمیم یا تبدیل ناممکن ہے۔ شعار کی حیثیت اسلام میں فرض سے زیادہ اہم ہے۔

تاریخ حرمت ربوا (۹ھ) کو مفسرین اور علماء کے بیان کے مطابق اگر صحیح تسلیم کرلیا جائے تب بھی ۹ھ کے قبل کے حالات ایسے ملتے ہیں جن سے حرمت ربا اس سے قبل ثابت ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی مندرجہ بالا آیات جن کا نزول ۲ھ کے قریب کا ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی جس کو فضالہ بن عبیدؓ نے روایت کیا ہے۔

قال اشتریت یوم خیبر قلادۃ باثنی عشرۃ دینارا فقال لاتباع حتی تفصل۔ (مسلم مشکوٰۃ شریف)

غزوہ خیبر ۷ھ میں ہوا ہے اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ۲ھ میں بھی حرمت ربوا ثابت ہے

غیر اسلامی ملکوں میں سود کی حرمت

مشکوٰۃ شریف باب الربا میں ایک دوسری حدیث شریف موجود ہے۔ جس کو امام احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

۔ شب معراج میں، میں ایک ایسی قوم کے پاس آیا کہ ان کے پیٹ مثل گھر کے پھولے ہوئے تھے اور ان میں سانپ تھے جو باہر ہی سے دیکھے جا سکتے تھے۔ میں نے جبرئیلؑ سے

ئه گنہگار کافر غور فرمائیے اور اس پر مزید اضافہ سود خوری۔

سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں فرمایا یہ سود خور ہیں۔
اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہجرت سے پہلے معراج کے موقعہ پر یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ اسوقت بھی سُود کو بُرا جانا جاتا تھا۔

اور جنگ ایران اور روم کے موقع پر ۵ نبوی میں مکہ معظمہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُمیّہ بن خلف کے ساتھ جو شرط کی تھی وہ شرط ۲ھ میں غزوۂ بدر کے موقعہ پر پوری کرائی گئی اور اس وقت اہل روم کو اہل ایران پر فتح ہوئی تھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سَو اونٹ حاصل کئے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صدقہ کرا دیا تھا۔ اس کی طرف قرآن شریف بھی مذکور ہے۔

ویومئذ یفرح المومنون — اس دن مومنین خوش ہوں گے۔

اور اس میں غزوہ بدر کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ واقعہ ۲ھ کا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں مذکور ہے کہ حربی کافر سے اس کی رضامندی سے جو مال حرام حاصل ہو اس کو صدقہ کر دینا چاہیے۔

۱۔ —— لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب۔ رد المختار دار الحرب میں مسلمان اور کافر کے درمیان ربوا نہیں ہے۔

۲۔ لأن الربوا لا یجری بین المسلم والحربی فی دار الحرب اس لئے کہ دار الحرب میں مسلم اور کافر کے درمیان ربوا نہیں ہے۔

(مکتوبات شیخ الاسلام)

یہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے جو نصوص کے زیادہ قریب ہے اس لئے کہ لا ربا میں لا نفی جنس کیلئے ہے۔ اور سود کی تعریف میں تراضی کی قید سے اس پر ربا کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن معاملہ مسلمان اور کافر کے درمیان تک محدود ہے۔ خواہ بینک ہی کیوں نہ ہوں البتہ اس مال کو حاصل کر کے صدقہ کرنے کا جو حکم ہے وہ بطور مشورہ ہے تاکہ مسلمانوں میں سود کی حرمت برقرار رہے اور اس کی قباحت دُور نہ ہو جائے۔

میری رائے میں ان سودی رقومات سے مختلف ٹیکسوں کی ادائے گی۔ رشوت دینا وغیرہ غیر اسلامی معاملات کو پورا کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ کیونکہ مال طیب کو بچا لینا اور مال حرام کو جائے حرام پر خرچ کر دینا زیادہ مناسب ہے۔

ان تصریحات کے بعد سود دینے کا معاملہ زیر بحث آتا ہے، قومی عسرت، اقتصادی پس ماندگی اور عموم بلوی کی وجہ سے سرکاری طور پر حاصل شدہ قرضوں، بینکوں سے لئے ہوئے قرضے، انشورڈ کمپنیوں اور فائنینس کمپنیوں کے ذریعہ قرضے، انکم ٹیکس اور دوسرے ٹیکسوں کی بھرمار کارخانے والوں

پرملازمین کے لئے فنڈ وغیرہ ایسے قیودات ہیں کہ اگر صحیح طور پر چلا جائے تو دیوالیہ ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں اس لئے کسان وکاس پتر اندرا وکاس پتر اور دوسرے متفرق قسم کے بونڈ سے رقومات کو حاصل کرنا چاہیئے اور اپنی قوم کے فلاحی کاموں پر بھی خرچ کر دینا چاہیئے۔

فقط : واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب



GOD IS THE BEST OF PROTECTORS

ربوا کی حقیقت

از: ـــــــــــــــ مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری
استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم دیوبند

ربوا عقد معاوضہ میں کسی فریق کو حاصل ہونے والی وہ زیادتی ہے جس کے مقابل کوئی چیز نہ ہو۔ فضل مال بلا عوض، فی معاوضۃ مال بمال (کنزالدقائق) اور ربوا کا دائرہ مقادیر (کیلی اور موزونی چیزیں) ہیں، مجانست کی شرط کے ساتھ۔ الربا محرم فی کل مکیل او موزون، اذا بیع بجنسہ متفاضلاً، فالعلۃ عندنا، الکیل مع الجنس، او الوزن مع الجنس، قال ؒ، ویقال، القدر مع الجنس وهو أشمل (ھدایہ باب الربوا)

اور تحقیق ربا کے لئے چار شرطیں ہیں (۱) عوضین کا معصوم ہونا یعنی ایسا محترم مال ہونا جس کا جبراً لینا درست نہ ہو (۲) عوضین کا مال متقول ہونا یعنی ایسا مال ہونا جس کا اتلاف موجب ضمان ہو۔ (۳) دونوں عوضوں کا ایک شخص کی ملکیت نہ ہونا کما بین العبد وسیدہ۔
(۴) عوضین میں متعاقدین کی شرکت کا نہ ہونا۔

(۱) صورت مسئولہ ۱ میں عدالت جو قیمت متعین کرتی ہے۔ اور اس پر ۶٪ سالانہ کی شرح سے سود کا حکم دیتی ہے اس پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی بلکہ حکومت کا یہ نام نہاد سود جبز وثمن ہے۔ اگر اس قسم کا حرجانہ اسلامی حکومت دے تو بھی درست ہے۔

(۲) اور صورتِ مسئولہ ۲ پر سود کی تعریف صادق آتی ہے، اس لئے وہ درست نہیں ہے صرف نام بدلنے سے کام نہیں چلتا، شراب کا نام شربت رکھ لیا جائے تو اس سے شراب حلال نہیں ہو جائے گی۔ البتہ اگر شراب سرکہ بن جائے تو حلال ہو جائے گی۔ کیونکہ اس صورت میں صرف نام ہی نہیں بدلتا۔ بلکہ اس کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے۔ اور حقیقت بدلنے کی صورت یہ ہے کہ واقعی مصارف لئے جائیں یعنی مصارف کا باقاعدہ حساب رکھا جائے اور سال کے آخر میں اس کو مستقرضین پر حصہ رسد پھیلایا جائے تو اس کا لینا درست ہو سکتا

ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ مدیون، دائن سے کہتا ہے کہ آپ اپنا قرضہ میرے گھر آکر لیجائیں آمدورفت کے مصارف میں ادا کروں گا تو یہ مصارف لینا درست ہے۔ الغرض محض "سروس چارج" نام رکھ لینے سے جواز پیدا نہیں ہوسکتا۔

(۳) اور صورت مسئولہ ۳ بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ عقد دو فریق مل کر طے کرتے ہیں۔ صرف مضارب کی نیت کافی نہیں ہے اور ۔٥٠ء چونکہ نفع متعین کر دیتی ہے۔ اس لئے یہ مضاربت فاسدہ ہے۔

(۴) اور صورت مسئولہ ۴ درست ہے۔ اس پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی۔ کیونکہ اس صورت میں کوئی عقد معاوضہ نہیں ہے۔ اس کی مثال پرو ویڈنٹ فنڈ پر مستزاد ملنے والی رقم ہے۔ جس کو حکومت سود کہتی ہے۔ مگر فقہاء کرام اس کو ابتدائی تبرع قرار دیتے ہیں اور اس کو جائز کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

دَارُالاِسْلَام اور دَارُالحَرب

دارالاسلام سے مراد وہ ملک ہے جو مسلمانوں کے زیر نگیں ہو، اور دارالحرب سے مراد وہ ملک ہے جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کے پاس ہو۔ المراد بدار الاسلام : بلاد یجری فیہا حکم امام المسلمین ، ویکون تحت قہرہ ، وبدار الحرب : بلاد یجری فیہا أمر عظیمہا ، ویکون تحت قہرہ (کذا فی بحوالہ فتاوی عزیزی ج ۱ ص ۱۶)

اور دارالحرب کے دارالاسلام بننے کے لئے صرف اقتدار کی منتقلی کافی ہے۔ دار الحرب تصیر دار الاسلام بأجراء احکام أھل الاسلام فیہا ، کجمعۃ وعید ، وان بقی فیہا کافر اصلی ، وان لم تتصل بدار الأسلام (ردالمحتار کتاب الجہاد، فصل فی استئمان الکافر)

اور دارالاسلام کے دارالحرب بننے کے لئے صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک تو اقتدار کی منتقلی کافی ہے۔ مگر امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک تین شرطیں ہیں۔ (۱) علی الاعلان احکام کفر کا جاری ہونا۔ (۲) اگر محدود خطہ ہو تو اس کا دارالحرب سے متصل ہونا۔ (۳) حاکم اسلام کے دیئے ہوئے امان کا بالکلیہ ختم ہوجانا

لاتصير دار الاسلام دار حرب، إلا بامور ثلاثة: باجراء احكام الشرك، وباتصالها بدار الحرب، وبان لا يبقى فيها مسلم او ذمي آمنا بالأمان الاول على نفسه (درمختار)

اور اگر کسی ملک میں مسلمانوں کے اور غیر مسلموں کے احکام ایک ساتھ نافذ ہوں تو وہ دار الحرب نہیں ہے۔ لو اجريت احكام المسلمين واحكام اهل الشرك، لا تكون دار حرب (شامی)

اور دونوں کے احکام جاری ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی خاص علاقہ میں مسلمانوں کے احکام جاری ہوں اور دوسرے علاقہ میں غیر مسلموں کے احکام نافذ ہوں بلکہ مراد یہ ہے کہ مسلمانوں میں اسلامی احکام جاری ہوں اور غیر مسلموں میں شرک کے احکام نافذ ہوں تو ایسا ملک، دار الحرب نہیں ہے، پھر کیا وہ دار الاسلام ہے؟ اس کی اگرچہ صراحت نہیں ہے مگر الاسلام یعلو کا تقاضا یہی ہے کہ وہ دار الاسلام کہلائے گا۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ موجودہ ہندوستان جس نے اپنی حیثیتِ عرفی تو کھو دی ہے مگر یہاں عظیم المشرکین کا تنہا حکم جاری نہیں ہے، کیونکہ ملک کا دستور سیکولر ہے حکومت کا نظام پارلیمانی ہے۔ ہر شخص کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہے اور ہر قوم کا پرسنل لا محفوظ ہے، پس ایسے ملک کو دار الحرب کہا جائے یا دار الاسلام، کیونکہ فقہاء کے نزدیک دار کی تیسری کوئی قسم نہیں ہے؟ مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں مجھے اس کے دار الحرب ہونے میں شک ہے۔ جو حضرات اس کو دار الحرب قرار دیتے ہیں ان کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ پارلیمانی نظام میں فیصلہ اکثریت کی بنیاد پر ہوتا ہے اور چونکہ اس وقت ہندوستان میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے۔ اس لئے اقتدار اعلیٰ انہی کا مانا جائے گا، مگر یہ خیال قرین صواب نہیں ہے۔ کیونکہ توافقِ آراء ہمیشہ مذہب کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ مشاہدہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں، اس لئے یہ ایسی قوی بنیاد نہیں ہے کہ بے جھجک ہندوستان کو دار الحرب کہدیا جائے۔

دوسری دلیل ان حضرات کی فسادات کا مسئلہ ہے، مگر اس کا سبب حکومت کی کمزوری ہے، مسلم ممالک کی صورت حال ہندوستان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ امام اعظم دار الحرب کا حکم لگانے میں احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ ضیصلۃ الأعلام في دار الحرب و دار الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے نظر دقیق سے بطور استحسان کے یہ بتایا ہے کہ جب تک غلبۂ اسلام کے آثار میں سے کوئی چیز پائی جاتی ہو یا استیلار کفار میں ایسا ضعف محسوس ہو کہ مسلمانوں پر اس کا زائل کر دینا مشکل نہ ہو، اس وقت تک اس ملک پر دار الکفر ہونے کا حکم نہیں کرنا چاہیئے۔ اسی بنا پر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملک کے دار الحرب ہونے کے لئے دو شرطیں زائد فرما دیں" (ترجمہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

پھر دار الحرب قرار دینے کا مقصد جہاد یا ہجرت ہوتی تو ایک بات بھی تھی۔ فی زمانہ تو اس بحث کا مقصد صرف سود کو جائز قرار دینا ہے۔ جبکہ سود کی شناعت زیادہ سے زیادہ احتیاط کی متقاضی ہے۔ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ رسائل قاسم العلوم میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

کار ایماں آں بود کہ در بارۂ ہجرت ہندوستان دار الحرب قرار می دادند، و در بارہ سود گرفتن و نا گرفتن، و دادن و نا دادن ایں دیار را دار الاسلام می فہمیدند، نہ ایں کہ در بارۂ ہجرت دار الاسلام، و وقت سود گرفتن دار الحرب" ———— (مکتوب ۷)

علاوہ ازیں دار الحرب کے معاملہ میں جو روایت آئی ہے اولاً تو وہ متکلم فیہ ہے، ثانیاً فقہاء کرام نے اس کو مسلم مستامن کے ساتھ مقید کیا ہے یعنی سود لینے والا وہ مسلمان ہو جو دار الاسلام سے ویزا لیکر دار الحرب میں آیا ہو، نیز یہ قید بھی لگائی ہے کہ اس نے سود لیا ہو، دیا نہ ہو اور حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے تو احتراز بدار الاسلام کو بھی شرط قرار دیا ہے۔

ا ــــ اور فقہاء کرام نے اس شخص کو جو دار الحرب میں مسلمان ہوا ہو، اور ہجرت کر کے دار الاسلام میں آیا نہ ہو، اس کو جو حربی کے مانند قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے یہ بیان فرمایا کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد اس حکم سے اس شخص کو عار دلانا ہے اور دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنے پر ابھارنا ہے۔ آنحضرت تحریر فرماتے ہیں کہ:

غرض امام رحمۃ اللہ علیہ ازیں کلام ایں بود کہ لحوق عار باعث ترک آں دار خواہد بود، ایں جا برعکس آں رو نمود، ہمیں اباحت سرمایۂ اقامت ہند گردید، استغفر اللہ!"

اس ضروری تمہید کے بعد عرض یہ ہے کہ اہل حرب کے اموال دار الاسلام کے مسلمانوں کے حق میں تو معصوم اور قابل ضمان نہیں ہیں، مگر دار الحرب میں مقیم مسلمانوں کے حق میں بھی معصوم اور قابل ضمان نہیں ہیں۔ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اس لئے ہندوستانی مسلمان

اور یہاں کے غیر مسلم کے درمیان کوئی سودی معاملہ ہوتا ہے تو وہ صورۃً بھی سودی معاملہ ہے۔ اور حقیقۃً بھی سودی معاملہ ہے۔

(۴) بینک میں ــــــ خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری ــــــ ضرورۃً جو رقم جمع کی جاتی ہے۔ اور اس پر جو سود ملتا ہے اس کا حکم قیاس کی رُو سے تو یہ ہے کہ اس کو نہ لیا جائے مگر انگریزی دور میں مفتیانِ کرام نے استحساناً یہ فتویٰ دیا تھا کہ اس کا لینا ضروری ہے۔ موجودہ ہندوستان میں اس فتویٰ کو بدلنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے اس لئے اب بھی اربابِ افتاء کی یہی رائے ہے کہ اس کو لے کر بغیر نیت ثواب غرباء کو مالک بنانا ضروری ہے۔ بعض اکابر نے رفاہِ عام کے کاموں میں خرچ کرنے کی بھی گنجائش دی ہے، مگر مجھے اس سلسلہ میں شرح صدر نہیں ہے۔

نوٹ: ایک فتویٰ یہ سامنے آیا ہے کہ "سود کی رقم بینک سے نکال کر اولاً غیر واجب ٹیکس کی ادائیگی کی صورت میں حکومت کو واپس کر دیا جائے تاکہ ردعلی رب المال کا اصول پورا ہو جائے۔ اگر یہ صورت نہ ہو سکے تو پھر اس رقم کو رفع وبال کی نیت سے فقراء ومحتاجوں کو دیدیا جائے"۔ ــــــ یہ فتویٰ درست نہیں ہے کیونکہ اگر ردعلی رب المال ضروری ہے تو پھر بینک سے اس کو لینے ہی کی کیا ضرورت ہے؟

(۵) موجودہ ہندوستان میں سود کے لینے کی یعنی استعمال کرنے کی تو قطعاً گنجائش نہیں ہے البتہ مجبوری کی صورت میں دینے کی گنجائش ہے اور اس کی بنیاد یہ فقہی جزئیہ ہے کہ یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباہ)

(۶) حاجت مند کے لئے سودی قرضہ لینے کی شرعاً گنجائش ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا جزئیہ سے واضح ہے۔ اور فتح القدیر میں پانچ مراتب بیان کئے گئے ہیں: ضرورت، حاجت، منفعت، زینت اور فضول:

ضرورت: ایسی حد تک پہونچ جانے کا نام ہے کہ اگر ممنوع چیز نہ کھائے گا تو ہلاک ہو جائے گا یا ہلاکت کے قریب پہونچ جائے گا۔ ــــــ یہ مرتبہ حرام کے کھانے کو مباح کر دیتا ہے۔

حاجت: جیسے بھوکا آدمی کہ اگر اس کو کھانے کی کوئی چیز میسر نہ ہوگی تو ہلاک تو نہ ہوگا۔ البتہ جہد ومشقت سے دوچار ضرور ہوگا۔ ــــــ یہ مرتبہ حرام کو حلال نہیں کرتا، البتہ ایسے شخص کے لئے روزہ افطار کرنا جائز ہے۔

منفعت : جیسے گیہوں کی روٹی، بکری کا گوشت، اور مرغن کھانوں کی خواہش کرنا۔
زینت : جیسے حلوئی شکر کی خواہش کرنا۔
فضول : جیسے حرام اور مشتبہ چیزوں کا ٹھاٹھ سے کھانا (حموی قاعدہ خامسہ)

(۷) ان سب کا حکم عام سودی قرضوں کی طرح ہے اور ان صورتوں میں سود دینے کو رشوت دینے پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ وجوہ درج ذیل ہیں۔

(الف) حق کی تحصیل کے لئے رشوت دینے کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ سود دینے کی اجازت نہیں دی۔

(ب) رشوت میں کوئی عقد معاوضہ نہیں ہوتا اور ان صورتوں میں عقد معاوضہ ہے۔ اس لئے رشوت دینے نہ دینے کا اختیار ہوتا ہے اور ان صورتوں میں نہ دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے

(ج) مالداروں کے مال میں بھی غرباء کا حق ہے وفی اموالھم حق معلوم، للسائل والمحروم اس لئے اگر رشوت والی تاویل حکومتی سودی قرضوں میں درست ہوگی تو پھر اس کو مہاجنی سودی قرضوں میں بھی جاری کرنا ہوگا۔ وھو کما ترٰی ؛

(۸) اگر چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی یا زیادہ ہے تو درست ہے اور اس کو قرضہ ہی کی واپسی کہا جائے گا۔ حکومت اس کا جو چاہے نام رکھے۔

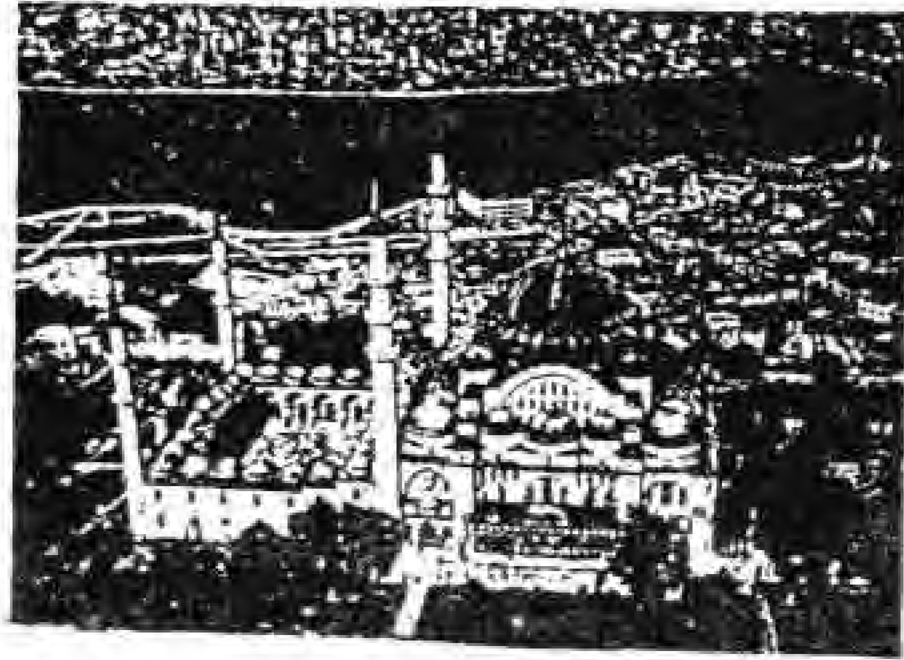
(۹) غیر ممالک سے مال درآمد کرنے کی صورت میں اگر واقعی قانونی مجبوری ہو تو سود دینے کی گنجائش ہے۔ جیسے ہوائی جہاز سے سفر کی صورت میں چونکہ بیمہ پالیسی میں مجبوراً حصہ لینا پڑتا ہے۔ اور غیر ممالک کو مال برآمد کرنے کی صورت میں چونکہ کوئی قانونی مجبوری نہیں ہے۔ اس لئے اس صورت میں ملنے والے سود کا حکم وہی ہے جو بینک کے سود کا ہے کہ اس کو لے کر غرباء کو مالک بنانا ضروری ہے۔

(۱۰) بینک خواہ سرکاری ہوں یا شخصی۔ سودی قرض لینے کے بارے میں دونوں کا حکم یکساں ہے۔

(۱۱) اپنی صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے پرائیوٹ سرمایہ کاروں سے سرمایہ حاصل کرکے اس پر سود ادا کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

تنبیہ: ایک خیال یہ سامنے آتا ہے کہ چونکہ سرکاری خزانہ میں ہر شخص کا حق ہے۔ اسلئے حکومت اور رعایا کے درمیان سودی معاملہ نہ ہوگا۔ یہ خیال بہت قدیم ہے۔ مگر صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ تحقق ربوا کی شرائط اربعہ میں تیسری شرط دونوں عوضوں کا ایک شخص کی ملکیت نہ ہونا جو بیان کی گئی

ہے۔ اس کی مثال عبد و سید دی گئی ہے۔ ایسی دوسری مثالیں مالک اور دکان کا مینیجر اور باپ اور بیٹا بھی ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ املاک متمایزہ نہ ہوں، بیٹا باپ کے ماتحت ہو لیکن اگر بیٹے کی املاک متمایزہ ہوں تو باپ اور بیٹے کے درمیان سود کا تحقق ہوگا۔ اگرچہ باپ کے مال میں وارث ہونے کی حیثیت سے اولاد کا حق ہوتا ہے۔ اسی طرح رعایا کا بیت المال میں جو حق ہے۔ اس کی وجہ سے املاک کا تباین ختم نہیں ہو جاتا۔



سود کا مسئلہ

از — مولانا مفتی جمیل احمد نذیری
جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور اعظم گڑھ

۱ — **ربا کی تعریف :-** فضل خال عن عوض بمعیار شرعی مشروط لاحد المتعاقدین فی المعاوضۃ۔ (درالمختار ج ۴ ص ۱۸۶)

ربا کا دائرہ :- فالعلۃ عندنا الکیل مع الجنس او الوزن مع الجنس قال ویقال القدر مع الجنس۔ (ھدایہ ج ۳ ص ۶۰)

اسی کتاب میں ہے۔ لان الربوا ھو الفضل المستحق لاحد المتعاقدین فی المعاوضۃ الخالی عن عوض شرط فیہ۔ (حوالہ مذکورہ)

اسی کتاب کے ص ۶۱ پر ہے واذا عدم الوصفان الجنس والمعنی المضموم الیہ حل التفاضل والنساء۔

بدائع میں ہے۔ ومنھا القبض من احتمال الربوا (الی) فاحتمال الربوا یفسد لہ (ج ۵ ص ۲۳۲)

۲ — دار الحرب کے سودی معاملات سود نہیں کہے جا سکتے کیونکہ عصمت بدلین تحقق ربا کے لیے شرط ہے۔

قال فی الشرنبلالیۃ ومن شرائط الربوا عصمۃ البدلین وکونھما مضمونین بالاتلاف فعصمۃ احدھما وعدم تقومہ لا یمنع۔ (درالمختار ج ۴ ص ۱۸۹)

فتح القدیر میں ہے۔ وھذا التقریر فی التحقیق یقتضی انہ لو لم یرد خبر مکحول اجاز النظر المذکور اعنی کون مالہ مباحا الا لعارض لزوم العقد۔ (ج ۵ ص ۳۰۱)

۳ — **دار الحرب اور دار الاسلام کی تعریف :-** ان المراد بدار الاسلام بلاد یجری فیھا حکم امام المسلمین وتکون تحت قھرہ وبدار الحرب بلاد یجری فیھا امر عظیمھا وتکون تحت قھرہ۔

یہ دونوں حقیقی دار الحرب (ایسے ممالک جو بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کبھی مسلمانوں کے زیر نگیں نہیں آئے) کی تعریف ہے اور ایسے حقیقی دار الاسلام (ایسے ممالک جو مسلمانوں کے

قبضہ میں آنے کے بعد سے آج تک انہیں کے قبضہ میں ہیں) کی۔ جو ممالک دارالاسلام رہ کر کفار کے تسلط میں چلے گئے ہوں ان کے متعلق بدائع الصنائع میں ہے۔ (ہندوستان بھی انہیں ممالک میں داخل ہے)

واختلفوا فی دارالاسلام انہا بماذا تصیر دارالکفر قال ابوحنیفۃ انہا لا تصیر دارالکفر الا بثلاث شرائط احدہا ظہور احکام الکفر فیہا والثانی ان تکون متاخمۃ لدارالکفر والثالث ان لا یبقی فیہا مسلم ولا ذمی آمنا بالامان الاول وہو امان المسلمین وقال ابویوسف ومحمد رحمہما اللہ انہا تصیر دارالکفر بظہور احکام الکفر فیہا۔
(ج ۷، ص ۱۳۰)

اسی کتاب میں ہے۔

وجہ قولہ ابی حنیفۃ رحمہ اللہ ان المقصود من اضافۃ الدار الی الاسلام والکفر لیس ہو عین الاسلام والکفر وانما المقصود ہو الامن والخوف ومعناہ ان الامان ان کان للمسلمین فیہا علی الاطلاق والخوف للکفرۃ علی الاطلاق فہی دارالاسلام وان کان الامان فیہا للکفرۃ علی الاطلاق والخوف للمسلمین علی الاطلاق فہی دارالکفر والاحکام مبنیۃ علی الامان والخوف لا علی الاسلام والکفر فکان اعتبار الامان والخوف اولی فما لم تقع الحاجۃ للمسلمین الی الاستئمان بقی الامن الثابت فیہا من الاطلاق فلا تصیر دارالکفر وکذا الامن الثابت علی الاطلاق لا یزول الا بالمتاخمۃ لدار الحرب فتوقف صیرورتہا دارالحرب علی وجودہما۔ الخ

مذکورہ بالا عبارات فقہیہ نیز اس کے علاوہ بھی کچھ عبارتیں ہیں جس سے احقر کے نزدیک ہندوستان کا دارالحرب ہونا یقینی نہیں، رجحان دارالامن کی طرف ہے۔ ویسے یہ ایک تفصیلی بحث ہے جس پر الگ سے گفتگو ہونی چاہیئے۔

۴۔ بینکوں سے سود نکال لیا جائے اور بلانیت ثواب محض تفریغ ذمہ کے لئے غرباء، و مساکین کو صدقہ کر دیا جائے۔

قال الشرنبلالی ان الخبیث واجب التصدق فلا یاخذ الامن یجوز لہ الصدقۃ (فتاویٰ مولانا عبدالحی مبوب ص ۶۶) لایقصد بہ ای بالتصدق من المال الخبیث تحصیل الثواب بل تفریغ الذمۃ۔ (کتاب مذکور ص ۵۲۰)

۵۔۔۔ سود لینے اور دینے میں فرق ہے۔ سود لینا کسی حال میں کبھی بھی جائز نہیں۔ سود دینے کی بعض حالات میں کچھ گنجائش ہے۔ جیسا کہ چھ کے تحت آرہا ہے۔

اس کی نظیر رشوت ہے کہ بعض حالات میں (مثلاً اپنا حق لینے اور اپنے سے ظلم کو دفع کرنے کے لئے) رشوت دینے کی گنجائش ہے مگر لینے کی کبھی بھی گنجائش نہیں۔

الرشوۃ ما یعطی لابطال حق او لاحقاق باطل اما اذا اعطی لیتوصل بہ الی حق او لیدفع بہ عن نفسہ ظلما فلا باس بہ (مرقات المفاتیح ج ۴ ص ۱۵۳)

۶۔۔۔ اگر کسی جائز ذریعہ معاش کا کوئی بندوبست نہ ہوتا ہو تو مجبوراً سودی قرض لینا جائز ہے۔

یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح۔ (الاشباہ والنظائر ص ۹۵)

۷۔۔۔ اس صورت میں احقر کے نزدیک رشوت پر قیاس درست ہے۔

۸۔۔۔ احقر کے نزدیک اس قسم کا قرض اس نیت سے لینے کی گنجائش ہے کہ اس چھوٹ کو قبول نہیں کرتے۔ ہم پوری رقم ادا کریں گے۔ خواہ حکومت چھوٹ والی رقم کے مساوی رقم، سود کے نام سے وصول کرے۔ ہم اصل رقم سمجھ کر ادا کر رہے ہیں، اور چھوٹ ہمیں منظور نہیں۔ (چھوٹ قبول نہ کرنے کی صورت میں وہ رقم پوری کی پوری ذمہ میں باقی رہ جائیگی۔ لہٰذا مذکورہ نیت کی گنجائش ہے۔ البتہ اگر چھوٹ والی صورت میں کچھ تفصیل ہو تو وہ بھی لکھی جائے تاکہ مزید غور کیا جائے۔

۹۔۔۔ غیر مسلم ممالک (دار الحرب) سے اس قسم کی تجارت جائز ہے۔ اس پر شرعاً سود کا اطلاق نہ ہوگا بین الاقوامی تجارتی ضوابط بھی حربی کے ہی وضع کردہ ہیں۔ لہٰذا اس قسم کی تجارت کی شرعاً گنجائش ہے۔

۱۰۔۔۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں، دونوں کا سود حرام ہے۔

۱۱۔۔۔ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ سودی قرض لینے کے لئے۔ سوال میں درج شدہ اعذار شرعاً عذر نہ بنیں گے۔ واللہ علم بالصواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضمیمہ سوال ۲ کے جوابات

— خواہ جائیداد پر قبضہ، افسر متعلق کی طرف سے قیمت کے تعین کے بعد ہوا ہو یا قبضہ فوراً ہی ہو گیا ہو اور قیمت کا تعین بعد میں ہوا ہو، دونوں صورتوں میں ۶ فیصد والی رقم کو شرعاً سود نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ ہماری ملکیت کا جو معاوضہ ہمیں ملا نہیں وہ خواہ معاوضہ کے فرق یا اپنی ملکیت کے انتفاع سے محرومی کے معاوضہ اور سود کے نام پر ملے حقیقت میں وہ ملکیت کا ہی معاوضہ مانا جائے گا۔ اسے شرعاً سود نہیں کہا جا سکتا کیونکہ سود (ربا) کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی۔ **نظیرہ:-**

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"تنخواہ کا کوئی جزو اس طرح وضع کرا دینا اور پھر یکمشت وصول کر لینا اگرچہ اس کے ساتھ سود کے نام سے کچھ رقم ملے یہ سب جائز ہے۔ کیونکہ درحقیقت وہ سود نہیں ہے اس لئے کہ تنخواہ کا جو جزو وصول نہیں ہوا وہ اس ملازم کی ملک میں داخل نہیں ہوا۔ پس وہ رقم زائد اس کی مملوک شے سے منتفع ہونے پر نہیں دی گئی بلکہ تبرع ابتدائی ہے گو گورنمنٹ اس کو اپنی اصطلاح میں سود ہی کہے۔ امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۱۲۹

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

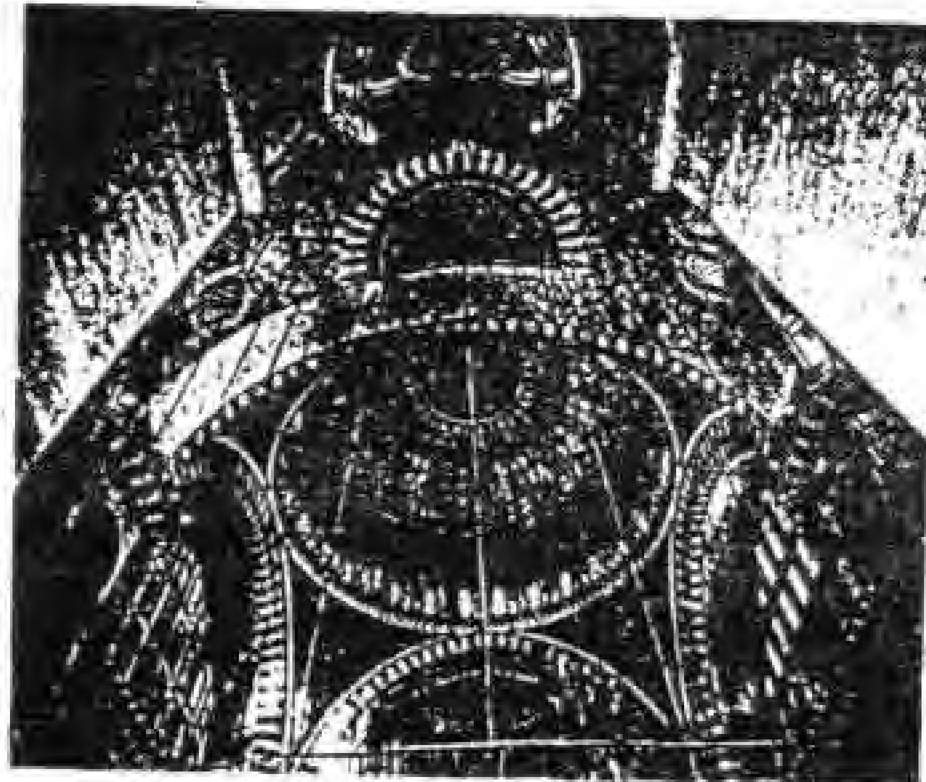
"پراویڈنٹ فنڈ اور اس پر جو سود ملتا ہے لینا اور اپنے صرف میں لانا جائز ہے۔ کیونکہ وہ حقیقتاً سود کے حکم میں نہیں ہے۔ (کفایت المفتی ج ۸ صفحہ ۹۳)

۲— اس توجیہہ و تاویل کی گنجائش ہے۔ حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمی، صدر مفتی دارالعلوم دیوبند نے نظام الفتاویٰ جلد اول ص ۲۵۱، ۲۹۶ میں اس مکمل پر مفصل بحث کی ہے۔ مگر ان معاملات پر علماء کرام کو مزید غور و خوض کی ضرورت ہے

اور اس توجیہہ و تاویل کے قبول کرنے میں کوئی کھٹک باقی نہ رہے
میرے خیال میں حضرت مفتی صاحب کی توجیہات پر ہی غور ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

۳۔ اگر پورے خلوص و دیانت داری کے ساتھ اسی نیت کے مطابق عمل درآمد کرے تو احقر کا رجحان جواز کی طرف ہے۔

۴۔ اس کو حرجانہ پر قیاس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ محمد یونس کو پوری رقم لینا جائز ہے، خواہ وہ تنخواہ کے نام پر ہو یا سود کے نام پر اور اس کی وجہ جواز وہی ہے جو سوال ۱ کے جواب کے تحت گذری۔ اسے تبرع ابتدائی کہیں گے اس زائد رقم کو شرعاً سود نہیں کہہ سکتے۔ ——— واللہ اعلم بالصواب



ربوا کی تعریف اور اس کے احکام و مسائل

از ——————— حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب، دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا گجرات

ربا حرام ہے اور اس کی حرمت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔ متعدد قرآنی آیات اور چالیس سے زیادہ احادیث اس کی شاہد ہے۔ یہاں محض تبرک اور اشارے کے طور پر دو آئتیں اور ایک حدیث کا ذکر کر رہا ہوں۔ پہلی آیت "اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" ہے جو سورہ بقرہ کی آیت ہے۔ اور دوسری آیت سورۂ آل عمران کی ہے یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضَاعَفَۃً وَّاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْن اور حدیث یہ ہے جو حضرت جابر بن عبداللہ سے مسلم شریف میں مروی ہے۔ روایت یہ ہے قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے سود دینے والے سودی تحریر اور حساب وغیرہ لکھنے والے اور سود کی شہادت دینے والے پر لعنت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ "گناہ" میں سب برابر ہیں۔ ربا لغت میں زیادتی اور بڑھوتری کو کہتے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں ربا اس زیادتی کو کہتے ہیں جو بغیر کسی مالی معاوضہ کے عقد معاوضہ میں حاصل کی جائے۔

صاحب ہدایہ نے ربا کی تعریف اس طرح کیا ہے۔ الربوا ھو الفضل المستحق لاحد المتعاقدین فی المعاوضۃ الخالی عن عوض شرط فیہ، ھدایہ جلد ثالث ص ٦١

اور شامی میں ربا کی تعریف اس طرح کی گئی ہے الربوا ھو لغۃ مطلق الزیادۃ وشرعاً فضل ولو حکماً فدخل ربا النسیئۃ والبیوع الفاسدۃ فکلھا من الربا فیجب رد عین الربا لو قائماً لارد ضمانہ لانہ یملک بالقبض" قنیۃ (یحی خال من عوض بمعیار شرعی" وھو الکیل والوزن فلیس الذرع والعد بربا مشروط" ذلک الفضل لاحد المتعاقدین فی المعاوضۃ۔ "(شامی ص۱۹۲ ج۴)

دونوں تعریف کا حاصل ایک ہی ہے یعنی شریعت میں ربا اس زیادتی کا نام ہے جو عقد معاوضہ میں متعاقدین بغیر کسی عوض کے حاصل کریں۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس میں وہ زیادتی بھی داخل ہے جو روپیہ کو اُدھار یعنی قرض دیکر حاصل کی جائے اس لئے کہ اصل راس المال کے معاوضہ میں تو پورے کا پورا مال مل ہی جاتا ہے۔ اور اس پر جو زیادتی سود یا انٹرسٹ کے نام سے لی جاتی ہے وہ بلاعوض ہے۔ اسی طرح بیع و شراء کی وہ صورتیں بھی اس میں داخل ہیں کہ جن میں کوئی زیادتی بلاعوض حاصل کی جائے۔

ربا کا یہ مفہوم کہ قرض دیکر اس پر کچھ نفع لیا جائے۔ عرب میں اسلام سے پہلے بھی رائج تھا۔ اور اس کو ربا ہی قرار دیا جاتا تھا۔ اسی طرح قرض کی رقم کا وقت مقررہ پر ادا نہ کرنے کی صورت میں میعاد بڑھا کر اس کے مقابلہ میں کچھ مزید رقم حاصل کرنا یہ بھی اہل عرب کے یہاں ربا ہی کے شعبہ میں داخل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بیع و شراء میں زیادتی بھی ربا میں شامل ہے۔ اس سے اہل عرب نہ واقف تھے۔ اور نہ اس کو ربوا قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ربا کے مفہوم کو وسیع کرتے ہوئے اس قسم کی زیادتی کو بھی ربا میں شامل کر دیا۔ چنانچہ بخاری شریف میں ابو سعید خدری کی یہ روایت موجود ہے جو بخاری کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں بھی موجود ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثل بمثل. يدا بيد فمن زاد او استزاد فقد اربى الآخذ والمعطى فيه سواء

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ چھ چیزیں جن کا ذکر اس حدیث میں ہے یعنی سونا۔ چاندی۔ گیہوں۔ جو۔ تمر اور نمک۔ اگر ان چیزوں کا تبادلہ اسی جنس کے ساتھ ہو تو ضروری ہے کہ معاملہ برابری اور نقد کا ہو۔ اگر اس میں کمی زیادتی کی گئی تو یہ ربا میں داخل ہوگا۔ اسی طرح اگر ادھار کا معاملہ کیا تب بھی یہ ربا میں داخل ہو جائے گا خواہ ادھار میں کمی زیادتی نہ ہو اور معاملہ برابر سرابر کا ہو۔

بیع و شراء میں زیادتی کی یہ صورت جس کو اس حدیث میں ربا قرار دیا گیا ہے۔ اہل عرب میں اسلام سے قبل اس کو سود نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات جب مشرکین مکہ کے کانوں تک پہونچی تو انہوں نے انما البيع مثل الربوا کہکر رد کر دیا۔ جس کا جواب اللہ تعالیٰ نے حاکمانہ انداز میں یہ دیا کہ دونوں ایک جیسا کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام قرار دیا ہے احل الله البيع وحرم الربوا ـــــ لیکن صحابۂ کرام اور خاص

طور پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم کو مذکورہ حدیث اور ربا کے بارے میں یہ پریشانی رہی کہ حضورؐ دنیا سے رخصت ہوگئے اور ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ربا کے بارے میں مزید توضیح و تفصیل معلوم نہ کرسکے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے تو "دعوا الربوا والریبۃ" کا اعلان فرما دیا۔ یعنی ربوا کو بھی چھوڑ دو۔ اور ان چیزوں کو بھی چھوڑ دو جن میں ربوا کا شبہ ہو۔ دراصل صحابہ کرام اور حضرت عمرؓ کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ربا کو مذکورہ چھ چیزوں میں منحصر فرمایا ہے یا ان چیزوں کو آپؐ نے بطور مثال کے ذکر فرما کر دوسری چیزوں کو بھی اس میں شامل فرمایا ہے اور اگر دوسری چیزیں بھی اس میں شامل ہیں۔ تو اس کی شمولیت کے لئے ضابطہ اور قاعدہ کیا ہوگا۔
اس کی وضاحت کئے بغیر آپؐ دنیا سے رخصت ہوگئے بعد میں ائمہ کرام نے حدیث مذکور کو معلل بالعلۃ قرار دے کر ربا کا دائرہ ان اشیاء ستہ سے وسیع کر دیا۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ نے قدر اور جنس علت نکال کر بتلا دیا کہ جہاں جہاں یہ دونوں باتیں پائی جائیں گی زیادتی اور ادھار دونوں حرام ہوگا اور جہاں ان دونوں چیزوں میں ایک چیز پائی جائے گی وہاں زیادتی جائز اور ادھار ناجائز ہوگا اور جہاں یہ دونوں وصف موجود نہ ہو وہاں زیادتی اور ادھار دونوں جائز ہوگا۔ چنانچہ مذروعات و معدودات میں دونوں باتیں جائز ہیں زیادتی بھی اور ادھار بھی۔
امام ابوحنیفہ ہی کی طرح دیگر ائمہ نے بھی اسی حدیث کو معلل بالعلۃ قرار دے کر علت کا استخراج کیا ہے جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے طعم اور ثمینت کو علت قرار دیا ہے۔ اور یہ بتلایا ہے کہ جہاں دونوں علت پائی جائیں گی۔ زیادتی اور ادھار دونوں حرام ہوگا۔ اور جہاں ایک علت موجود ہو وہاں زیادتی جائز اور ادھار ناجائز ہوگا۔ اور جہاں دونوں علت نہ ہو وہاں زیادتی اور ادھار دونوں کو جائز قرار دیا جائے گا۔ بہرحال صحابہ کے اقوال اور ائمہ کرام کے مذاہب سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ ربا کا دائرہ ان مذکورہ اشیاء ستہ میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ تمام مکیل اور موزونی چیزوں کو محیط ہے لیکن اس میں زیادتی اسی وقت حرام ہوگی جبکہ مکیلی یا موزونی چیزوں کا تبادلہ ہم جنس کے ساتھ ہو ورنہ اختلافِ جنس کے وقت تو حکم یہ ہے کہ اذا اختلف الجنس فبیعوا کیف شئتم۔ یعنی جب جنس مختلف ہو تو پھر جس طرح چاہو بیچو۔
بہرکیف ربا کا ایک خاص مفہوم ہے جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، اور اسی مفہوم کے اعتبار سے سود حرام ہے اور یہ حرمت بغیر کسی قیدِ ملک و مذہب کے ہے۔ نیز سود کی یہ حرمت بغیر کسی

فرد، اشخاص یا زمانہ کے مطلقاً مخصوص ہے اور سود کے صرف لینے دینے والے ہی کے لئے نہیں بلکہ انہیں کسی بھی حیثیت سے شرکت کرتے والے اور تعاون کرنے والے پر بھی طرح طرح کی وعیدیں اور لعنتیں وارد ہوئی ہیں۔

اس لئے سود کا مفہوم شرعی جس رقم پر بھی صادق آئے گا اور جس معاملہ پر بھی سودی معاملہ ہونا صادق آئے گا وہ حرام ہوگا۔ پھر وہ معاملہ خواہ ہندوستان میں ہو یا کسی دوسرے ملک میں مسلمان کے ساتھ ہو یا غیر مسلمان کے ساتھ ہو سبھی حرام اور ناجائز ہی رہے گا اور جس طرح سود کا لینا حرام ہوگا اسی طرح دینا بھی حرام ہوگا۔ مگر مجبوری کی حالت کا حکم دوسرا ہوگا۔

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ موجودہ دور میں بینکنگ کے تمام کاروبار کو سودی قرار دینا بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس دور میں بنک مختلف مقاصد کے لئے قائم ہو رہے ہیں۔ اور بنک کے اصول و مقاصد میں اب پہلے کے مقابلہ میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوتی جارہی ہیں بہت سے بنکوں میں مختلف نوع کے کاروبار تجارتی اصول پر بھی ہونے لگے ہیں بعض بنک شرکت ومضاربت کے اصول پر بھی چلائے جاتے ہیں۔ اس لئے جن کاروباروں میں مطالبات کی ادائیگی بنک کے ذریعہ یا چیک کے ذریعہ ہوتی ہے یا جن میں ملازمین کی تنخواہیں بنک کے ذریعہ ادا کی جاتی ہیں اور بنک اس میں اپنے لئے بھی کچھ رقم وصول کرتی ہے تو اس کا سود ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ وہ بنک کی اجرت اور محنتانہ میں بھی محسوب کیا جاسکتا ہے اور اس طرح بنک کو اجیر یا وکیل قرار دے کر اس حاصل کردہ رقم کو بنک کی اجرت اور کارکردگی کا معاوضہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ہر بنک کا ہر حال میں ایک ہی حکم نہیں رہے گا بلکہ بنک کے طریقہ کار، اس کے اصول وضوابط اور معاملات کے اعتبار سے الگ الگ احکام ہوں گے۔ جس صورت پر ربا کی شرعی تعریف صادق نہ آئے گی اس کو سود نہیں کہا جاسکتا خواہ بنک والے اس کو سود ہی کہتے ہوں جیسا کہ اکابرین اور فقہاء امت نے پراویڈنٹ فنڈ اور اس پر حکومت کی طرف سے ملنے والی زائد رقم کو سود نہیں کہا ہے۔ حالانکہ اس زائد رقم کو حکومت اور بنک والے سودی کہتے ہیں جو وضع شدہ رقم پر اور حکومت کی طرف سے شامل کردہ مجموعی رقم پر بنک کی طرف سے اضافہ کرکے ختم ملازمت پر دیا کرتے ہیں۔

اور آج کے اس دور فساد میں جبکہ بنک کے علاوہ دیگر ذرائع سے سرمایہ کی حفاظت دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوچکا ہے تو مجبوری اور احتیاج کے درجہ میں سودی کاروبار کرنے والے بنکوں

میں بھی اپنی رقوم کو جمع کرانا اور محفوظ کرنا جائز ہوگا جیسا کہ اب تک اکابرین اور مفتیان کرام کا یہی فتویٰ رہا ہے اس لئے اس مسئلہ پر گفتگو کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ نیز یہ بھی باتفاق علماء طے شدہ بات ہے کہ خاص سود لینے اور آمدنی بڑھانے کے ارادہ سے بنک میں روپیہ جمع کرانا جائز نہیں ہے۔

لیکن اگر حفاظت کے لئے روپیہ بنک میں جمع کرانا اور محفوظ رکھنا جائز ہے تو اب اس پر جو سود ملے گا تو اس کو کیا کرنا چاہیئے۔ یہ سوال نامہ میں موجود ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ فقہاء اُمت کے فتاویٰ کے مطابق اس سودی رقم کو بنک میں چھوڑ دینا بھی جائز نہیں ہے بلکہ اس کو حاصل کر کے بلا نیت ثواب غرباء مسلمین کو دے دینا لازم ہے خود اپنے لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہے خواہ سود کی یہ رقم سرکاری بنک سے حاصل ہو خواہ شخصی اور پرائیوٹ بنک سے۔ دونوں کا حکم ایک ہی ہے کہ صدقہ کر دیا جائے، مسلمان ضرورت مند کو دینا غیر مسلم ضرورت مند کو دینے سے افضل ہے۔

بنک سے سودی قرض لینے کی صرف مجبوری اور احتیاج شدیدہ کی حالت میں اجازت ہو سکتی ہے بغیر مجبوری اور ضرورت شدیدہ کے سود لینا اور دینا حرام ہی رہے گا۔ مجبوری کی حالت میں سودی قرض لے سکتا ہے جیسا کہ الاشباہ والنظائر اور اس کے حاشیہ حموی میں موجود ہے اشباہ کی عبارت یہ ہے وفی القنیة والبغیة یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح انتھیٰ اور اس کے حاشیہ حموی میں ہے قولہ یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح "وذالك نحو ان یقترض عشرة دنانیر مثلا ویجعل لربها شیئا معلوما فی کل یوم ربحا۔ ص ۱۲۹ مطبوعہ دارالعلوم دیوبند

حکومت کی ترقیاتی اسکیموں سے جو قرضے دیئے جاتے ہیں اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں جن میں بعض صورتیں تو جائز ہیں اور بعض ناجائز مثلاً کچھ سامان جیسے مشین یا کھیتی باڑی کے لئے ٹریکٹر یا ٹیوبویل اور سامان کے ساتھ بقدر ضرورت اس سامان کو استعمال کرنے کے لئے کچھ نقد رقم بھی دیا گیا اور اس پر کچھ زائد رقم وصول کر لی ہے تو اس کو سودی معاملہ قرار دینے کے بجائے یہ کہا جا سکتا کہ جو زائد رقم وصول کیا گیا ہے وہ اس شعبہ کے انتظامی امور کو درست رکھنے کے لئے فیس ہے۔ لہٰذا یہ صورت سودی معاملہ نہ ہونے کی وجہ سے جائز ہوگی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حکومت نے کاروبار کے لئے یا فیکٹری لگانے کے لئے سامان اور مشین وغیرہ دیا اور اس کے ساتھ نقد رقم اتنا زیادہ دیا کہ اس کی ضرورت اس سامان کو استعمال کرنے یا کام میں لانے کے لئے نہیں ہے اور پھر اس پر سود کے نام سے زائد رقم وصول کیا اور واپسی کی کل رقم حاصل شدہ رقم سے مقدار میں زیادہ ہے تو یہ سود ہے۔ کیونکہ اس پر سود کی تعریف ھو فضل خال عن العوض

لاحد المتعاقدين فی عقد المعاوضۃ ۔۔۔۔۔ صادق ہے اس کے علاوہ کل قرض جر نفعا نفعا کا بھی مصداق ہے۔ اس لئے یہ حرام ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ حکومت ترقیاتی اسکیموں کے ماتحت قرض دیتی ہے مثلاً تجارت کے لئے یا مکان بنانے کے لئے یا کنواں کھودنے کے لئے اور جو رقم قرض کے طور پر دیتی ہے اس میں کچھ چھوٹ بھی دیتی ہے اور باقی پر سود عائد کرتی ہے مثلاً بارہ ہزار روپے قرض دیا اور ایک تہائی یعنی چار ہزار معاف کر دیا اور باقی پر معمولی سود لمبی مدت تک کے لئے مقرر کر دیا تو دیکھا جائے گا کہ رقم اور اصل رقم ملا کر جو حکومت کو دینا پڑا ہے۔ حاصل کردہ رقم یعنی ۱۲ ہزار سے زیادہ تو نہیں ہے اگر زیادہ نہ ہو، برابر ہو یا کم ہو تو پھر یہ سود کے دائرہ سے خارج ہوگا اور جائز قرار دیا جائے گا۔

غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں بین الاقوامی اصول وضوابط کے ماتحت جو سود ملتے ہیں وہ شرعی حیثیت سے ربا میں شامل ہے اور حرام ہے مگر چونکہ مجبوری ہے اس لئے اس کو لینے میں گناہ نہیں ہوگا مگر جو بھی اس طرح سے سود کی رقم حاصل ہو اس کو بلا نیت ثواب غریبوں، مسکینوں پر صدقہ کر دینا واجب ہوگا۔

بنک خواہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، انفرادی شخصی ہو یا مشترکہ کمپنی، سودی لین دین کی اجازت ان میں سے کسی کے ساتھ نہیں ہے۔ البتہ جن صورتوں پر ربا کی شرعی تعریف صادق نہیں آئے گی اور اس کو بنک والے سود ہی کہتے ہوں گے تو بھی وہ جائز اور حلال ہوگا اور جن صورتوں پر ربا کی شرعی تعریف صادق آئے گی اس کو حرام قرار دیا جائے گا خواہ بنک والے اور حکومت کے اہل کار اس کا سود کے علاوہ کوئی بھی نام رکھیں۔

سودی کاروبار دارالاسلام اور دارالحرب دونوں میں ائمہ ثلثہ اور امام ابویوسف کے نزدیک ناجائز ہے۔ حتیٰ کہ سودی کاروبار کی دارالاسلام میں ذمیوں کے لئے بھی اجازت نہیں ہے۔ چہ جائیکہ مسلمان کے لئے جائز ہو۔ مگر امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک چند شرائط کے ساتھ دارالحرب میں ربا کی گنجائش ہے۔ چنانچہ شامی جلد خامس ص ۱۸۶ پر منقول ہے۔

ولا ربوا بین حربی ومسلم مستامن ولو بعقد فاسد او قمار ثمہ لان مالہ ثمہ مباح

ولا ربا بین حربی ومسلم مستامن ولو بعقد فاسد او قمار ثمه لان ماله ثمه مباح فیحل برضاہ مطلقا بلا غدر خلافا للثانی والثلثة وحکم من اسلم فی دار الحرب ولم یھاجر کحربی فللمسلم الربا معه خلافا لھما الی قوله وقلت ومنه یعلم حکم من اسلما ثمه ولم یھاجرا ـ وفی رد المحتار احترز بالحربی عن المسلم الاصلی والذمی وکذا عن المسلم الحربی اذا ھاجر الینا ثم عاد الیھم فانه لیس للمسلم ان یرابی معه اتفاقا ـ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے فتاویٰ میں اس کو نقل فرمایا ہے اور پھر لکھا ہے کہ قائلین بالجواز کے نزدیک بھی اس میں اتنی قیود ہیں (۱) وہ محل دار الحرب ہو (۲) معاملہ ربوا کا حربی سے ہو (۳) مسلم اصلی سے نہ ہو اور نہ ذمی سے ہو اور مسلم اصلی وہ ہے جو دار الحرب میں آنے کے قبل اسلام لایا ہو خود یا تبعا للاباء (۴) معاملہ کرنے والا وہ مسلم ہو جو دار الاسلام سے دار الحرب میں امن لے کر آیا ہو یا وہ مسلم ہو جو کہ دار الحرب میں اسلام لایا ہو، وہ مسلم اصلی نہ ہو جو خود دار الحرب ہی میں رہتا ہو ـــــــ امداد الفتاوی جلد سوم ص ۱۵۷

حضرت تھانوی نے اوپر کی شرائط جواز کو ذکر کرنے کے بعد امام ابو یوسف کے قول یعنی عدم جواز کو دلائل کے ساتھ ترجیح دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں دونوں قولوں کے دلائل میں نظر کی گئی تو امام ابو یوسف کے دلائل قوی معلوم ہوئے، چنانچہ اس کو مفصلا رسالہ تحذیر الاخوان میں ذکر کر دیا گیا ہے۔

لیکن اگر ہم حضرت تھانوی کی رائے کے برخلاف امام ابو حنیفہ ہی کے قول کو اختیار کریں تب بھی ہندوستان جیسے ملک میں ان کے مسلک اور شرائط کے مطابق ربا کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ شرائط مذکورہ کا یہاں تحقق نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الاسلام اور یہ کہ موجودہ حالات میں دار کا لفظ دار الاسلام اور دار الحرب میں درست ہے یا نہیں، تو اس بارے میں عرض یہ ہے کہ اصل دار تو فقہاء کرام کے یہاں دو ہی ہے ایک دار الاسلام اور دوسرا دار الکفر۔ دار الاسلام وہ ملک کہلاتا ہے جہاں اقتدار اعلیٰ مکمل طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اور مسلمان وہاں اسلامی احکام و قواعد کے مطابق قانون بنانے اور اس کو جاری کرنے پر قدرت رکھتے ہوں، اور اس کے بالمقابل دار الکفر وہ ملک ہے جہاں اقتدار اعلیٰ مکمل طور پر کافروں کے ہاتھ میں ہو وہاں کفر اور شعار کفر کا شیوع اور غلبہ ہو۔ پھر دار الکفر کی تین قسمیں کی گئی ہیں اول دار الحرب یعنی وہ ملک جو دار الاسلام کے ساتھ محاربہ رکھتا ہو یا محاربہ کی کیفیت پر قائم ہو جیسے صلح حدیبیہ سے پہلے مکہ کی حالت تھی۔

دارالکفر کی دوسری قسم دارالامن ہے یعنی وہ ملک جہاں اگرچہ اقتدار اعلیٰ کافروں کے ہاتھ میں ہو مگر مسلمانوں کو وہاں اسلامی زندگی گذارنے کی آزادی اور امن ہو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ملک حبشہ کا حال تھا۔

تیسری قسم دارالکفر کی وہ ہے جس کو دارالمعاہدہ والمسالمہ کہا جاتا ہے یعنی وہ ملک جہاں کفار کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی معاہدہ ہو اور اس معاہدہ کے تحت مسلمانوں کو کافروں سے اور کافروں کو مسلمانوں سے امن وامان حاصل ہو جیسے صلح حدیبیہ کے بعد تقریباً مکہ کی یہی حالت تھی۔

اور اب آج کے دور میں تو شاید دارالکفر کی ایک چوتھی قسم بھی وجود میں آگئی ہے جس کو دارالشر والفساد کہنا چاہیئے۔ ہمارے ملک ہندوستان کو ہمارے اکابرین دارالامن کہتے آئے ہیں۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ اس کو دارالمعاہدہ والمسالمہ کہنا زیادہ موزوں ہے کیونکہ دستور ہند یہاں کے تمام رہنے والوں کے درمیان ایک طرح کا عقد معاہدہ ہے۔

بہرحال ہندوستان دارالکفر ہے اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے پھر خواہ وہ دارالامن ہو یا دارالحرب شرعی نقطہ نظر سے امام ابوحنیفہ کے مسلک پر بھی یہاں کے مسلمانوں کیلئے سودی کاروبار نہ مسلمانوں سے جائز ہے نہ کافروں سے البتہ مجبوری اور احتیاج شدید کے وقت سودی قرض لینے کی اجازت ہے جیسا کہ اس سے پہلے الاشباہ کے حوالے سے اس کا ذکر کیا جاچکا ہے۔



مسئلہ ربوا

(۳) ــــــــــــــــ مولانا آدم پالنپوری ۔ گجرات

ج (۱) ربوا کی شرعی حقیقت کا تحقق قرض، رہن اور بیع فاسد کی بعض صورتوں میں ہوتا ہے۔ قرض میں اس طرح ہوتا ہے کہ ایک معین مقدار روپیہ متعین میعاد کے لئے ادھار دے کر معین شرح کے ساتھ نفع یا زیادتی لی جاوے جس کا ماخذ وہ حدیث ہے جو علامہ سیوطیؒ نے جامع صغیر میں بایں الفاظ نقل کی ہے "کل قرض جر منفعة فهو ربوا" جو محدثین کے نزدیک صالح للعمل ہے، نزول قرآن کے وقت ربوا کی یہی صورت مروج تھی کہ قرض دے کر کچھ نفع لیا جاوے، اور آیات ربو سنتے ہی سب صحابہؓ نے اسی ربو کو حرام سمجھ کر فوراً ترک کر دیا تھا ـــــ اسی طرح رہن میں بھی قرض دے کر مرہون سے انتفاع کی شرط لگائی جاتی ہے یا انتفاع معــروف ہو وہ بھی ربوا میں داخل ہے ـــــ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ربوا کے مفہوم میں اس کا بھی اضافہ فرمایا کہ اشیاء ستہ ـــ ذہب، فضہ وغیرہ کے باہمی تبادلہ میں کمی بیشی ہو یا ادھار معاملہ ہو خواہ اس ادھار میں مقدار کی کوئی زیادتی نہ ہو بلکہ برابر لیا دیا جائے، احکام القرآن میں ابو بکر جصاص حنفیؒ فرماتے ہیں:

فمن الربوا ما هو بيع ومنه ما هو ليس ببيع وهو ربوا اهل الجاهلية وهو القرض المشروط فيه الاجل وزيادة مال على المستقرض۔

(ترجمہ) ربوا کی ایک قسم وہ ہے جو بیع میں ہوتا ہے، دوسرا وہ جو بیع میں نہیں ہوتا ہے اور یہی ربوا اہل جاہلیہ میں جاری تھا کہ جس کی حقیقت یہ ہے کہ قرض کسی میعاد تک اس شرط پر دیا جائے کہ قرض لینے والا اس پر کچھ زیادتی ادا کرے گا ـــ آیات ربوا اور احادیث شخصی صرفی سود اور تجارتی سود دونوں کو شامل ہے، کیونکہ وہ مطلق ہیں، بلا کسی دلیل شرعی کے ان کو مقید کرنا جائز نہیں ہے۔ نیز آیات ربوا کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ

نزول قرآن کے وقت عرب میں تجارتی سود کا رواج تھا،
اس کو بھی حرام قرار دیا گیا۔
(مستفاد از "مسئلہ سود" مؤلفہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ) -

ج (۳) طرفینؒ کے نزدیک ربا کے متحقق ہونے کی ایک شرط بدلین کا معصوم ہونا بھی ہے، لہٰذا جب بدلین میں سے کوئی ایک غیر معصوم ہوگا تو طرفینؒ کے نزدیک ربا کا تحقق نہ ہوگا، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے، لہٰذا ان کے نزدیک اس صورت میں ربا متحقق ہو جائے گا۔ اسی بنیاد پر جب کوئی مسلمان دار الحرب میں کسی حربی سے سودی معاملہ کرے (جس میں وہ حربی سے سود حاصل کرے) تو طرفین کے نزدیک یہ جائز ہے، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ طرفین کی دلیل یہ ہے کہ دار الحرب میں حربی کا مال معصوم نہیں ہے پس جب ربا کے متحقق ہونے کی شرط نہیں پائی گئی تو یہ معاملہ ربا کا نہ ہوا بلکہ یہ معاملہ حربی کی رضا کے حصول کا سبب ہوا جس سے غدر منتفی ہوا، اور ملکیت تو مالِ مباح پر استیلا کے سبب سے حاصل ہوئی نہ کہ عقد کے سبب سے لہٰذا ربا متحقق نہ ہوگا، کیونکہ ربا اسی فضل کو کہتے ہیں جو عقد کے سبب حاصل ہو، اب یہ اشکال بھی نہ رہا کہ نصوص ربا عام ہیں جن کی تخصیص دار الاسلام کے ساتھ خبر واحد —— لاربابین اهل الحرب وبین اهل الاسلام اخرجه البیهقی مرسلاً —— کے ذریعہ کرنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ وجہ دفع اشکال کی یہ ہے کہ نصوص ربا عام ہونے کے باوجود اس مال کو شامل ہی نہیں ہیں جو استیلاء کے سبب سے حاصل ہو، نصوص کا عموم تو اس کو شامل ہے جو عقد کے ذریعہ حاصل کیا جاوے۔

وفی البدائع وأما شرائط جریان الربا فمنها أن یکون البدلان معصومین، فان کان احدهما غیر معصوم لایتحقق الربا عندنا و عند ابی یوسف هذا لیس بشرط، ویتحقق الربا، و علی هذا الاصل یخرج ما اذا دخل مسلم دار الحرب تاجرا فباع حربیاً درهما بدرهمین ...... انه یجوز عند ابی حنیفة ومحمد، و عند ابی یوسف لایجوز...... ولهما ان مال الحربی لیس بمعصوم بل هو مباح فی نفسه الا ان المسلم المستأمن منع من تملکه من غیر رضاه لما فیه من الغدر والخیانة، فاذا بذله باختیاره ورضاه فقد زال هذا المعنی، فکان الاخذ استیلاء علی مال مباح ..... وبه تبین ان العقد ههنا لیس بتملک بل هو تحصیل شرط التملک وهو الرضا ...... فالملک للمسلم یثبت بالاخذ والاستیلاء لا بالعقد فلایتحقق

الربا لانہ اسم لفضل یستفاد بالعقد (۱۹۲/۵)

قال العلامۃ ظفر احمد العثمانی فی حاشیۃ اعلاء السنن ۱۴/۳۰۲ تحت قول صاحب البدائع — فلا یتحقق الربا" — : فلا یرد علی ابی حنیفۃ تخصیص عمومات الربا وھی متواترۃ بمرسل مکحول وھو من الاحاد، لان العمومات — لم یتناول ما اخذ بالاستیلاء وانما تعم ما اخذ بالعقد فانھم وایضا فانھا انما تتناول الربا وھذا لیس بربا۔

ج (۳) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے ایک طویل فتویٰ میں" کافی" سے دارالاسلام اور دارالحرب کی تعریف بایں الفاظ نقل فرمائی ہے "ان المراد بدار الاسلام بلاد یجری فیھا حکم امام المسلمین وتکون تحت قھرہ — وبدار الحرب بلاد یجری فیھا امر عظیمھا وتکون تحت قھرہ"۔ اس تعریف کی رو سے ہندوستان دارالحرب ہے۔

نیز الدرالمختار اور فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ دارالاسلام کے دارالحرب بننے کے لئے امام ابوحنیفہ کے نزدیک تین شرطیں ہیں (۱) اس میں علی الاعلان مشرکین کے احکام جاری ہوں، مسلمانوں کے احکام جاری نہ ہوں — اس شرط سے معلوم ہوا کہ جس میں مشرکین کے احکام اور مسلمانوں کے احکام جاری ہوں وہ دارالحرب نہ ہوگا۔ (۲) وہ ملک دارالحرب سے متصل ہو یعنی دونوں کے درمیان کوئی دارالاسلام حائل نہ ہو — اور ظاہر ہے کہ ہندوستان بعض جوانب میں دارالحرب سے متصل ہے اور بعض جوانب میں دارالاسلام سے متصل ہے — (۳) وہاں کوئی مسلمان یا ذمی اپنے سابق امان کے ساتھ (جو دارالاسلام ہونے کی حالت میں حاصل تھا) باقی نہ ہو یعنی مسلم کو اسلام کی وجہ سے اور ذمی کو عقد ذمہ کی وجہ سے — اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں شرطیں مجموعی طور پر ہندوستان میں نہیں پائی جاتیں، لہٰذا امام صاحب کے نزدیک ہندوستان دارالحرب نہ ہوا — البتہ صاحبین کے نزدیک دارالاسلام کے دارالحرب بننے کے لئے صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں شعائر کفر رواج پا جائیں۔ کذا فی فتاویٰ عبدالحی۔ شامی میں اس شرط کو بایں الفاظ لکھا ہے۔ "وھو اظہار حکم الکفر" لہٰذا صاحبینؒ کے نزدیک ہندوستان دارالحرب ہے اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے "کافی" سے جو تحریر نقل فرمائی ہے وہ صاحبین کے مسلک پر ہے، اور جن محققین اکابر — مثلاً شاہ عبدالعزیز دہلوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی — نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا ہے وہ صاحبین کے

قول کو اختیار فرما کر دیا ہے۔

جواب ۲۔ ۳ کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستانی کفار سے سود لینے کا جواز صرف امام محمدؒ کے قول کے مطابق حاصل ہوتا ہے ـــــ کیونکہ امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق تو ہندوستان دارالحرب ہی نہیں ہے اس لئے ان کے نزدیک ہندوستانی کفار سے سود لینا جائز نہیں ہے ـــــ اور امام ابو یوسف کے قول کے مطابق اگرچہ ہندوستان دارالحرب ہے لیکن ان کے نزدیک دارالحرب میں بھی حربی سے سود لینا جائز نہیں ہے (جیساکہ جواب (۲) میں گزرا ہے) اس لئے اب صرف امام محمدؒ کے نزدیک ہندوستانی کفار سے سود لینے کا جواز ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک ہندوستان دارالحرب ہے اور دارالحرب میں حربی سے مسلمان کا سود لینا جائز ہے ـــــ اور افتار کا اصول یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں شیخین ایک جانب ہوں اور امام محمدؒ دوسری جانب تو شیخین کے قول پر فتویٰ دینا ضروری ہے اگرچہ مفتی دلائل میں غور کرنے کی اہلیت رکھتا ہو ـــــ الغرض ہندوستان کے (صاحبینؒ کے نزدیک دارالحرب ہونے کے باوجود) ہندو سے سود لینا مسلمان کے لئے جائز نہیں۔ اعلاء السنن ج ۱۴/ ۳۷۲ پر ہے" فان عنده لا تصیر دار الاسلام دار حرب الا بامور ثلثة، باجراء احکام اهل الشرك ای علی الاشتهار، وان لا یحکم فیها بحکم اهل الاسلام، وظاهره انه لو اجریت احکام المسلمین واحکام اهل الشرك لا تکون دار حرب ط شامی) وباتصالها بدار الحرب (بان لا یتخلل بینهما بلدة من بلاد الاسلام، هندیه ط قلت، والهند متصلة بدار الحرب فی بعض الجهات وبدار اسلام فی بعضها) وبان لا یبقی فیها مسلم او ذمی آمنا بالامان الاول علی نفسه، کذا فی الدر" مع الشامیه" (۳/ ۳۹) وفی تحقق بعض هذه الشروط فی ارض الهند نظر کما لا یخفی علی من له معرفة بحالها، ـــــ ثم اعلم ان بلاد الهند ونحوها لا ریب فی کونها دار الحرب عند المحقق وتدافتی به العلامة المحدث الدهلوی مولانا عبد العزیز، والعلامة المولی مولانا رشید احمد الجنجوهی ـــــ ولکن مبنی قولهما ذلك انما هو علی قول الصاحبین دون قول الامام ابی حنیفه .... ومع ذلك فابو یوسف یمنع الربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب ایضا فلا یتاتی جواز الربا بین المسلم والحربی فی ارض الهند الا علی قول محمد وحده ـــــ اذا اجتمع ابو یوسف مع الامام ابی حنیفه فلا یفتی بقول غیرهما، ولو کان المفتی مجتهدا ای اهلا للنظر فی الدلیل ولا شك انهما قد اجتمعا علی حرمة الربا بین المسلم

والحربي في دار الاسلام التي تغلب عليها الكفار، وا جريت فيها احكام المسلمين واحكام اهل الشرك جميعًا، ولم تتصل بدار الحرب، وان اختلفا في العلة، فلا يجوزا لا فتابتول غيرهما والحال هذه.

ــه وقالا بشرط واحد، وهو اظهار حكم الكفر وهو القياس (الدر مع الشامیہ ۳/۲۹۰)

ج (۴) سرکاری بینکوں میں اوران بینکوں میں جن کے مالک غیر مسلم ہیں رو پیہ جمع کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس رو پیہ سے وہ سودی کاروبار کرکے مالی استفادہ حاصل کرتے ہیں" اور اس کے منافع کو اسلام اور مسلمانوں کی تخریب پر صرف کیا جاتا ہے، اور یہ تعاون علی الاثم والعدوان ہے

لیکن اگر کسی نے غلطی یا قانونی مجبوری کی بناپر رو پیہ جمع کر دیا ہو تو اس کا سود (بھی باوجود حرام ہونے کے) وصول کر لینے کا جو فتویٰ ہمارے اکابر (حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مفتی سعید احمد مظاہری نوغیرہم) نے دیا تھا اس کی وجہ خود انھوں نے اپنے بعض فتاویٰ میں یہ بتائی ہے کہ ایسی سود کی رقمیں پادریوں کو عیسائیت کی تبلیغ کے لئے دی جاتی ہیں اور یہ رقمیں مسلمانوں کو مرتد بنانے میں استعمال کی جاتی ہیں، اس لئے سود کی رقم نہ لینا ایک بڑے فتنہ وفساد کا سبب ہے لہٰذا ارباب فتاویٰ نے فیصلہ کیا ہے کہ مذکورہ سود کی رقمیں ضرور لینا چاہئے بلکہ سمندر میں پھینک دینا بینک میں چھوڑ دینے سے بہتر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بینکوں کے سود کو ہمارے اکابر نے سود ہی قرار دیا تھا لیکن اھون البلیتین کو اختیار فرما کر اسے وصول کر لینے کا فتویٰ دیا تھا۔

(ملاحظہ ہو فتاویٰ رحیمیہ ۳/ص ۲۶۳، ص ۲۶۴، کفایۃ المفتی ۸/ص ۵۵، ص ۹۱)

ج (۵) سود لینے اور دینے کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے چنانچہ طرفین کے نزدیک دارالحرب میں یہ صورت بھی جائز ہے کہ مسلمان کسی حربی سے ایک درہم کے بدلے دو درہم لیوے اور یہ بھی جائز ہے کہ دو درہم کے بدلے ایک درہم لیوے کیونکہ حربی کے مال کو لینا حقیقتاً بطریق ربا نہیں ہے بلکہ بلا غدر بطریق اباحت ہے چنانچہ مبسوط سرخسی ع ۱/ ۵۹ پر مذکور ہے" ونیستوی ان کان المسلم اخذ الدرھمین بالدرھم اوالدرھم بالدرھمین لانه طیب نفس الکافر بما اعطاه قل ذلک اوکثر واخذ ماله بطریق الاباحة اھ۔ اور ائمہ ثلثہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک سود لینا اور دینا دارالحرب میں بھی جائز نہیں ہے ــــــــ سود دینا اضطرار کی حالت میں درست ہے پس اگر جان کا قوی خطرہ ہو یا عزت کا قوی خطرہ ہو اور اس سے بچنے کی صورت نہ ہو مثلاً نہ جانا

فروخت ہو سکتی ہے نہ روپیہ بغیر سود کے مل سکتا ہے تو ایسی حالت میں شرعاً معذور ہے، اور اگر ایسی ضرورت نہ ہو بلکہ کسی اور دنیوی کاروبار کے لئے ضرورت ہو یا روپیہ بغیر سود کے مل سکتا ہے یا جائداد فروخت ہو سکتی ہے تو پھر سود پر قرض لینا جائز نہیں، کبیرہ گناہ ہے (فتاویٰ محمودیہ ۶/۳۰۷)

ج (۶) سودی قرض لینا حرام ہے، لہٰذا حرام کے ارتکاب کے لئے جس درجہ کی ناقابل برداشت مجبوری ہونی چاہئے اس کے بغیر اس کی گنجائش نہ ہوگی۔ الاشباہ والنظائر میں قاعدہ بیان کیا ہے "الحاجة تنزل منزلة الضرورة" اس کے ذیل میں یہ جزئیہ نقل کیا ہے "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" جس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس درجہ محتاج ہو کہ کما نہیں سکتا، اور بغیر قرض کے گذارہ کی کوئی صورت نہیں، اور قرض بھی بغیر ربا کے نہیں ملتا وہ اپنی مجبوری کی حد تک معذور ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۶/۳۰۷)

اضطرار اور حد درجہ مجبوری کی حالت میں جب کہ ہلاکت نفس کا خوف ہو جس طرح بقدر ضرورت مردار کھا کر اپنی جان بچانے کی اجازت ہے اسی طرح فقہاء نے اضطرار اور حد درجہ کی احتیاج اور شدید مجبوری کی صورت میں جب کہ قرض وغیرہ ملنے کی امید نہ ہو تو بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی اجازت ہے، ضرورت سے زیادہ لینا درست نہیں ہے (فتاویٰ رحیمیہ ۶/۱۶۱ م) ———

پھر ضرورت اور حاجت میں فرق ہے۔ ضرورت کی تعریف یہ ہے کہ اگر ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو یہ شخص ہلاک یا قریب الموت ہو جائے گا۔ یہی صورت اضطرار کی ہے، اسی صورت میں حرام چیز کا استعمال بچند شرائط جائز ہو جاتا ہے ——— اور حاجت کے معنی یہ ہے کہ اگر ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو ہلاک تو نہ ہوگا مگر مشقت اور تکلیف شدید ہوگی یہ صورت اضطرار کی نہیں ہے، اس صورت میں نماز، روزے، طہارت وغیرہ بہت سے احکام میں سہولتیں تو دی گئی ہیں، مگر ایسی حالت میں حرام چیزیں نص قرآنی کے تحت حلال نہیں ہوگی (ماخوذ از جواہر الفقہ)

ج (۷) حکومت ترقیاتی اسکیموں یا امدادی قرضوں کے نام سے جو سودی قرضے تقسیم کرتی ہے اس کا لینا بلا اضطراری حالت کے جائز نہیں ہے۔ ان کا حکم بھی عام سودی قرضوں کی طرح ہے کیونکہ اس پر ربا کی تعریف صادق آتی ہے اس لئے کہ نقد روپیہ قرض دے کر زیادتی کے ساتھ واپس لینا اس میں ہوتا ہے ———

اب رہی یہ بات کہ جمہوری حکومت کے خزانۂ عامہ کی مالک اس ملک کے شہریوں کی مجموعی اکائی ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے شرعی ملک مراد نہیں، چنانچہ مالکانہ تصرفات (بیع،

ہبہ، وصیت وغیرہ) اس میں جاری نہیں ہوتے ـــــ اور جو انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے وہ دفع رشوت کے جواز کے لئے کافی نہیں کیونکہ یہ حق انتفاع ایسا ہی ہے جیسا کہ جنگل سے لکڑیاں چننے کا حق ہے اور حق احتطاب کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دینا جائز نہیں ہے چنانچہ البحر الرائق میں لکھا ہے " الظلمة تمنع الناس من الاحتطاب من المروج الا بدفع شئ اليهم فالدفع والاخذ حرام لانه رشوة (۶/ ۲۸۶)
رشوت تو اس صورت میں دینا جائز ہے جبکہ مال کسی مسلمان کی ملک میں آچکا ہوا ور قبضہ بھی ہو چکا ہو اور اس کے متعلق ظلم کا خوف ہو یا اپنی آبرو یا جان کے متعلق ظلم کا خوف ہو جیسا کہ البحر الرائق میں مذکور ہے " اذا دفع الرشوة خوفا على نفسه او ماله فهو حرام على الآخذ غير حرام على الدافع وكذا اذا طمع فى ماله فرشاه ببعض المال (۶/ ۲۸۶) ـــــ جب مقیس علیہ (رشوت) کا یہ حال ہے تو (مقیس) سود کا حال اسی سے معلوم ہو سکتا ہے۔

اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دینے کو فقہاء نے جو جائز کہا ہے اس کا مفہوم مندرجہ ذیل عبارت سے واضح ہوتا ہے جو سرکاری خزانے سے حق انتفاع کے مفہوم سے بالکل مغایر ہے۔

" اذا كان المدعى محقا يرى ان القاضى لا يحكم له بحقه ولا يدفع عنه ظلم خصمه الا بدفع الرشوة فلا باس له فى الدفع وحرام على القاضى الاخذ لان الحكم بالحق ودفع الظلم واجب عليه لا يجوز له ان ياخذ عليه شيئا (التفسير المظهرى)

جب عام معاشرہ بگڑ چکا ہو، غیر قومیں حرام مال سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوں تو علماء کا کام یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے لئے بھی جواز کی راہ نکال کر ان غیر قوموں کی اتباع کا فتویٰ دیں بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ رضاء خداوندی لعداولدی الغامات کا پورا نقشہ قوم کے سامنے اخلاص و قوت کے ساتھ پیش کریں اور یہ بتائیں کہ مسلمان کی ترقی احکام شریعت کی پابندی میں ہے نہ کہ حلال و حرام کی تمیز کے بغیر مال جمع کرنے میں ـــــ اگر موسم خراب ہوا اور امرود سے ہیضہ پھیلنے کا اندیشہ ہو تو حفظان صحت کے ماہرین خود دمیونسپلٹی میں بھی امرود کا داخل ہونا بند کرا دیتے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ بندر اور گدھے امرود کھا رہے ہیں اور ان کو کسی طرح ہیضہ نہیں ہوتا کہ ان کی حرص میں انسانوں کو بھی اجازت دی جاوے (فتاویٰ محمودیہ ۴/ ۲۱۸)

ج (۸) حکومت نے کسی کو مثلاً پانچ ہزار روپئے قرض دے کر ان میں سے ایک ہزار معاف کردئے تو یہ معاف کرنا فقہاء کی اصطلاح میں ابراء یا ہبۃ الدین ممن علیہ الدین کہلاتا ہے جو مدیون کے

قبول کے بغیر تام ہوجاتا ہے، البتہ مدیون کے رد کرنے سے رد بھی ہوجاتا ہے جیساکہ فتاویٰ عالمگیری ۴/۳۸۴ پر ہے ھبۃ الدین ممن علیہ الدین وابراءہ یتم من غیر قبول من المدیون و یرتد برده، ذکره عامۃ المشائخ وھو المختار اھ ـــــ اس اصول کی روشنی میں جب عام طور پر لوگ چھوٹ کو رد نہیں کرتے تو یہ ابراء کا معاملہ تام اور مکمل ہوجاتا ہے، اس بنا پر اب قرض صرف چار ہزار ہی رہ گیا، پھر جب اس کو زیادتی کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے جس کی پہلے سے شرط ہوتی ہے تو یہ سود ہوگیا ـــــ اگر مدیون ابراء کو رد کردے تو سود لازم نہ آوے، بشرطیکہ واپسی کی مجموعی رقم پانچ ہزار سے بڑھ نہ جاوے، لیکن ابراء کو رد کرنے کی عملی شکل کیا ہوگی؟ جب خود اس نے ابراء کا مطالبہ کر رکھا ہے اور فارم میں بھی اس مطالبہ کو پیش کرچکا ہے یہ محل غور ہے۔

ج (۹) غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں سود سے بچنے کا شرعی حیلہ یہ ہے کہ سودا (معین میعاد کے ساتھ) ادھار کیا جاوے اور وہ قیمت طے کی جاوے جو اصل اور سود کے ملانے سے حاصل ہوتی ہے، جس سے سود سود نہیں رہے گا بلکہ جزو ثمن بن جاوے گا مثلاً کوئی مسلم تاجر دوسرے ملک سے ایک لاکھ روپئے کا مال خریدتا ہے اور تین مہینے میں قیمت ادا کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کو مزید بیس ہزار روپئے سود بھرنا پڑتا ہے تو سود سے بچنے کے لئے یہ کرے کہ یہی مال تین مہینے کی میعاد سے ایک لاکھ بیس ہزار میں خریدے تو یہ بیس ہزار جزو ثمن بن جائے گا ـــــ اسی طرح مال بیچنے میں بھی کرے ـــــ ہدایہ میں ہے ـــــ "الا یری انہ یزاد فی الثمن لاجل الاجل"

ج (۱۰) سرکاری اور غیر سرکاری بینکوں میں ـــــ قرض لے کر سود ادا کرنے کے بارے میں کچھ فرق نہیں ہوگا یعنی اضطراری اور بعد درجہ کی احتیاج اور مجبوری کی صورت میں جب کہ قرض کے بغیر گذارہ کی کوئی صورت نہ ہو اور قرض بھی بغیر ربا کے نہ ملتا ہو تو بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی اجازت ہے ورنہ اجازت نہیں اور نہ ضرورت سے زیادہ لینا درست ہے۔

ج (۱۱) اپنی صنعت اور تجارت کی ترقی کے لئے پرائیوٹ سرمایہ کاروں سے سرمایہ حاصل کرنا اور اس پر سود ادا کرنا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے، یہ ترقی اسلامی نقطۂ نظر سے ترقی نہیں ہے بلکہ بربادی ہے اور قہار کا قہر جوش میں لانے والی ہے، مسلمان کی ترقی حرام اور لعنت کے کاموں سے پوری طرح پرہیز کرنے میں ہے، سودی کاروبار کو مالِ مسلم کی ترقی کا

ذریعہ تجویز کرنا نصوصِ قرآن وحدیث کا مقابلہ کرنا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے " یمحق اللہ الربا " اللہ تعالیٰ سود کو گھٹاتے ہیں، حدیث پاک میں ہے " وان الربا وان کثر فان عاقبتہ تصیر الی قل " یعنی سود خواہ کتنا ہی زیادہ ہو اس کا انجام کار قلت ہے ــــــــ جس وقت سود (ربا) کی حرمت نازل ہوئی اس وقت مسلمانوں کے حالات آج سے بہت زیادہ کمزور اور قابلِ رحم تھے، وہ حضرات پیٹ پر پتھر باندھتے تھے، کئی کئی روز فاقہ کرتے تھے، بھوک کی وجہ سے غش کھا کر گر جاتے تھے دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں سلگی، کپڑا بھی پوری تن پوشی کے لئے موجود نہ ہوتا تھا۔ بچوں کو بھوکا روتا ہوا دیکھ کر یہود کی مزدوری کرنی پڑتی تھی پھر بھی کسی قسم کی گنجائش یا کسی قسم کا اشارہ جوازِ ربا کی طرف نازل نہیں ہوا، لہٰذا علماء کی ذمہ داری ہے کہ غریب طبقہ کو صبر وقناعت کا سبق دیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عمومی حالات زندگی سنائیں ــــــــ
اس سلسلہ میں حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی مدظلہ کا ایک طویل فتویٰ مطبوعہ فتاویٰ محمودیہ ج۔۴ ص۳۰۲ تا ص۳۱۸ مستقل رسالہ کی صورت میں قابلِ اشاعت ہے۔



سود کا مسئلہ

(از) ———— مولانا جنید عالم ندوی قاسمی نائب مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

ربا کی تعریف

ربا کے لغوی معنی زیادتی اور بڑھوتری کے آتے ہیں اور اصطلاح شرع میں ربا ایسی زیادتی کو کہتے ہیں جو بغیر کسی مالی معاوضہ کے حاصل ہو۔ ابن العربی کی مشہور تفسیر احکام القرآن میں ربا کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے " الربوٰ فی اللغۃ الزیادۃ والمراد فی الآیۃ کل زیادۃ لا یقابلہا عوض (احکام القرآن)

صاحب ہدایہ ربا کی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ :

ربا ہر وہ زیادتی کہلائے گی جو دو آدمیوں کے باہمی لین دین کے معاملہ میں بغیر کسی مالی عوض کے کسی کو مشروط طریقہ پر حاصل ہو ملاحظہ ہو ھدایہ کی عبارت۔

" لان الربا ھو الفضل المستحق لاحد المتعاقدین فی المعاوضۃ الخالی عن عوض شرط فیہ" (ھدایہ باب الربا ج۳)

صاحب ھدایہ کی اس تعریف سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر زیادتی کی شرط نہیں لگائی گئی ہے بلکہ دینے والا اپنی خوشی سے اصل مال سے کچھ زیادہ دے رہا ہے تو وہ زیادتی ربوا نہیں کہلائے گی اور اس کا استعمال شرعاً جائز ہوگا ———— چنانچہ فتاویٰ ہندیہ کی عبارت سے اس کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔

قال محمدؒ فی کتاب الصرف ان ابا حنیفۃؒ کان یکرہ کل قرض جر منفعۃ قال الکرخی ھذا اذا کانت المنفعۃ مشروطۃ فی العقد بان اقرض غلۃ لیرد علیہ صحاحًا او ما اشبہ ذلک فان لم تکن المنفعۃ مشروطۃ فی العقد فاعطاہ المستقرض اجود مما علیہ فلا باس بہ (عالمگیری ج۳ ص۲۰۲)

عالمگیری کی مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ زیادتی کی شرط عقد کے اندر لگائی گئی تو وہ ربا کہلائے گی ورنہ نہیں ——— چنانچہ علامہ ابن نجیم نے "البحر الرائق" میں ربا کی جو تعریف نقل کی ہے اس میں بھی یہ قید ہے

"وفی البنایۃ قال علماءنا هو بیع فیہ فضل مستحق لاحد المتعاقدین خال عما یقابلہ من عوض شرط فی هذا العقد (البحر الرائق ج۶ ص۱۳۵)

علامہ ابن عابدین شامی نے البحر الرائق کے حاشیہ "المسمی بمنحۃ الخالق" میں ابن الکمال اور اس کی شرح کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں ایک اور قید کا اضافہ ہے وہ یہ کہ زیادتی کی شرط بدلین میں ہو یعنی بائع اور مشتری میں سے کسی ایک کے لئے ہو اگر ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے شخص کے لئے یہ شرط لگائی گئی ہے تو زیادتی ربا نہیں کہلائے گی۔

"عبارۃ ابن الکمال خال عن عوض شرط فی احد البدلین قال فی شرحہ فلو وجد الفضل فی احد البدلین ولم یکن مشروطاً فیہ ولم یکن فی احد البدلین بأن یکون لغیر البائع والمشتری لا یکون ربا (منحۃ الخالق علی حاشیۃ البحر الرائق باب الربا ج۶ ص۱۳۵)

اگر زیادتی کی شرط کسی تیسرے شخص کے لئے لگائی گئی تھی تو وہ زیادتی ربا نہیں کہلائے گی بلکہ ایسی صورت میں بیع فاسد ہو جائے گی اس لئے کہ یہ شرط فاسد ہے اور شرط فاسد سے بیع فاسد ہو جاتی ہے۔ "مشروط ذلک الفضل لاحد المتعاقدین أی بائع او مشتری فلو شرط لغیرهما فلیس بربابل بیعًا فاسداً" (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۱۷۶ و ۱۸۴)

فقہاء نے ربا کی جو تعریف کی ہے اس کو سامنے رکھنے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ معاملۂ بیع و شراء میں تحقق ربا کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ زیادتی اموال ربویہ کے اندر ہو، اور دو ہم جنس چیزوں کا باہم تبادلہ ہو تو وہ زیادتی ربا کہلائے گی ورنہ نہیں۔ چنانچہ اگر پانچ ذراع ہروی کپڑے سات ذراع ہروی کپڑے کے بدلے میں فروخت کر رہا ہے یا ایک انڈے کو دو انڈے کے بدلے میں فروخت کر رہا ہے تو یہ زیادتی ربا نہیں کہلائے گی اس لئے کہ کپڑے اور انڈے اموال ربویہ میں سے نہیں ہیں اسی طرح اگر گیہوں کی بیع جَو سے ہو رہی ہے تو اس میں بھی کمی بیشی جائز ہے اس لئے کہ یہ دونوں ہم جنس نہیں ہیں خلاصہ بحث یہ ہے کہ، ربا کا تحقق اس وقت ہوگا جب کہ

(۱) زیادتی کسی عوض کے مقابلہ میں نہ ہو (۲) صلب عقد میں کسی ایک جانب سے اس زیادتی کی شرط لگائی گئی ہو (۳) معاملہ بیع و شرا کے اندر زیادتی اموال ربویہ کے اندر ہو (۴) اور دو ہم جنس

اشیار کا باہم تبادلہ ہو نیز تحقق ربا کے لئے چار شرطیں ہیں، ـــــــــــــــــــــ
(۱) بدلین کا معصوم ہونا (۲) ان دونوں کا کسی ایک شخصیت کی ملکیت نہ ہونا (۳) بدلین میں عاقدین کی شرکت کا نہ ہونا خواہ شرکت عنان ہو یا شرکت مفاوضہ ـــــــ اگر یہ چار شرطیں پائی جائیں گی تو ربا کا تحقق ہوگا ورنہ نہیں ـــــــ

ربا کا دائرہ :۔ چونکہ اردو زبان کا دامن عربی کے مقابلہ میں تنگ ہے اس لئے ربا کا ترجمہ سود سے کیا جاتا ہے اور عام طور پر اس سے وہی سود مراد ہوتا ہے جو ہمارے زمانہ میں مروج ہے یعنی وہ زیادتی جو قرض کے نتیجہ میں دی جاتی ہے بلاشبہ یہ بھی ربا ہے لیکن ربا کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے۔ معاملہ بیع وشرار کے اندر جو زیادتی حاصل ہوتی ہے اس کو بھی شرعًا ربا کہتے ہیں۔

علمار ربا کی دو قسمیں کرتے ہیں ایک ربار النسیئۃ جس کو ربا الجاھلیۃ بھی کہتے ہیں اور دوسری قسم کو ربا النقد یا ربا البیع یا ربا الفضل سے تعبیر کرتے ہیں ـــــــ زمانہ جاہلیت میں بھی پہلی قسم کا ربا مروج تھا اور اصطلاحًا اسی زیادتی کو ربا کہتے تھے جو قرض کے نتیجہ میں مدیون سے لی جاتی تھی ـــــــ لغت عرب کی نہایت ہی مستند کتاب لسان العرب میں ہے۔

"الربا ربوان والحرام کل قرض یؤخذ بہ اکثر منہ یجربہ منفعۃ" ربا کی دو قسمیں ہیں اور حرام وہ قرض ہے جس سے کچھ زیادہ لیا جائے یا جس سے کوئی منفعت حاصل ہو۔

ابوبکر جصاص نے اپنی مشہور تفسیر "احکام القرآن" میں ربا کی دو قسمیں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک ربا تو وہ ہے جو بیع میں ہوتا ہے اور ایک وہ ہے جو بیع کے علاوہ دوسری چیزوں میں ہوتا ہے اور یہ وہ زیادتی ہے جو قرض لینے والا قرض دینے والے کو ادا کرتا ہے اور یہی ربا زمانہ جاہلیت میں مروج تھا ـــــــ ملاحظہ ہو احکام القرآن کی عبارت۔

"فمن الربا ما ھو بیع ومنہ ما لیس ببیع وھو ربا الجاھلیۃ وھو القرض المشروط فیہ الاجل وزیادۃ مال علی المستقرض"

چونکہ زمانہ جاہلیت میں ربا کی یہی قسم مروج ومتعارف تھی اس لئے جب حرمت ربا کے سلسلہ میں آیات قرآنیہ نازل ہوئیں تو سب نے اس ربا کو حرام سمجھ کر ترک کر دیا ـــــــ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے ربا کے جو معنی بیان فرمائے اس میں ایک اور قسم کا اضافہ تھا اور وہ ہے بیع وشرار کے اندر زیادتی۔ اس طرح ربا کا اطلاق ان قسموں

پر ہوتا ہے۔ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں

" الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل یداً بید فمن زاد واستزاد فقد اربی الآخذ والمعطی فیہ سواء" (بخاری شریف)

اس حدیث میں چھ چیزوں کا ذکر ہے۔ سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور اور نمک۔ ان چیزوں کا باہمی تبادلہ اور بیع و شراء ہو تو کمی زیادتی جائز نہیں ہے اس لئے کہ زیادتی رِبا ہے ـــــ اس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صراحت فرما دی ہے کہ رِبا کا تحقق صرف قرض ہی کی صورت میں نہیں ہے بلکہ بیع و شراء کے اندر بھی ہے۔

یہاں پر ایک بحث یہ آتی ہے کہ یہ حدیث ان چھ چیزوں کے ساتھ خاص ہے یا معلل ہے، اور اس علت کی بنیاد پر ان چھ کے علاوہ دیگر اشیاء میں بھی رِبا کا تحقق ہوگا ـــــ ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل اس بات پر متفق ہیں کہ یہ حدیث ان چھ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ دیگر اشیاء میں بھی رِبا کا تحقق ہوگا۔ البتہ اس کی علت میں اختلاف ہے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے اجتہاد سے ایک ضابطہ بنایا اور اس ضابطہ کے مطابق ان چھ کے علاوہ دوسری چیزوں میں بھی رِبا کا حکم جاری کرتے ہوئے حرمت کا فتویٰ دیا۔ (اس کی پوری تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد دوم اور بدایۃ المجتہد جلد دوم)

یہاں پر صرف اس بیان پر اکتفا کرتا ہوں کہ حنفیہ کے نزدیک علت تحریم قدر مع الجنس ہے یعنی اگر دونوں چیزیں کیلی یا وزنی ہوں اور دونوں ایک جنس سے ہیں تو زیادتی بھی ناجائز اور ادھار بھی ناجائز۔ اور اگر ان دونوں میں سے صرف ایک وصف موجود ہے دوسرا نہیں تو زیادتی جائز ہے ادھار نہیں۔ اور اگر دونوں وصف معدوم ہیں تو تفاضل اور ادھار دونوں جائز ہیں۔ (دیکھئے ھدایہ ج ۳ ص ۶۱)

خلاصہ کلام یہ کہ، رِبا کا دائرہ محدود نہیں ہے بلکہ وسیع ہے۔ قرض کے دائرہ سے نکل کر بیع و شراء کے اندر بھی رِبا کا تحقق ہوتا ہے اور ہر ان دو چیزوں کے باہمی تبادلہ میں زیادتی رِبا کہلائے گی جو کیلی یا وزنی ہوں اور دونوں ایک جنس سے ہوں۔

جواب ۲: دار الحرب میں سودی لین دین کے احکام

دار الحرب میں سودی لین دین کے احکام مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) دارالحرب میں دو مسلمانوں کے مابین باہم سودی کاروبار کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

(۲) اگر کوئی مسلم حربی ہجرت کرکے دارالاسلام چلا آیا اور پھر دارالحرب میں چلا گیا تو اس سے بھی مسلم مستأمن بالاتفاق سودی کاروبار نہیں کرسکتا ہے۔ اسی طرح دارالحرب کا ہی رہنے والا مسلمان کافر حربی سے سودی کاروبار نہیں کرسکتا ہے۔

(۳) اگر دو شخصوں نے دارالحرب میں اسلام قبول کیا اور ان دونوں نے دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان دونوں کے مابین سودی لین دین جائز ہے اور صاحبین کے نزدیک ناجائز۔

(۴) جو مسلمان ویزا لے کر دالحرب میں چلا گیا تو وہ امام ابوحنیفہ اور امام محمدؒ کے نزدیک غیر مسلم حربی سے سودی معاملہ کرسکتا ہے اور امام ابویوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نہیں کرسکتا ہے (پوری تفصیل اور حوالہ کے لئے دیکھئے شامی ج۴ ص۱۸۸) پہلی دونوں صورتوں میں تو سب متفق ہیں کہ سودی معاملہ دارالحرب میں بھی جائز نہیں ہے۔ تیسری صورت میں صرف امام صاحب جواز کے قائل ہیں اور بقیہ حضرات عدم جواز کے اور چوتھی صورت میں طرفین جواز کے قائل ہیں اور امام ابویوسف اور ائمہ ثلاثہ عدم جواز کے ———— گویا کہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ کسی بھی صورت میں دارالحرب میں رہ کر بھی کسی کافر سے سودی معاملہ کرے

اس اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ طرفین کے نزدیک تحقق ربا کے لئے بدلین اور عوضین کا معصوم اور متقوم ہونا شرط ہے اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک شرط نہیں ہے ———— چونکہ دارالحرب میں ایک مسلم مستأمن کے لئے ایک حربی کا مال معصوم اور متقوم نہیں ہے اس لئے ان کے مابین ربا کا تحقق نہ ہوگا۔ امام ابویوسفؒ کے نزدیک چونکہ معصوم اور متقوم ہونے کی شرط نہیں ہے اس لئے ربا کا تحقق بہرحال ہوگا۔ (ملاحظہ ہو بدائع الصنائع ج۷ ص۱۲۷ و ۱۲۸)

امام ابویوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ کا قول زیادہ راجح اور احتیاط سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ مفتیان کرام کو ابویوسفؒ ہی کے قول پر فتویٰ دینا چاہئے جیساکہ مفتی عزیزالرحمٰن صاحب اور دیگر اکابرین دیوبند نے اسی کو احتیاطی قول قرار دیتے ہوئے اسی پر فتویٰ بھی دیا ہے اس لئے کہ ————

(۱) قرآن وحدیث میں سود کی حرمت اور اس کی شناعت جتنی شدت سے بیان کی گئی ہے اور سود لینے والے کو اللہ اور اس کے رسول سے اعلان جنگ کی دھمکی دی گئی ہے اس کے پیش نظر

کسی مسلمان کی یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ کسی شخص سے بھی سودی کاروبار کرے خواہ وہ مسلم ہو کہ کافر اور خواہ دارالاسلام میں ہو یا دارالکفر میں۔

(۲) فقہاء کرام نے یہ صراحت کر دی ہے کہ مسلمان جہاں بھی رہے احکام اسلام کا پابند ہے۔

"ولان المسلم ملتزم بحکم الاسلام حیث مایکون (مبسوط ج ۱۴ ص ۱۲۸)

(۳) باب ربا میں احتیاطی پہلو کو زیادہ راجح قرار دینا چاہئے۔ چنانچہ مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ نے باوجودیکہ انگریزی دورِ اقتدار میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا لیکن سودی لین دین کے معاملہ میں اس کو دارالاسلام ہی مانتے تھے (ملاحظہ ہو مکتوبات قاسمیہ)

(۴) امام صاحب کے جواز کا مقصد عار دلانا تھا کہ اس کو تو دارالاسلام میں رہنا چاہئے تھا لیکن اس نے دارالاسلام کو چھوڑ کر دارالحرب کی سکونت کو ترجیح دی تو وہ سودی رقم جیسی حرام چیز کا استعمال کرے۔

بہر کیف! راقم الحروف کے نزدیک اس ایک خاص جزیہ میں بھی امام ابو یوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ کا قول احوط ہے اسی قول پر مفتیان کرام کو فتوی دینا چاہئے۔

جواب (۳) دار کی تقسیم اور اس کی تعریف

چونکہ پوری دنیا کے اندر رہنے والے انسان دو قسموں پر منقسم ہیں، ایک مسلم اور دوسرے غیر مسلم اس لئے ہم پوری دنیا کو دو دار میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک "دارالاسلام" اور دوسرا "دارالکفر" پھر دارالکفر کی بھی ذیلی چند قسمیں ہوتی ہیں۔ دارالحرب، دارالمعاہدہ اور دارالامن۔

دارالاسلام کی تعریف

دارالاسلام وہ ملک ہے جس کا اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل ہو اس میں شریعت اسلام کے احکام و قوانین نافذ ہوتے ہوں اور حدود و تعزیرات کا اجراء ہوتا ہو۔ وہاں کا نظام مملکت شرعی اصول پر قائم ہو اور پورے ملک پر شریعت کا غلبہ ہو کما یستفاد من الآیات القرانیہ

"قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ"

قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ ان آیات میں کفر و شرک سے اس وقت تک مقابلہ کا حکم ہے

جب تک کہ ان کا خاتمہ ہو کر دین کا غلبہ نہ ہو جائے اور اس کے احکام کا نفاذ نہ ہونے لگے۔ اس سے بظاہر یہی مستفاد ہوتا ہے کہ جب تک کسی ملک میں شریعت اسلام کا نفاذ پورے طور پر نہیں ہوتا ہے وہ ملک دارالاسلام نہیں قرار پائے گا۔

کافی میں ہے " ان المراد بدار الاسلام بلاد یجری فیہا حکم المسلمین وتکون تحت قہرہ"

یعنی دارالاسلام سے مراد وہ ملک ہے جس میں مسلمانوں کا حکم نافذ ہو اور ان کے زیر اقتدار ہو

مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی نائب امیر شریعت امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ نے اپنی لاجواب کتاب (ہندوستان اور مسئلہ امارت) میں دارالاسلام کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

دارالاسلام دنیا کے اس حصہ ملک کو کہتے ہیں جہاں مسلمانوں کو حاکمانہ اقتدار حاصل ہو عام ازیں کہ اس ملک میں شخصی حکومت ہو یا شورائی (ہندوستان، و مسئلہ امارت)

صاحب شرح السیر الکبیر نے دارالاسلام کی تعریف کرتے ہوئے اس کی علامت یہ بتلائی ہے کہ مسلمان اس ملک میں مامون ہوں، ان کو جانی مالی اور ایمانی تحفظ حاصل ہو

"فان دار الاسلام اسم للموضع الذی یکون تحت ید المسلمین وعلامۃ ذلک ان یأمن فیہ المسلمون" (شرح السیر الکبیر ج ۳ ص ۹۱)

دارالاسلام کی تعریف کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ملک دارالاسلام کہلائے گا۔

(۱) جس کا اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل ہو (۲) شریعت کے احکام و قوانین مثلاً حدود و قصاص اور دیگر تعزیرات کا نفاذ ہو اور جمعہ عیدین وغیرہ شعائر اسلام کا قیام ہو (۳) اور مسلمانوں کو جانی مالی اور ایمانی تحفظ حاصل ہو۔

دارالکفر دارالاسلام کب بنتا ہے

یہاں پر اس حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دارالکفر دارالاسلام کب بنتا ہے فقہاء نے یہ صراحت کی ہے کہ جب کسی ملک میں اسلام کے احکام نافذ ہونے لگیں تو وہ ملک دارالاسلام کہلائے گا "ودار الحرب تصیر دار الاسلام باجراء احکام الاسلام فیہا کجمعۃ و عیدین وان بقی فیہا کافر اصلی وان لم تتصل بدار الاسلام" (درمختار مع الشامی ج ۳ ص ۲۳۲)

اعلم دار الحرب تصیر دار الاسلام بشرط واحد وھو اظہار حکم المسلمین فیہا (فتاوی الہندیہ ج ۲ ص ۲۳۲)

واضح رہے کہ یہاں پر اظہار احکام سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ عیدین، جمعہ اور دیگر نمازیں پڑھی جائیں بلکہ ان کے ساتھ ساتھ حدود و قصاص بھی نافذ ہوں اور شریعت اسلامیہ کو غلبہ بھی حاصل ہو ۔۔۔۔۔ کسی ملک میں صرف مذہبی آزادی کا حاصل ہو جانا اس کے دارالاسلام ہونے کے لئے کافی نہیں ہے اس لئے کہ

(۱) لغت اور آیات قرآنیہ پر نظر رکھنے والا شخص یہ جانتا ہے کہ "اظہار میں غلبہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ ولیظہرہ علی الدین کلہ" تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔ آیت کریمہ میں صرف اظہار مقصود نہیں ہے بلکہ غلبہ مقصود ہے۔

(۲) ذمی کو دارالاسلام میں مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے اگر صرف مذہبی آزادی کسی ملک کی تبدیلی کا ذریعہ بن جائے تو ایک ہی ملک کو دارالاسلام اور دارالحرب دونوں ماننا پڑے گا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

(۳) اگر مذہبی آزادی کو دارالاسلام قرار دینے کی بنیاد مانا جائے تو شاید ہی کوئی ملک دارالحرب ہو اس لئے کہ تقریباً ہر ملک میں مسلمانوں کو نماز وغیرہ ادا کرنے کی مذہبی آزادی حاصل ہے

دارالکفر کی تعریف

"تعرف الاشیاء باضدادھا" چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ جب ماقبل میں دارالاسلام کی تعریف کر دی گئی تو اس کی روشنی میں دارالکفر کی تعریف بھی از خود سمجھ میں آجاتی ہے کہ دارالکفر وہ ملک ہے جس کا اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کو حاصل ہو اور ان کے یعنی کفر و شرک کے احکام جاری ہوتے ہوں کافی میں ہے۔ "بلا دیجری فیھا امر عظیمھا ویکون تحت قھرہ" (کافی)

دارالحرب کی تعریف

دارالحرب یا دارالمحاربہ دنیا کا وہ دارالکفر ہے جس کی حکومت اسلامی حکومت سے برسرپیکار ہو، مسلمانوں کی دشمن اور ان کی آزادی کے لئے خطرہ ہو۔ مولانا مودودی صاحب اپنی کتاب "سود" کے صفحہ ۳۸۹ پر دارالحرب سے متعلق لکھتے ہیں کہ

"دارالحرب سے مراد وہ ملک لیا جائے جس سے بالفعل ہماری جنگ برپا ہو"

دارالمعاہدہ

دارالکفر کا وہ ملک جس کا اسلامی حکومت سے معاہدہ ہو جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر کفار مکہ سے چند سالوں کے لئے معاہدہ کیا تھا۔

دارالامن

دارالکفر کا وہ ملک دارالامن کہلاتا ہے جہاں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔ ان کو امن وامان حاصل ہو، حکومت ان کی تہذیب وثقافت اور مذہبی امور میں کوئی دخل اندازی نہ کرے جیسا کہ دورِ رسالت میں ایک کہ مکہ مکرمہ تھا جس کے باشندے مسلمانوں سے ہر طرح برسرِپیکار رہتے تھے۔ مسلمانوں کو مکہ میں رہتے ہوئے مذہبی آزادی نہیں تھی۔ وہ مذہب کی تبلیغ اور اس پر علی الاعلان عمل پیرا نہیں ہو سکتے تھے اس لئے اس کو دارالکفر اور دارالحرب کہا گیا۔ اس کے بالمقابل مدینہ منورہ تھا جہاں پر مسلمانوں کو ہر طرح کی مذہبی آزادی حاصل تھی، اسلام کا غلبہ تھا، حدود وقصاص اور دیگر احکام شرع بھی نافذ تھے اس کو دارالاسلام کہا گیا ــــــ اسی دور میں ایک ملک تھا ملک حبشہ، وہاں کی حکومت تو عیسائی حکومت تھی، اس کی باگ ڈور نجاشی کو حاصل تھی جو عیسائی مذہب کا پیرو تھا لیکن اس میں لوگوں کو امن وامان حاصل تھا۔ اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی تھی اسی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی چنانچہ کچھ مسلمان ہجرت کر کے حبشہ گئے اور وہاں پر ان کو امن وامان اور مذہبی آزادی حاصل رہی اس لئے اس ملک کو دارالامن کہا گیا۔

دارالاسلام دارالحرب کب بنتا ہے

امام ابوحنیفہ کے نزدیک دارالاسلام کے دارالحرب بننے کی تین شرطیں ہیں (۱) اس میں کفر وشرک کے احکام جاری ہو جائیں (۲) اس کے اور دارالحرب کے درمیان کوئی اسلامی ملک حائل نہ ہو بالفاظ دیگر دارالحرب سے متصل ہو۔ ذمی اور مسلمانوں کو امان کی بنیاد پر جو تحفظ باقی تھا وہ باقی نہ رہا ہو۔

اور صاحبین کے نزدیک دارالاسلام کے دارالحرب بننے کی صرف ایک ہی شرط ہے کہ اس میں

کفر وشرک کے احکام کا اظہار برملا ہو۔

لا تصیر دار الاسلام دار حرب الا بامور ثلثۃ باجراء احکام الشرک وباتصالہا بدار الحرب وبان لا یبقی فیہا مسلم او ذمی آمنا بالامان الاول علی نفسہ (درمختار) وفی الشامی - وقالا بشرط واحد لا غیر ھو اظہار حکم الکفر شامی (نیز عالمگیری جلد دوم ص۲۳۲)

اگر کسی ملک میں مسلمانوں کے احکام بھی جاری ہوں اور غیر مسلمین کے بھی تو اس کو دار الحرب نہیں کہا جائے گا۔" لو اجریت احکام المسلمین واحکام اہل الشرک لا تکون دار حرب (شامی)

موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت

اس سے قبل دار الاسلام اور دار الحرب کی جو تعریف کی گئی ہے اس کی روشنی میں موجودہ ہندوستان پر نہ تو دار الاسلام کی تعریف صادق آتی ہے اور نہ ہی دار الحرب کی جو ظاہر ہے اس لئے کہ یہاں کی حکومت کو خود کوئی مذہب نہیں ہے، بلکہ یہ تو ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے، دستور وآئین کے اعتبار سے یہاں کے انتظامی امور میں مسلمانوں کو بھی حصہ لینے کا حق حاصل ہے، یہاں ہر شخص کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی حاصل ہے۔ حکومت ان کے شخصی قانون میں مداخلت نہیں کر سکتی ہے۔ اگر کرے گی تو مسلمان دستور وآئین میں دئے گئے حق کے مطابق حکومت سے لڑ سکتے ہیں۔ لہٰذا راقم الحروف کے نزدیک موجودہ ہندوستان نہ تو دار الاسلام ہے، اور نہ ہی دار الحرب بلکہ دار الامن ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ ہر جگہ فسادات ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کا جانی ومالی نقصان بھی کافی ہوتا ہے تو پھر یہ دار الامن کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا معاملہ عوام سے ہے خود حکومت علی الاعلان ان فسادات میں حصہ لے کر مسلمانوں کو جانی ومالی نقصان نہیں پہنچا سکتی ہے نیز مسلم ممالک کا حال بھی تو اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

جواب ۲۔ بینک کی سودی رقم بینک میں نہ چھوڑا جائے بلکہ اس کو نکال کر بلا نیت صدقہ کر دیا جائے اس لئے کہ گرچہ وہ سود ہے جس کی حرمت پر نصوص صریحہ اور اجماع امت موجود ہے لیکن بینک میں چھوڑنے سے ایک سودی ادارہ کا تعاون ہوگا اور اس کے سودی کاروبار میں مزید

ترقی ہو گی جو تعاون علی الاثم والعدوان ہے جس کی مخالفت نص قرآنی سے ہے اس لئے واذا ابتلی ببلیتین فلیختراھونھما کے اصول کے پیش اس رقم کو نکال لینا ہی راجح ہے۔

بینک کی سودی رقم کے مصارف

بینک کی سودی رقم نکال لینے کے بعد اس کے مصارف کے سلسلہ میں تقریباً تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ اس کو نکال کر بلانیت ثواب فقراء و مساکین پر صدقہ کر دیا جائے اور نارواداغیر واجبی ٹیکس مثلاً انکم ٹیکس وغیرہ بھی دے سکتے ہیں ـــــــ (غیر واجبی ٹیکس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی نفع مسلمانوں کو نہ پہنچتا ہو) البتہ ان کے علاوہ مسلمانوں کے مفاد عام میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں اس میں علماء کے دو گروہ نظر آتے ہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مفتی عزیز ا ؟ ا، حضرت مفتی شفیع صاحبان اور دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مفتیان کرام کی رائے یہ ہے کہ اس کو فقراء و مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے، رفاہِ عام میں صرف نہیں کر سکتے ہیں۔ ان حضرات کے پیش نظر لقطہ اور مال حرام کا حکم ہے کہ جب مالک کا پتہ نہ ہو تو ان کا تصدق واجب ہے۔ فقہاء نے ان جیسے مال کے لئے تصدق کا لفظ استعمال کیا ہے اور تصدق میں تملیک کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ گویا کہ ایسی جگہوں پر صرف کرنا صحیح نہیں جہاں مالک بننے کی صلاحیت نہیں۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم، مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری، مفتی سعید احمد صاحب مفتی اعظم مظاہر علوم، شیخ الاسلام حسین احمد مدنی کی رائے یہ ہے کہ اس کو مسلمانوں کے مفادِ عام میں صرف کر سکتے ہیں۔ حضرت مدنی تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اس کو نکال کر سمندر میں پھینک دینا بہتر ہے بینک میں چھوڑنے سے ـــــــ یوسف قرضاوی اور عبداللہ بن باز کا فتویٰ بھی جواز کا ہے ـــــــ ان حضرات نے عام طور پر فقہاء کی عبارت وما اوجف المسلمون علیہ من اموال الحرب بغیر قتال یصرف فی مصالح المسلمین سے استدلال کیا ہے۔

راقم الحروف کا ذاتی رجحان بھی جواز ہی کی طرف ہے اس لئے کہ مسلمانوں کے لاکھوں اور کروڑوں روپے بینک کے اندر سود کی شکل میں موجود ہیں۔ اور اب مسلمان زیادہ تنگ دست بھی نہیں ہیں نیز ان کے ذہنوں میں سود کی حرمت و شناعت اس قدر بیٹھی ہوئی ہے کہ وہ پریشانیوں کو جھیل سکتے ہیں لیکن سودی رقم کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے الآ یہ کہ بہت زیادہ

مجبوری ہو ـــــــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو وہ رقم بینک ہی میں چھوڑ دی جائے جو صحیح نہیں ہے یا اس کو نکال کر سمندر وغیرہ میں پھینک دی جائے جس کی اجازت نہ تو شریعت دیتی ہے اور نہ ہی کوئی عقلمند انسان۔ اس لئے اس کو لامحالہ رفاہِ عام میں صرف کرنا ہوگا۔

اور یہ استدلال صحیح نہیں ہے کہ فقہاء نے مالِ حرام کے لئے لفظ تصدق استعمال کیا ہے اور لفظ تصدق میں تملیک کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ لفظ تصدق صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ فقہاء نے قربانی کے جانوروں کی کھال اور ان کو فروخت کر دینے کے بعد اس کی قیمت دونوں ہی کے لئے تصدق کا لفظ استعمال کیا ہے جب کہ کھال کا تصدق واجب نہیں ہے بلکہ خود بھی استعمال کر سکتا ہے اور کسی مالدار کو بھی دے سکتا ہے البتہ اس کو فروخت کر دینے کے بعد اس کی قیمت کا تصدق واجب ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ لفظ تصدق کا استعمال صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں ہی کے لئے ہوتا ہے۔

فقہاء کی عبارت پر جب ہم غور کرتے ہیں تو صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ جس کے پاس مالِ حرام ہے اس پر ضروری ہے کہ اس کو صدقہ کر کے اپنے آپ کو گناہ سے بری کرلے۔ لیکن کیا اس کے مصارف وہی ہوں گے جو صدقاتِ واجبہ کے مصارف ہیں اس کی صراحت نہیں ملتی ہے۔ وفی القنیۃ لوکان الخبیث نصابا لایلزمہ الزکوۃ لان الکل واجب التصدق علیہ فلا یفید ایجاب التصدق ببعضہ (شامی کتاب الزکوٰۃ ج۲ ص۲۵) جن حضرات نے اس کے مصارف صدقات واجبہ کے مصارف کو قرار دیا ہے ان کے پیشِ نظر لفظ تصدق ہے لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ لفظ تصدق صدقات واجبہ اور نافلہ دونوں ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ مالک کا پتہ نہ ہونے کی صورت میں مالِ حرام کا تصدق محض اس نیت سے ہے کہ اصل شئے نہیں تو کم از کم اس کا ثواب ہی مالک کو پہنچ جائے۔ اور ظاہر ہے کہ جس طرح فقراء اور مساکین پر صدقہ کرنے سے مالک کو ثواب ملے گا اسی طرح رفاہِ عام میں صدقہ کرنے سے بھی ثواب حاصل ہوگا بلکہ احادیث میں تو رفاہِ عام میں صدقہ کرنے کو صدقۂ جاریہ قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا میری ناقص رائے میں مالِ حرام کے تصدق کا مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس مالِ حرام ہے اس پر ضروری ہے کہ اس کو صدقہ کر کے اپنے آپ کو گناہ سے بری کر دے۔ لیکن اس کے مصارف وہی ہوں جو صدقاتِ واجبہ کے مصارف ہیں ضروری نہیں ہے۔

نیز لقطہ کے مشابہ مان کر عدم جواز کا فتویٰ دینا دو وجہوں سے صحیح معلوم نہیں ہوتا اول یہ کہ

لقطے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ لقطہ میں مالک کا علم نہیں ہوتا ہے اور یہاں پر مالک کا علم ہے لقطہ میں مالک کی طرف مال کا لوٹانا ضروری ہے اور یہاں پر لوٹانے کے بجائے لینا ضروری ہے۔ ثانیاً اگر لقطے کے مشابہ مان لیا جائے تب بھی فقراء پر تصدق ضروری نہیں ہے اس لئے کہ لقطہ کو مسلمانوں کے مفاد عامہ میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؛ اس سلسلہ فقہاء کی عبارتیں مختلف ہیں ـــــ صاحب درمختار نے جواز کے پہلو کو اختیار کیا ہے گرچہ علامہ شامی نے صاحب ہدایہ وغیرہ کی عبارت سے عدم جواز ہی کے پہلو کو راجح قرار دیا ہے تاہم اختلاف کی وجہ سے استدلال تام نہیں ہوگا ـــــ (شامی ج ۲ ص ۵۸) (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے فتاویٰ رحیمیہ جلد سوم)

سود لینے کے سلسلہ میں سرکاری اور غیر سرکاری بینک کا فرق

سود لینا بہر حال حرام ہے اس کی حرمت نصوص صحیحہ اور اجماع امت سے ثابت ہے اس لئے اس کو نکال کر اپنے ذاتی مصرف میں استعمال نہیں کر سکتے ہیں خواہ سرکاری بینک کا سود ہو یا غیر سرکاری بینک کا۔ البتہ سود کی رقم بینک میں نہیں چھوڑی جانی چاہئے بلکہ نکال کر صدقہ کر دینا چاہئے۔ خواہ سرکاری بینک ہو یا غیر سرکاری ـــــ اس لئے کہ دونوں ہی صورت میں ایک سودی ادارہ کا تعاون ہوگا جو تعاون علی الاثم والعدوان ہونے کی وجہ سے ناجائز اور ممنوع ہوگا۔

جواب ۵:۔ سود لینے اور دینے کے حکم میں فرق یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لئے سود لینا کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں پر لعنت فرمائی ہے اور اصول فقہ کا عام قاعدہ بھی ہے کہ "ماحرم اخذہ حرم اعطاءہ" جس چیز کا لینا حرام ہے اس کا دینا بھی حرام ہے۔ علامہ ابن نجیم نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "الاشباہ والنظائر" میں مذکورہ قاعدہ کے تحت سود اور رشوت کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اس قاعدے سے بعض حالات کو مستثنیٰ بھی قرار دیا ہے اور ان حالات میں رشوت دینے کو جائز قرار دیا ہے۔ مثلاً جان و مال کا خطرہ ہو یا کسی حاکم کے پاس اپنا جائز کام کرانا ہو یا اس قسم کی کوئی دوسری مجبوری ہو تو رشوت دینا جائز ہے (دیکھئے الاشباہ والنظائر ص ۔۔۔) لہٰذا بعض مجبوریوں میں سود دینے کی اجازت ہوگی خواہ وہ مجبوریاں اسلامی ملک میں ہوں یا غیر اسلامی ملک میں۔

جواب ۶:۔ عام حالات میں تو سودی قرض لینا شرعاً جائز نہیں ہے اس لئے کہ جس طرح سود لینا حرام ہے اسی طرح دینا بھی حرام ہے البتہ اگر حالات ایسے ہیں جن کو شریعت حاجت و

ضرورت سے تعبیر کرتی ہے، جن حالات میں حرام اشیاء کے استعمال کی شرعًا اجازت ہوتی ہے یا جن میں احکام کے اندر تخفیف ہوجاتی ہے، مثلاً سودی قرض کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، یا زندگی گذارنا دشوار و مشکل ہو یا زندگی کی بنیادی چیزیں مثلاً روٹی اور مکان وغیرہ بھی پورا نہ کرسکیں تو ایسے حالات میں سودی قرض لینے کی اجازت ہوگی "الضرورات تبیح المحظورات" (الاشباہ) یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباہ والنظائر ص۱۲۱)

جواب ۷:۔ عام سودی قرضوں اور حکومت کے سودی قرضوں کے درمیان فرق ہے۔

جواب ۶ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ عام قرضوں کا حکم ہے۔ حکومت کے سودی قرضوں کا حکم ان سے کچھ مختلف ہے۔ ترقیاتی منصوبوں کے پیش نظر حکومت جو قرض دیتی ہے اس کا لینا جائز ہے اس لئے کہ حکومت اپنے خزانہ میں جو رقم رکھتی ہے وہ تمام شہریوں کی ترقی کے لئے ہوتی ہے گویا کہ اس کے ساتھ جس طرح غیر مسلموں کا حق متعلق ہے اسی طرح مسلمانوں کا حق بھی متعلق ہے چونکہ حکومت کا ترقیاتی نظام رشوت اور سود پر مبنی ہے اس لئے جب مسلمان اپنے حق کی وصولیابی کے لئے جاتا ہے تو وہ بھی رشوت وسود دینے پر مجبور ہوتا ہے اور فقہاء نے یہ صراحت کردی ہے کہ اپنے حق کی وصولیابی کے لئے رشوت وسود دینا جائز ہے۔ لہٰذا مسلمان بھی مذکورہ صورت میں اپنے حق کی وصولیابی کے لئے رشوت وسود دے سکتا ہے، یا یوں کہا جائے کہ وہ رشوت ہی نہیں ہے بلکہ حکومت عام لوگوں کی ترقی کے لئے خزانہ میں رقم رکھتی ہے اس لئے اس کے نظام کو چلانے کے لئے ملازمین وغیرہ کی اجرت کے طور پر قرض لینے والوں سے کچھ رقم لے لیتی ہے جس کو رشوت نہیں کہا جاسکتا ہے۔ یہی رائے مفتی نظام الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند اور خالد سیف اللہ رحمانی کی ہے اور مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاضی شریعت بہار واڑیسہ کی بھی یہی رائے ہے۔ (دیکھئے ان کی کتاب "چند اہم فقہی مسائل بدلتے ہوئے حالات میں") (دیکھئے نظام الفتاوی اور جدید فقہی مسائل)

جواب ۸:۔ اگر حکومت قرض پر چھوٹ بھی دیتی ہے اور اس پر سود بھی لیتی ہے اور چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی یا اس سے زیادہ ہے تو ایسی صورت میں قرض لینا شرعًا جائز ہوگا۔ اس لئے کہ جب حکومت نے سود کے مساوی یا اس سے زائد چھوٹ ہی دے دیا تو اضافی رقم کو سود دینا نہیں کہا جائے گا گرچہ حکومت اس کو سود کے نام پر وصول کرتی ہے ــــــ مفتی نظام الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند نے بھی ایسی صورت میں سودی قرض لینے کو جائز قرار دیا ہے۔

اور اس کو سود ہی نہیں مانا ہے (دیکھئے نظام اقتصادی جلد اول)

جواب ۹ ۔ غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں چونکہ سود اور رشوت سے نجات مشکل ہے اس لئے بدرجۂ مجبوری سود اور رشوت دے سکتے ہیں، شرعاً اس کی اجازت ہوگی۔ اسی طرح اگر قانونی مجبوری کے پیش نظر مال برآمد کرنے کی صورت میں سود ملتا ہے تو اس کو چھوڑنا نہیں چاہئے بلکہ بینک کے سود کی طرح اس کو نکال کر بلانیت ثواب صدقہ کر دینا چاہئے۔

جواب ۱۰ ۔ دونوں قسم کے بینکوں میں فرق ہے وہ بینک جن کے مالک اشخاص و افراد ہوتے ہیں ان کا مقصد صرف دولت اکٹھا کرنا اور معاشی پریشانی کو دور کرنا ہوتا ہے اس لئے ان بینکوں سے عام حالات میں سودی قرض نہیں لے سکتے ہیں البتہ اگر "ضرورت" و "حاجت" کے درجہ کی مجبوری ہو تو "الضرورات تبیح المحظورات" اور "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" کے پیش نظر سودی قرض لینے کی شرعاً اجازت ہوگی۔

جواب ۱۱ ۔ جہاں تک سرکاری بینکوں کا تعلق ہے جن کے مالک حکومت ہوا کرتی ہے تو ان کا مقصد دولت جمع کرنا نہیں ہوتا بلکہ عوام کی تجارتی، صنعتی وغیرہ ترقی کو فروغ دینا ہوتا ہے اور اس نظام کو چلانے کے لئے ملازمین کی اجرت کے طور پر قرض لینے والوں سے کچھ اضافی رقم حکومت لیتی ہے جو معمولی رقم ہوتی ہے اس کو سود نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے عام حالات میں بھی تجارتی اور صنعتی ترقیات کے لئے حکومت کے بینک سے قرض لے سکتے ہیں۔

جواب ۱۲ ۔ کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے پرائیوٹ سرمایہ کاروں سے سرمایہ حاصل کرے اور اس پر سود ادا کرے اس لئے کہ بلا کسی شدید مجبوری کے سود دینا پڑے گا اور سود دینا و لینا دونوں ناجائز اور حرام ہے۔

فقط، واللہ تعالیٰ اعلم



جواب ضمیمہ سوال نمبر ۲

جواب ۱۔ قانون حصول اراضی کی دونوں شکلوں میں سود کے نام پر دی جانے والی اضافی رقم پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی ہے اس کو لے کر اپنے ذاتی مصرف میں استعمال کرنا شرعاً جائز ہوگا اس لئے کہ
(۱) اضافی رقم بھی زمین کی اصل قیمت شمار کی جائے گی گرچہ حکومت نے اس قیمت کو دو قسطوں میں ادا کیا ہے
(۲) اضافی رقم حکومت کی طرف سے انعام ہے جیسا کہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کے سلسلہ میں علماء اور مفتیان کرام کا فتویٰ ہے۔
(۳) کوئی اضافہ اس وقت سود قرار پاتا ہے جب کہ کسی جانب سے مشروط ہو جیسا کہ اس سے قبل ربا کی تعریف میں فقہاء کرام کی عبارتیں ذکر کی جا چکی ہیں ــــــــ اور مذکورہ صورت میں اضافی رقم مشروط طریقہ پر نہیں مل رہی ہے بلکہ عدالت کے فیصلہ پر حکومت اپنی طرف سے دے رہی ہے یا بغیر فیصلہ کے اپنی طرف سے دے رہی ہے۔
اگر یہ حرجانہ کوئی اسلامی حکومت دے تب بھی اس کا لینا شرعاً جائز و درست ہوگا۔
جواب ۲۔ کاشتکاروں کو حکومت سے زرعی ترقیاتی سودی قرضے لینا جائز و درست ہے اس لئے کہ
(۱) حکومت کے خزانہ میں دیگر شہریوں کی طرح ہر مسلمان کا بھی حق ہے اور اپنے حق کی وصولیابی کے لئے سود ورشوت دینا جائز ہے۔
(۲) اضافی رقم درحقیقت سود نہیں بلکہ حکومت اپنے انتظام کو چلانے کے لئے ملازمین وغیرہ کی اجرت لیتی ہے گویا کہ اضافی رقم کا تعلق انتظامی مصارف سے ہے ــــــــ
جواب ۳۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کارپوریشن کے حصص خریدے اس پر سود کی تعریف صادق آتی ہے۔ سوالنامہ میں خود ہی اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ کارپوریشن کے حصص مضاربت کے اصول پر فروخت نہیں کئے جاتے لہٰذا محض ایک شخص کی نیت کر لینے سے مضاربت صحیح نہیں ہوگی اور یہ عقد جائز نہ ہوگا اس لئے کہ عقد تو دو فریق مل کر طے کرتے ہیں نیز کارپوریشن جب نفع بشکل سود متعین کر دیتی ہے تو مضاربت کے صحیح ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ــــــــ
جواب ۴۔ یہ صورت جائز و درست ہے اس میں اضافی رقم پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی۔ محمد یونس کے لئے اضافی رقم کا لینا شرعاً جائز و درست ہے۔ اس میں بھی وہ تمام تاویلیں چل سکتی ہیں جو جواب ۱ میں کی گئیں۔ فقط

سود کا مسئلہ

از ـــــــــــ ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی۔ علی گڑھ

(۱) شرعاً ربا اس زیادتی کو کہتے ہیں جس کے مقابل کوئی معاوضہ نہ ہو۔ اگر بغیر شرط کے اضافہ کر دیا جائے تو یہ ربا نہیں ہے بلکہ قضاء احسن ہے۔ خیرکم احسن قضاءً
ربا کے دائرہ میں ہر طرح کا قرض داخل ہے، خواہ وہ کسی مقصد کے لئے دیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ اس کا اطلاق تبادلہ اشیاء کے بعض ان معاملات پر بھی ہوتا ہے جن میں ایک جنس اپنی طرح کی جنس سے کمی بیشی یا وقت کے اختلاف کے ساتھ بدلی جائے۔

(۲) ربا کے معاملہ میں دار الحرب کے استثنا کی بنیاد قوی نہیں ہے۔ اگر ہم اس طرح اصول بناتے جائیں تو دار الحرب میں چوری، زنا وغیرہ بھی جائز رہنے چاہئیں جنہیں کوئی معقول نہیں سمجھتا۔

(۳) میرے خیال میں دار الحرب اور دار الاسلام کی قدیم اصطلاحات دورِ حاضر کے شاید ہی ایک آدھ ممالک پر منطبق ہوں۔ آج خود مسلم ممالک میں صحیح اسلام کی سربلندی کے لئے کوشش کرنے والوں کو جس طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اکثر غیر مسلم ممالک میں جو آزادیٔ فکر و عمل ہے اس کو دیکھتے ہوئے نئی تقسیم کی ضرورت ہے۔ دار الحرب اور دار الاسلام کی قدیم تقسیم اس وقت کے سیاسی و دینی نظام کے تحت تھی۔ اب حالات دوسرے طرح کے ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہ نہ تو دار الحرب ہے نہ دار الاسلام بلکہ دار الفتن ہے جہاں کبھی امن رہتا ہے کبھی فساد۔ یہاں شہادت علی الناس کی ضرورت ہے۔

(۴) بینکوں سے جو سود ملتا ہے اس کے بارے میں مجھے علماء کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ اسے وہیں چھوڑ نہیں دینا چاہئے۔ جہاں تک اس کے مصرف کا تعلق ہے چونکہ اس کے

حقیقی مالک نامعلوم ہوتے ہیں (بینک نہ جانے کن جیبوں سے وصول کرتا ہے) اس لئے ایسے موال جن کے اصل مالک کا پتہ نہ چل سکے رفاہِ عام کے کاموں میں لگانا مناسب رہے گا مثلاً اگر حکومت کسی سڑک کی تعمیر کے لئے چندہ طلب کرتی ہے تو اس میں دے دینا، فسادات کے موقع پر مظلومین کی آباد کاری، فسادات کی روک تھام کی تدابیر وغیرہ۔ اس سے غیر مسلمین کی تالیف قلب کے سلسلہ میں بھی غور کیا جا سکتا ہے۔

(۵) دارالحرب میں جن فقہاء نے سود کے حکم میں فرق کیا ہے انہوں نے صرف سود لینے کو جائز کہا ہے دینے کو نہیں۔

(۶) صرف اضطرار کی شکل میں سودی معاملہ جائز ہو سکتا ہے۔ اضطرار کا تعین اکثر فرد خود کرتا ہے۔ یہ سود صرف رفع اضطرار اور بس ضرورت بھر ہونا چاہئے۔

(۷) مسئلہ سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے۔ چونکہ ایک عام شہری کی حیثیت سے حکومت کی مراعات سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے اور اس سے فائدہ اٹھا کر بہت سے بندگان خدا کا بھلا کر سکتا ہے اس لئے بہ کراہت کچھ گنجائش نکل سکتی ہے۔ اس کا معاملہ بھی بہت کچھ نیتوں پر منحصر ہے عام اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ اس کی وجہ سے سود سے نفرت کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور اچھے نظام کے لئے کوشش یا کم از کم خواہش مٹ سکتی ہے۔

(۸) اگر فعل حرام نہیں تو کم از کم کراہت سے خالی نہیں۔

(۹) غیر ممالک سے تجارت کے سلسلہ میں جہاں تک سود دینے کی مجبوری کا تعلق ہے اس کے اضطرار کا فیصلہ صاحبِ معاملہ خود کرے یا کچھ عادل و عالم اشخاص سے دریافت کرے۔ بہر حال معاملہ کراہیت سے خالی نہیں۔ رہا سود ملنے کا مسئلہ تو اس سود کو خود استعمال نہ کرے بلکہ جس طرح بینکوں کے سود کو خرچ کرنا چاہئے اسی طرح اس کو بھی خرچ کرے۔

(۱۰) دونوں کی نوعیت یکساں ہے۔

(۱۱) ابھی تو سرکاری بینکوں سے سرمایہ حاصل کرنے کا مسئلہ ہی حل طلب ہے۔ اگر سرکاری بینکوں سے سود پر سرمایہ حاصل کرنے کا جواز ثابت ہو جاتا ہے تو رشوت سے احتراز اور ظلم سے فرار کی خاطر پرائیوٹ سرمایہ کار سے معاملہ کا جواز پیدا ہو سکتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

ضمیمہ سوال نمبر ۲ کا جواب

مثال ۱

چونکہ اس معاوضہ حرجانہ کی ادائیگی میں مارکٹ شرح سود کو بنیاد بتایا جاتا ہے اور وقت کی کمی و بیشی پر اس کی کمی وزیادتی کا انحصار ہوتا ہے نہ کہ صاحب معاملہ کی تگ و دو اور اخراجات کا اس لئے اس کے جواز کا فتویٰ کراہیت سے خالی نہیں ہوگا۔ اس مثال کے آخر میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس صورت میں قرض کا عنصر موجود نہیں ہے جو سود کی تقریباً تمام ہی صورتوں میں موجود ہوتا ہے" ربا البیوع میں قرض کا عنصر موجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح شرکت کا وہ معاملہ جس میں کوئی شریک سرمایہ پر متعین رقم وصول کرے وہ بھی سود کی نوعیت کا ہے جبکہ اس میں قرض کے بجائے شرکت کا عنصر موجود ہے۔

دوسری مثال

"راس المال پر مدت کے معاوضہ میں اضافہ" ہی دراصل ربا الجاہلیہ ہے جس کی حرمت آئی ہے۔ اسلام میں جہاں نیتوں کے فرق سے حکم میں فرق واقع ہوجاتا ہے اگر شکلا بھی معاملہ غلط ہو تو حکم واضح ہے۔ رہی یہ بات کہ حکومت کو مختلف مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں تو یہ کوئی وجہ جواز نہیں اس طرح کے انتظامی مصارف بینک بھی برداشت کرتا ہے تو کیا اسے سود وصول کرنے کا جواز حاصل ہوجائے گا۔ حکومت تو طرح طرح کے ٹیکس وصول کرتی ہے۔ اس سے یہ مصارف پورے کرنے چاہئیں یا صرف اتنی ہی رقم وصول کرے جو واقعی مصارف ہوتے ہیں۔ جب تک یہ بات نہیں ہوتی سود کے سلسلہ میں آئی ہوئی وعیدوں کے پیش نظر اس طرح کے قرضوں سے احتراز اولیٰ ہے۔ خاص طور سے اس سلسلہ میں عام جواز کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔

تیسری مثال

کارپوریشن کے معاملہ میں ایک مسلمان اپنے طور پر اپنی شرکت کو مضاربت نہیں

قرار دے سکتا یہ معاملہ دونوں طرف سے طے کرنے کا ہے۔ مثال مذکور میں خسارہ ہونے یا نفع باعتبار حصہ رسدی کچھ ہونے کا ذکر تو ہے لیکن باعتبار حصہ رسدی نفع زیادہ ہونے کا ذکر نہیں ہے؟۔ دراصل کارپوریشن یا اس طرح کے دوسرے کاروباری اداروں میں شرکت کا معاملہ ہی جدا نوعیت کا ہے، جس پر الگ سے غور ہونا چاہئے۔ اس طرح اداروں کا بیشتر سرمایہ سود پر حاصل کیا ہوا ہوتا ہے کاروبار کے مختلف مراحل میں سود کا نفع اور سود کی ادائگی بھی ہوتی ہے۔

چوتھی مثال

محمد یونس کا جو معاملہ ہے وہ ایک جزئی یا شخصی معاملہ ہے۔ اس کی مثال سے ایک عام حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ بینکوں کے سود کی طرح محمد یونس کو چاہئے کہ ان کے معاوضہ پر ملنے والی رقم کا سود وصول کریں لیکن اس کا کیا مصرف ہو۔ پورے کا پورا اضافہ وہ خود رکھ لیں یا پورے کا پورا محتاج و مضطر پر خرچ کر دیں، کسی طرح یہ حساب کریں کہ اس عرصہ میں اس کی وصولیابی کے لئے انہیں کتنے اخراجات برداشت کرنے پڑے اور کتنی مشقتیں اٹھانی پڑی ہیں۔ پھر اس کے مطابق سود کی رقم کے حصے کریں یا نہ کریں پھر یہ کہ اس مدت میں افراط زر ہوا ہے یا تفریط زر، کیونکہ اس تاخیر سے مدعی کا فائدہ بھی ہو سکتا ہے اگر اس مدت میں قیمتوں کی عام سطح میں گراوٹ آگئی ہو —— یہ سب چیزیں محمد یونس خود فیصلہ کر سکتے ہیں اگر وہ اس کی صلاحیت محسوس کریں یا پھر کسی قابل اعتماد عالم سے دریافت کر سکتے ہیں۔ اس طرح کی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض فتاوی میں ملتی ہے کہ صاحب معاملہ کے پیش نظر ایک ایسا حکم دیا جو عام حکم نہیں بن سکتا۔ مثلاً ایک کفارہ دینے والے کو اجازت دی کہ وہ اپنے کفارہ کو خود اپنے اہل وعیال میں خرچ کر ڈالے۔

والله اعلم بالصواب

مسائلِ ربوا

از: ـــــــــــــــــ مولانا محمد ایوب ندوی۔ جامعہ اسلامیہ بھٹکل

ربا کی چار قسمیں ہیں

(۱) ربا فضل : دو ہم جنس اشیاء کا تبادلہ کمی وبیشی کے ساتھ ہو مثلاً ایک کلو عمدہ چاول دو کلو معمولی چاول کے بدلے بیچنا۔

(۲) ربا الید : اگر دو ہم جنس اشیاء کا تبادلہ کرتے وقت متبادل اشیاء پر قبضہ سے پہلے مجلس برخاست ہو جائے تو اس میں سود پایا جاتا ہے۔

(۳) اگر دو ہم جنس اشیاء کا تبادلہ ادھار ہو تو اس ادھار کا ربا پائے جانے کی وجہ سے یہ بھی حرام ہے۔

(۴) ربا القرض : قرض لینے والا اپنے لئے نفع کی شرط لگا کر مال دینا۔ یہ چاروں صورتیں ربا میں شامل ہیں۔ آج کل چوتھی صورت کثرت سے پائی جاتی ہے۔

(۳) شوافع کے نزدیک دار الحرب اور دار الاسلام میں کوئی فرق سود کی حرمت کے معاملے میں نہیں ہے۔

(۴) بینکوں میں جمع شدہ رقم کا سود لے کر غرباء و مساکین پر بلا نیت خرچ کر دینا جائز ہے۔

(۵) سود لینا بالکل حرام ہے اور دینے میں اگر کسی قسم کی مجبوری ہو، جیسے ہندوستان کے سرکاری قوانین کی بنیاد پر کسی قسم کی مجبوریاں معلوم ہوتی ہیں تو سود دینا ضرورتاً جائز ہے۔

(۶) اگر کسی مسلمان کے پاس کوئی مناسب ذریعہ معاش نہ ہو اور اپنے ذاتی روپیے کاروبار شروع کرنے کی صورت میں اس بات کا خطرہ ہو کہ حکومت انکم ٹیکس کے ذریعہ

اس میں سے ایک ، بڑی مقدار غصب کرے گی تو صرف حکومت کو دکھانے کے لئے اس وقت سود پر روپیہ لے سکتا ہے جب کہ اس کو جلد ادا کی امید ہو۔

(۷) حکومت سے ترقیاتی اسکیموں کے لئے سودی قرض لینا جائز نہیں ہے لیکن اگر حکومت سود اتنا کم لے جو صرف اس کے اخراجات کے لئے کافی ہو تو یہ اخراجات بنام سود لینا جائز ہونا چاہئے۔

(۸) جائز ہے لیکن احتیاط بہتر ہے۔

(۹) معلوم نہیں۔

(۱۰) کچھ فرق نہیں ہوگا۔

(۱۱) سرکاری قرضہ لینے کی صورت میں جو رعایتیں حاصل ہوتی ہیں، اگر وہی رعایتیں کمپنی کی طرف سے قرضہ لینے کی صورت میں حاصل ہوتی ہوں تو دونوں کا حکم یکساں ہے ورنہ عام حالات میں یہ جائز نہیں۔

جوابات ضمیمہ سوال ۲

۱۔ (۱)۔ اس صورت میں مالک زمین یا ملازم صرف اپنی واجبی رقم طلب کرتا ہے اور عقد بیع یا اجارہ میں اس قسم کی کوئی شرط نہیں ہوتی بلکہ حکومت اپنے قانون کی بنا پر مع سود ادا کرتی ہے تو اس کا لینا شرعاً جائز ہے اس لئے کہ سود انہیں قرضوں میں ہوتا ہے جہاں ادائیگی مع اضافہ مشروط ہو یہاں کوئی شرط نہیں ہے۔ اور شوافع کے نزدیک قرض کی ادائیگی بھی باضافہ سنت ہے لہٰذا زائد رقم لینا بالکل جائز ہے۔

(۲) حکومت جو اخراجات بنام سود لیتی ہے اس کا ادا کرنا جائز ہونا چاہئے اس لئے کہ آج کل جو لوگ اسلامی بینک چلا رہے ہیں ان کو ۸ فی صد سے زائد اخراجات آرہے ہیں۔

(۳) عقود کے صحیح ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ ایجاب و قبول میں معنی یکسانیت ہے اگر متعاقدین کی نیتیں مختلف ہوں تو عقد صحیح نہیں ہوگا لہٰذا اس طرح کا شیر لینا جائز نہیں ہے فتح المبین باب البیع کے ابتدا میں ہے

ویشترط ایضاً ان یتوافقا معنی لا لفظاً فلو قال بعتک بالف حالۃ فاجل او عکسہ او مؤجلہ بشہر فزاد لم یصح للمخالفۃ۔

والله اعلم بالصواب

مسائل ربوا

(انا) ——— حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

دونوں سوالناموں میں ضمنی سوالات کی پوری تفصیلی تحقیق سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے دارالاسلام و دارغیراسلام کی پوری تشریح سامنے آجائے اس کے بعد ضمنی نمبرات پر کلام کیا جائے۔

اس لئے ضمنی سوالات کی ترتیب بدل کر پہلے دارالاسلام و دارغیراسلام پر اپنی بضاعۃ مزجات کے مطابق کچھ عرض ہے۔

اصل میں سارا عالم (موجودہ و آئندہ موجود ہونے والا سب) حسب ضابطہ فقہاء (الدار داران) دو دار میں منقسم ہے" اور عقلاً بھی سارا عالم دو دار میں منحصر ہوگا ایک "دارالاسلام" دوسرا دارغیراسلام"۔

اس لئے کہ وہ دار و ملک جس میں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل ہو یعنی مسلمان اس میں اسلامی احکام و قوانین جاری کرنے میں اور سب پر لاگو کرنے میں آزاد ہوں اور اس پر قادر ہوں ——— اور دوسرا دار (دارغیراسلام) ——— وہ دار و ملک جس میں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو اس طرح حاصل نہ ہو کہ وہ اس میں اسلامی احکام و قوانین جاری و لاگو کرنے میں آزاد ہوں اور حسب منشاء خود اس پر قادر ہوں۔

خلاصہ: یہ ہوا کہ مطلق دار مقسم کے درجہ میں ہوا اور یہ دونوں دار (دار اسلام و دار غیراسلام) اسی مقسم کی دو قسمیں ہوئیں، اور آپس میں متبائن و قسیم اور ایک دوسرے کے متقابل ہوئیں" اور ظاہر ہے کہ اسلام کا متقابل کفر ہے، لہٰذا دارالاسلام کا متقابل دارالکفر ہوگا"۔

اور دارالکفر کی حصر عقلی اعتبار سے محض چار قسمیں نکلیں گی اس لئے کہ دارالکفر کا محاربہ کسی دارالاسلام سے ہوگا یا نہیں ——— اگر محاربہ ہو تو وہ شرعاً دارالکفر و دارالمحاربہ

شمار ہوگا ـــــــ اور اگر محاربہ نہ ہو تو پھر دو حال سے خالی نہیں یعنی یہ کہ دارالاسلام سے معاہدہ یا مصالحہ ہے یا نہیں ـــــ اگر ہے تو وہ شرعاً دار المعاہدہ والمصالحۃ ہے ـــــــ اور اگر معاہدہ یا مصالحہ نہیں ہے تو پھر دو حال سے خالی نہیں یعنی یہ کہ اس دارالکفر میں مسلمان امن وسکون سے ہیں یا نہیں ـــــ اگر امن وسکون سے ہیں تو وہ دارالکفر شرعاً دارالامن شمار ہوگا ـــــ اور اگر مسلمان وہاں امن وسکون سے نہیں ہیں تو پھر وہ دارالکفر شرعاً دارالشر والفساد شمار ہوگا۔

الغرض دارالکفر کی حصر عقلی کے اعتبار سے یہ چار قسمیں (دارالمحاربہ۔ دارالمعاہدہ یا المصالحہ۔ دارالامن ـــــ دارالشر والفساد) نکلیں گی ـــــ اور دارالکفر کی یہ چار قسمیں شخصی حکومت کے اعتبار سے ہیں۔

اگر حکومت شخصی نہ ہو جمہوری ہو تو اس کی تقسیم دوسرے اعتبار سے ہوگی۔ اور وہ یہ کہ دارالکفر اور دارالاسلام کا جو مقسم (مطلق دار) ہے اس کی دو قسمیں ہوں گی ـــــــ ایک تو وہ جمہوری ملک جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو وہ ملک دار غیر اسلام یعنی دارالکفر ہوگا، اور دارالکفر کی دوسری قسم دارالمعاہدہ میں عموماً داخل ہوگا اس لئے کہ جمہوری ملکوں میں ملک کا ہر فرد اور ہر باشندہ بلالحاظ مذہب ومسلک کے ایک معاہدہ کے تحت ہو کر اس معاہدہ کا پابند ہوتا ہے جس کو اصطلاح میں ملک کا دستور کہتے ہیں، اور چونکہ وہ دستور اپنے ہی ہاتھوں کا بالواسطہ یا بلاواسطہ براہ راست بنایا ہوا ہوتا ہے اس لئے اس اعتبار سے ہر فرد اپنے کو بلالحاظ مسلک ومذہب آزاد حر بھی کہہ سکتا ہے۔

اور دستور کا تابع و پابند ہونے کی وجہ سے معاہد بھی کہہ سکتا ہے۔ لہٰذا سابق کی ساری اصطلاحات شرعیہ (حر و غلام یا ذمی ومستامن وغیرہ کسی کا مصداق) باقی نہ رہیں گی، اور ان کے احکام وہی ہو جائیں گے جو ایک معاہد کے ہوتے ہیں۔

الغرض یہ چاروں قسمیں دارالکفر کی ہیں، اور ان چاروں قسموں کے شرعاً الگ الگ احکام ہیں جو عنقریب معلوم ہوں گے۔

اور فقہائے کرام جو ان چاروں قسموں کو صرف دارالحرب سے تعبیر کر دیتے ہیں وہ یا تو اشارۃً آیت کریمہ وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للّٰہ ○ پ۲ سورۃ البقرۃ رکوع ۸ "تعریضاً علی الجہاد وترغیباً لہ" فرماتے ہیں ـــــــ

اور بہت ممکن ہے کہ اسی اشارہ کی بنیاد پر حضرات شوافع سارے عالم کو فقط ایک دار

(دارالاسلام) فرماتے ہیں"۔

بہر حال ان اطلاقات سے ان چاروں قسموں (دارالمحاربہ۔ دارالمصالحۃ۔ دارالامن۔ دارالشر والفساد) کے الگ الگ احکام میں شرعاً کوئی فرق نہ پڑے گا" شلا دارالمحاربہ میں بزمانہ محاربہ اموال حربی شرعاً معصوم ومتقوم یا واجب الضمان شمار نہیں ہوتے، بلکہ مباح الاستعمال ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ خداع صریح وغصب وظلم وغیرہ قبیح لعینہ اور حسن لعینہ کے خلاف کا ارتکاب نہ ہو۔

اور شلاً دارالمعاہدہ والمسالمہ میں حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے اور معاہدہ ومسالمہ کی رعایت کرتے ہوئے تمام احکام شرعیہ انفرادی ہوں یا اجتماعی ہیں اتباع معاہدہ ومسالمہ کرنا واجب رہے گا اور اس کے خلاف کرنا درست نہ رہے گا۔

اور شلاً دارالامن میں تمام احکام شرعیہ انفرادیہ ہوں یا اجتماعیہ ہوں واجب العمل رہیں گے بشرطیکہ قانون امن کے یا قانون حکومت کے صریح خلاف نہ ہوں اگر صریح خلاف ہو تو حکومت وقت سے اجازت لے کر عمل کریں گے"۔

اور شلاً دارالشر والفساد میں ان کے جان ومال کچھ بھی معصوم نہ ہوں گے بلکہ حدود شرع کے مطابق مباح الاستعمال شمار ہوں گے، اور حسب استطاعہ ان سے جہاد کرنا یا وہاں سے ہجرت کرجانا لازم رہے گا جبکہ مقام ہجرت کہیں ملے ـــــ اور جب استطاعۃ جہاد نہ ہو یا مقام ہجرت کہیں میسر نہ ہو تو وہیں رہ کر صبر کرنا اور انابۃ الی اللہ اور اپنے اعمال واحوال اجتماعیہ وانفرادیہ میں رجوع الی اللہ کرنا لازم رہے گا ـــــ كما اشار اليه قوله تعالىٰ "ربنا اخرجنا من هذه القرية الظالم اهلها ○ الآية پ۵ سورہ مائدۃ"

واشار اليه قوله عليه السلام عن ابى الدرداءؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله تعالىٰ يقول انا الله لا اله الا انا مالك الملوك وملك الملوك قلوب الملوك فى يدى وان العباد اذا اطاعونى حولت قلوب ملوكهم عليهم بالرحمة والرأفة وان العباد اذا عصونى حولت قلوبهم بالسخطة والنقمة فساموهم سوء العذاب فلا تشغلوا انفسكم بالدعاء على الملوك ولكن اشتغلوا انفسكم بالذكر والتضرع كى اكفيكم مشكوٰۃ ص ۳۱۲

دارالکفر (دارالحرب) کے ان چاروں قسموں کی مثال دیکھنا چاہیں تو دارالشر والفساد

کی مثال مکہ مکرمہ ہجرت سے قبل بن سکتا ہے"۔ اور حبشہ دار الامن کی مثال بن سکتا ہے؛ اس لئے کہ ان دو داروں کے لئے دار الاسلام کا وجود لازم نہیں ہے بخلاف دار المعاہدہ ودار المحاربہ کے کہ ان دونوں (دار المحاربہ و دار المعاہدہ) کے نام میں باب مفاعلہ مستعمل ہے، اور باب مفاعلہ میں فریقین کا دار ہونا خود بخود نکلتا ہے" اس لئے ان دونوں (دار المعاہدہ والمحاربہ) کی مثالوں میں دار الاسلام کا وجود ماننا بھی لازم رہے گا، اور ان دونوں کی مثال صلح حدیبیہ سے لے کر جبتک صلح قائم تھی مکہ اور اطراف مکہ دار المعاہدہ کی مثال بن سکتے ہیں۔ اور اسکے علاوہ عرب کا سارا علاقہ جن سے جہاد و محاربہ جاری تھا وہ سب دار المحاربہ کی مثال بن سکتے ہیں"۔

اور ان مثالوں کے ذریعہ سے ان سب کے احکام کا شرعاً الگ الگ ہونا بھی واضح ہو سکتا ہے"۔ نیز کتب مذہب میں اکثر مصرح بھی ہیں" اور اکثر الگ الگ تفصیل کے ساتھ بیان شدہ بھی ہیں۔

دار الاسلام کی قسموں کا بیان

یہاں سے یہ بات بھی سنتے چلئے کہ دار کی یہ چار قسمیں دار غیر اسلام بمعنی دار الکفر کی ہیں، اور دار الاسلام کا شرعی اور اصلی حکم تو یہی ہے کہ دار اسلام سارے عالم کا ایک ہی ہونا چاہئے جس طرح دور رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم سے دور عثمانی تک تھا پھر حضرت حسنؓ کے صلح کے بعد سارے اسلام کا واحد دار الاسلام عود کر آیا۔ یہ درمیان کا ساڑھے چار سال کا دور جس کو مشاجرات صحابہ کا دور بھی کہا جا سکتا ہے، یہ دور تو بلا شبہ دلائل شرعیہ کے اندر اور خالص اخلاص پر مبنی تھا اور خطأ اجتہادی سے آگے بڑھا نہیں گئی، اور اسی وجہ سے اس پر انگشت اعتراض اٹھانے کی بھی اجازت نہیں ہے؛ اس لئے کہ احادیث پاک میں وارد ہے"۔

المجتہد قد یخطی وقد یصیب اذا اخطاء فلہ اجر واذا اصاب فلہ اجران او کما قال۔

اور پھر یہ دور عبوری آیت کریمہ۔

وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینہما الآیۃ۔

اور آیت کریمہ

انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون ○ الآیۃ۔

کا مظہر ہو کر حضرت حسنؓ کی صلح پر حسب ارشاد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ختم ہو جاتا ہے اور وہ ارشاد نبوی یہ ہے۔

عن ابی بکرۃؓ قال رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المنبر والحسن بن علی الی جنبہ وھو یقبل علی الناس مرۃ وعلیہ اخری ویقول ان ابنی ھذا سید ولعل اللہ ان یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین رواہ البخاری (مشکوٰۃ ص ۵۶۹)

اور پھر صدیوں سارے عالم کا دار اسلام دار واحد تھا پھر دارالاسلام کا تعدد جو شروع ہوا ہے ان تمام تعدد والے دور کو مثل مشاجرات صحابہ رضوان اللہ علیہم کے دور کے مبنی براخلاص وغیرہ نہیں کہا جا سکتا۔

اور اگر کسی اختلاف سلطنت کی ابتدا مبنی بر اخلاص رہی بھی ہو تو پورے دور اختلاف کو ہرگز مثل مشاجرات صحابہ رضوان علیہم اجمعین کے مبنی بر اخلاص وغیرہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ چونکہ دار اسلام واحد کی نعمت خاص عطیہ خداوندی تھی کما اشار الیہ الحدیث۔ . . . . .

اور سنت اللہ بھی جاری اس طرح ہے کہ

ان اللہ لم یک مغیرا نعمۃ انعمہا علی قوم

حتی یغیروا ما بانفسہم ○ الآیۃ

اور اس طرح ہے

کما تکونوا یولی علیکم اوکما قال

وفی روایۃ اعمالکم عمالکم اوکما قال

اس قسم کی آیات و روایات سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ تعدد دار اسلام عموماً اپنے شامت اعمال یا سوء اتفاق یا سوء فہمی یا سوء تدبیر سے ہوا ہے۔

بہر حال جب ہو گیا تو اس دار کی بھی دلیل حصری کے مطابق وہی چار دار نہیں نکلیں گی جو دار غیر اسلام (دار الکفر) کی ہیں یعنی دار المحاربہ — دار الشر والفساد۔ دار المعاہدہ، دار الامن۔

اور ان دونوں دار کے (دارالمعاہدہ و دارالامن کے) احکام تقریباً یکساں ہی ہوں گے ، صرف معمولی اور ضمنی فرق ہوگا"۔

البتہ دونوں کے دارالمحاربہ اور دارالشروالفساد کے احکام میں بہت فرق ہوگا"۔ مثلاً دارالکفر کے دارالمحاربہ و دارالشروالفساد میں کسی کا مال معصوم ومتقوم وواجب الرد والضمان نہیں رہتا ـــــــ مگر دارالاسلام کی دونوں قسموں میں آپس کے عین محاربہ وفساد کی حالت میں بھی ہر فرد کا مال معصوم ومتقوم اور واجب الرد والضمان رہتا ہے ۔

جیساکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عمل

(وجعل سلاحہ للذی جاء بہ (الی قولہ)

حتیٰ وضعت الحرب اوزارها رده علی صاحبہ اھ

وصرح بہ فی قواعد الفقہ ص۱۱۱ ناقلاعن السیر

مال المسلمین لا یصیر غنیمۃ بحال

دونوں داروں کے احکام کی تفصیل کا موقع نہیں ہے صرف اشاروں پر اکتفا ہے ، اور دار غیر الاسلام کے چاروں قسموں کے اموال اور ان سے متعلق احکام کی بقدر ضرورت تفصیل ان شاء اللہ آئے گی ۔

ربوا کی تعریف اور اس کی شرعی حیثیت

ربوا کی شرعی تعریف :ـــــــ اموال ربویہ معصوم ومتقوم میں عقد معاوضہ کا معاملہ کیا جائے اور اس عقد میں کسی کی جانب کوئی شی عوض سے خالی اور زاید ہو تو یہ زیادتی "والفضل ربوا" میں داخل ہو کر شرعی ربوا (شرعی سود) کہلائے گی ، اور اس عقد کا نام عقد ربوا کہلائے گا. اور اس زیادتی کا لینا دینا دونوں حسب ضابطۂ شرع ممنوع وحرام رہے گا ۔

اس تعریف میں جتنی قیدیں ہیں سب احترازی ہیں ـــــــ پس اموال ربویہ سے مراد وہ اموال ہیں جن میں جنس وقدر میں اتحاد ہو ـــــــ اور معصوم ومتقوم سے مراد وہ اموال ہیں جن کا مالک کی اجازت کے بغیر لینا اور استعمال کرنا درست نہ ہو جیسے دارالامن اور دارالاسلام کے ہر قسم کے جائز اموال ـــــــ اور دارالمعاہدہ کے وہ اموال جو معاہدہ کے تحت ہوں ۔

بخلاف دار المحاربہ اور دار الشر والفساد میں حربی اور شر وفساد والوں کا مال جو مباح الاستعمال ہوتا ہے اور معصوم ومتقوم واجب الضمان نہیں ہوتا۔

اور عقد معاوضہ سے مراد وہ عقد ہے جس میں اموال کا ایک دوسرے سے تبادلہ ہو جیسا کہ عقد بیع وشرا میں اور شفعہ وہبہ بالعوض وغیرہ میں ہوتا ہے۔

اور معاملہ کیا جائے سے مراد وہ اعمال ہیں جن میں طرفین میں یعنی دو شخصوں کے درمیان میں لینے دینے کا عمل کیا جائے۔

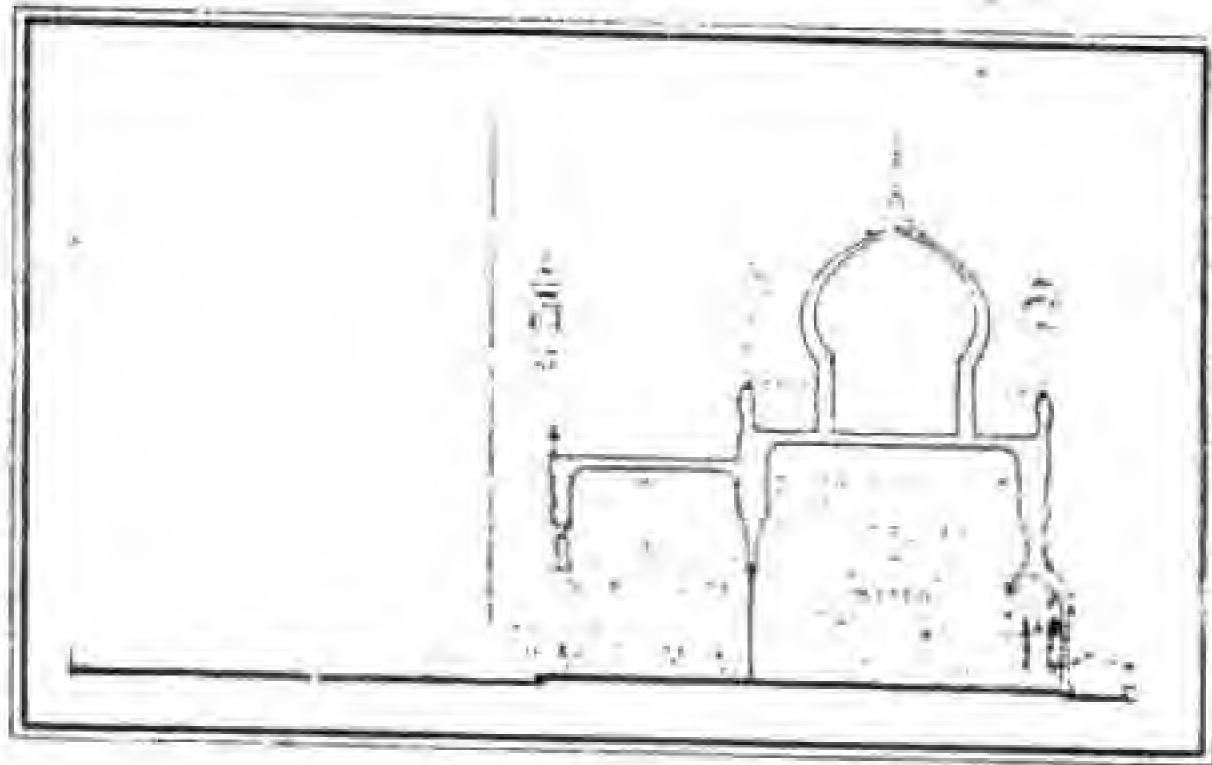
اس سے وہ اعمال نکل جائیں گے جن میں طرفین میں لینے دینے کا عمل نہ کیا جائے بلکہ کوئی شخص خود اپنی مرضی وخوشی سے بلا لحاظ معاملہ بطور عطیہ یا تبرعاً کچھ دیدے جیسا کہ دیے میں ہوتا ہے۔ یا کوئی شخص صدقہ وخیرات وغیرہ کردے وغیرہ وغیرہ کما فصلہ وحققہ حق التحقیق فی بدائع الصنائع ص۱۹۲ تا ۲۱۲ ج۵ وفی اعلاء السنن ص۲۲۳ تا ۲۲۶ ج۱۴۔

یہیں سے کتب فقہ کی اس عبارت (لا ربوا بین الحربی والمسلم المستامن فی دار الحرب (علی اختلاف العبارات) کا مفہوم بھی واضح ہو گیا کہ "الحربی" اور "المستامن" میں الف لام عہد کا ہے استغراق کا نہیں ہے اور اس سے صرف دار المحاربہ اور دار الشر والفساد کے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر قیود احترازیہ کے ضمن میں ابھی گذرا ہے۔

آیت کریمہ الم غلبت الروم فی ادنی الارض الخ کے نزول کے بعد حضرت صدیق رض کا بعض اہل مکہ سے مقامرہ کے قبیل کا معاملہ کر لینے سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے اس لئے کہ مکہ مکرمہ اس وقت بالیقین دار الشر والفساد تھا اور یہ واقعہ موضوع وغلط نہیں ہے بلکہ صحیح وثابت ہے نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر نکیر نہ کرنا بھی ثابت وصحیح ہے کما حققہ و برھنہ صاحب اعلاء السنن۔

پھر بھی چونکہ حرمت ربوا کا حکم بہت زیادہ تہدید آمیز ہے یہاں تک کہ حضرت امام ابو حنیفہ کا قول جس کو صاحب تفسیر مدارک نے نقل کیا ہے یہ ہے اخوف آیات القرآن عندی ایۃ الربوا او کما قال ——— نیز چونکہ حکم حرمت ربوا کے الفاظ عام ہیں۔ ائمہ ہدیٰ نے اس معاملہ پر بہت احتیاط برتی ہے اور فرماتے ہیں کہ لا ربوا بین حربی الخ کے حکم میں محض زیادتی لینے کی اجازت ہے زیادتی دینے کی اجازت نہیں ہے کما صرح بہ فی فتح القدیر قبیل باب الحقوق بقولہ فالظاھر ان الاباحۃ تفید

المسلم الزیادۃ وقد التزم الاصحاب فی الدرس ان مرادھم
من حل الربا والقمار ما اذا حصلت الزیادۃ للمسلم نظراً الی العلۃ وان
کان اطلاق الجواب خلافہ ۔ ۱۲
وھکذا فی عامۃ کتب الفقہ کالدر والرد وغیرھما۔
رہ گیا سود دینا اس کا حکم آگے سوال ۲ کے ضمن میں آئے گا۔



سوالنامہ ۲ سے متعلق جواب

۱ و ۲ و ۳ ——— ان تینوں نمبروں کا جواب تفصیل سے ۱ اور تمہید میں گذر چکا ہے یہاں ان سب کا اعادہ بے سود ہوگا۔

البتہ بعض زائد باتیں جو سوالنامہ میں ضمنی آگئی ہیں ان پر حسب ضرورت گفتگو ہوگی۔

ربوا کی شرعی حیثیت و حقیقت ربوا کی شرعی تعریف کے ضمن میں آچکی ہے اور اس کا دائرہ عمل و اثر دارالحرب کی چاروں قسموں میں سے صرف دو قسموں (دارالامن دارالمعاہدہ) کو اور دارالاسلام کی تمام قسموں کو عام و شامل ہے ان سب میں ربوا کا لینا دینا سب حرام رہے گا ——— باقی دارالحرب کی دو قسموں (دارالمحاربہ دارالشر والفساد) میں اس کا حکم جاری نہیں ہوتا ——— مزید تفصیل و دلیل سب سوالنامہ ۱ کے اندر گذر چکی ہے۔ وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔

اور بعض معاملات جو دیکھنے میں ربوا معلوم ہوتے ہیں مگر تتبع کے بعد ان کی حقیقت ربا ہونے کے بجائے کچھ اور نکلتی ہے۔ اس لئے ان کا حکم بھی ربوا کے حکم کے علاوہ کچھ اور نکل سکتا ہے ——— البتہ چونکہ شریعت مطہرہ نے ربو والریبہ ہر ایک سے روکا ہے اس لئے ان کا حکم اخذ کرنے میں غایت احتیاط اور نہایت بیدار مغزی سے کام لینا ہوگا ——— اور پورے اصول شرع پر حاوی ہو کر ہی ان کا حکم اخذ ہو سکتا ہے بلکہ اصول شرع پر مع جمع و فرق کے پوری طرح حاوی ہونے کے بعد اور جزئیات

فقہیہ پر فی الجملہ حاوی ہونے کے بعد سارے عالم کے ہر خطہ و ملک کے ہر معاملہ کا حکم شرعی جواز و عدم جواز کا برابر نکل سکتا ہے کما اشار الیہ قولہ تعالیٰ۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ○ الآیۃ۔

مثلاً ہندوستان اور ہندوستان جیسا ہر ملک جہاں اکثریت غیر مسلموں کی ہو۔ اور وہاں عوامی جمہوری حکومت قائم ہو۔ وہاں کا ہر فرد بلا لحاظ مذہب و ملت حکومت کے ساتھ معاہد کی حیثیت میں ہوتا ہے۔ اور وہ ملک دار الحرب کی ایک خاص قسم (دار المعاہدہ) کے درجہ میں شمار ہوتا ہے، اور وہاں کے احکام حدود شرع میں رہتے ہوئے جو معاہدہ کے مطابق ہوں جاری ہوتے ہیں۔

اور اسی اصل کے تحت وہاں کے سرکاری بینکوں کے ذریعہ کاروبار کرنے اور حکومت کی ترقیاتی و اقتصادی اسکیموں میں شریک ہونے اور ان اسکیموں کے تحت قرضہ لینے دینے سے متعلق شرعی احکام بھی مستنبط ہوتے ہیں۔

اس کی مزید تفصیل اگلے نمبروں کے جوابوں کے تحت انشاء اللہ آجائے گی۔"

سوال ۴ و ۱۰ کا جواب

بینک دو طرح کے ہوتے ہیں۔ جیساکہ سوال ۱۰ میں مذکور ہے۔ ان کے احکام یہ ہیں کہ جو بینک غیر سرکاری ہوں یعنی اس کے مالک افراد یا اشخاص یا سوسائٹی ہو تو اس میں جمع کردہ روپیہ پر جو رقم سود کے نام سے ملے اس کو وہاں سے نکال کر اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مسلم غرباء و مساکین کو جو مستحق زکوٰۃ ہوں ان کو بطور تصدق دیدے اور خود اپنے کسی کام میں نہ لائے اور اس کو دینے میں ثواب کی نیت نہ کرے۔

اور جو بینک سرکاری اور گورنمنٹ کے ہوں ان بینکوں میں جمع شدہ رقم پر جو پیسہ سود کے نام سے ملے اس کو بھی بینک میں نہ چھوڑے بلکہ وہاں سے نکال کر دیکھے۔ اگر اپنے اوپر سرکار و گورنمنٹ کا کوئی غیر شرعی ٹیکس لاگو ہو رہا ہو تو وہ رقم پہلے اس میں دے تاکہ ردالی رب المال ہو جائے پھر جو رقم بچے اس کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مسلم غرباء و مساکین کو جو مستحق زکوٰۃ ہوں ان کو بطور تصدق دے کر اپنے ملک سے نکال دے اور اس کو دینے میں ثواب کی نیت نہ کرے کیونکہ ایسے مال کے تصدق کرنے میں ثواب کی

نیت کرنے کو محققین فقہا، کفر تک فرماتے ہیں۔

اس حکم کے دلائل ـــــ حرام مال کے بارے میں جو احکام کتب فقہ میں اور بذل المجہود جلد ۱ ص۳۷ میں مذکور ہیں وہ کافی ہیں۔ اور مزید تحقیق و تفصیل اگر مطلوب ہو تو اعلاء السنن جلد ۱۴ وغیرہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

اور سرکاری بینکوں اور غیر سرکاری بینکوں سے سود کے نام پر ملنے والی رقوم میں ایک فرق تو یہی ہے جو ابھی مذکور ہوا ـــــ باقی اور فرق تو ہر واقعہ جزئیہ کی صورت سامنے ہونے کے بعد ہی واضح ہو سکتا ہے ـــــ اور احقر کے بہت سے فتاوی اس قسم کے جزئی واقعات پر شائع بھی ہو چکے ہیں ان سے بھی ان فروق پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

ع۵: ـــــ سود (ربوٰ) کی شرعی تعریف صادق آجانے کے بعد لینا دینا دونوں حرام ہو جائے گا۔ اور ساری دنیا کے غیر ربوا کہنے سے غیر ربوا (غیر سود) نہ کہا جائے گا۔

اسی طرح جب ربوا کی شرعی تعریف صادق نہ آئے تو اس کو حرام کہنا یا ربوا کہنا درست و جائز نہ رہے گا بلکہ اس کا لینا دینا دونوں درست رہے گا اسلامی ملک ہو یا غیر اسلامی ملک ہر جگہ یہی حکم ہو گا۔ اس میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔ البتہ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر سود معلوم ہوتے ہیں مگر تنقیح کے بعد اس کی حقیقت کچھ اور نکلتی ہے اس کے اندر یہ حکم جاری نہیں ہو گا بلکہ اس کے لینے دینے میں فرق پڑ سکتا ہے جیسا کہ سوال ع۱تا۴ کے تحت کچھ تفصیل گذر چکی ہے۔

ع۶: ـــــ سودی قرض لینے کی شریعت مطہرہ نے صرف اس وقت اجازت دی ہے جبکہ بغیر قرض لئے کام نہ چلے اور غیر سودی قرض نہ ملے، اور بغیر اس قرض کو لئے ہوئے ناقابل تحمل و برداشت تکلیف کا سامنا ہو معیشت باقی نہ رہے یا کاروبار معطل ہو جائے تو بوجہ مجبوری اور بقدر مجبوری سودی قرض لے لینے کی گنجائش ہو جائے گی جیسا کہ "الاشباہ والنظائر" کے اس جزئیہ (یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح) سے اور اس کی شرح حموی سے معلوم ہوتا ہے" البتہ ایسا قرض جہاں تک ہو سکے جلد سے جلد ادا کر کے سبکدوش ہو جانا لازم رہے گا اسی طرح جہاں تک ہو سکے اس سے بچنا بھی چاہئے۔

ع۷: ـــــ حکومت کے ترقیاتی اسکیموں میں اقتصادیات کی بحالی کے منصوبوں میں مسلمانوں کو بھی حدود شرع میں رہتے ہوئے برابر شریک ہونا چاہئے کما اشار الیہ

قولہٗ "واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم الایۃ" سے اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

پس اسی نیت سے حدود شرع میں رہتے ہوئے شرکت کی جائے۔ رہ گئی یہ بات کہ اس سلسلہ میں حکومت جو قرض لوگوں کو دیتی ہے تو اس قرض میں ہمیشہ سود ہونا شرعاً لازم نہیں آتا بلکہ اس میں تفصیل ہے اس لئے اس کے لینے دینے کے جواز وعدم جواز میں بھی تفصیل ہو گی۔ اور ہر جزئی کا حکم تنقیح کے بعد واضح ہوگا۔ اور اسی تنقیح کے مطابق جواز وعدم جواز کا جو حکم نکلے گا صحیح ہوگا۔

اس تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اس کا حکم عام سودی قرضوں کی طرح نہیں ہوگا بلکہ اس سے کچھ مختلف ہو گا" مثلاً کبھی بے روزگاروں کو باروزگار بنانے کے لئے حکومت کچھ رقم قرض دیتی ہے اور اس میں کچھ چھوٹ بھی دیتی ہے مثلاً چھتیس ۳۶ ہزار قرض دے کر ایک چھوتھائی نو ہزار چھوٹ دے کر صرف ستائیس ۲۷ ہزار قرض تسلیم کرکے ادائے گی شروع کرنے کے لئے مزید پانچ سال کی یا جو مدت مناسب ہوتی ہے اس کی مہلت دیتی ہے پھر اس مدت کے ختم ہونے کے بعد اوسی ستائیس ہزار پر کچھ سود کے نام سے زیادتی کرکے باقساط وصول کرتی ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ جبتک یہ کل ادائے گی کل یافتنی رقم (۳۶ ہزار) کے اندر اندر رہے گی وہ شرعاً سود شمار نہ ہوگی اور کسی غیر مسلم خواہ حکومت ہی کیوں نہ ہو اس کے سود کہنے سے اس کا سود ہونا لازم نہ آئے گا۔ اگر ۳۶ ہزار کی رقم پوری ہونے سے قبل ہی حسب مطالبہ حکومت ادائے گی مکمل ہوجائے گی تو ۳۶ ہزار میں سے باقی ماندہ رقم تبرع شمار ہوجانے کی وجہ سے سود لینا بھی لازم نہ آئے گا۔

اور مثلاً حکومت نے تعمیر کے لئے یا کاروبار وغیرہ کے لئے کوئی رقم یا کوئی سامان خود دیا یا کسی کارخانہ وغیرہ سے سستے داموں سے دلاکر خود اس کی قیمت اپنے خزانہ سے ادا کیا، مگر جس کام کے لئے دیا اس کی نگرانی کے لئے ایک عملہ مقرر کیا جو وقتاً فوقتاً نگرانی کرتا ہے کہ رقم اپنے کام میں صحیح طریقہ سے خرچ بھی ہوتی ہے یا نہیں نیز حسب ضرورت وہ عملہ مشورے بھی دیتا ہے کہ اس کام میں اس طرح خرچ کرو۔ نیز انھیں مصلحتوں سے کہ رقم ضائع نہ ہو حکومت بیک مشت ساری رقم نہیں دیتی بلکہ کام کا معاینہ کرنے کے بعد باقساط دیتی ہے تو اس صورت میں اپنی دی ہوئی رقم سے کچھ زاید رقم اگرچہ سود کے نام

سے وصول کرے مگر اس زیادتی کا کسی غیر مسلم حکومت یا فرد کے سود کہدینے سے شرعاً سود ہونا لازم نہ آئے گا جب تک سود کی شرعی تعریف صادق نہ آجائے، جیسا کہ ہم تمہید میں کہہ آئے ہیں اس لئے کہ سود شرعی لفظ ہے اور اس کا ایک شرعی معنی ہے نیز اس لئے کہ کوئی غیر مسلم ان احکام کا مکلف ہی قول راجح و محقق میں نہیں ہے کہ اس کے سود کہدینے سے اس کا سود ہونا لازم آجائے۔

بلکہ اصل دی ہوئی رقم پر ان تمام زیادتیوں کو شرعی تاویل سے اس عملہ کی اجرت و فیس بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اور اس زائد رقم کی وصولی کو ایک طریقہ ادائے گی اجرت قرار دے سکتے ہیں۔

ترقیاتی اسکیموں سے ملی ہوئی رقوم پر سود دینے کے جواز کے لئے یہ استدلال (کہ جمہوری حکومت کے خزانہ عامہ کی مالک اکثر) صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ملک کی اکائیوں کو صرف استحقاق ملک ہوتا ہے تحقق ملک نہیں ہوتا۔ استحقاق ملک اور چیز ہے اور تحقق ملک اور چیز ہے دونوں میں بون بعید ہے اور بڑا فرق ہے۔ اس کو اس طرح دیکھئے کہ زکوٰۃ وفطرہ اور رقوم واجبۃ التصدق غرباء و مساکین کے لئے ہی ہوتی ہیں اور وہی لوگ اس کے مستحق ہوتے ہیں مگر جب تک مالک نصاب (متفلین) ان مستحقین کو دے نہ دیں وہ مستحقین ملک اس دی ہوئی رقم کے مالک شمار نہیں ہوتے

پس معلوم ہو گیا کہ استحقاق ملک دوسری چیز ہے اور تحقق ملک دوسری چیز ہے۔ اور دونوں کے احکام بھی الگ الگ ہیں۔ اس لئے یہ قیاس صحیح نہ ہو گا۔ اور اس پر یہ حکم متفرع نہ ہو گا۔

اسی طرح رشوت دینے پر بھی اس دینے کو قیاس نہیں کر سکتے اس لئے کہ رشوت تو اپنے حق متحقق و مشخص کو حاصل کرنے سے مجبور ہونے کی صورت میں اور مانگنے اور طلب کرنے پر بھی نہ ملنے کی مجبوری میں دینے کی اجازت ہوتی ہے۔ اور بغیر اس مجبوری کے دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ فافترقا۔ فتدبر۔

ع۸ : ہاں اگر چھوٹ کا تناسب اس رقم کے مساوی ہے جس کو محکمہ سود کے نام سے لیتا ہے تو اس پر شرعاً سود دینے کا اطلاق نہ ہو گا۔ اور یہ دینا جائز رہے گا جیسا کہ حوالہ ع کے ضمن میں اور تمہید میں گذر چکا ہے۔

ع۹ : جن مجبوریوں میں سودی قرض لینے کی اجازت ہے انہیں مجبوریوں میں سود دیے کی بھی اجازت ہے۔ اس لئے کہ سودی قرض لینے کی ممانعت کیوجہ وہی سود دینا ہی ہے اور اس کی گفت گو جواب ع۶ میں گذر چکی ہے۔

اور جن مجبوریوں میں اپنے ملک کے اندر سود دینے کی گنجائش ہے اس سے زیادہ مجبوری غیر ممالک سے بذریعہ تجارت سود دینے میں ہے اس لئے کہ اگر سود دینے سے بچنے کیلئے غیر ممالک سے تجارت کرنا ہی بند کردیا جائے تو پوری قوم مسلم فی زمانہ مفلوج ومعطل ہوکر رہ جائے گی اور آیت کریمۂ "واعدوا لہم ما استطعتم الخ" کے بھی خلاف ہو جائے گا، اس لئے اس کی اجازت رہے گی۔

علاوہ ازیں فی زمانہ غیر ممالک سے کاروبار وتجارت کرنے میں پوری قوم مسلم اپنی معیشت کو برقرار رکھنے کے لئے مضطر ہے۔

اور اضطرار دو قسم کا ہوتا ہے ایک اضطرار انفرادی وشخصی۔ اور ایک اضطرار اجتماعی وقومی۔ پس جس طرح "ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" اضطرار شخصی وانفرادی میں سودی قرض لیکر سود دینے یا اسی طرح اضطرار اجتماعی وقومی میں بھی سودی قرض لینے یا سود دینے یا سودی معاملہ بوجہ اضطرار کرنے کی گنجائش رہے گی۔

رہ گیا سود ملنے یا لینے کی گنجائش کا معاملہ اس کا حکم تو سوال ع۱ میں "لا ربوا بین الحربی والمسلم" کے تحت مفصل و مدلل گذر چکا ہے کہ اس کی گنجائش رہے گی۔

ع۱۰ : ـــــ اس نمبر کا جواب بضمن جواب ع۸ گذر چکا ہے۔

ع۱۱ : ـــــ ان افراد یا کمپنیوں سے ایسا معاملہ یا کاروبار کرنا جس میں سود دینا پڑے بغیر ایسی شدید مجبوری کے گنجائش نہیں ہوگی کہ بغیر اس معاملہ یا کاروبار کے معیشت باقی نہ رکھ سکے جیسا کہ جواب ع۶ وتمہید کے ضمن میں بدلائل اس کا بیان گذر چکا ہے۔

ہاں ایسی مذکورہ شدید مجبوریوں کے اگر معاملہ یا کاروبار کرے تو حکم میں یہ تفصیل ہوگی۔ اگر وہ افراد یا کمپنیاں محض مسلمانوں کی ہوں تو جس قدر رقم سود کی ملے اس کو کسی نہ کسی طرح عیاناً واپس کردے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو یا مضر ہونے کا اندیشہ ہو تو کسی حیلہ سے خواہ مخفی طور پر ہو ان کی ملک میں پہونچا دے۔

اور اگر وہ افراد یا کمپنیاں محض مسلمانوں کی نہ ہوں۔ تو جس قدر رقم سود کی ملے اس کو واپس نہ کرے بلکہ اس کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مسلم غرباء ومساکین کو بلا

جلد دے کر اپنی ملک سے نکال دے ۔

یا پھر ان افراد یا کمپنیوں سے شرکت عنان کا معاملہ کر کے کاروبار کرے تو اس صورت میں سود لینے وغیرہ کا قصہ آنا لازم نہ رہے گا۔ کما حققہ العلامۃ التھانوی نور اللہ مرقدہ فی فتاواہ (التحقیق السنی فی حصص کمپنی)

پھر اگر بینکوں سے سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے میں مذکورہ پریشانیاں پیش آتی ہوں تو اپنی صوابدید سے مذکورہ تفصیل کے ساتھ ان افراد وغیرہ سے بھی سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے میں مضائقہ نہ ہوگا۔



ضمیمہ ع ۲ سے متعلق جوابات

(۱) اگر حصول اراضی قانون کے مطابق حکومت جب چاہتی ہے کسی بھی جائداد غیر منقولہ کو مفاد عامہ کے ماتحت ان کے مالکوں کی مرضی کے بغیر خود اس کی ایک قیمت مقرر کر کے اپنے قبضہ میں کر لیتی ہے" ہاں اتنی مہربانی کرتی ہے کہ اگر مالکوں کے نزدیک وہ قیمت کم ہو تو عدالت سے قیمت تشخیص کرائیں لیکن دینے میں مالکان مجبور ہی ہوتے ہیں انکار نہیں کر سکتے۔

پھر اگر عدالت اس کی قیمت کچھ زیادہ تشخیص کر دے جب بھی مالکان دینے سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس فیصلۂ عدالت کے مطابق قیمت لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور اگر چہ اس فیصلہ میں جو دو تین سال کی تاخیر ہو جائے اور حکومت اس تاخیر کی وجہ سے کچھ رقم بنام سود دے جب بھی ظاہر ہے کہ مالکان جائداد کی مرضی کو اس معاملہ میں دخل نہیں ہوتا تو اس زائد رقم دینے پر سود کی شرعی تعریف صادق نہیں آسکتی جیسا کہ تمہید میں سود کی شرعی تعریف سے واضح ہے۔ بلکہ یہ زاید دینا منجانب حکومت عطیہ کے حکم میں ہوگا۔ اور چھ فیصد یا کسی بھی فیصد سے دے یہ دینا عطیہ دینے کا ایک قانون و نظم قرار پائے گا۔ لہذا اس زیادتی کا لینا اصل قیمت کے لینے کی طرح جائز اور مباح رہے گا۔

لہذا ضمیمہ کے اس نمبر میں جتنی تاویلیں مذکور ہیں ان میں سے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) اس نمبر کے اندر ذکر کردہ تاویلات کی قطعاً حاجت نہیں ہے بلکہ سوالنامہ ۲ میں ذکر کردہ تاویل کے مطابق اس زیادتی کو عملہ کی اجرت قرار دیا جائے گا اور اس کا دینا جائز گردانا جائے گا۔

(۳) جب یہ کارپوریشن تجارتی ادارہ ہے اور حصص فروخت کرکے اکٹھا شدہ سرمایہ سے اور مشترک سرمایہ سے اپنا کاروبار کرتا ہے تو یہ معاملہ اور کاروبار شرکت عنان کے قبیل کا ہوگیا۔ اور سال ختم ہونے پر سال بھر کے نفع ونقصان کا میزانیہ تیار کرنا یہ بھی اس کاروبار کے شرکت عنان ہونے کا قرینہ ہے۔

لہٰذا یہ کاروبار عقد مضاربہ کے قبیل کا ہوگا ہی نہیں۔ پس اس کو عقد مضاربہ قرار دینا یا عقد مضاربہ کی قبیل میں داخل کرکے شریک وغیرہ ہونا مبنی بر غلط ہوگا، اور فرق بین العقود سے ناواقفیت کی وجہ سے ہوگا۔ بلکہ اس کا حکم وہی ہوگا جو مبنی بر شرکت کمپنیوں کا ہوتا ہے جس کی جانب احقر سوالنامہ ۱ وغیرہ میں التحقیق السنی فی حصص کمپنی کے حوالہ سے اشارہ کرچکا ہے۔

اور مبنی بر شرکت کمپنیوں میں جس طرح حصہ ونفع لینا جائز ہے اوسی طرح اس میں بھی حصہ اور نفع لینا جائز رہے گا۔

(۴) فوجی محمد یونس کو حکومت جو زائد رقم چھ فیصد کے حساب سے دیتی ہے اس کو حکومت بطور خود دیتی ہے، اس دینے میں محمد یونس سے کوئی معاملہ نہیں کرتی۔ محمد یونس کا مطالبہ تو صرف اس رقم کا تھا جو حکومت پر اس کے ضابطہ کے مطابق واجب الادا تھی۔ اور وہ وصول نہیں ہورہی تھی۔

لہٰذا اس زاید حاصل شدہ رقم پر سود کی شرعی تعریف صادق نہیں آتی سود کی شرعی تعریف جو تمہید میں بیان ہوچکی ہے اس کو دیکھ لیا جائے۔

اس لئے اس زاید رقم کو ضمیمہ ۱ کے اندر زاید ملی ہوئی رقم کی طرح شرعاً عطیہ کہیں گے اور جائز وحلال کہیں گے۔

اگر کسی اسلامی حکومت میں اس طرح کا معاملہ پیش آئے، اور قاضی وقت ایسی زاید رقم سود کے نام سے دے تو شرعاً وہ زاید رقم عطیہ ہی شمار ہوکر جائز الاخذ والاستعمال ہوگی۔ اور یہ تعبیر (بنام سود) اس قاضی کے شرعی علوم سے ناواقفیت کی وجہ سے ہوگی۔ فقط

ربوا کی شرعی حقیقت

از ——— محمد عبید اللہ الاسعدی ——— الجامعۃ العربیہ ھتورا، باندہ۔

مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں "قرآن حکیم میں جس چیز کو بلفظ "ربا" حرام قرار دیا گیا ہے اس کا ترجمہ اردو زبان میں تنگ دامنی کے باعث عام طور سے لفظ "سود" کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ "ربا" اور سود دونوں عربی اور اردو ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ لیکن حقیقتہً یہ نہیں مروجہ سود عربی ربا کی ایک قسم یا فرد کی حیثیت میں ہے مروجہ سود ایک معین مقدار روپیہ متعین میعاد کے لیے ادھار دیکر معین شرح کے ساتھ نفع یا زیادتی لینے کا نام ہے بلاشبہ یہ بھی ربا کی تعریف میں داخل ہے مگر ربا اس میں منحصر نہیں ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عموماً ربوا صرف اس کو کہتے تھے اور سمجھتے جیسے آج سود کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربا کے معنی کی وسعت بیان کرکے بہت سی ایسی صورتوں کو بھی ربا قرار دیا ہے۔ جن میں ادھار کا معاملہ نہیں ہے۔ آپ نے آیات کی تشریح کرتے ہوئے ربا کے جو معنی بیان کئے ان میں ایک قسم کا اضافہ تھا جس کو پہلے سے عرب میں ربا کے اندر داخل نہ سمجھا جاتا تھا اسی لئے عام طور سے علماء نے لکھا ہے کہ ربا کی دو قسمیں ہیں" [۱]

ہمارے فقہاء نے رباشرعی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ ھوالفضل المستحق لاحد المتعاقدین فی المعاوضۃ الخالی عن عوض مشروط فیہ [۲]

اسی سے ملتے جلتے الفاظ دوسری کتابوں میں بھی ہیں اسی کے قریب الفاظ احکام القرآن لابن العربی احکام للجصاص، نہایہ ابن اثیر وغیرہ میں بھی ہیں۔

حاصل یہ نکلتا ہے کہ سود کی شرعی حقیقت ہے "آپس میں ہونے والے مالی لین دین کے معاملات میں ایک طرف سے پیش کیا جانے والا مال کا وہ حصہ جس کے مقابلہ میں دوسری طرف سے مال کا کوئی حصہ نہ ہو اور یہ قدر زائد معاملہ میں مشروط بھی ہو"۔

یعنی رباشرعی کے تحقق کے لئے چند امور ضروری ہیں۔

---

[۱] مسئلہ سود ص ۱۳ تا ۱۵ [۲] ہدایہ ج ۳، ص ۶۰، مجمع الانہر ج ۲ ص ۸۲ عنایہ علی ہامش الفتح ج ۵، ص ۲۷۳ احکام الجصاص ج ۱، ص ۵۵۱

اولاً : باہمی معاملہ جانبین سے مال کا ہو۔ یعنی ایسی صورت نہیں کہ جس میں ایک طرف سے مال دیا جانے والا ہو جیسے کرایہ وغیرہ کا معاملہ بلکہ اس کے لئے خرید و فروخت کا معاملہ یا قرض کا معاملہ درکار ہے کہ ان دونوں میں دونوں طرف سے مال کا لین دین ہوتا ہے۔

دوم : معاملہ میں ایک طرف سے پیش کیا جانے والا مال دوسری جانب کی مقدار سے زائد ہو کہ اس کے مقابلہ میں مال کا کوئی حصہ نہ ہو حقیقۃً و حساً یا حکماً سہی جیسے کہ فقہاء سونے چاندی وغیرہ کی باہمی ادھار فروخت میں مانتے ہیں۔

سوم : ایک طرف سے پیش کی جانے والی زائد مقدار کی معاملہ کی گفتگو میں شرط ہوئی ہو۔ اس لئے اگر ایک آدمی نے دوسرے سے سو روپئے قرض کا معاملہ کیا تو دوسری طرف سے بھی اسے واپس میں سو روپیہ ملے گا۔ اب واپسی میں اگر سو روپے کے ساتھ دس بڑھا دیئے گئے تو ایک طرف کا مال دوسرے طرف کے مال سے زائد ہے کہ اس کے مقابلہ میں سو کے آگے کچھ نہیں ہے۔ اب اگر یہ دس زائد کی باہم شرط ہوئی ہو تو یہ دس ربا و سود ہے ورنہ اگر پہلے نے دوسرے کو ہبۃً مثلاً کسی وقت سو روپئے دیئے۔ دوسرے نے کسی دوسرے وقت جواب میں اس کو دوسو روپئے دیئے یا قرض ادا کرنے والے نے بوقت ادائیگی بغیر سابقہ شرط کے سو کے سوا سو کر دیئے تو پہلے کی طرف سے دیئے جانے والے مال پر ملنے والی زائد مقدار سود نہیں کہلائے گی۔

اس تفصیل کے مطابق حکومت کے مروج "رعایتی قرض" جس میں قرضدار سے ایک حصہ کی معافی کے بعد باقی کی واپسی مطلوب ہوتی ہے اس تفصیل کے ساتھ کہ اگر متعینہ مدت تک باقی رقم ادا کر دے تو معافی سے فائدہ اٹھائے گا ورنہ پھر باقی پر اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہ قرضے بظاہر اس وقت تک "سود" کی حد میں نہیں داخل ہوں گے جب تک کہ قرضدار کی طرف سے واپس کی جانے والی رقم اصل لی ہوئی رقم سے زیادہ نہ ہو۔ چنانچہ مفتی نظام الدین صاحب اعظمی نے متعدد فتاویٰ میں اسی بنیاد پر ایسے قرض کی اجازت دی ہے ملاحظہ ہو[۱]

شرائط ربوا

صاحب بدائع نے ربا کے پائے جانے کے جو شرائط ذکر کئے ہیں ان میں دو شرطیں یہ ذکر کی ہیں۔ ۱۔ بدلین کا معصوم ہونا۔ ۲۔ متقوم ہونا[۲]

اول کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ کرنے والے دونوں اشخاص کی طرف سے مال معصوم ہونا چاہئے یعنی ایسا کہ ایک دوسرے کو بغیر دوسرے کی رضا اس کے لینے کا حق نہ ہو۔ اور دوم کا مطلب یہ ہے کہ شریعت اس کی حیثیت کو یوں تسلیم کرتی ہو کہ اس کے ضائع کر دینے پر ضمان واجب کرتی ہو۔

---

۱ نظام الفتاویٰ ج ۱ ص ۲۵۵ و ۲۶۹ ۲ بدائع ج ۵ ص ۱۹۲۔

اوّل کے مفقود ہونے کی وجہ سے دار الحرب کے کافر اور مسلمان کے درمیان سود کا اعتبار نہیں اور سودی معاملہ کا جواز ہے اس لئے کہ حربی کا مال مسلمان کے حق میں "مباح" ہے جس طرح چاہے وہ اس پر قبضہ کرسکتا ہے حتیٰ کہ اس کی رضا کے بغیر بھی اور چوری کرکے بھی۔

اور دوسری شرط پر یہ صورت متفرع ہے کہ اگر کوئی مسلمان دار الحرب میں ہی اسلام لانے والے (سابق کافر حربی) سودی معاملہ کرے تو درست ہے، اس لئے کہ اس نومسلم کا مال (متقوم) یعنی قابل ضمان نہیں ہوتا۔ خود اس کی جان چلی جانے پر ضمان نہیں ہے۔

یہ جزئیات فقہ حنفی کی کتابوں میں عموماً مذکور ہیں اور نہ صرف سود کا معاملہ بلکہ مختلف فاسد معاملات بھی روا ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ جزئیات اور ان کے اصول و شرائط طرفین کے مشہور قول پر مبنی ہیں کہ دار الحرب کے باشندوں کے معاملات میں ربا کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اگرچہ پہلی ہی صورت ان دونوں کے نزدیک درست ہے۔ دوسری و تیسری تو صرف امام صاحب کے نزدیک درست ہے۔

اس لئے اس شق و سوال کا جواب دراصل حضرات طرفین کے قول کی تحقیق پر مبنی ہے۔

(ب) دار الحرب میں جواز سود سے متعلق طرفین کا قول

احقر نے کسی زمانے میں اس سلسلہ میں ایک مبسوط تحریر تیار کی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے۔

اوّلاً: یہ کہ حضرات طرفین کا یہ قول اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہے بلکہ اکابر نے اس کی توجیہ فرمائی ہے۔ مولانا یعقوب صاحب نے فرمایا کہ مطلب صرف یہ ہے کہ امام المسلمین ایسے شخص سے تعرض نہ کرے گا۔ حضرت مولانا قاسم صاحب نے فرمایا کہ جواز کے لئے دار الاسلام میں منتقل کرکے لیجانا ضروری ہے۔ یا پھر یہ کہ نفس معاملہ تو جائز نہیں، ہاں حاصل کردہ مال مباح ہوگا۔ اگرچہ حضرت تھانوی نے ان ساری توجیہات کو ذکر کرنے کے ساتھ رد بھی فرمایا ہے۔[1]

ثانیاً: اگر اس کو ظاہر پر رکھا جائے تو تحقیق مسائل کا جو قاعدہ ہے حتیٰ کہ خود حنفی اصول افتاء کے مطابق صورت یہ ہے کہ ایک طرف نقہاء و مجتہدین کا سواد اعظم، دلائل کی قطعیت اور قوت و صراحت ہے، سود سے متعلق وعیدیں آخرت کی سزائیں حتیٰ کہ ذمیوں کے لئے بھی ممانعت ہے۔ دوسری طرف حضرات طرفین اور بعض تابعین اور دلائل حرمت کی حیثیت کے نہیں، یوں بھی مسئلہ حلت و حرمت کا ہے۔ اور معروف قاعدہ ہے کہ مبیح و محرم اور حلت و حرمت کے درمیان تعارض کی صورت میں بربنا ر احتیاط بھی محرم و حرمت کو ترجیح دی جاتی

---

[1] ملاحظہ ہو تحذیر الاخوان، رافع الضنک، امداد الفتاوی، فتاوی محمودیہ میں بھی ایسی توجیہات کا ذکر ہے۔ ج ۳ ص ۲۳۸، ۲۳۹۔

ہے۔ اسی لیے اگرچہ یہ مسئلہ فقہ حنفی کے اصل متوں میں جواز کی تعبیر و رسلوب میں ہی ذکر کیا گیا ہے۔ بلکہ صاحب مبسوط و صاحب بدائع وغیرہ کی توجیہات و تفصیلات بھی اسی کے مطابق ہیں۔ مگر اکابر علماء دیوبند کا عام میلان یا آخری میلان عدم جواز و حرمت کی طرف ہی رہا ہے۔ حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب حضرت تھانوی، مفتی محمد شفیع صاحب۔ اور آخر میں استاذی مفتی محمود حسن صاحب، مفتی نظام الدین صاحب مفتی عبدالرحیم صاحب وغیرہ سب نے انہیں وجوہ کی بنا پر حرمت کے قول کو اختیار کیا ہے۔[۱]

جواز کے سلسلہ میں شاہ عبدالعزیز صاحب کا نیز قاضی ثناء اللہ صاحب کا فتویٰ معروف ہے[۲] مولانا عبدالحی صاحب بھی اسی رائے پر ہیں[۳] حضرت گنگوہی کے متعلق مشافہۃً ایسا سنا ہے۔ تحریر میں نہیں ملا۔ مولانا ظفر احمد صاحب اعلاء السنن کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ اگرچہ مولانا کا معاملہ یہ ہے کہ مولانا نے روایۃً و درایۃً طرفین کے مذہب کو قوی قرار ثابت کرتے رہتے ہوئے بھی کہا ہے کہ احوط اکابر کی ہی رائے ہے پھر ہندوستان کے حق میں تو وہ جواز کے قائل نہیں اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہند اگر دارالحرب ہے تو صاحبین کے قول پر اور جواز ہے امام صاحب کے نزدیک یہ تلفیق ہے جو کہ ممنوع ہے[۴] مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب کا ایک مبسوط اور پر زور مضمون اس کے جواز پر ہے[۵] اور اخیر میں مکرمی مولانا اسحٰق صاحب سندیلوی سابق مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اس مسئلہ کے مجتہد فیہ ہونے کی وجہ سے گنجائش کا ذکر کیا ہے۔ جیسے کہ مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کے قیام مظاہر علوم وغیرہ کے زمانے کے فتاویٰ میں بھی آیا ہے[۶]

اگرچہ میں نے اوپر جس رائے کا ذکر کیا ہے وہ قیام دارالعلوم کے عہد کے فتویٰ سے ماخوذ ہے۔

حضرت تھانوی فرماتے ہیں "سود کا جائز ہونا جی کو نہیں لگتا۔ دوسرے اگر ہو بھی سہی تو اجازت میں عوام کے لیے بہت بڑا فتنہ ہے کیونکہ ان میں قیاس فاسد کا مادہ بہت ہوتا ہے کیا عجب ہے کہ تھوڑے دن میں یہ قیاس کرنے لگیں کہ زنا بھی کافر سے جائز ہے۔ اس طرح سے کہ اول مقدمہ تو یہ ہو کہ سود اور زنا میں فرق نہیں۔ دوسرا مقدمہ ہے سود کافر سے حلال ہے۔ پس ان دونوں مقدموں کا نتیجہ ہے کہ زنا بھی کافر

---

۲۰۲ - ۲۵۲ - ج ۱، ص ۲۹۵۔

[۱] فتاویٰ رشیدیہ ص ۵۰۵۔ امداد الفتاویٰ ج ۳، ص ۱۱۳۔ عزیز الفتاویٰ ج ۰۰۸، ص ۳۰۰۔ ۲۶۔ فتاویٰ محمودیہ ج ۳، ص ۲۳۹، ۲۴۰، ۲ و نظام الفتاویٰ ج ۱، ص ۲۵۶ و ۲۹۶۔ فتاویٰ رحیمیہ ج ۳، ص ۱۰۳۔ [۲] فتاویٰ عزیزیہ (اردو) ص ۱۰۵ تا ۱۰۶ [۳] مجموعۃ الفتاویٰ ج ۲، ص ۱۳۱، ۱۴۸، ۱۵۱/۱۵۲ [۴] اعلاء السنن ج ۱۴، ص ۳۶۹ و ۳۷۰۔ [۵] مضمون گیلانی شامل سود از مودودی ترتیب جدید۔ [۶] فتاویٰ محمودیہ ج ۳، ص ۱۹۸۔

سے حلال ہے [1]

تیسری بات یہ کہ قائلین جواز کے نزدیک یہ قید لگی ہے کہ جواز صرف اس مسلمان کے حق میں ہے جو دارالاسلام کا باشندہ ہو اور اپنی کسی ضرورت سے امان لیکر دارالحرب میں آیا ہو۔ باقی جو شخص دارالحرب کا مستقل باشندہ ہو اس کے حق میں یہ جواز نہیں ہے آج کل جو سوال اٹھ رہا ہے وہ دوسری قسم کے مسلمانوں کے حق میں ہے۔ دارالحرب سے متعلق تیسری صورت یعنی دارالحرب میں اسلام لانے والے اور وہاں سے ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں کے درمیان سود کا جواز صرف امام صاحب کے نزدیک ہے۔ امام محمد کے نزدیک بھی نہیں دوسرے یہ کہ یہ صورت بھی صادق نہیں آتی اس لیے کہ دارالحرب میں مستقل سکونت رکھنے والے مسلمان یا تو ایسے ہیں کہ ان کے آباؤاجداد دوسرے ملکوں سے بحالت اسلام یہاں آئے یا ان کے آباؤاجداد کئی پشت پہلے اسلامی عہد میں مسلمان ہو چکے تھے۔ لہٰذا یہ مسلمان کسی طرح جواز کا مصداق نہیں بن سکتے۔ اب اس کے بعد ملک کے ہندو باشندے ہیں جو پہلے ذمی تھے۔ اب حربی کہلائیں گے اور یا انقلاب کے بعد اسلام لانے والے تو امتیاز کہاں تک و کیسے ہوگا [2]

جواز کی قید کے ہی سلسلہ کی کڑی یہ ہے کہ جواز ہر کافر سے اور ہر دارالکفر میں نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب دارالحرب میں امان لیکر جانے کی صورت میں اس کا پابند بنایا جاتا ہے معاملہ کرکے ہی کچھ لیا جائے اگرچہ معاملہ غلط ہو ورنہ عہد شکنی لازم آئے گی۔ حالانکہ ان سے ہماری جنگ ہے تو جس دارالکفر سے ہماری جنگ نہیں یعنی جو دارالحرب نہیں ہے کہ ہر دارالکفر دارالحرب نہیں ہوتا اور ہر کافر حربی نہیں ہوتا۔ ایسے دارالکفر میں اس قسم کا معاملہ جائز نہ ہوگا۔ اس لئے کہ ان سے ہمارا امن و امان اور صلح و مسالمت کا فی الجملہ معاملہ ہوتا ہے اور کتابوں کی عبارتیں اور مسئلہ کی تصریحات بھی اس کی تائید کرتی ہیں مودودی صاحب نے جو مولانا گیلانی کا تعقب لکھا ہے اس میں بار بار اس کی وضاحت کی ہے اور اس کو مدلل کیا ہے [3]۔ بات سمجھ میں بھی آتی ہے۔ دیکھئے کہ عام دارالکفر کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر باہم معاہدہ نہیں بھی ہے تو بھی اگر پہلے سے دعوت اسلام و اعلان جنگ کے بغیر ان پر مسلمان حملہ کردیں اور ان کی جان و مال ضائع کردیں تو اگرچہ ضمان تو نہیں ہے مگر گناہ ہوگا [4]۔ اسی طرح دارالحرب کے اندر رہنے والے دو مسلمان ایک دوسرے کا نقصان کریں تو ضمان نہ ہوتے ہوئے گناہ ضرور ہوگا [5]

---

[1] حسن العزیز ج ۱۔ حصہ ۳۔ ص ۹۳ [2] جواز کی شرطوں کے لیے ملاحظہ ہوں حضرت تھانوی کا رسالہ رافع الضنک، امداد الفتاویٰ ج ۳۔ ص ۱۱۲۔ تحذیر الاخوان ص ۹، وغیرہ [3] سود ترتیب جدید ص ۳۰۲ — ۳۰۶ — ۳۰۷ — ۳۰۹، وغیرہ [4] المبسوط ج ۱۰، ص ۳۰۔

[5] ″ ج ۱۳، ص ۵۸۔

دارالحرب و دارالاسلام "دارالحرب اور دارالاسلام" کیا تھا ۔ اس سلسلہ میں فقہ حنفی کی کتابوں میں خود ائمہ احناف کا اختلاف منقول ہے اسلئے فقہاء حق کہ ہمارے فقہاء ہند بھی دو گروہ ہو ں میں ہیں ۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا میں دو ہی بنیادی مذہب ہیں اسلام، کفر یعنی اللہ کا نازل کردہ آخری دین اور کفر یعنی دین محمدی کے ماسوا تمام ادیان و مذاہب خواہ ان کا کچھ نام ہو "لان الکفر ملۃ واحدۃ" اس لئے انسان بھی صرف دو قوموں میں منقسم ہیں مسلمان، اور کافر یعنی دین محمدی پر ایمان نہ رکھنے والے خواہ وہ کسی دین و مذہب کو مانتے ہوں ۔

اس لئے (دار) بھی دو ہی بنتے ہیں ۔ دارالاسلام ۔ دارالکفر

دارالاسلام وہ ملک اور خطہ زمین جس میں اسلام کا بایں معنیٰ بول بالا ہو کہ اس کا اقتدار اس کی حکمرانی ہو اور اس کے پیش کردہ احکام و قوانین پر اس ملک کے حکومت کی اساس و بنیاد ہو ۔ اور دارالکفر جس میں کفر کا بایں معنیٰ بول بالا ہو کہ اس میں شریعت محمدی کے قوانین و احکام کے بجائے دوسرے قوانین اور نظام اسلام کے بجائے دوسرا نظام رائج و نافذ ہو ۔ دارالحرب اور دارالامن دراصل اسی "دارالکفر" کے نام ہیں، عوارض کے اعتبار سے کہ اگر اس ملک نے مسلمانوں سے جنگ چھیڑ رکھی ہے تو وہ دارالحرب ہے اور اگر اس نے مسلمانوں سے امن وامان کا معاملہ کر رکھا ہے تو دارالکفر ہو کر بھی دارالامن ہے ۔ جیسے کہ کبھی کسی ملک کو اقتدار اعلیٰ کافروں کے ہاتھ میں ہونے کے باوجود اس لئے "دارالاسلام" کہہ دیا گیا یا کہہ دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے نظام و احکام کے لئے اس کا معاملہ دارالاسلام کا سا ہی ہوتا ہے کہ سیاسی نظم و انتظام ہے کفر کا مگر ان کے جملہ معاملات ان کے علماء و قضاۃ کے زیر سایہ اسی طرح شریعت محمدیہ کے مطابق انجام پاتے ہیں جیسے کہ خود ان کی اپنی حکومت میں ۔

میرے خیال سے تو سابقہ تفصیل کے بعد "دار" کی کوئی تیسری قسم نہیں بنتی اور کم از کم ایسے "جمہوری ملک" جس کے نظام و آئین میں قرآن و سنت کی اساسی حیثیت کیا سرے سے کوئی حیثیت نہیں ہے اور وہاں جو قانون پاس ہوتا ہے اپنے اور دوسروں کے تجربہ اور محض اپنی عقل و فکر کی بنیادوں پر وہ سب دارالکفر ہی ہیں ۔ خواہ ان کے حالات کی بنا پر ان کو جو کہا جائے اور ان کے منشور و دستور میں جو بھی رعایتیں و آزادیاں مذکور ہوں، اس لیے کہ ایسے ملکوں میں کفر کا ہی بول بالا اور عموماً اہل کفر کے لیے ہی اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے ۔ باقی سب سیاسی مصلحتیں ہوتی ہیں ۔

اگر انگریزی اقتدار کا ہندوستان علماء محققین کی جماعت کے نزدیک دارالحرب ہو سکتا ہے ۔ جس نے حسب سابق نظام تھا کو ۔ ق ۔ کھنے کی سعی و کوشش کی تھی اور گرفت و پکڑ ان کی ہی کی تھی جن کو باغی ثابت کیا تھا ۔ تو وہ اقتدار جس میں دستور کی تمام تر رعایتوں کے باوجود شریعت محمدیہ کے خلاف مسلمانوں کے حق میں کوئی بھی قانون و تجویز پاس ہونے کے امکانات بلکہ واقعات ہیں ۔ اس کو اس زمرہ میں شامل کرنے میں کیا تامل ہو سکتا ہے ۔

مالٹا میں حضرت شیخ الہند سے سوال کیا گیا کہ "ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام ہے ؟" حضرت نے فرمایا علماء کا اختلاف ہے۔ سوال کیا گیا آپ کی رائے ؟ فرمایا میرے نزدیک دونوں صحیح کہتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ دارالحرب دو معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور حقیقت میں یہ دونوں اس کے درجات ہیں جن کے احکام جدا جدا ہیں ایک معنی کی حیثیت سے اس کو دارالحرب کہہ سکتے ہیں۔ اور دوسرے کے اعتبار سے نہیں — فرمایا دارالحرب اس ملک کو کہتے ہیں جس میں کافروں کی حکومت ہو اور وہ اس قدر با اقتدار ہوں کہ جو حکم چاہیں جاری کریں۔ مسٹر برن نے کہا کہ یہ بات تو ہند میں ہے، فرمایا اسی لئے ہندوستان دارالحرب ہے۔ اور دوسرے معنیٰ میں جس ملک میں اعلانیہ طور پر شعائر اسلام اور احکام اسلامیہ کے ادا کرنے کی ممانعت کی جاتی ہو وہ دارالحرب ہے۔ (اور اس سے ہجرت واجب ہے اگر استطاعت اصلاح نہ ہو) اس نے کہا یہ بات تو ہند میں نہیں فرمایا "احتراز کرنے والوں نے والوں نے غالباً اسی کا لحاظ کیا ہے" ۔[1]

کافی میں ہے۔ "دارالاسلام سے مراد وہ ملک ہے جس میں امام المسلمین کا حکم چلتا ہو اور وہ اس کے زیر اقتدار ہو" ۔[2]

جامع الرموز میں اس کے ساتھ مزید ہے "دارالحرب وہ ملک ہے جس میں مسلمان کافروں سے خوف محسوس کرتے ہوں" ۔[3]

شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں احکام کفر کے جاری کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ملکی مسائل رعایا کے انتظام خراج وعشر کی تحصیل، تجارت وسیاست چوری و ڈکیتی باہمی مقدمات کے فیصلوں نیز جرائم کی سزا میں کفار پورے طور پر حاکم ہوں ۔[4]

اور حضرت گنگوہی فرماتے ہیں کفار اپنا حکم علی الاستہار جاری کردیں کوئی خدشہ ان کو اور کوئی مانع نہ رہے تو دارالاسلام مغلوب ہو جائے گا اور قیاس بھی اسی کو چاہتا ہے کہ غلبہ اس کا ہی عنام ہے کہ اپنا حکم جاری کریں تو کوئی مانع نہ رہے ۔[5]

اس سلسلہ میں نظام الفتاویٰ میں آئی ہوئی تفصیل لائق مطالعہ ہے ۔[6]

اس میں آیا ہے وہ مملکت جہاں مسلمانوں کو یہ اقتدار حاصل نہ ہو خواہ مسلمان وہاں ہر طرح امن واطمینان سے رہتے ہوں وہاں کے سیاسی اور غیر سیاسی کاموں میں حصہ لیتے ہوں اس کو اپنا وطن سمجھتے ہوں اور باشندۂ ملک کی حیثیت سے اس کی حفاظت وترقی کو بھی اپنا فرض سمجھتے ہوں اس کے لئے ایثار اور قربانی بھی کر دیتے ہوں مسلمان کی حیثیت سے یا مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کی بناء پر نہیں بلکہ ایک شہری کی حیثیت سے وہ اقتدار اعلیٰ میں حصہ لے

---

[1] امیر مالٹا، ص ۹ ۔ ۱۰ [2] از تحذیر الاخوان ص ۱۵ و ۱۶ [3] از ہندوستان اور دارالحرب [4] از فتاویٰ محمودیہ ج ۲ ۔ ص ۲۸۴ —
[5] تحذیر الاخوان ص ۱۵ ۔ ۱۶ [6] ج ۲ ص ۱۹۷ تا ۲۰۰ ۔

سکتے ہوں مگر احکام اسلام جاری نہ کر سکتے ہوں جرم وسزا اور اقتصادی مسائل وغیرہ میں احکام اسلام کو قانون نہ بنا سکتے ہوں بلکہ ان میں اس ملک کے قوانین کے پابند ہوں تو وہ دارالاسلام نہیں ہے، ۔۔۔ یہ ملک دارالحرب ہوگا لیکن ایک پرامن اور باحفاظت ملک کے لئے اس لفظ کو غیر مانوس سمجھا جاتا ہے ۔ تو اس کو دارالامن کہدیا جاتا ہے[۲]۔

اس تفصیل کے بعد یہی کہا جائے گا کہ کم از کم موجودہ ہندوستان نہ دارالحرب ہے اور نہ اس کے کافر حربی جیسے کہ نہ دارالاسلام ہے اور نہ اس کے کافر، کافر ذمی ۔ بلکہ وہ دارالکفر ہے جو کہ ہمارے لیے اپنے مخصوص دستور کی وجہ سے دارالامن ہے اور اس کے کفار دستور کی رو سے دارالامن کے غیر محارب کفار ہیں ۔ مودودی صاحب نے دارالاسلام و دارالحرب پر گفتگو کرتے ہوئے ہندوستان کے متعلق لکھا ہے ۔

ہندوستان اس وقت دارالحرب تھا جب تک کہ انگریزوں سے جنگ جاری تھی مگر جب ہندوستانی مغلوب ہوکر خاموش ہوگئے اور ان کی حکومت کو تسلیم کرلیا تو پھر دارالکفر بن گیا[۳] تو کیا ہندوستان کی آزادی کے بعد ہم مسلمانوں کے لئے ہندوستان کا معاملہ یہی نہیں ہے جو کہ انگریزوں کی حکومت کا ان کی حکومت کے مضبوط ہوجانے کے بعد تھا ۔

بینک سے ملنے والے سود کا لینا (الف) بینک سے ملنے والے سود کا کیا حکم ہے لیا جائے یا نہیں ؟ ہمارے اکابر کا متفقہ فتوی ہے کہ اس کو ضرور لے لیا جائے نہ لینے کی صورت میں نہ صرف امکان بلکہ واقع میں بھی ایسا ہوا ہے کہ اس کو ہماری مضرتوں اور ہمارے لئے تخریب ہمارے اور دین محمد کی بیخ کنی کے لئے اس کا استعمال ہوا اور ہوتا ہے وہ ہوگا یہ فتوی غالباً ۱۹۲۰ء میں دیا گیا جیسا کہ نظام الفتاوی میں ایک موقع پر آیا ہے ۔ اور حضرت تھانوی ، مفتی عزیز الرحمن صاحب ، مفتی محمد شفیع صاحب ، مفتی کفایت اللہ صاحب حضرت مدنی رحمہم اللہ سب سے منقول ہے اور بعد میں مفتی محمود حسن گنگوہی مفتی نظام الدین صاحب ، مفتی عبدالرحیم صاحب دام ظلہم کا بھی اس پر اتفاق ہے[۴] ۔ اعلاء السنن میں بھی اس کا تذکرہ آیا ہے ۔ اور ابی بن خلف کے ساتھ ہونے والے حضرت ابوبکر کے معاملہ کو اس کے لئے بطور اصل ذکر کیا گیا ہے[۵]۔

. لیکن بقول مفتی نظام الدین صاحب یہ حکم غیر مسلم حکومتوں کے بینکوں یا غیر مسلم بینکوں کا ہے مسلم بینک و ملک کا نہیں بلکہ اس میں چھوڑ دینا لازم ہے[۶] اس لئے کہ جس خطرہ و خدشہ کے پیش نظر یہ حکم دیا گیا ہے وہ غیر مسلم ملکوں اور

---

[۱] نظام الفتاوی ج ۱ ص ۱۹۹ و ۲۰۰ [۲] سود از مودودی ص ۱۱۳ و ۲۱۴ [۳] امداد الفتاوی ج ۳ ص ۱۴۳ ۔ فتاوی دارالعلوم ج ۶۔ ۵ ۔ ص ۴۲۹ و ۴۳۳ . وغیرہ رحیمیہ ج ۳ ص ۱۹۱ تا ۲۲۳ و ج ۲ ص ۱۹۲ ، ۱۹۷ ، ۱۹۹ ۔ محمودیہ ج ۲ ۔ ص ۳۰۳ ۔ ۳۰۵ و ۳۰۵ نظام الفتاوی ج ۱ ص ۲۰۴ ۔ ۲۰۹ ج ۲ ۔ ص ۲۰۴ ۔ ۲۰۹ [۴] اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۳۵۹ [۵] نظام الفتاوی ج ۲ ص ۲۱۴ ۔۔

بینکوں سے ہی ہو سکتا ہے مسلم ملک و بینک سے کیا سوال

حضرت گنگوہی کے فتاویٰ سے کم از کم ہندوستان جیسے ملکوں میں ایک جہت اور سود کو وصول کر لینے کی نکلتی ہے، حضرت فرماتے ہیں (سود لینے کا) ایک حیلہ شرعی یہ ہے کہ آدمی یہ خیال کرے کہ سرکار بہت سے موصول اپنے رعایا سے لیتی ہے کہ ہماری شریعت میں اس کا لینا جائز نہیں ہے گو قانون انگریزی سے وہ خلاف نہیں ہے۔ مگر شرع محمدی میں ظلم ہے اور ناجائز ہے اور مستحق رد ہے سو یہ شخص یوں خیال کرے کہ جو غریب رعایا سے سرکار نے محصول شرع کے خلاف لیا ہے اس کو میں سرکار سے مسترد کراتا ہوں اور پھر اس کو وصول کر کے انہیں لوگوں پر تقسیم کر دے جن سے سرکار نے بلا اذن شرع لیا تھا۔ اس نیت میں شاید اللہ تعالیٰ مواخذہ نہ فرمائیں[1]

مگر اس انداز کی توجیہ تو خود ان لوگوں کے حق میں ہے کہ استعمال کے جواز کو پیدا کرتی ہے جو کہ ناجائز ٹیکس بھرتے ہیں۔

(ب) سود کا مصرف

جہاں تک سوال ہے حاصل کردہ سود کے مصرف کا، تو فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ معروف ہے، اور مولانا برہان الدین صاحب کے تفصیلی وتحقیقی مضمون کے مطابق یہ اتفاقی امر ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی ایسا مال ہے جس کو وہ اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا اگر مالک معلوم ہے تو اس تک پہنچائے جیسے کہ غصب کردہ مال یا لقطہ کا عام حکم ہے اور اگر مالک معلوم نہیں ہے اور اس کا حصول کسی عقد کے ذریعہ ہوا ہے اگرچہ عقد غلط ہو جیسا کہ ایک موقع پر شاہ عبدالعزیز صاحب نے فرمایا ہے[2] یا مالک معلوم ہے مگر اب کسی طرح اس تک پہنچانا ممکن نہیں کہ نہ وہ خود موجود ہے نہ اس کے ورثاء، تو ایسے مال کا حکم یہ ہے کہ اس کو صدقہ کر دیا جائے ـــ مولانا سنبھلی نے بواسطہ ابن تیمیہ حنابلہ سے، اور بواسطہ قرطبی مالکیہ سے بھی یہی حکم نقل کیا ہے اور احناف کے یہاں تو یہ حکم ہے ہی شامی وغیرہ میں لقطہ، غصب، رشوت سب کا حکم اسی قسم کا آیا ہے[3] اور لقطہ یا غصب کا حکم مالک تک لوٹا دینے وغیرہ کا نصوص صریحہ صحیحہ سے ثابت ہے اس لئے یہ حکم شوافع کے یہاں بھی ہے اور چونکہ سود کو غصب ولقطہ سے

---

[1] رشیدیہ (طبع پاک) ص ۰۰-۰۱-۵ [2] ملفوظات عزیزی ص ۳۰۔ بلکہ اس انداز کی تصریح زاد المعاد میں ابن القیم نے بھی کی ہے ج ۴ ص ۲۳۲، [3] شامی ج ۳ ص ۲۲۳

مناسبت ہے جو کہ ظاہر ہے اس لئے بینک سے وصول کئے جانے والے سود کا بھی یہی حکم ہے کہ اس کو یشکر صدقہ کیا جائے اگرچہ مفتی عبدالرحیم صاحب نے لقطہ ہونے کی جہت کو یہ کہہ کر رد کیا ہے اس کے مالک نامعلوم ولاپتہ بھی نہیں اور ان کو پہونچا نا متعذر بھی نہیں ہے اور یہ رقم واجب الرد بھی نہیں ہے پھر بینک میں دی ہوئی عین رقم تو واپس ہوتی ہی نہیں [1] مگر کہا جا سکتا ہے کہ اس کو (عین لقطہ) کون کہتا ہے ظاہر ہے کہ غصب، رشوت، لقطہ، سود سب کے الگ حقائق ہیں۔ البتہ باہم ایک مناسبت اور قدر مشترک ہے جس کی بنا پر احکام میں توافق ہو سکتا ہے اور ہے۔ سود کے صدقہ کر دینے کی حکم سے اصل کے طور پر مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ کو ذکر کیا ہے جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا اور معارف السنن میں بواسطہ دار قطنی حضرت امام صاحب سے ایسے اموال کے حق میں ایک روایت کو اصل بنا نا نقل کیا گیا ہے یہ روایت عاصم ابن کلیب کی ہے، جس میں یہ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ ایک گھر میں مدعو تھے کھانے میں بکری کا گوشت تھا آپ نے گوشت کی بوٹی منہ میں رکھنے کے بعد فرمایا بکری مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کی گئی ہے۔ تحقیق سے یہی ثابت ہوا تو آپ نے فرمایا۔ اسے قیدیوں کو کھلا دو [2] ابوداؤد کی ایک دوسری روایت سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے جس میں آپ نے پچھنا لگانے کی اجرت کو بار بار استعمال میں لانے کی اجازت طلب کرنے پر فرمایا اسے اپنے جانور یا غلام کو کھلا دو [3] شاہ عبدالعزیز صاحب نے ذکر فرمایا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ ایسے مال کا یا تو تبادلہ کرے یا گھوڑے یا خادم کو کھلا دے یا کافر کو اجرت میں دیدے [4] مگر یہ حدیث کہاں کی ہے اور کیسی ہے یا حدیث ہے بھی یا نہیں تحقیق نہیں ہو سکی۔

بہرحال نصوص صریحہ وصحیحہ سے ثابت اس اصل وقاعدہ کی بنا پر سود کا جو مصرف عموماً علماء نے تجویز کیا ہے وہ اس کو صدقہ کر دینا ہے بقول مولانا سنبھلی جدہ کے اندر ۱۳۹۹ھ میں منعقد ایک فقہی وعلمی مجلس کے مختلف ملکوں کے شرکاء نے اس کو بالاتفاق طے کیا، اور ہمارے اکابر تو عرصہ سے یہ فتویٰ دیتے چلے آرہے ہیں حضرت تھانوی سے لیکر موجودہ حضرات تک [5]

---

[1] رحیمیہ ج ۳، ص ۲۶۵، ۲۶۶، [2] دار قطنی ج ۲، ص ۵۴۵، ابوداؤد مع بذل ج ۱۴، ص ۲۹۵، ۲۹۶ [3] بذل المجہود ج ۱۵، ص ۹۰، [4] ملفوظات عزیزی ص ۲۷، [5] بینک انشورنس اور سرکاری قرضے ص ۴۲، ۴۳ نیز فتاویٰ رحیمیہ ج ۳ ص ۲۶۱، ودیگر فتاویٰ۔

رہا اس کا سوال کہ سود کا جیسے دینا حرام ہے لینا بھی حرام ہے، اور یہ کہ استعمال جیسے اغنیار کو منع ویسے فقرار کو شق اول کا جواب یہ ہے کہ جواز بربنا رضرورت اسلام و مسلمانوں کو ایسے ضرر شدید سے بچانے کے لئے ہے کہ جو سود لینے کے ضرر سے بڑھ کر ہے [1] اور شق ثانی کا جواب یہ ہے کہ فقرار کے لئے حلت اس لیے ہے کہ سود کا مال اصلاً بینک کی ملک نہیں ہے دوسرے سود دینے والوں کی ہے جو ہم کو معلوم نہیں اب سود لینے والا اصلی مالک کو تو لوٹا نہیں سکتا تو لقطہ کی طرح اس کی طرف سے صدقہ کردیتا ہے [2]

اس صورت میں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی غریب کو دے دے مسلمان ہو یا غیر مسلم یا یہ کہ مسلمان و مستحق زکاۃ کی تخصیص ہے مفتی نظام الدین صاحب کا میلان یہ ہے کہ تخصیص ہے انہوں نے بار بار مستحق صدقہ و مستحق زکاۃ کو دینے کی تصریح کی ہے [3]

مفتی عبدالرحیم صاحب نے اولیٰ ضرور کہا ہے مگر ضروری قرار نہیں دیا۔ باقی حضرات نے کوئی قید نہیں لگائی بس یہ فرماتے ہیں کہ فقرار و مساکین و اہل حاجت کو دیدے ـــــ جو احادیث بطور استدلال یا مناسبات ذکر کی گئی ہیں ان سے تو اس کی تائید ہوتی ہے کہ کوئی قید نہیں ہے اس لئے کہ عاصم ابن کلیب کی روایت میں آیا ہے کہ قیدیوں کو کھلادو اور وہاں قیدی کفار ہی ہوتے تھے اور دوسری روایت میں خادم کا ذکر ہے جو کہ غیر مسلم بھی ہوتے تھے۔ اگرچہ یہ کہا جاسکتا ہے بکری والے واقعہ میں بھی حلت کی جہت موجود تھی قیمت دیدی گئی تھی جسے مالک کی بیوی نے وصول کیا تھا صرف یہ کہ مالک (شوہر) برموقع موجود نہ تھا، اور پچھنے کی اجرت جمہور کے نزدیک حلال ہے [5] اور حضرت ابوبکرؓ کے واقعہ میں مولانا ظفر احمد صاحب نے صدقہ کو تورع و تبرع پر محمول کیا ہے [6]

یہ صحیح ہے کہ ایسے مال کا ایسی صورت حال میں صدقہ کرنا واجب ہے جس سے تخصیص کا خیال ہوتا ہے کہ صدقات واجبہ کا مصرف مسلمان ہی ہیں صرف ذمی کو فطرہ مل سکتا ہے مگر یہاں ذمی کہاں، مگر مفتی عبدالرحیم صاحب نے حضرت تھانوی کی "الطرائف والظرائف" [7] سے یہ نقل کیا ہے کہ صدقہ واجبہ اور تصدق واجب کے درمیان فرق ہے۔ اور دونوں کے مصرف کا ایک ہونا ضروری نہیں ہے

---

[1] نظام الفتاوی ج ۱ ص ۳۲۹ [2] بینک انشورنس ص ۴۴ تا ۴۶، [3] نظام الفتاوی ج ۱ ص ۲۰۸، ۲۲۸، ج ۲ ص ۴۴۹، ۲۶۱ [4] رحیمیہ ج ۶ ص ۱۴۱ [5] بذل المجہود ج ۱۲ ص ۲۲۶ و ۲۶۲ و ج ۱۵ ص ۹۰، [6] اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۳۵۹ [7] ج ۱ ص ۴۲ -

غنی لقطہ کا محل ہے جو کہ واجب التصدق ہے مگر صدقہ واجبہ کا نہیں۔ ایسے ہی قربانی کی کھال اور اس کی قیمت کو صدقہ کرنے کا حکم ہے مگر کھال کسی کو دے سکتا ہے [۱]۔ دوسرا مصرف اس وقت کے ہمارے تینوں اکابر اہل افتاء مفتی محمود حسن صاحب مفتی نظام الدین صاحب مفتی عبدالرحیم صاحب نے یہ ذکر فرمایا ہے کہ اس رقم کو غیر شرعی سرکاری ٹیکس میں لگا دیا جائے، غیر شرعی کا معیار یہ ہے کہ ایسا ٹیکس جس کی بظاہر کوئی منفعت ہم کو نہ حاصل ہو رہی ہو مثلاً انکم ٹیکس سیل ٹیکس ہیں لیکن واٹر ٹیکس وغیرہ میں نہیں البتہ مفتی عبدالرحیم صاحب بدرجۂ مجبوری جبکہ ٹیکس ادا کرنے کی حیثیت نہ ہو یا بہت بوجھ ہو تب اس کی اجازت دیتے ہیں ورنہ نہیں [۲]۔

:. باقی دونوں حضرات کے نزدیک یہ مصرف صدقہ پر مقدم اور اس سے اولیٰ ہے [۳]۔ اگرچہ اس مصرف میں لگانے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے "مال حرام بود بجائے حرام رفت" مگر اصل بنا اس کی جو قاعدہ پیچھے گذر چکا ہے اس کی ایک شق پر ہے کہ مملوک غیر حتی الامکان مالک تک پہونچانا چاہیئے بینکوں سے ملنے والے سود میں اگرچہ یہ احتمال شامل ہے کہ بینک کے قرضداروں سے لیے ہوئے سود سے کھاتے داروں کو سود دیا جاتا ہے مگر بینک تجارت بھی کرتا ہے پھر کھاتے دار کا معاملہ تو براہ راست بینک سے ہی ہے اس لیے اس کا اصل مالک بینک اور حکومت ہی ہیں، تو کسی عنوان سے حکومت کو لوٹانا۔ اصل مالک کو لوٹانا ہے۔ جیساکہ ایک موقع پر مفتی نظام الدین صاحب نے تصریح بھی کی ہے [۴]۔

اور بظاہر یہ بات دل کو لگتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

تیسرا مصرف جسے ان تینوں ارباب افتاء میں سے مفتی عبدالرحیم صاحب نے اپنے متعدد فتاویٰ میں ذکر کیا ہے بلکہ ایک موقع پر اس کو مدلل و مبرہن کر کے پیش کیا ہے اور بظاہر یہ ان کے نزدیک ٹیکس سے مقدم ہے کہ اس سے پہلے اور اس کے مقابلے میں توسع کے ساتھ انہوں نے اس کو ذکر کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسے عام مسلمانوں ورفاہ عام کے کاموں میں استعمال کیا جائے یعنی دین کی نشر و اشاعت کوئی قومی و ملی کام و خدمت، یتامیٰ و مساکین کی امداد، طلباء کے وظائف، مسافر خانہ و کنواں کی تعمیر، سڑکوں کی روشنی، عوامی بیت الخلاء اگرچہ مسجد کا ہو وغیرہ میں

---

[۱] رحیمیہ ج ۳، ص ۲۶۶ [۲] رحیمیہ ج ۲، ص ۱۹۹، ج ۶ ص ۱۳۹، شاید یہ بات ملحوظ ہے کہ دینے والا کو نہ کچھ تو فائدہ حاصل کرتا ہے۔ [۳] محمودیہ ج ۳ ص ۲۰۳ [۴] نظام الفتاویٰ ج ۱، ص ۲۶۱۔

اسے صرف کیا جا سکتا ہے۔

اس مضمون کے متعدد فتاویٰ مفتی کفایت اللہ صاحب سے نیز مفتی سید احمد صاحب (سہارنپور) حضرت مدنی اور بعض علماء مراد آباد سے منقول ہیں اور مفتی عبدالرحیم صاحب نے اس کو اختیار کیا ہے اور اگرچہ انہوں نے لقطہ کے درجہ میں ہونے سے انکار کیا ہے مگر کہا ہے کہ لقطہ بھی ہو تو بھی یہ مصرف ہو سکتا ہے کہ اسلامی بیت المال کے اموال میں ایک جہت یہ بھی ہوتی ہے [۱] ان حضرات نے اس کی اصل یہ قرار دی ہے جیسا کہ حضرت مدنی کے ایک فتویٰ [۲] میں آیا ہے اور مفتی عبدالرحیم صاحب نے بھی اس کو ذکر کیا ہے فقہ حنفی کی کتابوں میں کتاب السیر کے مسائل کے تحت یہ مسئلہ آیا ہے۔ اہل حرب کا جو مال مسلمانوں کو، اہل حرب سے جنگ کے بغیر حاصل ہو جسے شریعت کی اصطلاح میں "فے" کہتے ہیں۔ اس کا مصرف مسلمانوں کے مصالح ہیں جس کے تحت یہ سارے امور آجاتے ہیں [۳]۔

مولانا گیلانی نے ہندوستان یا دارالحرب میں سود لینے کے جواز کے سلسلہ میں جو مضمون لکھا ہے اس کی بناء ہی اسی پر ہے کہ یہ فے ہے لہٰذا اس کو وصول کرنا چاہیئے بلکہ اس کا نہ لینا قومی و دینی جرم ہے [۴]۔ مولانا گیلانی کے پورے مضمون کی تردید تو مودودی صاحب نے کر دی ہے اور فقہ حنفی کی رو سے لہٰذا وہاں دیکھنے کے لائق ہے۔

مگر یہاں یہ عرض ہے کہ عموماً جو ہمارے حضرات نے اس شق کو نہیں اختیار کیا ہے اس کا باعث یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے کاموں میں صرف کرنے پر خود ایسی چیز سے براہ راست صرف کرنے والا بھی فائدہ اٹھائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اس کے لیے منع ہے۔ بقول مفتی نظام الدین صاحب اس کو تو حاصل کرنے والا نہ خود استعمال کر سکتا ہے اور نہ کسی طرح ضائع کر سکتا ہے راستہ صدقہ ہی ہے [۵] اور اصل بات یہ ہے کہ اس قول کی بناء اس پر ہے کہ ہم کو بینک سے جو سود مل رہا ہے وہ محض حکومت وغیر مسلم کا پیسہ ہے اور ملک چونکہ دارالحرب ہے۔ لہٰذا ان کی رضا سے اس کا لینا درست ہے۔ مگر یہ تفصیل پیچھے آچکی ہے کہ دارالحرب میں ان چیزوں کے قول جواز کی کیا حیثیت ہے اور یہ کہ یہ جواز ہر دارالکفر میں نہیں ہے اور ہندفی الوقت دارالحرب نہیں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس وقت بینک جو سود دیتا ہے اس میں ہم مسلمانوں کا مال بھی ہوتا ہی ہے تو اسے کیسے اہل حرب کے مال کے مواقع میں صرف کیا

---

۱ فتاویٰ رحیمیہ ج ۲، ص ۲۶۰ تا ۲۶۸ ۔ ۲ مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱، ص ۴۲ ۔ ۳ رحیمیہ ج ۲ ص ۲۶۱، از ہدایہ ج ۲ ص ۲۶۸ و رحیمیہ ج ۲ ص ۲۹۶ از شامی و عالمگیری وغیرہ ۔ ۴ سود ص ۳۱۱ تا ۳۱۲ وما بعد ۔ ۵ نظام ج ۱ ص ۲۹۷ ۔

جاسکتا ہے [1]

مصرف کے سلسلہ میں لقطہ ہونے کی تقدیر پر یا اہل حرب کا مال ہونے کی تقدیر پر خود بھی استعمال کرنے کی شق نکلتی ہے مگر ایک تو مِن لقطہ نہیں۔ دوسرے حلت و حرمت میں احتیاط کا مقتضی اجتناب ہے اور حربی کے متعلق تفصیل گذر چکی ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

(ج) سرکاری غیر سرکاری سود کا فرق

"سود" سود ہے۔ اس میں سرکاری غیر سرکاری بینک کا کوئی فرق نہیں بجز اس کے کہ غیر سرکاری بینک یا افراد سے حاصل ہونے والا سود ٹیکس میں نہیں دیا جاسکتا اس لئے کہ جو بنا رہے اس کے جواز کی وہ اس میں نہیں پائی جاتی مفتی نظام الدین صاحب فرماتے ہیں پبلک بینک سے (سود کی) رقم مل رہی ہے تو کل کی کل مستحقین صدقہ کو بطور صدقہ دیکر اپنی ملک سے نکال دینا چاہئے [2]

(د) سود کے لینے دینے کا فرق بالخصوص غیر اسلامی ملک میں

"سود و رشوت" ان دونوں کا لینا دینا حرام ہیں، نصوص دونوں کو عام ہیں لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی [3] لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوا وموکلہ الحدیث [4]

ہاں یہ ضرور ہے کہ سود و رشوت کا لینا، حرام مال کا کمانا اور جمع کرنا ہے اور حرام کا کھانا اور استعمال میں لانا زیادہ سخت ہے، غالباً اسی لیے قرآن کریم میں سود کی حرمت کے سلسلہ میں دینے کے بجائے لینے اور کھانے کا ذکر آیا ہے، الذین یاکلون الربوا۔ الآیہ۔ [5]

یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوٰ، الآیہ [6]

یاایھا الذین اٰمنوا لا تاکلوا الربوا اضعافاً مضاعفۃ۔ الآیہ [7]

دینے والا حرام فعل کا ارتکاب کرتا ہے، مگر حرام مال کو استعمال نہیں کرتا اسی لیے فقہاء نے جو استثناءات ذکر کئے ہیں ان میں رشوت دینے یا سود دینے کا ذکر آیا ہے۔ ہاں حرام کے ارتکاب اور حرام پر تعاون کی وجہ سے اس جواز کو ضرورت کے ساتھ مقید کیا ہے۔

---

[1] سود از مودودی ص ۲۱۹ [2] نظام الفتاویٰ ج ۲ ص ۴۰۴ [3] ترمذی شریف کتاب الاحکام [4] مشکوٰۃ ص ۲۴۴، بحوالہ مسلم [5] البقرہ آیت [6] البقرہ آیت [7] آل عمران آیت۔

رشوت کے سلسلے میں شامی میں ہے" اگر اپنے دین کی حفاظت کے لیے رشوت دے تو جائز ہے۔ اسی طرح اگر کسی ظالم حاکم کو دے اپنی جان یا مال سے ظلم کو دفع کرنے کے لئے اور اپنا حق لینے کے لئے تو یہ رشوت نہیں ہے [1]

اور سود کے متعلق الاشباہ کا یہ جزیہ معروف ہے یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح [2] جب سودی قرض لینے اور سود دینے کے جواز کا مدار حاجت بے ضرورت ہے تو ضرورت وحاجت تو ایک خاص حالت کا نام ہے جو کہیں بھی پیش کر سکتی ہے اس لیے نفس حکم میں تو اسلامی ملک اور غیر اسلامی ملک کے درمیان فرق کا سوال نہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ مسلم ملک میں چونکہ اسلامی نظام رائج ہوتا ہے اور اسلامی معاشرہ ہوتا ہے اس لئے ضرورت مندوں کی ضرورت کی کفالت کی مختلف صورتیں موجود ہوتی ہیں اعانت وامداد کے تبیل کی بھی کہ ان کو رقم کا مالک بنا دیا جائے اور بغیر سود کے قرض کی بھی۔

مگر غیر اسلامی ملک میں نہ تو اسلامی نظام بیت المال اور عشر وخراج اور زکاۃ صدقات وغیرہ ہیں اور نہ ہی اسلامی معاشرہ وایثار۔ اس لیے نہ بطور ملک آسانی سے ملنے کا سوال اور نہ بطور قرض یوں بھی اب جو حالات ہیں ان میں افراد شخصی طور پر قرض دینے سے گھبراتے ہیں کہ بکثرت لینے والے نہ صرف یہ کہ دینے سے انکار کرتے ہیں بلکہ بعض مرتبہ فساد کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔

اسلامی ملک وغیر اسلامی ملک کے درمیان اس نمایاں فرق کی بنا پر ضرور یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیر اسلامی ملک کے اندر رہنے والا مسلمان زیادہ اس بات پر مجبور ہو سکتا ہے کہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان بچانے کے لئے ایسا قرض لینے پر مجبور ہو جائے چنانچہ مفتی نظام الدین صاحب نے ہندوستان کی نسبت سے متعدد مواقع پر اس قسم کے حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۶) ضرورت کی بنا پر سودی قرض

فقہ حنفی میں اس سلسلہ میں الاشباہ والنظائر کا یہ جزیہ بہت معروف ہے جسے عموماً ارباب افتاء ذکر کیا کرتے ہیں "حاجت مند کے لئے کچھ نفع کے عوض قرض کا لینا جائز ہے [3]

لیکن یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا سوال یہ کہ، وہ حاجت کیا ہے اور وہ محتاج کون ہے جس کے لئے یہ جواز ہے۔

دوسرا یہ کہ، جواز جہاں اور جس کے لیے ہوگا کس حد تک ؟

---

[1] شامی ج ۵ ص ۲۷۲ [2] الاشباہ والنظائر ص ۹۲ [3] الاشباہ ص ۹۲۔

فقہ کی اصطلاح میں حاجت وضرورت کیا ہے اور اس کے احکام وتفصیلات توالاشباہ اور اس کی شروح وغیرہ میں مذکور ہیں اور ار باب افتاء ذکر کرتے ہیں اور کریں گے۔ میں تو اس موقع پر زیر بحث مسئلہ کی نسبت سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سود کے جواز کا محتاج بقول استاذی مفتی محمود حسن صاحبؒ، ایسا شخص ہے جو کہ اس درجہ محتاج ہو کہ کما نہیں سکتا اور بغیر قرض کے گذارہ کی کوئی صورت نہیں اور قرض بغیر سود کے ملتا نہیں" ؎۱

۱۔ یعنی یہ محتاج ایسا شخص ہے کہ جس کے پاس ضروریات زندگی کی صورت میں یا سامان کی صورت میں کوئی اثاثہ نہیں ہے اور نہ وہ کمانے پر قادر ہے۔

۲۔ یہ محتاج ایسا شخص ہے جس کے پاس ضروریات زندگی، مکان، کپڑے، ضروری برتن کی صورت میں اثاثہ ہے مگر ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نقد اثاثہ نہیں ہے اور ضروریات کا سامان بیچ دے تو عزت کے ساتھ سر وتن چھپانے کی صورت بھی جاتی رہی اور کمانے پر بھی قادر نہیں۔

۳۔ یہ محتاج ایسا شخص ہے کہ جس کے پاس مکان وغیرہ ضروریات کے ساتھ اتنی زمین ہے مثلاً کہ جس سے کسی طرح اس کی ضرورت کی بقدر غلہ کی یافت ہو سکتی ہے۔ مگر اس کے حصول کے لئے یعنی چیزیں نہ ہونے کی وجہ سے اسے زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً کھاد وبیج وسینچائی کے حق میں اور اس کے مخصوص حالات کے پیش نظر مزدوری کے حق میں بھی زحمت ہوتی ہے کہ خود بدن سے محنت نہیں کر سکتا اور مزدوری کے پیسے نہیں پاتا۔

اور اس قسم کی صورت میں ایسے شخص کو غیر سودی قرض یا کوئی امدادی رقم کہیں سے حاصل نہیں ہو سکتی — تو وہ اس حد کے تحت آئے گا، اور خیال رہے کہ کمانے پر قادر نہ ہونے کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ صحت وقوی کمزور ہوں بلکہ صحت وقوی کے ہوتے ہوئے آدمی خاندانی طور پر محنت ومشقت کا عادی نہیں ہے تو وہ بھی قادر نہیں شمار ہوگا ؎۲ اور جیسے قدر کفاف روزی کے لئے آدمی کو محتاج قرار دیکر جواز ہو سکتا ہے ایسے ہی اگر رہائش کے مسئلہ میں آدمی واقعی مجبور ہو کر کرایہ گراں، پھر کرایہ داری مستقل زحمت، تو ضرورت کے لئے کافی مکان بنوانے کی حد تک بھی اسے محتاج

۱۔ محمودیہ ج ۳، ص ۲۲۷، نیز ۲۴۲ ج ۹ ص ۲۰۸، رحیمیہ ج ۲ ص ۶ ۱۳، نظام الفتاویٰ ج ۲، ص ۳ ۲۶۳۔

۲۔ جیسا کہ فقہاء نے زکوٰۃ کے مصرف وسوال کے جواز کے حق میں اس کی تصریح کی ہے۔

قرار دیا جا سکتا ہے [1] ایسا شخص کہ جس کے پاس ایک معقول ذریعۂ معاش ہے، جو بقدر کفاف روزی دیتا ہے، وہ اسے اور اچھا کرنا چاہے یا پھیلانا چاہے تو وہ محتاج نہیں ہے جیسے کہ رہائش کے ایک مکان کے علاوہ اگر مزید ایک مکان ہے جس کے کرایہ کو استعمال کرتا ہے مگر نا کافی ہے تو وہ محتاج نہیں ہے اسے مکان بیچ کر ذریعہ معاش اپنانا چاہیئے اسی طرح زائد از ضرورت، گھر کے سامان ہوتے ہوئے انسان محتاج نہیں کہلائے گا۔ حضرت گنگوہی نے ایک فتوی میں فرمایا کہ مکان اگرچہ نقصان کے ساتھ بیچنا پڑے مکان بیچ مگر سود نہ دے [2]

جیسے کہ احتیاج کے تحت اس کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس وسیع کاروبار ہے، کاروبار پھیلانے و بڑھانے کے لئے وافر سرمایہ موجود ہے لیکن اگر وہ اپنی ضروریات کے لیے اپنے سرمایہ کو سامنے لاتا ہے تو سرکاری قوانین کے سامنے اس کو جواب دہ ہونا پڑے گا بلکہ مجرم کے کٹہرہ میں کھڑا ہونا پڑے گا اور بڑی زحمتیں اور نقصانات اٹھانے پڑیں گے، اب وہ مجبور ہو کر اپنی جائز کمائی کو بچانے اور چھپانے کے لئے اگر ایسا اقدام کرے تو اس کو بھی حد ضرورت میں شمار کیا جا سکتا ہے [3] جیسے کہ کاروبار وغیرہ کے انشورنس کے حق میں اہل افتاء کہتے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ چونکہ یہ جواز مخصوص حال و حاجت کی بنا پر ہے اس لئے صرف اسی حد تک ہو گا کہ جس سے یہ حاجت آدمی کی پوری ہو جائے۔ یعنی معقول صورت میں کہ جو گذارہ کے لیے واقعی کافی ہو اور اس کی ضرورت کی حالت ختم ہو جائے جیسا کہ جواز کے فتاوی کے ساتھ اکابر نے تصریح کی ہے اور فقہ کا مسلمہ قاعدہ ہے "الضرورۃ تتقدر بقدر الضرورۃ"

(۷) ترقیاتی اور اسکیمی قرضے

مفتی نظام الدین صاحب نے اپنے فتاوی میں بار بار اس کی صراحت کی ہے کہ حکومت کی ترقیاتی اسکیموں کے متعلق قرضوں کی حیثیت عام ضرورتوں کے تحت لیے جانے والے قرضوں سے مختلف ہیں حکومت کا مقصود ایسے قرضوں سے بالخصوص زر اندوزی وتحصیل زر نہیں ہے بلکہ ملک کے معاشرہ کی فلاح وصلاح ہی ہوتی ہے۔

اور اس کے تحت انہوں نے اس کی وضاحت کی ہے کہ ایسے قرضے کہ جن میں گورنمنٹ اصل

---

[1] یہ تفصیل سابقہ کے فتاوی سے ماخوذ ہے بلکہ اسی انداز کے امور ان میں صراحۃً آئے ہیں [2] رشیدیہ ص ۵۰۲ [3] نظام الفتاوی ج ۱ ص ۲۳۹، ۲۴۰

دی ہوئی رقم پر کچھ چھوٹ دیکر واپسی کا مطالبہ کرتی ہے اور ایک وقت مقررہ پر ادا نہ کر سکنے کی صورت میں اضافہ کرتی ہے، حتی کہ اضافہ شدہ رقم کے ساتھ باقی ماندہ رقم اصل کے برابر اور بعد میں اس سے زائد بھی ہو جاتی ہے۔

ایسے قرضے سودی قرض کے تحت اس وقت تک نہ آئیں گے جب تک کہ قرض لینے والے کو واپسی میں اصل رقم سے کچھ زائد دینے کی نوبت نہ آئے، اس لئے اس سے پہلے جو کچھ دے گا اس پر سود کی تعریف صادق نہ آئے گی اور سود گھٹنے سے رقم سود نہ بن جائے گی۔[۱]

دوسرے ایسے قرضے کہ جن میں حکومت بنیادی طور پر ضرورت مندوں کو نقد رقم فراہم کرنے کے بجائے ضرورت کے مطابق اسباب مشینری وغیرہ فراہم کرتی ہے اور اس کے ساتھ کام چلانے کے لئے معمولی رقم بھی دیتی ہے وہ بھی عام سودی قرضوں کے تحت نہیں آئیں گے۔ اس لئے کہ واپسی میں جو زیادتی دی جائے گی اس میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم نے گورنمنٹ سے پمپنگ سیٹ مشین نہیں خریدی بلکہ گورنمنٹ نے ہم کو خرید کر دی۔ اب اگر وہ اپنی دی ہوئی رقم پر ہم سے کچھ زائد لیتی ہے تو گویا وہ مشین کی قیمت لیتی ہے جو کہ گورنمنٹ و کمپنی کے درمیان کم ہے اور ہمارے و گورنمنٹ کے درمیان زیادہ۔ دوسرے یہ کہ یہ زائد رقم جو دی جائے گی ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کو اپنا نظام چلانے اور عوام کی ایسی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے وسیع عملہ اور دیگر اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے یہ زائد رقم انتظامی اخراجات کے لیے بطور اجرت و فیس بھی کہی جا سکتی ہے۔

یعنی ایسے قرضوں میں زائد دی جانے والی رقم کے حق میں یہ توجیہ کی جا سکتی ہے۔ مفتی صاحب نے فرمایا بالخصوص ہندوستان جیسے ملک میں اگرچہ ان کا یہ قصد نہ ہو، مگر ضرورت کی بنا پر جیسے حضرت تھانوی نے منی، آڈر کی فیس میں توجیہ فرمائی ہے جواز کی شق نکالنے کے لیے۔ ایسے ہی یہاں بھی ہو سکتی ہے۔ اور یہ توجیہ اس قسم کے معاملات اور ضروریات کے عام ہونے کی وجہ سے اختیار کی گئی ہے۔[۲] مفتی صاحب موصوف نے اس جہت سے بڑی تفصیلی اور واضح و مدلل گفتگو فرمائی ہے اور قواعد کی بنیاد پر توجیہ کی ضرورت و مناسبت کو ثابت کیا ہے۔

اور دوسری جہت وہ بھی سوچی جا سکتی ہے جس کو سوالنامہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ کہ جب یہاں اسلامی بیت المال، زکوٰۃ و صدقات نہیں، نہ غیر سودی قرضے، اور رعایا ہونے کی بنا پر ہمارا بھی حق اور

---

[۲] نظام الفتاوی ج ۱ ص ۲۵۵ و ۲۶۳ و ۲۷۰۔

سود دینا ہی وسیلہ ہے اس حق کے وصولنے کا۔ تو اس کو مجبوری درجہ میں اس رشوت کی حیثیت دی جائے جو کہ اپنا حق وصول کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔

بہرحال ایسے قرضوں میں یہ دونوں جہتیں سوچی جاسکتی ہیں۔ دل جس پر مطمئن ہوجائے۔ یا پھر کوئی دوسری ہی رائے اختیار کی جائے۔ اور ان دو قسم کے ماسوا قرضے جن میں کوئی معافی نہیں۔ یا یہ کہ نقدی نقد یا وافر مقدار میں نقد لیا جاتا ہے۔ عام حالات میں ان کا جواز نہیں ہوگا۔

(۸) **معافی والے قرضے** | بظاہر تو یہ صورت جائز ہے کہ اس پر کم از کم اس وقت تک سود کی تعریف صادق نہیں آتی جب تک کہ مقروض کی طرف سے واپس کی جانے والی رقم اصل سے زائد نہ ہو جیسا کہ گذشتہ بار بار آچکا ہے۔ البتہ ایک اشکال یہ ہے کہ ابتداء معاملہ میں یہ بات بھی بہرحال سامنے آتی ہے کہ اگر مقررہ وقت پر مطلوبہ باقیماندہ رقم ادا نہ کر سکے تو پھر اس حساب سے مزید دینا ہوگا جو کہ بڑھتے بڑھتے اصل سے زائد ہوسکتی ہے۔

(۹) **بینک کے واسطے سے سود کے ساتھ تجارت** | مفتی نظام الدین صاحب نے بینک کے ذریعہ تجارت کی صورتوں کی تنقیح کرنے کے بعد جو تفصیل کی ہے اس کے مطابق اگر مال منگانے والا یا بھیجنے والا اپنے اختیار سے بینک سے اس قسم کا معاملہ کرتا ہے بالخصوص مال منگانے کی صورت میں اور صورت یہ ہوتی ہے کہ خریدار پوری قیمت بینک سے قرض لے کر ادا کرتا ہے یا یہ کہ بینک سے معاملہ کرکے اس کے ذریعے ادا کراتا ہے تو یہ سودی معاملہ کہلائے گا۔ اور ضرورت کے بغیر اس کا جواز نہ ہوگا، ضرورت کا مطلب یہ ہے قانونی مجبوری ہو کہ واسطہ بنایا جانا ضروری ہو یا غیر سودی قرض نہ ملے یا ملے مگر زیادہ شرح کیساتھ۔ اور اگر سود لینے کی صورت بینک کو واسطہ بنانے کی بنا پر پیدا ہوتی ہے تو یہ ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے اہون ہے کہ اس میں آدمی کو سود دینا نہیں ہے ملتا ولیتا ہے جسے حاصل کرکے مستحق کو دیکر وہ اس سے بری الذمہ ہو جائے گا۔[1]

بہرحال ازروئے اصول وگذشتہ تفصیلات مفتی صاحب کی توضیح وتفصیل معقول معلوم ہوتی ہے۔

(۱۰) **شخصی وحکومتی بینکوں کے سودی فرق** | بظاہر دونوں قسموں کے بینکوں سے قرض لیکر سود ادا کرنا یکساں حیثیت رکھتا ہے۔

---

[1] نظام الفتاوی ج ا ص ۲۳۴۔

(۱۱) سرکاری زحمتوں سے بچنے کے لیے شخصی سودی قرضے | بظاہر یہ شق "اھون البلیتین" کے تحت آتی ہے۔ دیکھا یہ جائے گا کہ حکومت سے معاملہ کرنے کی صورت میں اگر اس کو واقعی زیادہ زیر بار ہونا پڑتا ہے، سود بہر حال لگتا ہے، مزید رشوت بھی دینی پڑتی ہے اور اپنی حلال و محفوظ کمائی کو خطرہ میں ڈالنا پڑتا ہے تو پھر جن ضرورتوں کے تحت سرکاری قرض لیا جا سکتا ہے اس کی بھی گنجائش ہو سکے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

جوابات ضمیمہ سوالات

محمد عبید اللہ الاسعدی

تمہید | (الف) سود ایک شرعی حقیقت ہے جہاں صادق آئے گی وہی اعتبار ہوگا (ب) شرعی حقیقت کے مطابق سود محض قرض کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، (ج) اور جانبین کے مالی معاملہ میں ایک طرف سے شرط کے ساتھ زیادتی کا حاصل ہوتا ہے۔
جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حق سے زائد کچھ ملے مگر مشروط نہ ہو تو سود نہیں ہے۔

جوابات

(۱) کے تحت مذکورہ دونوں صورتیں بظاہر سود کے تحت نہیں آتیں اس لیے کہ مدعی کا یہاں اس انداز کا کوئی معاملہ نہیں ہے بلکہ اس کا اپنے واجبی و واقعی حق کا مطالبہ ہے جس پر عدالت تصفیہ کر کے اسے ایک رقم دلاتی ہے، ضروری نہیں کہ وہ اس کی طلب کے عین مطابق ہو تو اگرچہ حکومت اس کو دو حصوں میں کر کے دو عنوانوں سے دلائے مگر ہم مجموعے کو مجموعی طور پر اس کا حق اور اس کی زمین کی قیمت کہہ سکتے ہیں۔ عدالت کی تعبیر سے ایسے ہی فرق نہیں پڑے گا جیسے پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ میں اضافہ ہے۔

(۲) مفتی نظام الدین صاحب نے ایسی فلاحی قرضے جن میں نقد برائے نام اور اصلاً اشیاء کی فراہمی ہوتی ہے۔ بالخصوص ہندوستان جیسے ملکوں کے لیے اس انداز کی توجیہ کو مقبول قرار دیا ہے۔ اس تقدیر پر کہ زائد رقم اصل مال کی قیمت میں بھی شمار ہو سکتی ہے کہ ہم نے مشین حکومت سے لی ہے۔ حکومت نے کارخانہ سے اور انتظامی اخراجات میں بھی شمار کی جا سکتی ہے۔

ایسی کسی نیت سے فرق نہیں پڑے گا یہ نیت تو ہر جگہ چل سکتی ہے۔ جواز کے لیے معاملہ کی مجموعی صورت کو اصول شرع کے مطابق ہونا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایسی صورت میں بھی پہلی صورت کے مطابق توجیہ ہو سکتی ہے۔ "واللہ تعالیٰ اعلم"



سودی کاروبار کا عموم

از ـــــــــــــــــــ مفتی حبیب اللہ القاسمی (جونپور)

ربوا ایک معاشرتی لعنت ہے جس کی اقتصادی تباہ کاریوں نے ہمیشہ ہی غریب کے لہو سے سرمایہ داری کی آبیاری کی ہے اور غربت کے سسکتے وجود سے سرمایہ دار کی ہوس کو غذا بخشی ہے اسی وجہ سے خداوند قدوس نے بھی ایسوں کے دلوں کو ہلا دینے والا چیلنج کیا ہے"۔ فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ" اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کم و بیش چالیس حدیثیں اس کی مذمت پر مشتمل ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ربوا کو وجود پذیر ہوئے اتنا طویل زمانہ گذر چکا ہے کہ اس کی جڑوں کو کھود کر پھینکنا اور معاشرہ کو اس کی گندگی سے پاک کرنا گویا کہ محالات کے قبیل سے ہو چکا ہے، بلکہ اب تو ربوا کی مختلف شکلوں نے معاشرہ و معیشت کو اپنے احاطہ میں اس طرح لے لیا ہے کہ اس سے نکلنا خرط قتاد کے مترادف ہے اس کے باوجود ایسے دیندار ہر زمانے میں رہے جنہوں نے اختیاری درجہ تک اس لعنت سے بچنے و دور رہنے کی مکمل کوشش کی اور نتیجہ کے طور پر اگر کچھ لوگ ناکام رہے تو کچھ کامیاب بھی رہے اگرچہ عصر حاضر میں ملکی اعتبار سے ایمان والے بعض ایسی شکلوں کے شکار ہیں جس نے اختیار کو اضطرار سے بدل دیا ہے اس لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ اہل افتاء پیدا ہونے والی نئی شکلوں کے سلسلہ میں متفقہ طور پر کوئی ایک راہ عمل متعین کر کے امت کو اس سے باخبر کریں ۔ اللہ پاک جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب مدظلہٗ کو کہ انہوں نے اس موضوع کو اٹھا کر جہاں امت مسلمہ کو سنبھالا ہے وہیں اہل علم و افتاء کے لیے یکجہتی کی ایک راہ بھی ہموار کر دی ہے اس مختصر سی تمہید کے بعد اب سوالات کے سلسلہ میں کچھ معروضات سپرد قرطاس ہیں ۔

① ربوا کے لغوی معنیٰ زیادتی بڑھوتری کے ہیں اصطلاح فقہاء میں ربوا اس زیادتی کو کہتے ہیں جو کسی مالی معاوضہ کے بغیر حاصل ہو تقریباً سارے ہی حضرات فقہاء قدرے الفاظ کے تفاوت کے ساتھ یہی فرماتے ہیں۔

"الربوا هو فضل خال عن عوض" (ملتقى الابحر ص...)

لیکن لفظ سود ربوا کے پورے مفہوم کی ادائیگی سے قاصر ہے۔ اس لیے سود اور ربوا کو الفاظ مترادفہ میں سے سمجھنا غلط ہوگا۔ منطقی اعتبار سے دونوں میں عموم خصوص مطلق کا فرق ہے ربوا اپنے اندر ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے اور سود اس کی ایک شاخ ہے اس لیے ہمارے عرف میں جو سود رائج ہے اس کی حقیقت صرف اتنی ہے "روپیہ ایک متعین مدت کے لیے قرض دے کر معین شرح کے ساتھ زیادتی لینا۔"

ربوا کی ساری صورتوں اور شکلوں کے تجزیہ کے بعد ربوا کی پانچ قسمیں سمجھ میں آتی ہیں اور اسی سے مختلف معاملات میں پھیلاؤ کا انداز معلوم ہوتا ہے گویہ قسمیں استقرائی ہیں۔ ① "ربوا قرض" اس کا حاصل قرض خواہ کا قرضدار سے حسب شرط متعینہ میعاد کے بعد اپنے اصل مال پر کچھ زائد لینا ہے۔ ② "ربوا رہن" بلا کسی مالی معاوضہ کے وہ نفع جو مرتہن کو راہن یا شئ مرہون سے حاصل ہو۔ ③ "ربوا شرکت" ایک شریک اپنے دوسرے شریک کے لیے نفع متعین کر دے اور اس کے جملہ نقصانات و منافع کا خود مستحق بن جائے۔ ④ "ربوا نسیئہ" دو چیزوں کے باہم لین دین میں یا خرید و فروخت میں ادھار کرنا اور اس ادھار کو تحصیل منافع کا ذریعہ بنانا۔ ⑤ "ربوا فضل" دو چیزوں کا کمی بیشی کے ساتھ باہم لین دین کرنا جبکہ اس میں کمی بیشی درست نہ ہو اس قسم کا تعلق خاص طور پر بیع صرف سے ہے۔

اس کے بعد یہ عرض کرنا غالباً خارج از موضوع اور تطویل لاطائل کے مرادف نہ ہوگا کہ جن چیزوں سے معاملات کا تعلق ہوتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں گو یہ بھی استقرائی ہیں (۱) کیلی (۲) وزنی (۳) غیر کیلی غیر وزنی۔

کسی چیز کے مکیل یا موزون ہونیکی صفت کو اصطلاح فقہاء میں قدر کہتے ہیں اور اس کی حقیقت کو جنس کہتے ہیں۔ پھر اشیاء کی جنس و قدر کے اعتبار سے چار قسمیں ہیں۔

① متحد الجنس متحد القدر جیسے گیہوں اور جو ② غیر متحد الجنس غیر متحد القدر جیسے بکری کی بیع بکری سے ③ متحد الجنس غیر متحد القدر جیسے کپڑے کی بیع کپڑے سے کہ جنس ایک ہے نہ کیلی ہے نہ وزنی ④ غیر متحد الجنس متحد القدر جیسے گیہوں کی بیع نمک سے۔

ان اقسام کا حکم یہ ہے کہ پہلی قسم میں سواءً بسواءٍ اور یداً بیدٍ دونوں واجب ہے یداً بید "فبیعوا کیف شئتم" میں داخل ہے اور تیسری قسم میں یداً بید واجب ہے سواءً بسواءٍ واجب نہیں۔

ان تفصیلات وتصریحات فقہاء سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف اصناف کے معاملات ایسے ہیں کہ اگر ان شرعی اصولوں کے مطابق نہیں کیا گیا تو ربوا لازم آئے گا۔ اس کے برخلاف سود کا پھیلاؤ اس اعتبار سے محدود در محدود ہے۔

(۲) دارالحرب میں جو حضرات سود کو جائز قرار دیتے ہیں ان حضرت کی منتہائے نظر لاربوا بین المسلم والحربی فی دارالحرب" ہے امام زیلعیؒ نے نصب الرایہ میں اس کے غریب ہونے کی تصریح کی ہے بعض طرق میں عن مکحول عن رسول اللہ ہے اس صورت میں اس کا منقطع ہونا متعین ہے اس لیے کہ مکحول صحابی نہیں، اور اگر واسطہ مان لیا جائے حضورؐ اور مکحول کے درمیان ہو وہ واسطہ مجہول ہے، نیز غریب کے ساتھ لیس بثابت' لاحجة فیہ کی بھی تصریحات اس کے بارے میں ملتی ہیں، صحاح ستہ میں مذکور نہیں اور اگر تھوڑی دیر کے لیے اسے قابل استدلال مان لیا جائے تو اس کا مطلب وہ نہیں جو عموماً ذہنوں میں ہے بلکہ (۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان دارالاسلام سے دارالحرب میں امن لے کر رہنے لگے اس کے بعد عقود فاسدہ ربویہ کے ذریعہ مال حاصل کرے اور وہ مال لے کر دارالاسلام آجائے تو اس کے مال سے بیت المال کا حق خمس متعلق نہ ہوگا اس کا حاصل یہ ہے کہ اس کے دارالحرب سے دارالاسلام انتقال کی صورت میں اموال محصلہ فی دارالحرب پر اسی کی ملکیت ثابت رہے گی۔

قلت ویدل علی ذالک ما فی السیر الکبیر و شرحہ حیث قال واذا دخل المسلم دار الحرب بامان فلا بأس بان یاخذ منهم اموالهم بطیب انفسهم بای وجه کان لانه انما اخذ المباح علی وجه عری عن الغدر فیکون ذلک طیبا له والاسیر والمستامن سواء حتی لو باعهم درهما بدرهمین اوباعهم میتة بدراهم اواخذ مالاً منهم بطریق القمار فذلک کله طیب له اه منقحا۔

(ردالمحتار ج۴ مجمع الانہر ج۲)

دوسرا مطلب یہ ہے کہ مسلم مستامن دارالحرب میں رہتے ہوئے حربیوں سے عقود فاسدہ ربویہ کے ذریعہ جو مال حاصل کرتا ہے اس پر ربوا کا اطلاق نہیں ہوگا بلکہ جس طرح اشیاء مباحہ حطب، حشیش وغیرہ پر محض استیلاء موجب ملک ہے اسی طرح یہاں بھی ہے البتہ غدر وخیانت سے

بچنے کے لیے رضامندی ضروری ہے اور یہ بصورت عقد حاصل ہے اگرچہ عقد موجب ملک نہیں بلکہ موجب ملک تو استیلاء ہی ہے۔

ولهذا ان مال الحربي ليس بمعصوم بل هو مباح في نفسه الا ان المسلم المستامن منع من تملكه من غير رضاه لما فيه من الغدر والخيانة فاذا بذله باختياره ورضاه فقد زال هذا المعنى فكان الاخذ استيلاء على مال مباح غير مملوك وانه مشروع مفيد للملك كالاستيلاء على الحطب والحشيش وبه تبين ان العقد ههنا ليس بتملك بل هو تحصيل شرط التملك وهو رضاه لان ملك الحربي لا يزول بدونه ومالم يزل ملكه لا يقع الاخذ تملكا لكنه اذا زال فالملك للمسلم يثبت بالاخذ والاستيلاء لا بالعقد فلا يتحقق الربا لان الربا اسم لفضل يستفاد بالعقد — (بدائع الصنائع ص ۱۹۲ ج ۵)

الحاصل اتنی بات تو درست ہے کہ سود کے تحقق کے لیے بدلین کا معصوم و متقوم ہونا ضروری ہے اور اہل حرب کے اموال معصوم و متقوم نہیں لیکن اس پر یہ نتیجہ مرتب کرنا کہ پھر ہندوستان میں رہنے والے کافروں سے سود لینا جائز ہونا چاہیے اس نتیجہ کو مرتب کرنے سے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟

(۳) ہندوستان کا دارالحرب ہونا یا نہ ہونا ایک ایسا مسئلہ ہے کہ قطعیت کے ساتھ فیصلہ بہت ہی دشوار ہے اس لیے کہ اس مسئلہ میں جہاں تک اپنے اسلاف کی آراء کا سوال ہے تو ان کی آراء دونوں خانوں میں منقسم ہیں گو بعض رائے کے بارے میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان کی رائے اس وقت کی ہے جب انگریزوں کا تسلط تھا اور ان کے ظلم و استبداد کی زد میں پوری انسانیت تھی لیکن جب حالات نے کروٹ لیا تو کیا اب بھی وہی حکم باقی رہے گا۔ یا وہ حکم بدل گیا؟ یہ مستقل حل طلب امر ہے جہاں تک حضرات فقہا کی تصریحات کا سوال ہے تو اس سلسلے میں علاؤالدین حصکفیؒ فرماتے ہیں۔

"تنبيه" ومن مهمات هذا الباب معرفة الامام والدارين (اي دار الاسلام ودار الحرب) قال (ودارالاسلام ما يجرى فيها حكم امام المسلمين ودار الحرب ما يجري امور رئيس الكافرين (الكافي) وذكر الزاهدي انها من غلب فيه المسلمون وكانوا فيه آمنين ودار الحرب ما خافوا فيه من الكافرين .... وبخلاف ان دارالحرب تصير دارالاسلام باجراء بعض احكام الاسلام فيها — (سكب الانهر ص ۶۳۲ ج ۱)

ان تعریفات کی روشنی میں اگر ہندوستان کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنے میں کوئی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اس لئے کہ یقیناً موجودہ صورت حال ایسی ہی بن گئی ہے۔ کہ مسلمان کافروں سے خائف ہیں لیکن فتاویٰ بزازیہ میں ہے۔

والبلاد التی فی ایدی الکفرۃ الیوم لاشک انھا بلاد الاسلام لعدم اتصالھا ببلاد الحرب ولم یظھروا فیھا احکام الکفر بل القضاۃ مسلمون من قال منھم انا مسلم و شھد بالکلمتین یحکم باسلامہ .... وقد تقرر ان ببقاء الشئ من العلۃ یبقی الحکم وقد حکمنا بلا خلاف بان ھذہ الدیار قبل استیلاء التتار کانت من دیار الاسلام وبعد استیلائھم اعلان الاذان والجمع والجماعات والحکم بمقتضی الشرع والفتوی والتدریس ذائع بلا نکیر من ملوکھم فالحکم بانھا من بلاد الحرب لاجھۃ لہ نظرا فی الدراسۃ والدرایۃ واعلان بیع الخمور واخذ الضرائب والمکوس والحکم من الطاغوت فی مقابلۃ محمد علیہ الصلوۃ والسلام فی عھدہ بالمدینۃ ومع ذلک کانت بلدۃ الاسلام بلاریب، و ذکر الحلوانی رحمہ اللہ انما تصیر دارالحرب باجراء احکام الکفروان لایبقی فیھا مسلم ولا ذمی امنا بالامان الاول اعنی بامان اثبتھا الشارع بالایمان اوعقد الذمۃ فاذا وجدت الشرائط کلھا صارت دارالحرب وعند تعارض الدلائل والشرائط یبقی ماکان علی ماکان او یترجح جانب الاسلام احتیاطا الا یری ان دارالحرب تصیر دارالاسلام بمجرد اجراء احکام الاسلام اجماعا۔

(الفتاوی البزازیہ علی ھامش الھندیہ ص۳۱۲ ج۶)

اور اسی طرح کی عبارت مکب الانہر ص۶۳۴ ج۱ پر مذکور ہے۔

اس باب میں حلوانی کی عبارت خاصی واضح ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی دار کے دارالحرب ہونے کی تین شرطیں ہیں۔ (۱) کافروں کے احکام کا اجراء علی العلانیہ ہو اور حکام کفر کی بنیادوں پر فیصلہ کرتے ہوں (۲) اس دار کا کسی دارالحرب سے اس طور پر متصل ہونا کہ دارالاسلام سے مدد پہنچنے کی کوئی امکانی صورت نہ ہو۔

(۳) ایمان وامان موجب حفاظت نہ ہو بلکہ کافروں کا امان اصل ہو منطقی اعتبار سے ان شرائط کی

حیثیت مانعۃ الخلو کی ہے یہی وجہ ہے کہ اگر پہلی شرط بھی مفقود ہو گئی تو وہ دارالحرب نہیں کہلائے گا بلکہ اس پر دارالاسلام کا اطلاق کیا جائے گا جیسا کہ

"الا یری ان دارالحرب تصیر دارالاسلام بمجرد اجراء احکام الاسلام اجماعاً"

سے ظاہر ہے اور علامہ علاؤ الدین حصکفی فرماتے ہیں۔

وقال شیخ الاسلام والامام الاسبیجابی ان الدار محکومۃ بدارالاسلام ببقاء حکم واحد فیہا کما فی العمادیۃ وغیرہا۔ (سکب الانہر بہامش مجمع الانہر ص۶۳۲ ج۱)

اور آگے فرماتے ہیں۔

فالاحتیاط ان تجعل ہذہ البلاد دارالاسلام وان کانت ایدی فی الظاہر للملاعین ولہؤلاء الشیاطین، ربنا لا تجعلنا فتنۃ للقوم الظالمین ونجنا بر حمتک من القوم الکافرین کما فی المستصفی۔ (سکب الانہر ص۶۳۲ ج۱)

اس سے ظاہر یہی ہے کہ احتیاطاً اس دار کو دارالاسلام ہی کہا جائے گا جو کافروں کے زیر تسلط ہو۔ اور اگر شرائط ثلاثہ جس کا تذکرہ امام کردری نے "الجامع الوجیز" میں اور علامہ علاؤ الدین حصکفی نے "سکب الانہر" میں کیا ہے ان کا تجزیہ کیا جائے تو ہر شرط فی الجملہ ہندوستان پر غیر منطبق معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ قانونی و دستوری نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو بلا تفریق مذہب و زبان و علاقہ ہر شہری کو اپنے مذہبی شعائر کی آزادی کے ساتھ ملکی وسائل سے انتفاع کا حق دیا گیا ہے اور بنیادی طور پر ہر ایک مذہب والا اپنے مذہب کے احکامات پر عمل کرنے میں خود مختار ہے چنانچہ مساجد و مراکز و خانقاہوں کا وجود و قیام، اعیاد و اضحیہ و دیگر شعائر اسلام پر قانونی اعتبار سے کوئی پابندی نہیں، مذہب کا اشتہار و تشہیر بشکل تبلیغ یا تقریر یا تحریر ہر مذہب والا کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہو رہا ہے، دستوری اعتبار سے مسلم پرسنل لاء کا تحفظ بھی موجود ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لیے دلائل و شرائط کا تعارض تسلیم کر لیا جائے کہ ممکن ہے کسی کے پاس اس کے دارالحرب ہی ہونے کے دلائل و شرائط ہوں تب امام کردری کے اس قول کو فیصل مان لیا جائے۔ وعند تعارض الدلائل والشرائط یبقی ما کان علی ما کان او یترجح جانب الاسلام احتیاطاً۔ (البزازیہ بہامش الہندیہ ص۲)

گو حضرات فقہاء نے دار کو دارالاسلام و دارالحرب میں منحصر کیا ہے جیسا کہ عبارات فقہاء سے ظاہر ہے لیکن وجدانی طور پر دار کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیے۔

(۱) دارالاسلام (۲) دارالکفر اور پھر دارالکفر کی دو قسمیں ہونی چاہئیں (۱) دارالامن (۲) دارالشر

والفساد جس کا دوسرا نام دارالحرب قرار دیا جائے اور پھر دارالامن کو امن و امان کی بنیاد پر دارالاسلام کا حکم دیا جائے اور دارالشر والفساد کو شر و فساد کی بنیاد پر دارالحرب قرار دیا جائے اور اس کی نظیر اس کو بنا سکتے ہیں کہ مکۃ المکرمہ سے حبشہ بہت سے صحابہ ہجرت کر کے گئے باوجودیکہ حبشہ دارالاسلام نہیں تھا لیکن اس کو دارالحرب بھی نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ صحابہ پورے شعائر کے ساتھ رہے بلکہ اس کو دارالکفر کہنا چاہیئے اس لیے کہ زمام کار مسلمان کے ہاتھ میں نہیں تھا اور مکہ مکرمہ بھی اس وقت دارالکفر ہی تھا اس لیے کہ زمام کار کافروں کے ہاتھ میں لیکن صحابہ کے لیے حبشہ دارالامن تھا اور مکہ مکرمہ دارالشر والفساد تھا۔ اس تقسیم میں کافی وسعت ہے لیکن اسلاف کے کلام سے تائید نہیں ملتی اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس تقسیم کے اعتبار سے تو دارالاسلام کی بھی دو قسمیں ہونی چاہیے۔ (۱) دارالامن (۲) دارالشر والفساد اس لیے کہ حالات حاضرہ اس کے متقاضی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ دارالاسلام چاہے اپنے ساکنین کے لیے دارالامن ہو یا دارالشر اگر اسلامی قوانین، حدود و قصاص کا اجراء ہو رہا ہے تو وہ دارالاسلام ہی رہے گا دارالشر والفساد ہونے سے دارالاسلام ہونے سے خارج نہیں ہوگا جیسے مدینہ طیبہ میں منافقین آئے دن شر و فساد پھیلاتے رہتے تھے لیکن وہ دارالاسلام ہی رہا دارالاسلام سے خارج نہیں ہوا۔ هذا ما عندی ولعل عند غيری احسن منه والله تعالیٰ اعلم وعلمه اتم واحكم۔

(۴) اگر گھر میں حفاظت کی کوئی شکل ہو تو بینک میں روپیہ ہی نہیں رکھنا چاہیے بدرجہ مجبوری رکھنے کی اجازت ہے اس لیے کہ یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ بینک کا سارا نظام سودی ہے اور جتنا روپیہ جاتا ہے وہ سب اس نظام کے تحت استعمال کیا جاتا ہے اور نص قطعی ہے: "ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" اور یہ روپیہ بینک میں رکھنے کی صورت میں تعاون علی الاثم لازم آئے گا جو ممنوع ہے اسی وجہ سے حضرت گنگوہی و حضرت تھانوی نے اپنے فتاویٰ میں بینک میں روپیہ جمع کرنے کو نادرست قرار دیا ہے لیکن گھر میں غیر محفوظ علی شرف الخطر ہونے کی صورت میں "الضرورات تبيح المحظورات" کے تحت رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی کوشش اس کی ہو کہ "لاکر" لیکر اس میں رکھ دیا جائے۔ یا پھر کرنٹ اکاؤنٹ کھول کر اس میں جمع کر دیا جائے لیکن اگر یہ دونوں صورتیں نہیں اپنائی گئیں بلکہ چالو کھاتہ کھلوا کر رقم جمع کیا ہے پھر اس پر سود ملے اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے خواہ سرکاری ادارہ ہو یا غیر سرکاری اس لیے کہ وہ اپنی عبادت گاہوں میں اسے استعمال کرتے ہیں اور یہ بھی تعاون علی الاثم کے دائرہ میں داخل ہے اور اگر اس سے اپنی عبادت گاہ وہ نہ بنائیں تو یقیناً وہ پیسہ کسی دوسرے راستے سے اسلام دشمنی پر خرچ ہوگا یا اس سے اپنی پوزیشن وہ مضبوط کریں گے جو نتیجہ کے اعتبار سے

اسلام اور مسلمان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا اس لیے "اذا ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما" ضابطہ کے اہون یہی ہے کہ اسے لے لے بینک میں نہ چھوڑے ۔

اب دوسرا سوال اس کے مصارف کے سلسلہ میں پیدا ہوتا ہے کہ اسے کہا صرف کیا جائے؟ اس کے مصارف کی تعیین سے قبل یہ متعین کرنا ضروری ہے کہ اس مال کی حیثیت کیا ہے؟——

—————— تو اس کے سود ہونے کی وجہ سے مال حرام ہونا متعین ہے اور مال حرام کا صدقہ کرنا واجب ہے "اذا حصل بسبب خبیث وھو التصرف فی مال الغیر ومنا ھذا حالہ فسبیلہ التصدق ۔ (ھدایہ) لہٰذا سود کا واجب التصدق ہونا متعین ہوگیا ۔ اب اس کے مصارف تین ہیں ۔ (۱) فقراء کو دینا (۲) غیر واجبی ٹیکس اس سے ادا کرنا۔

(۳) رفاہ عام کنواں نل بیت الخلا وغیرہ میں لگانا ان مصارف ثلاثہ میں سے مصرف اول یعنی فقراء کو دینا تو متفق علیہ ہے اس میں اکابر واصاغر کا کوئی اختلاف نہیں چنانچہ علامہ علاؤالدین حصکفی فرماتے ہیں

الفقراء مصرفہ عند جھل اربابہ (در المختار ص۳۲۳ ج ۴)

اسی طرح حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ومفتیانِ دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں کہ فقراء پر صدقہ کردینا چاہیئے ۔ لیکن فقراء کو دینا بھی لابشرط شئ نہیں بلکہ بشرط شئ ہے اب ان شرائط کو عرض کرتا ہوں ۔

(۱) فقراء مسلمین ہوں غیر مسلمین نہ ہوں اس لیے کہ جب اس کا واجب التصدق ہونا متیقن ہوگیا تو واجب التصدق اموال جیسے زکوٰۃ، صدقۃ الفطر وغیرہ جس طرح غیر مسلم کو دینا جائز نہیں اسی طرح سود بھی غیر مسلم کو دینا جائز نہیں ۔

(۲) بلانیت ثواب دیا جائے اس لئے کہ مال حرام بہ نیت صدقہ دینا بہت خطرناک ہے چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں۔

"رجل دفع الی فقیر من المال الحرام شیئاً یرجو بہ الثواب یکفر"۔

(رد المحتار ص۲۹۲ ج ۲ کتاب الزکوٰۃ)

اسی طرح ملا علی قاری نے بھی شرح فقہ اکبر میں تصریح کی ہے۔

"وفی المحیط من تصدق علی فقیر شیئاً من الحرام یرجو الثواب کفر"

(ص۲۳۳)

ہاں البتہ تعمیل حکم پر ثواب ملے گا۔

"کما صرح بہ العلامۃ انور شاہ الکشمیری" فمن صرح بالاجر بالتصدق فی مثلہ فالغرض الاجر بامتثال حکم الشریعۃ" (معارف السنن ص۳۳ ج۱)

لیکن صدقہ کرنے والا تو صرف فراغ ذمہ وسبکدوشی کی نیت سے دیدے۔

"والظاہر ان المتصدق بمثلہ ینبغی ان ینوی بہ فراغ ذمتہ ولا یرجو بہ المثوبۃ" (معارف السنن ص۳۳ ج۱)

(۴) ان اعزار کو نہ دیا جائے جن کو زکوٰۃ وغیرہ دینا جائز نہیں۔ الغرض واجب التصدق اموال کی طرح سود کی رقم میں بھی شرائط کا لحاظ کرنا ضروری ہوگا۔

مصرف ثانی غیر واجبی ٹیکس میں سود کی رقم کو دینا ہے اس ملک میں بہت سے ٹیکس غیر واجبی ہیں ان میں سود کی رقم دی جاسکتی ہے اب تک ناکارہ کے علم میں اس مصرف کے بارے میں بھی کسی کا اختلاف نہیں اور غیر واجبی ٹیکس میں دینے کی اجازت یہاں سے ملتی ہے کہ مال حرام کا مالک اگر معلوم نہ ہو اور نہ معلوم کرنا ممکن ہو تب فقراء پر تصدق واجب ہے۔ اور اگر معلوم ہو تو مالک کو پہونچانا ضروری ہے اگر مالک زندہ نہ ہو تو اس کے ورثاؤ کو دیدے چنانچہ علامہ علاؤالدین حصکفی فرماتے ہیں۔ علیہ دیون ومظالم وجہل اربابھا وایس من معرفتھم فعلیہ التصدق بقدرھا من مالہ (درالمختار ص۳۳۶ ج۴، کتاب اللقطۃ) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تصدق اسی وقت واجب ہے کہ مالک کا سراغ لگنا مشکل ہوجائے سود کی رقم جب بینک سے حاصل ہوتی ہے تو اس اعتبار سے مالک معلوم ہے کہ بینک حکومت کی ملکیت ہے اس لیے کہ جب بینک کا نقصان ہوتا ہے تو اس کی تلافی حکومت ہی کرتی ہے کھاتہ داروں سے اس سے کوئی مطلب نہیں اور جو نفع ہوتا ہے وہ بھی فی الجملہ حکومت کے خزانہ کا ایک جز ہوتا ہے لہٰذا حکومت پر رد غیر واجبی ٹیکس کی ادائے گی کے ذریعہ کردیا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ضروری ہے کہ غیر واجبی ٹیکس ہی کے ذریعہ حکومت کے خزانہ میں یہ رقم پہونچائی جائے بلکہ اسے بینک ہی میں چھوڑ دیا جائے تو اس کا جواب اس سے پہلے آچکا ہے کہ اس کے ذریعہ غیر مسلمین کی پوزیشن مضبوط کی جائے گی یا اسے ایسی جگہ استعمال کیا جائے گا جس میں اسلام یا مسلمانوں کا نقصان ہو یا پھر وہ سودی کاروبار کا جزبنے گا یہ بھی تعاون علی الاثم کے تحت ممنوع ہے۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ یہ تو اچھا نسخہ ہے کہ غیر واجبی ٹیکس ادا کرنے کی نیت سے بینک

میں رقم جمع کرادی جائے اور جب سود ملے تو اس سے غیر واجبی ٹیکس ادا کردیا جائے ؟ تو اس کا جواب بھی ابھی یہ ہی کے تحت گذر چکا ہے کہ اصل حکم تو یہی ہے کہ بینک میں رقم ہی جمع نہ کی جائے۔ لیکن بدرجۂ مجبوری گھر میں حفاظت کی شکل نہ ہونے کی صورت میں بینک میں جمع کرنے کو جائز کیا گیا ہے اسی وجہ سے فکس ڈپوزٹ کو ناجائز کیا گیا ہے کہ بلاضرورت متعین میعاد تک کے لیے رقم جمع رکھنے کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ رقم دوگنی ہو کر ملے گی غرض کہ شروع ہی سے نیت سود لینے کی ہوتی ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ غیر واجبی ٹیکس ایسا ہو جس کا تعلق حکومت کے خزانہ سے ہو یعنی اس مد کی رقم حکومت کے خزانہ میں جاتی ہو۔

لیکن غیر واجبی ٹیکس میں بھی اس سودی رقم کو دے سکتے ہیں جو ایسے بینک سے حاصل ہوئی ہو جو شخصی اور غیر سرکاری نہ ہو بلکہ سرکاری ہو اگر غیر سرکاری بینک ہے تو اس رقم کا غیر واجبی ٹیکس میں دینا جائز نہ ہوگا اس لیے کہ اس صورت میں مالک پر عود نہیں ہوسکے گا۔ اس لیے غیر سرکاری بینک سے حاصل ہونے والی سودی رقم کا مصرف اول یعنی فقراء پر تصدق متعین ہے۔ لیکن سود کی رقم لینے کے سلسلے میں سرکاری وغیر سرکاری دونوں بینکوں کا حکم ایک ہے اس لیے کہ تعاون علی الاثم وتعاون علی مخالفۃ الاسلام وتقویۃ اعداء اسلام دونوں صورتوں میں لازم آئے گا لہٰذا بینک سرکاری ہو یا غیر سرکاری سود بینک میں ہرگز نہیں چھوڑا جائے گا۔

مصرف ثالث رفاہی چیزوں میں سود کے پیسوں کا استعمال ہے لیکن یہ مصرف شدید اختلافات کا شکار ہے چنانچہ خود اکابرین کی دو طرح کی مطبوعہ رائیں ملتی ہیں لیکن ناکارہ کے نزدیک راجح دلیل کے اعتبار سے رفاہِ عام میں خرچ کرنے کا عدم جواز ہے اس لیے کہ یہ بات پہلے معلوم ہوچکی ہے کہ سود حرام ہے اور مال حرام کا مالک نہ ملنے کی صورت میں صدقہ کرنا واجب ہے اور صدقہ کی حقیقت "العطیۃ" ہے اور اس کا رکن نفس الاداء الی المعرف ہے جس کا حاصل فنی التملیک کالازم کا قہ ہے اور رفاہی کاموں میں لگانے کی صورت میں تملیک کا تحقق نہیں ہو پائے گا۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"اذا کانت لقطۃ او غصبا او رشوۃ الخ والفقراء مصرفہ عند جھل اربابہ"۔ (ردالمحتار ص۳۲۴ ج۳ کتاب اللقطۃ)

نیز امام کردری رحمۃ اللہ علیہ کے اس جزئیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو بجامع الوجیز"

میں ہے نیز امام ابویوسفؒ کی کتاب الآثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے مفتی محمد شفیع صاحب مفتی مہدی حسن صاحب اور حضرت مفتی محمود حسن صاحب مدظلہ و دیگر اکابرین بھی اسی کے قائل ہیں کہ سود کے پیسے کو مدارس کی تعمیر، کنواں، راستہ، نل رفاہ عام میں لگانا جائز نہیں۔

اور اگر اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو "اذا اجتمع الحلال والحرام فغلب الحرام" یا "اذا اجتمع المبیح والمحرم فغلب المحرم" سے بھی جانب عدم جواز احوط معلوم ہوتا ہے۔

دلائل کے اعتبار سے ناکارہ کے نزدیک راجح تو یہی ہے کہ رفاہی کاموں میں سود کے پیسوں کو استعمال نہ کیا جائے لیکن اکابرین کے اس اختلاف سے بچنے کے لیے اب تک ناکارہ اس صورت کو مختلف فیہ قرار دیکر متفق علیہ پر عمل کے ارجح ہونے کا فتویٰ دیتا رہا۔

(۵) لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربا وموکلہ۔ (الحدیث، مشکوٰۃ شریف ص۲۴۴) کا عموم سود لینے دینے والے کو یکساں طور پر شامل ہے لہٰذا جس طرح سود لینے والا گنہ گار ہے اسی طرح سود دینے والا بھی گنہ گار ہے۔ یہاں البتہ کاروباری لائن میں بعض شکلیں ایسی ہیں جن میں مجبوراً سود دینا پڑتا ہے اور زبردستی سود کے نام پر رقم وصول کرلی جاتی ہے مثلاً ایک کاشتکار نے بوائی کے وقت دوسرے کاشتکار سے ایک من غلہ لیا وہ کٹائی کے وقت اس کے بدلہ ڈیڑھ من لیتا ہے جبکہ آدھا من زائد سود ہوا لینے والا گنہ گار ہوگا دینے والا نہیں۔ (محمودیہ ص۲۴۳ ج ۴) اسی طرح بیمہ کو ناجائز کہا گیا ہے اس لیے کہ سود وجوا پر مشتمل ہوتا ہے لیکن اگر بغیر بیمہ کے مال کی حفاظت نہ ہوسکتی ہو یا قانونی مجبوری ہو تو جائز قرار دیا گیا ہے جس طرح بیمہ کے مسئلہ میں بھی گنجائش نکل سکتی ہے اور جس طرح سود حرام ہے اسی طرح رشوت بھی حرام ہے لیکن بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں رشوت دینے والا گنہ گار نہیں ہوتا جس کی تفصیل ردالمحتار میں ہے اسی طرح سود کے مسئلہ میں اسی صورت کا وجود مستبعد نہیں البتہ سود لینے والا ہر حال میں گنہگار ہوگا الا یہ کہ اضطرار کی حالت ہو لیکن سود دینا کن صورتوں میں ناجائز ہے اور کن صورتوں میں گنجائش نکل سکتی ہے اس کی تعیین کے لیے اصولی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا جب تک واقعہ سامنے نہ ہو اور اس کے تمام اجزاء پر مع مالہ وما علیہ گہری نظر نہ ڈال لی جائے۔

(۶) ہاں البتہ سودی قرض لینے کی حضرات فقہاء نے بعض صورتوں میں اجازت دی ہے اور اس باب میں سرمایۂ کل حموی کا ذکر کردہ وہ جزئیہ ہے جو اشباہ مع الحموی ص۱۲۹ پر مذکور ہے: "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محتاج سودی قرض لے سکتا ہے لیکن محتاج کی کوئی توضیح وتشریح نہیں کی ظاہر یہی ہے کہ محتاج سے مراد ایسا شخص ہے جو کمائی پر قدرت نہ رکھتا ہو، بغیر قرض کے

گذارہ کی کوئی صورت نہ ہو، اور قرض بغیر سود کے ملتا نہ ہو، چونکہ ایسا شخص اپنی مجبوری کی حد تک معذور ہے اس لیے گنہگار نہیں ہوگا۔

لیکن کیا وہ لوگ جو صاحبِ ثروت ہیں لیکن قانونی گرفت سے اس قدر مجبور ہیں کہ بلا واسطہ وہ کوئی کام نہیں کر سکتے اگر کارخانہ لگانا ہے فیکٹری بنانی ہے جیپ یا ٹریکٹر خریدنا ہے تو بغیر بینک کے واسطہ کے نہیں خرید سکتے اور ہرگز نہیں خرید سکتے، اگر خرید لیا تو لینی کی دینی پڑ جاتی ہے اور اگر براہ بینک آپ وہ کام کرتے ہیں تو جھک مار کے آپ کو سود دینا ہوگا ورنہ کڑکی ہو جائے گی۔ اب ان حالات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امت مسلمہ کو صرف یہ کہدینے سے علماء و مفتیان کرام بری ہوجائیں گے کہ کیا ضرورت ہے ٹرک و ٹریکٹر و جیپ لینے کی۔ اور کیا ضرورت ہے کارخانہ لگانے کی۔

جبکہ اس گئے گذرے دور میں بھی ایسے افراد ہر جگہ موجود ہیں جو جائز طریقہ کے متلاشی ہیں۔ اور ان کی نگاہیں مفتیان کرام کے قرطاس و قلم پر جمی ہوئی ہیں۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ جس طرح تصویر کھینچوانا حرام ہے لیکن جب قانونی طور پر تصویر لازمی قرار دیدی گئی تو تصویر کھنچوانا جائز ہو گیا۔

اور بیمہ، سود و جوا کی وجہ سے حرام ہے لیکن قانونی مجبوری کی وجہ سے بیمہ جائز ہوگیا کہ بغیر انشورنس کے گاڑی روڈ پر نہیں آسکتی۔ جیسا کہ اکابرین کے فتاوی میں اس کی تصریح موجود ہے۔ تو کیا کاروباری لائن میں براہِ بینک کاروبار کو عملی شکل دینے کی شرط قانونی مجبوری کے تحت داخل نہیں اور کیا ایسا صاحب ثروت کاروباری مجبوری کی حد تک معذور نہیں۔ ناکارہ کے فہم ناقص کے مطابق تو ان جزئیات سے جواز کے اشارے ملتے ہیں لیکن ناکارہ کو اس پر اصرار نہیں۔ تاہم یہ پہلو رجحان سے خالی بھی نہیں ہے۔ اربابِ افتاء کی خصوصی توجہ درکار ہے۔ البتہ ایسا شخص جس کا کاروبار بقدر کفاف ہی نہیں بلکہ اس سے بہت زائد ہے اور کاروبار ایسا ہے کہ اس میں بینک کا کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن بر بنائے محبت دنیا اس کاروبار کو وہ پھیلانا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی موجود پونجی موجودہ کاروبار میں مشغول ہے۔ اگلے پروگرام کو وجود دینے کی اس پونجی میں سکت نہیں۔ اس نے اس موقعہ پر بینک کا سہارا لیا اور سودی قرض (لون) لے کر اگلے پروگرام کو بڑھایا تو ایسے شخص کو سودی قرض لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی چونکہ یہ شخص نہ محتاج ہے کہ بجوز الخ جزئیہ کا ترتب ہوسکے اور نہ مجبور ہے کہ الضرورات الکلیہ کے تحت اسے معذور قرار دیا جاسکے واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

(۷) اس سوال کا جواب بھی سوال نمبر ۵ کے جواب کے ضمن میں آچکا ہے کہ اگر محتاج ہے تو جائز ہے اور اگر مجبور ہے تو بدرجۂ مجبوری بوقت مجبوری معذور ہے۔

ـــــــــــــــــ اور اگر نہ محتاج ہے نہ مجبور ہے تب گنہگار ہوگا تاہم یہ بات ذہن میں رہے کہ جہاں تک فی نفسہٖ قرض کی بات ہے اس کا لینا تو قرض کے درجہ میں جائز ہے لیکن چونکہ یہ قرض مفضی الی امر حرام ہے اس لیے ایسے قرض کا لینا ہی ممنوع قرار دیا گیا، الّا یہ کہ محتاج یا مجبور ہو۔ جس طرح حضرات فقہاء نے جوان کو روزہ کی حالت میں بیوی کا بوسہ لینے سے منع کیا ہے کہ بوسہ فی نفسہٖ حرام نہیں بلکہ جوان ہونے کی وجہ سے اس کا بوسہ حرام کام کی طرف مفضی ہوسکتا ہے اس لیے بوسہ ہی سے روک دیا گیا۔ بخلاف بوڑھے کے کہ اس کے لیے ممنوع نہیں۔

فتاوی محمودیہ میں ہے۔ سوال۔ گورنمنٹ کی طرف سے کاشت کاروں کو بونے کے لیے سود پر غلہ اور کھ فصل پر دی جاتی ہے۔ فصل کٹنے پر جتنا دیا جاتا ہے اس سے زیادہ مقدار میں لے لینا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سود ہے۔ جواب۔ کاشت کار کو جو ملا ہے وہ قرض ہے سود نہیں پھر اس سے جو مقدار زائد واپس لی گئی ہے وہ سود ہے۔ صـ ۲۴۲ ج ۴۔

⑧ اگر سرکاری چھوٹ سے فائدہ اٹھانے کی صورت میں سود دینے کی نوبت نہ آئے تو اس کے لینے میں بظاہر کوئی مضائقہ نہیں چاہے وہ اپنے یہاں چھوٹ والی رقم کو جس نام سے درج کرے۔

واللّٰہ تعالیٰ اعلم۔

⑨ اس کا جواب بھی سوال ۸ کے جواب کے ضمن میں آچکا ہے ناکارہ کی ناقص سمجھ کے اعتبار سے تو غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں حکومت جو سود لیتی ہے شرعاً حکومت کو اس کا کوئی حق نہیں لیکن بدرجۂ مجبوری جس طرح انکم ٹیکس سیل ٹیکس وغیرہ دینا پڑتا ہے۔ اسی طرح حکومت سود کے نام پر گویا کہ بیرونی ملک سے تجارت کا ایک ٹیکس لیتی ہے۔ گو اس کے بعد اصل ٹیکس بھی وصول کرتی ہے لیکن اس کی بھی حیثیت ٹیکس ہی کی ہے۔ گو حکومت کی اصطلاح میں اس کا نام سود ہے۔ اس لیے بیرونی ملک سے تجارت کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم۔

⑩ بینک خواہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری اگر مقدار قرض سے زیادہ وہ ادارہ قرض خواہ سے وصول کرتا ہے تو "کلّ قرضٍ جرّ نفعاً حرام" (ردالمختار صـ ۱۶۶ ج ۴) کے تحت دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ سود کی رقم کی ادائیگی میں فرق ہوگا۔ جس کی تفصیل سوال ۲ کے جواب میں آچکی ہے۔

⑪ جن کمپنیوں کا تذکرہ سوال ۱۱ میں ہے ان کمپنیوں کے واسطہ سے ٹرک وغیرہ خریدنے کی اجازت نکل سکتی ہے اس طور پر کہ خریدار اپنا پیسہ اپنے پاس محفوظ رکھے اور کمپنی سے رابطہ قائم کرکے اس سے کہے کہ

مجھے ایک ٹرک لینا ہے۔ فرض کیجئے اس کی قیمت تین لاکھ -/۳۰۰۰۰۰ ہے لیکن اس پر کمپنی سود کے نام سے جو رقم لے گی وہ تیس ہزار -/۳۰۰۰۰ ہے تو کمپنی والے اپنی اس زائد رقم کو اصل قیمت کے ساتھ شامل کر کے کل ثمن ۳ لاکھ ۳۰ ہزار قرار دیں اور خریدار سے کہیں ہم آپ کو ۳ لاکھ ۳۰ ہزار میں ٹرک دیں گے اور خریدار اس کو منظور کر لے اب گویا کہ ۳ لاکھ ۳۰ ہزار میں خریدار نے ٹرک خریدا ہے جب ۳۰ ہزار کو ثمن کا جز قرار دے دیا جائے گا تب خریدار سود دینے والا نہیں کہلائے گا اور ٹرک حاصل ہونے کے بعد ایک مشت خریدار کمپنی کو رقم ادا کر دے گا، لیکن یہ اسی شخص کے لئے ہے جس کے پاس پوری رقم موجود ہو لیکن قانونی مجبوری کی وجہ سے ٹرک نہ خرید سکتا ہو۔ ایسے شخص کے لیے بینک کا واسطہ لینے سے یہ بہت اَہْوَن ہے اس لیے کہ یہ شکل جو اوپر جواز کی ذکر کی گئی۔ بینک میں اس کا اجرا مشکل ہے اس لیے کہ بینک سے تو ضرورت ظاہر کر کے قرض لینا پڑتا ہے جب کہ یہ شخص ضرورت مند نہیں ہے۔ پھر یہ سود کیسے دے سکتا ہے بخلاف کمپنی کے واسطہ کے وہاں قرض لینے کی ضرورت نہیں صرف اپنی پونجی کی حفاظت کے لیے اور کمپنی کے واسطہ کو بطور "شو" کے استعمال کر رہا ہے ہاں اگر اتنی رقم نہ ہو جس سے ٹرک خرید سکے اس کو بہر حال قرض لینا ہے اب یہ چاہے بینک سے قرض لے کر بینک کو سود ادا کرے یا پرائیویٹ کمپنی سے قرض لے کر سود ادا کرے بہر حال اس کو سود ادا کرنا ہے اور یہ نہ محتاج ہے نہ مجبور اس لیے اس کے لیے یہ جائز نہ ہوگا۔ الا یہ کہ یہ شخص وہی صورت اختیار کرے یعنی جز و ثمن کل رقم کو قرار دے کر کمپنی ہی سے ٹرک لے اور کمپنی والے پوری رقم کو ثمن قرار دیں تب اہل افتاد کے لیے یہ صورت بھی محل غور ہو گئی اور اصل ثمن سے زائد رقم جس کو کمپنی سود کا نام دے رہی ہے خریدار اس کو حق المنت یا دلالی کے دائرہ میں داخل کر سکتا ہے یا نہیں اس پر غور و فکر کی ضرورت ہو گی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

سودی معاملات
شریعت کی نظر میں

مولانا مفتی نسیم احمد قاسمی مظفرپوری
رفیق مجمع الفقہ الاسلامی (الہند)

(۱) ربوا کی لغوی تعریف: ـــــ ربوا لغت میں مطلق زیادتی اور اضافہ کو کہتے ہیں (۱) صاحب معجم لغۃ الفقہاء ربوا کی لغوی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"الربا: بکسر الراء مصدر رباالشئی یربو ربواً: اذا زاد" (۲) ربا راء کے کسرے کے ساتھ ربا الشئی یربو ربواً سے ماخوذ ہے۔ یہ جملہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کسی چیز میں اضافہ ہوتا ہے علامہ ابوالقاسم الحسین بن محمد راغب اصفہانی (المتوفی ۵۰۲ھ) مفردات القرآن میں ربوا کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"الربا: الزیادۃ علی راس المال لکن خص فی الشرع بالزیادۃ علی وجہ دون وجہ" ربوا لغت میں راس المال پر زیادتی کا نام ہے، اور شریعت میں ایک مخصوص زیادتی کو ربوا کہا جاتا ہے۔

ربوا کی اصطلاحی تعریف: ـــــ صاحب معجم لغۃ الفقہاء نے ربوا کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: "کل زیادۃ مشروطۃ فی العقد خالیۃ عن عوض مشروع" (۴)

ربوا ہر وہ زیادتی ہے جو عقد میں مشروط ہو اور عوض مشروع سے خالی ہو۔ فقہاء نے ربوا کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی ہے: "اموال ربویہ میں سے کسی چیز کا ہم جنس کے ساتھ تبادلہ کرنے کا معاملہ کیا جائے اور اس میں کسی ایک جانب سے بلاعوض اضافے کا دینا بھی مشروط ہو۔ یعنی اضافہ کی شرط بطور جزو معاہدہ ہو" اس طرح کے معاملے کے نتیجے میں جو اضافہ ہوگا وہ "ربوا" کہلائے گا۔(۵) صاحب درمختار ربوا کی شرعی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"وشرعاً فضل خال عن عوض بمعیار شرعی مشروط لاحد المتعاقدین فی المعاوضۃ" (۶)

---

(۱) درمختار علی ہامش الطحطاوی صفحہ ۱۰۰ جلد ۳۔ (۲) معجم لغت الفقہاء صفحہ ۲۱۸ مطبوعہ بیروت، (۳) مفردات القرآن صفحہ ۱۸۸ مطبوعہ بیروت۔ (۴) معجم لغت الفقہاء صفحہ ۲۱۸ (۵) بینک، انشورنس اور سرکاری قرضے صفحہ ۱۰ (۶) درمختار علی ہامش الطحطاوی صفحہ ۱۰۰، جلد ۳۔

ربوا شرعاً لین دین کے سلسلے میں فریقین میں سے کسی ایک کے لیے ایسے اضافہ کا نام ہے جو عوض سے خالی ہو۔ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی ربوا کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "کیلاً یا وزناً احد المتجانسین کی زیادتی دوسرے پر معاوضۂ مالیہ میں بلا عوض ربوا ہے۔"[1]

ربوا کا دائرہ :— ربوا کی تعریف صادق آنے کے لیے چار اسباب کا پایا جانا ضروری ہے:

(۱) ہم جنس چیز کے تبادلہ کا معاملہ ہو۔

(۲) وہ جنس "اموال ربویہ" میں سے ہو

(۳) اضافہ ایک ہی جانب سے ہو۔ یعنی دوسری جانب سے اس کا کوئی واقعی ایسا بدل نہ ہو، جسے شرعاً بدل قرار دیا جا سکے۔

(۴) اس اضافہ کا لینا دینا عقد معاملہ کرتے وقت ہی بطور لازمی جز کے طے ہو چکا ہو۔

ربوا کے پائے جانے کے لیے مذکورہ بالا چاروں چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے اگر ان میں سے ایک چیز بھی موجود نہ ہو گی تو وہ اضافہ شرعاً "ربا" نہیں کہلائے گا۔ اور اس کا لینا دینا جائز قرار پائے گا۔

چنانچہ اگر کوئی شخص دوسرے کسی شخص سے قرض لیتا ہے اور قرض کا معاملہ کرتے وقت اضافہ کی نہ شرط کی تھی نہ نیت۔ لیکن اگر اس صورت میں بوقت ادائے گی کچھ زیادہ دیتا ہے تو اس اضافہ کا لینا اور دینا دونوں جائز ہوگا۔ کیونکہ "ربوا" کے چار اسباب میں سے ایک سبب (اضافہ بوقت عقد مشروط ہو) نہیں پایا گیا۔

ربوا کا تحقق کب ہوگا؟ —— "ربوا" کے وجود و تحقق کیلئے مذکورہ بالا اسباب کے علاوہ فقہاء نے چند شرطیں بھی لکھی ہیں، ان شرطوں کے پائے جانے کے بعد ہی "ربوا" کا تحقق ہو سکے گا۔ ان میں سے۔

۱— بدلین کا معصوم[2] اور ذی قیمت ہونا۔

۲— ہر دو بدل کا متعاقدین میں سے کسی ایک کی ملکیت میں ہونا

۳— ہر دو بدل کا اس مشترک مال میں سے نہیں ہونا جس میں ہر دو فریق عنان[3] یا مفاوضہ[4]

---

[1] مجموعۃ الفتاویٰ اردو، صفحہ ۱۳۹، جلد ۲۔ [2] معصوم سے وہ مال مراد ہے جو کسی کی ملک میں ہو اور اس پر دوسرے کا قبضہ اور تصرف جائز نہ ہو اور ایسا کرنا باعث گناہ ہو بعد اس کو ضائع کرنے کی صورت میں ضمان واجب ہوتا ہو۔ [3] اس میں نہ تو سرمایہ کا برابر ہونا ضروری ہے اور نہ نفع میں برابری شرط ہے اس میں ہر شخص شریک ہو سکتا ہے خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ [4] شرکت مفاوضہ میں سرمایہ اور نفع میں برابری ضروری ہے اس میں شرکاء میں سے ہر ایک کو دوسرے کے مال میں تصرف (یعنی خرید و فروخت کرنے کرایہ پر لینے اور دینے) کا حق حاصل ہوتا ہے۔

کے شریک ہیں۔

لہٰذا حربی (کافر) یا وہ مسلمان جس نے دار الحرب سے ہجرت نہیں کی اس کا مال اس مسلمان کے لیے جو دار الاسلام میں رہتا ہے اور قید ہو کر دار الحرب چلا گیا ہے۔ یا وہ مسلمان جو اجازت (ویزا) لے کر دار الحرب میں تجارت کے لیے گیا ہے۔ اس کے لئے معصوم اور متقوم نہیں؛ اس لئے اگر معاملہ میں کوئی غدر و دھوکہ نہ کیا جائے تو اس قیدی اور تاجر کے لیے جس کا بیان اوپر ہوا حربی (کافر) اور مسلم غیر مہاجر کا مال" ربوا" کی صورت میں بھی لینا جائز ہوگا۔ اس لیے کہ یہ صورتاً تو " ربوا" ہے لیکن شرط[1] موجود نہیں ہے، اس لیے " ربوا" کا تحقق نہیں ہوگا۔ اسی طرح غلام اور اس کے آقا کے درمیان اور باہم شرکت مفاوضہ یا شرکت عنان رکھنے والے دو شخصوں کے درمیان مال شرکت میں " ربوا" کا تحقق نہیں ہوتا۔ علامہ شامی شرنبلالیہ کے حوالے سے " ربوا" کی شرائط ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

" ربوا" کے متحقق ہونے کی شرطوں میں سے یہ ہے کہ عوضین مال معصوم ہوں اور ضائع ہونے پر ان دونوں کا تاوان واجب ہوتا ہو۔ لہٰذا صرف ایک طرف کے عوض کا معصوم اور غیر متقوم ہونا اس معاملے کے جواز کے لیے مانع نہ ہوگا، لہٰذا قیدی یا تاجر کا حربی یا دار الحرب کے ایسے مسلمان کا مال جس نے ہجرت نہ کی ہو، اسی جنس کے مال کے بدلے میں اضافہ کے ساتھ خریدنا درست ہے۔ ربوا کی شرطوں میں سے یہ بھی ہے کہ عوضین فریقین میں سے کسی ایک ہی کی ملک نہ ہوں، جیسے آقا کا معاملہ اپنے غلام کے ساتھ (کہ غلام کی طرف سے جو عوض ہے اس کا مالک بھی آقا ہی ہے، کیونکہ غلام خود کسی شئ کا مالک نہیں ہوتا ہے) اور نہ فریقین میں شرکت عنان یا شرکت مفاوضہ کا معاملہ ہو۔"

مذکورہ بالا اسباب اور شرائط کے پائے جانے کے بعد ہی " ربوا" کا تحقق ہوگا۔

دار الحرب میں سودی معاملات کی شرعی حیثیت:

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد فرماتے ہیں کہ دار الحرب میں غیر مسلموں سے سود لینا درست ہے۔ اور دار الحرب میں سودی معاملات، حقیقۃً سود قرار نہیں دیئے جا سکتے اس لئے کہ اہل حرب کے اموال معصوم اور قابل ضمان نہیں، اور سود کے تحقق کے لیے بدلین

---

[1] شامی: صفحہ ۴۴۴، جلد ۴

کا معصوم و متقوم ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اس شرط کے مفقود ہونے کی وجہ سے حقیقۃً ربوا کا تحقق ہی نہیں ہوگا۔ اگرچہ صورۃً وہ معاملات سودی ہوں، حضرت امام ابویوسف، ائمہ ثلاثہ حضرت امام شافعی، امام مالک اور امام احمد دار الحرب میں بھی سودی معاملات کو ناجائز قرار دیتے ہیں

صاحب در مختار تحریر کرتے ہیں:

ولا بین حربی ومسلم مستامن ولو بعقد فاسد او قمار (ثمہ) لان مالہ ثمہ مباح فیحل برضاہ مطلقا بلا غدر خلافا للثانی والثلثۃ وحکم من اسلم فی دار الحرب ولم یھاجر کحربی فللمسلم الربوا معہ خلافا لھما لان مالہ غیر معصوم فلو ھاجر الینا ثم عاد الیھم فلا ربوا اتفاقا"[1]

حربی اور امان لے کر آنے والے مسلمان کے درمیان سود نہیں، اگرچہ وہ مال عقد فاسد یا قمار کے ذریعہ ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ اس لیے کہ اس کا مال مباح ہے۔ لہٰذا اس کی رضا سے لینا مطلقاً بغیر کسی غدر اور دھوکہ کے بھی جائز ہوگا، بخلاف امام ابویوسف اور ائمہ ثلاثہ کے، اور اس شخص کا حکم جس نے دار الحرب میں اسلام قبول کیا اور ہجرت نہیں کی حربی ہی کا ہے، مسلمان کے لیے اس سے سودی معاملہ کرنا جائز ہے، بخلاف صاحبین کے اس لیے کہ اس کا مال معصوم نہیں ہے، پھر اگر وہ ہجرت کر کے ہمارے پاس آگیا پھر ان کی طرف لوٹ گیا تو بالاتفاق اس سے سودی معاملہ جائز نہ ہوگا۔ نیز حضرت امام حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک دار الحرب میں مسلمانوں کے لئے وہاں کے حربی باشندوں سے سود و قمار کے ذریعہ بلا غدر و دھوکہ رقم حاصل کرنا جائز ہے، سود دینا مسلمانوں کے لیے دار الحرب میں بھی جائز نہیں ہے۔ صاحب فتح القدیر علامہ ابن الہمام ولا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

فالظاھر ان الاباحۃ تفید نیل المسلم الزیادۃ، وقد التزم الاصحاب فی الدرس ان مرادھم من حل الربا، والقمار ما اذا حصلت الزیادۃ للمسلم نظراً الی العلۃ وان کان اطلاق الجواب خلافہ"[2]

ظاہر یہ ہے کہ اباحت ربوا مسلمان کے لئے زیادتی کے حصول کا فائدہ دیتی ہے اور اصحاب درس علماء کا اس پر اصرار ہے کہ ربوا اور قمار کے جواز سے مراد یہ ہے کہ جب اس کے ذریعہ اضافی رقم مسلمان کو حاصل ہو۔ علت ربوا پر نظر ڈالتے ہوئے اگرچہ جواب

---

[1] درمختار علی ہامش الشامی صفحہ ۱۹۱، جلد ۴ ۔ [2] فتح القدیر صفحہ ۱۷۸، جلد ۶

کا اطلاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دارالحرب میں مطلقاً سودی معاملات جائز ہیں۔

امام ابوحنیفہ کا مستدل: ـــــ حضرت امام ابوحنیفہ دارالحرب میں سودی معاملات کے جواز پر اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں حربی اور مسلم کے درمیان "ربوا" کی نفی کی گئی ہے اور جسے مکحول جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً روایت کرتے ہیں اور چونکہ مکحول ثقہ ہیں۔ اس لیے ان کے مراسیل حجت تسلیم کیے جاتے ہیں جو لوگ دوسری رائے رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر روایت کو ثابت تسلیم کر بھی لیا جائے جب بھی "لاربوا" میں لا کو بمعنی نہی و ممانعت لیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ نصوص شرعیہ میں بکثرت وارد ہے، مثلاً فَلَا رَفَثَ، وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ، ای لاترفثوا ولا تفسقوا ولا تجادلوا، اور اس صورت میں "ولا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب" کا مفہوم یہ ہوگا کہ دارالحرب میں بھی حربی اور مسلمان کے درمیان سود حرام اور ممنوع ہے۔

نیز اس روایت کو محقق ابن الہمام نے غریب قرار دیا ہے، امام شافعی کہتے ہیں کہ یہ روایت ثابت ہی نہیں ہے ابن ہمام نے فتح القدیر میں حدیث اور اس سے استدلال پر تفصیلی بحث کی ہے۔[1]

حضرت امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ کے مسلک کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ نصوص قرآن اور نصوص حدیث علی الاطلاق سود کی حرمت و شناعت پر دلالت کرتی ہیں اموال کے بارے میں بھی کوئی تفصیل موجود نہیں ہے کہ فلاں قسم کے اموال میں سود متحقق ہوگا اور فلاں میں نہیں، نیز شریعت کے احکام کسی مکان و زمان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں مثلاً جھوٹ، زنا، غصب، غیبت، شرب خمر اور سرقہ جس طرح دارالاسلام میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے حرام ہیں، اسی طرح دارالحرب اور صحرا و بیابان میں رہنے والے مسلمانوں پر بھی حرام ہیں۔

اور مختلف دلائل کے علاوہ جو ان کے مسلک کو سب سے قوی بنا دیتی ہے یہ حقیقت ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت سود کے خاتمہ کا اعلان فرمایا تھا۔ اس وقت حضرت عباس بن عبدالمطلب اور دوسرے مسلمانوں کے سودی کاروبار کا بڑا حصہ کافروں سے متعلق تھا، مگر ہر قسم کے سود یک قلم منسوخ کر دیئے گئے، اور ایسا کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا اگر دارالحرب میں سودی معاملات جائز ہوتے، اور دارالحرب کے حربی سے مسلمانوں کیلئے سود لینا جائز ہوتا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی مسلمانوں کی ان سودی بقایا کے خاتمہ کا

---

[1] فتح القدیر، صفحہ ۱۰۸، جلد ۶۔

،علان نہیں فرماتے جو غیرمسلموں سے متعلق تھیں، قرآن کریم میں مسلمانوں سے کہا گیا:

وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین (القرآن) جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی سودی بقایا چھوڑ دیں چاہے وہ بقایا غیرمسلموں کے ذمہ ہوں یا مسلمانوں کے۔

پس حاصل یہ ہے کہ سودی معاملات چاہے دارالاسلام میں کئے جائیں یا دارالحرب اور دارالکفر میں، اور مسلمان چاہے دارالاسلام میں سود لے یا دارالحرب میں، ہر جگہ اس کے لئے سودی معاملہ کرنا ناجائز ہے۔ اس لیے کہ بحیثیت مسلمان ہر جگہ وہ احکام اسلام کا پابند ہے، مبسوط سرخسی میں ہے:

ولان المسلم ملتزم بحکم الاسلام حیث ما یکون (۱) اور اس لیے کہ مسلمان حکم اسلام کا پابند ہے چاہے جہاں بھی رہے۔

دارالحرب میں سودی معاملات کے جواز کا مفہوم: ـــــــ اس سے قبل یہ بات گزر چکی ہے کہ دارالحرب میں صرف مسلمانوں کے لیے سود لینا جائز ہے۔ دینا جائز نہیں ہے، نیز حضرت امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک دارالحرب میں سودی معاملات کا جواز صرف اس مسلمان کے حق میں ہے جو دارالاسلام سے امان (ویزا) لیکر دارالحرب آیا ہو۔ ایسے مسلم مستامن کے لئے دارالحرب کے غیرمسلموں سے سود و قمار کے ذریعہ مال حاصل کرنا جائز ہے۔ درمختار میں ہے: " ولا بین حربی و مسلم مستامن[۲] اور نہ ربوا حربی اور مسلم مستامن کے مابین متحقق ہوتا ہے۔

علامہ ابن عابدین تحریر فرماتے ہیں:

" احترز بالحربی عن المسلم الاصلی والذمی ..... لیس للمسلم ان یرابی معہ اتفاقا"[۳]

حربی کی قید سے مسلم اصلی اور ذمی سے احتراز کیا ہے ـــــــ کہ مسلمان کیلئے بالاتفاق ان سے سود لینا جائز نہیں۔

سوال ۳ کا جواب:

دار کی قسمیں | دستوری قانون کی رو سے اسلام دنیا کو دو حصوں پر تقسیم کرتا ہے، ایک دارالاسلام، دوسرے دارالحرب۔

۱۔ مبسوط سرخسی: صفحہ ۱۲۹، جلد ۳۔ ۲۔ درمختار علی ہامش الشامی صفحہ ۱۹۱، ۳، ۴۔ ۳۔ درمختار صفحہ ۱۹۰، جلد ۴

دارالاسلام: ــــــــــ دارالاسلام دنیا کا وہ ملک ہے جہاں مسلمانوں کو حاکمانہ اقتدار حاصل ہو، اور شریعت اسلامی کے احکام و قوانین اس ملک میں نافذ ہوتے ہوں۔ حدود و قصاص کا اجراء ہوتا ہو اور وہاں کا نظام مملکت اصول اسلام پر استوار ہو۔ مولانا عبدالصمد رحمانی دارالاسلام کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

دارالاسلام دنیا کے اس حصہ ملک کو کہتے ہیں جہاں مسلمانوں کو حاکمانہ اقتدار حاصل ہو۔ عام ازیں کہ اس ملک میں شخصی حکومت ہو یا شورٰی۔ (بطریق خلافت راشدہ)[1]

دارالاسلام میں چاہے شخصی حکومت ہو یا شوروی ہر دو صورت میں اس کا نظام قوانین خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ حضرات خلفاء راشدین کے عہد میمون میں اسلام کا نظام مملکت "شورٰی" کی مضبوط بنیادوں پر قائم تھا۔ اور خلفائے راشدین کے بعد نظام مملکت شخصی ہوگیا۔ دونوں نظاموں میں فرق یہ ہے کہ شوروی نظام میں امور مملکت اراکین شورٰی کے باہمی مشوروں سے طے پاتے ہیں، جو شریعت اسلامی کی نظر میں بے حد مستحسن ہے۔ اور جیسے قرآن نے "وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ" کہہ کر سراہا ہے اُس کے برخلاف شخصی حکومت میں امور سلطنت خود حاکم اعلیٰ اپنی آراء سے طے کرتا ہے، جو شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے دارالاسلام کی تعریف اس طرح کی ہے۔

دارالاسلام وہ علاقہ ہے جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور اس حکومت میں اسلامی قانون بالفعل نافذ ہو، یا حکمرانوں میں اتنی قوت ہو کہ اس قانون کو نافذ کرسکیں۔[2]

دارالکفر

دارالکفر دنیا کے اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں اقتدار اعلیٰ کافروں کو حاصل ہو۔ اور اسکے احکام قوانین ملک میں نافذ ہوتے ہوں چاہے اس ملک میں بسنے والے مسلمانوں کو اپنے مذہب اور شعائر اسلام پر عمل پیرا ہونے کی آزادی حاصل ہو۔ مولانا عبدالصمد رحمانی دارالکفر کی تعریف میں تحریر فرماتے ہیں:ــــــــ

دارالکفر دنیا کے اس حصہ ملک کو کہتے ہیں جہاں غیر مسلموں یعنی کافروں کا غلبہ ہو اور اس کے قوانین و احکام ملک میں نافذ ہوتے ہوں۔ خواہ ان کی کوئی باضابطہ آئینی

---

[1] ہندوستان اور مسئلہ امامت، صفحہ ۲۔ [2] سود: صفحہ ۲۷۳۔

حکومت ہو یا غیر آئینی، جمہوری، ہو یا شخصی اور اسی قسم کے ملک کو فقہائے اسلام کی اصطلاح میں دارالحرب بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے ملک میں احکام اور قوانین الٰہی کی تنفیذ کے لیے حرب وجنگ بھی ہوسکتی ہے، اگرچہ کسی وقت مجبوراً یا مصلحۃً اس ملک کے حاکم کفار سے جنگ نہ ہو اور بظاہر امن وامان ہو[1] مولانا مودودی کے الفاظ میں (وہ ملک جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں اور اسلامی قانون نافذ نہیں، دارالکفر ہے)[2]

دارالحرب | دارالکفر کا وہ ملک اصطلاح فقہاء میں دارالحرب کہلاتا ہے، جہاں کی حکومت کافرہ، حکومت اسلامیہ سے برسرپیکار ہو۔

دارالحرب کے متعلق مولانا مودودی لکھتے ہیں: دارالحرب سے مراد وہ ملک لیا جائے جس سے بالفعل ہماری جنگ برپا ہو[3]

دارالامن | دارالکفر کا وہ ملک "دارالامن" کہلاتا ہے جہاں مسلمانوں کو امن وامان حاصل ہو اور انھیں اپنے مذہب اور شعائر اسلام پر عمل کرنے کی اجازت ہو، ان کی تہذیب وثقافت اور تمدن اسلامی میں دخل اندازی نہ کرتی ہو۔ جیسا کہ زمانۂ نبوت میں ملک حبشہ دارالکفر تھا، وہاں کی باگ ڈور نجاشی کے ہاتھ میں تھی جو عیسائی مذہب کے پیرو تھے، مگر اس ملک میں ہر مذہب کے لوگوں کو امن وامان حاصل تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ کفار مکہ اہل اسلام پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے احباب کو "حبشہ" ہجرت کر جانے کا حکم فرمایا، وہاں جاکر مسلمانوں کو امن وامان حاصل ہوا۔ اس لیے ان کے حق میں حبشہ دارالامن قرار پایا۔

دارالمعاہدہ | دارالکفر کا وہ ملک جس سے حکومت اسلامی کا معاہدہ ہو۔ اسے دارالمعاہدہ کہا جاتا ہے۔ اور اس معاہدہ کی وجہ سے کفار کی جان ومال محفوظ رہتے ہیں۔ دوران معاہدہ مسلمانوں کے لیے ان سے جنگ وحرب جائز نہیں ہوتی۔

جمہوری ملک: ــــــ فقہائے اسلام کے دور میں صرف دو قسم کے ملک تھے۔ ایک وہ ملک جس میں مسلمانوں کی حکومت تھی اور اس ملک میں ان کے احکام وقوانین نافذ ہوتے

---

[1] ہندوستان اور مسئلہ دارالحرب صفحہ ۳۔ [2] سود صفحہ ۳۷۳۔ [3] سود، صفحہ ۳۸۹۔

تھے : اسے دارالاسلام سے تعبیر کیا گیا۔ دارالاسلام میں رہنے والے غیر مسلموں کو ذمی کہا جاتا ہے۔ اور ایک وہ ملک جس میں غیر مسلموں کی حکومت تھی اور اس کے احکام و قوانین اس ملک میں نافذ ہوتے تھے پھر اگر وہاں غیر مذہب کے لوگوں کو امن و امان حاصل ہوا اور اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہو تو اسے دارالامن کہا گیا، اور اگر وہ حکومت اسلامی حکومت سے برسر پیکار ہو تو اسے دارالحرب سے موسوم کیا گیا اور اگر وہاں کی حکومت سے حکومت اسلامیہ کا کوئی معاہدہ ہو تو اسے دارالمعاہدہ کہا گیا۔

دارالخوف : ـــــــ اگر دارالکفر میں مسلمانوں کو امن و امان حاصل نہ ہو، اور انھیں تحفظ حاصل نہ ہو تو وہ دارالکفر و دارالخوف قرار پائے گا۔

فقہاء کے زمانے میں دار، یا تو دارالاسلام تھا یا دارالحرب، مگر اب اس دور میں دار کی ایک اور قسم ہے۔ جس میں نہ تو مسلمانوں کی حکومت ہے اور نہ غیر مسلموں کی بلکہ جمہوری اور سیکولر نظام ہے، جس میں خود حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اس میں ہر مذہب و فرقہ سے تعلق رکھنے والے افراد شریک ہوتے ہیں اور اس ملک میں ہر مذہب کے لوگوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ ان کے مذہبی معاملات میں حکومت کو دخل دینے کا حق نہیں ہوتا، اور قانونی اور دستوری نقطۂ نظر سے بلا تفریق مذہب و زبان و علاقہ ہر شہری کو اپنے مذہبی شعائر کی آزادی کے ساتھ ملک کے وسائل آمدنی سے منتفع ہونے کا مساوی حق ہوتا ہے۔ اس طرح کا ملک میرے نزدیک دارالاسلام نہیں ہے بلکہ دارالکفر کی قسم دارالامن ہے۔

دارالکفر کب دارالاسلام بنتا ہے :

ہمارے نزدیک دارالکفر اس وقت دارالاسلام بنتا ہے، جبکہ اس میں احکام اسلام علی سبیل الاشتہار جاری کئے جائیں، اور احکام اسلام سے مراد راقم سطور کے نزدیک صرف عبادات، نماز، روزے، جمعہ و عیدین نہیں ہیں، بلکہ حدود و قصاص کا اجراء بھی ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے۔

" اعلم ان دار الحرب تصير دار الاسلام بشرط واحد وهو اظهار حكم الاسلام فيها "[1]

دارالحرب صرف ایک شرط کی وجہ سے دارالاسلام بن جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس

---

[1] فتاوی عالم گیری، صفحہ ۲۳۲، جلد ۲، مطبوعہ بیروت، لبنان۔

ملک میں اسلام کے احکام جاری ہونے لگیں:

شمس الائمہ علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:۔ ہمارے اصحاب کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دار الکفر محض احکام اسلام کے اجراء سے دار الاسلام بن جاتا ہے[1]

دار الاسلام کے دار الکفر بننے کی شرطیں:

حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں کہ دار الاسلام محض احکام کفر و شرک کے اجراء سے دار الکفر بن جاتا ہے، اور احکام کفر کے اجراء سے مراد یہ ہے کہ مقدمہ ملک داری اور رعایا کے بندوبست اور مال تجارت سے ٹیکس اور چور ڈکیتوں کے انتظام ــــــ لڑائی جھگڑے کے فیصلے اور جرائم کی سزا کے معاملہ میں کفار اپنے طور پر حاکم ہو جائیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ دار الاسلام تین شرطوں کے ساتھ دار الکفر بنتا ہے:

۱ــــ اس ملک میں کفار کے احکام کا برملا اظہار و اجراء ہونے لگے اور احکام اسلام میں سے کوئی حکم آہیں باقی نہ رہے۔

۲ــــ وہ ملک دار الحرب سے اس طرح متصل ہو جائے کہ اس کے اور دار الحرب کے درمیان دار الاسلام کا کوئی شہر حائل نہ ہو۔

۳ــــ اس ملک میں کوئی مسلمان اور ذمی اس امان کی وجہ سے مامون باقی نہ رہے جو ابتداً کفار سے پہلے مسلمان کو اسلام کی وجہ سے اور ذمی کو عقد ذمہ کی وجہ سے حاصل تھا۔

جب یہ شرطیں دار الاسلام میں پائی جائے گی تو وہ دار الاسلام، دار الکفر بن جائے گا[2]

ابو الیسر کی سیر الاصل میں ہے:۔

"دار الاسلام، دار الحرب اس وقت تک نہیں بنتا جب تک کہ وہ تمام باتیں ختم نہ ہو جائیں جن سے دار الاسلام بنا ہے، اس لیے کہ حکم جب کسی علت کی وجہ سے ثابت ہو گیا تو علت کا جب تک کچھ بھی حصہ باقی ہے تو حکم باقی رہے گا۔" اور منشور میں ہے:

"دار الاسلام احکام اسلام کے نفاذ کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا جب تک علائق اسلام میں سے کچھ بھی باقی رہے، جانب اسلام کو ترجیح دی جائے گی۔

---

[1] بدائع صفحہ ۳۰۳ جلد ۹ (ط: قاہرہ)۔ [2] فتاویٰ عالمگیری، صفحہ ۲۳۲، جلد ۱، بدائع صفحہ ۳۰۳، جلد ۹

علامہ شمس الائمہ حلوانی نے ذکر کیا ہے :۔

"دار الحرب احکام کفر کے جاری کرنے سے بنتا ہے اور یہ کہ احکام اسلام میں سے اس میں کوئی حکم باقی نہ رہے اور دار الحرب سے متصل ہو جائے اور کوئی مسلم اور ذمی امان اوّل سے مامون نہ رہے، پس یہ سب شرطیں جب پائی جائیں گی اس وقت دار الحرب بنیگا اور دلائل و شرائط کے تعارض کے وقت جیسا ہے ویسا ہی رہے گا، یا احتیاطی طور پر جانب اسلام کو ترجیح دی جائے گی"۔[1]

موجودہ ھندوستان کی شرعی حیثیت :

ہندوستان کی شرعی حیثیت پر گفتگو کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ہندوستان کے مختلف ادوار اور اس کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں پھر اس کی روشنی میں ہندوستان کے بارے میں اپنی حتمی رائے اور فیصلہ کا اظہار کریں۔ راقم الحروف کے نزدیک ہندوستان تین دوروں سے گذرا ہے اور ہر دور میں اس کی حیثیت جُدا جُدا رہی ہے۔

۱۔ ہندوستان کا پہلا دور وہ ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت اور اقتدار تھا اور وہ اس کے تاج شاہی کے مالک تھے۔ سالہا سال مسلم حکمراں بڑی شان و شوکت کے ساتھ یہاں حکومت کرتے رہے۔

۲۔ دوسرا وہ دور ہے جب انگریز اس ملک پر قابض ہو گئے اور اس کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔

۳۔ تیسرا دور آزادی کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور اب تک چل رہا ہے۔

پہلے دور میں بلاشبہ ہندوستان دار الاسلام ہے، اس دور میں اس کے دار الاسلام ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں، دوسرا دور جبکہ انگریز اس ملک پر قابض تھے، علماء و مشائخ کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ کچھ علماء اس وقت کے ہندوستان کو دار الاسلام قرار دیتے ہیں اور علماء کی اکثریت اسے دار الحرب مانتی ہے۔ راقم سطور کے نزدیک اس دور میں ہندوستان دار الحرب تھا۔ مولانا مودودی اس دور کے ہندوستان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] بحوالہ فتاویٰ محمودیہ، صفحہ ۳۰۲، جلد ۶

ہندوستان عام معنی میں اس وقت دارالکفر ہوگیا ہے جب سے مسلم حکومت کا یہاں استیصال ہوا۔ جس زمانہ میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے جواز سود کا فتویٰ دیا تھا۔ اس زمانہ میں واقعی یہ مسلمانان ہند کے لیے دارالحرب تھا۔ اس لیے کہ انگریزی قوم مسلمانوں کی حکومت کو مٹانے کے لیے جنگ کر رہی تھی۔" لـه

تیسرے دور میں ہندوستان (یعنی موجودہ ہندوستان) میرے نزدیک ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے جس میں ہندوستان کے ہر شہری کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت کا قانوناً حق حاصل ہے۔ لہٰذا ہندوستان کو اصطلاحِ فقہاء میں دارالامن کہا جائے گا۔

اس وضاحت کے بعد ہندوستان کے بارے میں علماء کی فقہی آرا حسب ذیل ہیں۔

سَیّد نذیر حُسَین مُحدّث دَہلوی کی رائے:۔

سیّد نذیر حسین محدث دہلوی کی رائے یہ ہے کہ انگریزوں کے تسلط و قبضہ کے بعد بھی ہندوستان دارالاسلام رہا۔ اس کا دارالاسلام ہونا انگریزوں کے برسرِ اقتدار آجانے کی وجہ سے ختم نہیں ہوا۔ اور دارالاسلام ہونے کو انہوں نے مختلف فقہی عبارات اور علماء کے اقوال سے ثابت کیا ہے، ایک سوال کے جواب میں ہندوستان و بنگال کی حیثیت واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"کتب فقہ حنفیہ میں مذکور ہے کہ دارالحرب دارالاسلام ہوجاتا ہے احکام اسلام کے جاری کرنے سے اس میں جیسے نماز جمعہ وعید، بطریق شہرت واعلان کے ساتھ ادا کرنا۔ اور حال ہندوستان و بنگال کا یہی ہے۔ پھر کیونکر ہندوستان و بنگالہ دارالحرب ہوگا۔ اور یہی مذہب امام ابوحنیفہ کا ہے اور جب تک احکام اسلام جاری و باقی رہیں گے۔ دارالاسلام دارالحرب ہرگز نہ ہوگا۔ اور اکثر مشائخ حنفیہ نے اس کو بدلیل قوی محکم کیا ہے۔ چنانچہ تنویر الابصار و الدر المختار و طحطاوی و فصول عمادی وغیرہ میں مذکور ہے۔ (وتصیر دارالحرب دارالاسلام باجراء احکام الاسلام کجمعۃ، وعید کذا فی الدرالمختار) میاں صاحب بہت ساری عبارات فقہیہ نقل کرنے کے بعد ہندوستان کے متعلق اپنی رائے کا اظہار

لـه سود۔ صفحہ ۴۲۹

ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"کتب معتبرہ بالاسے صاف واضح ہوا کہ جب تک تلاوت و وعظ و نصیحت قرآن مجید و دعوت اسلام و ادائے جمعہ و عید بر ملا و اشتہار عام و اعلان تمام پایا جائے گا ہندوستان میں تو وہ بدستور دارالاسلام رہے گا، دارالحرب نہ ہوگا، چنانچہ علمائے دیندار محققین ماہرین شرع پر مخفی نہیں ہے، نیز دارالحرب میں ربوا کے جواز و عدم جواز پر بحث کرتے ہوئے ہندوستان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :

امام صاحب (امام ابوحنیفہ) بواسطہ حدیث مذکور کے ربوا لینا دارالحرب میں جائز رکھتے ہیں نہ دارالاسلام میں اور ہندوستان شرقاً و غرباً موافق مشروط قرار دادہ امام صاحب کے دارالحرب نہیں ہے، چنانچہ فصول عمادیہ وطحطاوی وغیرہ سے پہلے واضح ہوچکا۔ پس امام صاحب کے نزدیک بھی ہندوستان و بنگالہ میں سود لینا حرام و ناجائز ہوگا۔ کیونکہ دارالاسلام ہے۔[1]

ابوالحسنات مولانا عبدالحیؒ لکھنوی کی تحقیق :

ہندوستان کے نامور عالم دین ابوالحسنات مولانا عبدالحیؒ لکھنوی بھی ہندوستان کو انگریزی دور اقتدار میں "دارالاسلام" قرار دیتے ہیں اور ہندوستان کے غیر مسلموں سے سودی لین دین کو ناجائز قرار دیتے ہیں، ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں :

لیکن بلاد ہند جو قبضہ نصاریٰ میں ہے دارالحرب نہیں ہے ان میں کافر سے سود لینا جائز نہیں ہے۔[2] دوسری جگہ لکھتے ہیں :

ہندوستان دارالحرب نہیں ہے بلکہ دارالاسلام ہے چنانچہ ان عبارات فقہیہ سے واضح ہوتا ہے الی قولہ پس یہ بلاد دارالحرب نہ ہوں گے۔ نہ بمذہب امام اور نہ بمذہب صاحبین[3] اور اپنی حتمی رائے کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں : "والصحیح انه دای ملك الانجلیز دارالاسلام ولم یصر دارالحرب الی الان"[4] اور صحیح بات یہ ہے کہ ہندوستان (انگریز کا ملک) دارالاسلام ہے ابھی تک دارالحرب نہیں بنا۔ ایک شخص نے ان سے دریافت کیا۔ "ہندوؤں سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟" اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں۔

"جائز نہیں ہے کیونکہ دارالاسلام میں سود لینا اور دینا حرام ہے"۔[5]

---

[1] فتاویٰ نذیریہ، صفحہ ۱۹۴، جلد ۲، ملخصاً۔ [2] مجموعۃ الفتاویٰ صفحہ ۲۰۶، جلد ۲ [3] بحوالہ بالا صفحہ ۱، جلد ۱ [4] بحوالہ بالا صفحہ ۴۵ جلد ۲، بحوالہ فتاویٰ محمودیہ صفحہ ۲۹۶، جلد ۶ [5] مجموعۃ الفتاویٰ، صفحہ ۱۲۰، جلد ۲

مولانا کے اِن فتاویٰ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کو دارالاسلام، اور یہاں کے غیر مسلموں کو ذمی کے حکم میں قرار دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُن سے سودی لین دین کو حرام سمجھتے ہیں۔ کیونکہ دارالاسلام میں مسلمانوں کے لیے ذمیوں سے سُود لینا امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔

مولانا عبدُالباری لکھنوی کا رجحان:

ہندوستان کے مایہ ناز عالم دین مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ ہندوستان دارالاسلام ہے اور انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے اسکا دارالاسلام ہونا ختم نہیں ہوا۔ بلکہ جس طرح دورِ مغلیہ اور اس سے پہلے مسلم حکام کے زمانے میں ہندوستان دارالاسلام تھا، انگریزوں کے اقتدار کے بعد بھی دارالاسلام ہی رہا۔ مولانا اپنی تائید میں نواب صدیق حسن صاحب بھوپالی کی عبارت نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

ہندوستان عموماً اور ریاسات اسلامیہ خصوصاً امام اعظم کے نزدیک دارالحرب نہیں، ہندوستان کے مشاہیر فقہاء حنفیہ ہند مثل علماء دہلی ورامپور اور بھوپال کا فتویٰ اور مختار مذہب یہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مملکت ہند خصوصاً اسلامی ریاستیں دارالاسلام ہیں نہ کہ دارالحرب بعض معاصرین نے لکھا ہے کہ احتیاطاً اسی میں ہے کہ ہم ان شہروں کو دارالاسلام قرار دیں۔ اگرچہ بظاہر سلاطین یہ شیاطین ہیں[1] ——— نواب صدیق حسن کا بھی یہی مسلک ہے کہ ہندوستان انگریزوں کے دور اقتدار میں بھی دارالاسلام ہی رہا ہے۔ دارالحرب نہیں بنا۔

قائلین دارالحرب

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا فتویٰ ——— حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ کے چشم و چراغ اور ان کے علوم و معارف کے وارث و امین ہیں۔ شاہ ولی اللہ ہی کے زمانہ میں خاندانِ مغلیہ زوال سے دوچار ہونے لگا تھا۔ اور شاہ عبدالعزیز کے زمانہ میں

---

[1] مجموعہ رسائل ہجرت و قربانی گاؤ، صفحہ ۳۳، بحوالہ فتاویٰ محمودیہ، صفحہ ۳۰۲، جلد ۲۔

خاندان مغلیہ کا چراغ ہمیشہ کے لیے بے نور ہوگیا، اور ہندوستان کی قسمت اور اس کے تاج شاہی کی مالک بدیسی قوم انگریز بن گئی تھی، جب انگریز پوری طرح ہندوستان پر قابض ہوگئے تو مفکر اسلام شاہ عبدالعزیز تڑپ اٹھے، اور بلا خوف لومۃ الائم یہ فتویٰ دیا کہ ہندوستان انگریزوں کے تسلط کی وجہ سے دارالحرب بن گیا ہے۔ اور مختلف دلائل وشواہد سے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کو ثابت فرمایا۔ غالباً حضرت شاہ صاحب وہ پہلے شخص ہیں جس نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا نہایت مفصل فتویٰ صادر کیا، شاہ صاحب فتاویٰ عزیزی میں ہندوستان کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"کافی میں لکھا ہے کہ دارالاسلام سے مراد وہ ملک ہے جس میں امام المسلمین کا حکم جاری ہو اور وہ ملک اس کے قبضہ میں ہو، دارالحرب سے مراد وہ ملک ہے جس میں کافروں کا حکم جاری ہو اور وہ اسکے تسلط میں ہو، اس شہر میں امام المسلمین کا حکم بالکل جاری نہیں بلکہ رؤسا نصاریٰ کا حکم جاری ہے، اور احکام کفر کے اجراء سے مراد یہ ہے کہ مقدمہ ملک داری اور رعایا کے بند وبست اور مال تجارت سے ٹیکس اور چور ڈکیتوں کے انتظام۔ اور مقدمات کے فیصلے اور جرائم کی سزا کے معاملہ میں کفار اپنے طور پر حاکم ہوں۔ اگرچہ بعض احکام اسلام مثلاً جمعہ وعیدین واذان اور گاؤ کشی پر روک نہ لگائیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ چیزیں ان کے نزدیک ہدر ہیں۔ اس لئے بلا تکلف مساجد کو منہدم کردیتے ہیں اور کوئی مسلمان یا ذمی ان کے امان دیئے بغیر اس ملک اور اس کے ارد گرد میں نہیں رہ سکتا البتہ اپنے نفع کی خاطر آنے والے مسافروں اور تاجروں کی مخالفت نہیں کرتے ہیں"[1]

شاہ صاحب نے اپنے اس فتوئی میں ہندوستان کی شرعی حیثیت کی تعیین کے ساتھ ساتھ بہت سارے شکوک وشبہات کا ازالہ بھی کئے ہیں۔ اور دارالحرب کی تعریف بیان فرماکر واضح کیا کہ محض بعض احکام اسلام مثلاً جمعہ وعیدین، تلاوت اور گاؤ کشی پر پابندی عائد نہ کرنے کی وجہ سے دارالحرب دارالاسلام نہیں بنتا جن لوگوں نے انگریزوں کے دور اقتدار میں بھی ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیا ہے ان سب نے اسی سے استدلال کیا ہے کہ بعض احکام اسلام مثلاً جمعہ وعیدین ہندوستان میں اس وقت بھی باقی وجاری تھے اور جب تک

---

[1] فتاویٰ عزیزی، صفحہ ۱۷، جلد ۱

کسی ملک میں اسلام کے کچھ احکام بھی جاری رہیں گے وہ ملک دارالحرب نہیں بنے گا۔ شاہ صاحب نے اسے رد کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر اقتدار اور ملک کی باگ ڈور غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے اور اسمیں انکے احکام جاری ہوتے ہیں تو وہ ملک دارالحرب قرار پائے گا، چاہے اس میں اسلام کے بعض احکام جاری ہوں۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ کا خیال

شاہ اسماعیل شہید شاہ ولی اللہؒ کے پوتے ہیں۔ مولانا شہید ایک عظیم مجاہد ہونے کے ساتھ جید الاستعداد عالم دین ہیں۔ جب ہندوستان پر انگریز قابض ہو گئے تو انہوں نے بھی ہندوستان کے اکثر حصہ کو دارالحرب قرار دیا، اور صرف دارالحرب قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہو گئے اور سید احمد شہید کی قیادت میں مختلف محاذوں پر انگریزوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر بالاکوٹ کے تاریخی معرکہ میں جام شہادت نوش کر کے ہمیشہ کے لئے آسودۂ خاک ہو گئے۔ انھیں اکابر کی بے مثال قربانیوں کے نتیجے میں ہندوستان میں آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ مولانا شہید ہندوستان کی شرعی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

" بلکہ ہندوستان کا حال اس وقت ۱۲۴۳ھ میں یہ ہے کہ اس کا اکثر حصہ دارالحرب ہو گیا"[1]

مفتیٔ اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی کی تحقیق:

مفتی کفایت اللہ دہلوی اپنی فقاہت، دقت نظر اور علمی بصیرت کی وجہ سے اہل علم و فقہ کی نگاہ میں بڑی قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی تو انہوں نے ہندوستان کو دارالحرب اور انگریزوں کو محارب قرار دیا۔ مگر پھر جب ہندوستان آزاد ہوا اور اس میں جمہوری نظام جاری ہوا تو پھر مولانا نے ہندوستان کو ایک جمہوری اور سیکولر ملک قرار دیا۔ ایک سوال کے جواب میں مفتی صاحب ہندوستان کے بارے میں اپنی تحقیق کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

" ہندوستان بقول راجح دارالحرب ہے"[2]۔ ایک دوسرے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

---

[1] صراط مستقیم صفحہ ۱۰۵۔ [2] کفایت المفتی، صفحہ ۱۹، جلد ۱

"ہندوستان دارالحرب ہے"[1]

اکابرِ دیوبند کا رجحان

اکابر دیوبند کا بھی اسی طرف رجحان ہے کہ ہندوستان انگریزوں کے دورِ حکومت میں دارالحرب ہے، چنانچہ مفتی محمد شفیع دیوبندی سابق مفتی اعظم پاکستان ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ہندوستان موجودہ زمانہ میں ہمارے حضرات کے نزدیک دارالحرب ہے اور دارالامان اگرچہ دارالحرب کی کوئی قسم نہیں لیکن دارالحرب والوں سے صلح و مسالمت شرعاً جائز ہے اور مسالمت کی صورت میں امن قائم رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی دارالحرب کو بحالت مسالمت دارالامان کہدے تو مضائقہ نہیں۔[2]

موجودہ ہندوستان کے بارے میں فیصلہ کن رائے:

میرے نزدیک موجودہ دور میں ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے۔ جو تمام شہریوں کے مساوی حقوق کی بنیاد پر قائم ہے اور قانونی نقطۂ نظر سے بلاتفریق مذہب و زبان و علاقہ ہر شہری کو اپنے مذہبی شعائر کی آزادی کے ساتھ ملک کی ذرائع آمدنی سے منتفع ہونے کا مساوی حق حاصل ہے، حکومت کو کسی بھی قوم کے مذہبی امور، ان کی تہذیب و تمدن اور ان کے ملی مسائل میں دخل اندازی کا حق نہیں پہونچتا لیکن اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کو حاصل ہے اور حکومت ہند کی بنیاد اصول اسلام پر قائم نہیں ہے، اور نہ قوانین اسلام کا نفاذ ہے۔ اس لیے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دینا تو ممکن نہیں ہے۔ البتہ آئین و دستور کے لحاظ سے یہاں کے مسلمانوں کو تحفظ جان و مال حاصل ہے اور انہیں احکام اسلام پر عمل کی آزادی بھی حاصل ہے اس لیے اسے دارالامن قرار دیا جاسکتا ہے

مگر چونکہ ادھر کئی سالوں سے فرقہ وارانہ فسادات میں خود ارباب حکومت کا ملوث ہونا اور مسلمانوں کے جان و مال کو برباد کرنا ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے

---

[1] کفایت المفتی صفحہ ۲، جلد ۱   [2] امداد المفتین مع فتاویٰ دارالعلوم قدیم، ص ۱۰۶۶

ہندوستان کا دارالامن ہونا مشکوک ہو رہا ہے، ایسی صورت حال میں اسے دارالخوف بھی کہا جاسکتا ہے، راقم الحروف کے نزدیک آئین و دستور کے اعتبار سے دارالامن ہے۔ اور موجودہ حالات کے پیش نظر دارالخوف ہے۔

سوال ۴ کا جواب

بینک میں روپیہ جمع کرنے کے بعد مخصوص تناسب سے اس پر جو اضافی رقم اور نفع ملتا ہے وہ سود ہے، اور اس کے سود ہونے پر تقریباً تمام ہی علماء کا اتفاق ہے۔ بینک سے ملنے والے سود کو بینک میں چھوڑنا درست نہیں ہے، کیونکہ معتبر ذرائع سے یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی سودی رقم بینک سے لینے سے انکار کر دیتا ہے تو اس سودی رقم کو بینک کے منتظمین ایسے مواقع پر خرچ کر دیتے ہیں جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے قطعاً نامناسب اور بسا اوقات مضر ہوتے ہیں بلکہ تجربہ یہ بھی ہے کہ تخریب اسلام کے لئے قائم شدہ بعض اداروں پر اسے خرچ کر دیا جاتا ہے اور اس کی بکثرت نظیریں موجود ہیں، برطانوی ہند میں بینکوں کی طرف سے مسلمانوں کی جمع کردہ رقم کے سود سے گرجا بنوا دیا گیا، یا عیسائی مشنریوں کو تبلیغ عیسائیت اور تخریب اسلام کے لئے دے دیا گیا۔ اور آج اگر گرجا نہیں تو مندر کی تعمیر میں یا کسی اور خلاف شریعت منصوبہ میں اس سودی رقم کو لگایا جاتا ہے۔ اس لیے اپنی سودی رقم بینک میں چھوڑنا گویا گرجا، مندر بنانے یا تخریب اسلام میں حصہ لینے کے برابر ہوگا۔ اور "تعاون علے الاثم والعدوان" ہوگا۔ جس سے مسلمانوں کو سختی سے روکا گیا ہے۔ ہندوستان کے نامور علماء مفتی کفایت اللہ دہلوی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی مفتی شفیع سابق مفتی اعظم پاکستان، مولانا حسین احمد مدنی اور عالم اسلام کی معروف شخصیت علامہ مصطفیٰ الزرقا وغیرہم کا فتویٰ یہی ہے کہ اگر ضرورت کے تحت بینکوں میں رقمیں رکھی جائیں تو اس کا سود بینکوں میں نہ چھوڑا جائے، کیونکہ سودی رقم کو بینک کے منتظمین تبلیغ عیسائیت اور اسلام کی تخریب کاری میں صرف کرتے ہیں بلکہ اسے لیکر فقراء مسلمین پر بلا نیت ثواب صدقہ کر دیا جائے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔

- اگر کسی نے بینک میں روپیہ جمع کر دیا تھا۔ تو اس کا سود وہاں نہ چھوڑنا چاہئے کیونکہ اس سے عیسائیت کی تبلیغ کی جاتی ہے بلکہ وہاں سے لیکر فقراء و مساکین پر صدقہ کر دینا چاہئے۔ اپنے

خرچ میں لانا جائز نہیں۔[1]

حکیم الامت مولانا تھانوی کے ایک فتوی سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ "بینک میں سودی رقم چھوڑنے سے اگر یہ خطرہ ہو کہ بینک ناجائز مصرف میں صرف کرے گا تو وہاں نہ چھوڑے بلکہ لیکر اہل حاجت کو دیدے"۔[2]

بینک کے سود کا مصرف:

بینک سے ملے ہوئے سود کو اپنی ذات پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اسے بینک سے نکال کر اگر اس پر حکومت کی طرف سے کوئی ناجائز ٹیکس عائد ہوتا ہو تو اولاً اس کی ادائے گی کرے۔ پھر اگر اس سے بچ جائے تو اس کے وبال سے بچنے کے لئے مسلم فقراء پر بلانیت ثواب صدقہ کر دینا ضروری ہے۔ کیونکہ سود میں ملنے والی رقم بلاشبہ مال حرام ہے۔ اور مال حرام کا اس کے مالک تک لوٹانا اگر ممکن نہ ہو تو اس صورت میں اس کا فقراء ہی پر صدقہ کر دینا ضروری ہے۔ عام مصرف خیر اور رفاہ عام کے کاموں میں اسے صرف نہیں کیا جا سکتا، جیساکہ مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنے ایک رسالہ میں بدلائل ثابت کیا ہے کہ مال حرام جس کی واپسی اس کے مالک تک ممکن نہ ہو اسے فقراء ہی پر صدقہ کر دینا ضروری ہوگا۔ کسی اور طرح کے مصرف خیر میں خرچ کرنا۔ (مثلاً مسجد بنانا، مدارس و مکاتب کی تعمیر اور مدرسین کی تنخواہوں میں خرچ کرنا پل سڑک وغیرہ بنانا جائز نہ ہوگا۔ مفتی صاحب کا یہ رسالہ جواہر الفقہ جلد سوم میں عارف کمپنی دیوبند سے شائع ہو چکا ہے۔ علمی اعتبار سے یہ رسالہ بڑا قیمتی اور وقیع ہے اس میں مفتی صاحب نے مختلف دلائل و براہین سے تصدق کو ضروری قرار دیا ہے اور مخالف اعتراضات و احتمالات کے اطمینان بخش جوابات دیئے ہیں، بعض علماء نے عام مصارف خیر میں بھی اس طرح کے مال کو صرف کرنے کی اجازت دی ہے، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مفتی عبدالرحیم لاجپوری اور مولانا خالد سیف اللہ کا اسی طرف رجحان ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک پہلی رائے راجح اور قوی ہے، اور میرے نزدیک اس طرح کی رقوں کو عام مصارف خیر میں صرف کرنے کی

---

[1] فتاوی دار العلوم قدیم، بحوالہ بینک، انشورنس اور سرکاری قرضے صفحہ ۴۳ [2] امداد الفتاوی صفحہ ۱۵۳ جلد ۳۔ تفصیل کے لیے دیکھئے فتاوی رحیمیہ، صفحہ ۲۶۲ تا ۲۶۵ جلد ۳

اجازت نہیں ہے، اکابر دارالعلوم دیوبند مفتی عزیز الرحمن حضرت تھانوی حضرت مفتی محمد شفیع اور موجودہ مفتیان دارالعلوم دیوبند، سودی رقم کے تصدق کو ضروری قرار دیتے ہیں اور رفاہ عام کے کاموں، (مثلاً کنواں کھودنا، تالاب بنانا) میں صرف کرنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ البتہ اگر رقم کسی محتاج کو دے کر اُسے مالک بنا دیا جائے اور پھر وہ اس سے پل بنائے یا مدرسہ کی تعمیر کرے تو درست ہوگا۔

سرکاری اور غیر سرکاری بینکوں سے سود لینے کا حکم

سود چاہے سرکاری بینکوں سے وصول کیا جائے یا غیر سرکاری بینکوں سے، ہر صورت میں حرام ہے، اور سود حاصل کرنے کی نیت سے نہ تو سرکاری بینکوں میں روپیہ جمع کرنا درست ہے اور نہ غیر سرکاری بینکوں میں۔ اور کسی بھی صورت میں اس سود کو اپنی ذات پر استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ میرے نزدیک سود لینے میں سرکاری اور غیر سرکاری بینکوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا حکم یکساں ہے۔

سوال ۵ کا جواب

سود لینا ایک مسلمان کے لیے کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے اگر وہ سود لیتا ہے تو گویا خداوند قدوس کو مبارزت کی دعوت دیتا ہے اور اپنے کو خدا اور اسکے رسول کی لعنت کا مستحق ٹھہراتا ہے، البتہ ہندوستان جیسے ملک میں بعض حالات میں واقعی مجبوریوں کے تحت سودی قرض لینے اور اس پر سود کی ادائے گی کی گنجائش ہوگی اگر ایک مسلمان اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل سودی قرض لئے بغیر نہ کر سکے۔ اور اسے غیر سودی قرض نہ ملے تو ایسی حالت میں بقدر مجبوری سودی قرض لینے کی اجازت ہوگی، مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

سوال ۶ کا جواب

سود لینا اور دینا دونوں ہی معصیت اور غضب الٰہی کا موجب ہے۔ اس لیے اصولی طور پر ظاہر ہے کہ سودی قرض لینا درست نہ ہوگا۔ مگر یہ حقیقت واقعہ ہے کہ کبھی ایسے قرضے لینا ضرورت بن جاتی ہے۔ اور خورد و نوش، تجارت، کاشت اور صنعت و حرفت کے لیے ایسے

قرضے لینا ناگزیر ہو جاتا ہے، ان حالات میں بدرجۂ مجبوری سودی قرضے لینے کی درج ذیل شرائط کے ساتھ گنجائش ہوگی۔

۱ انسان سودی قرض لینے پر اس طرح مجبور ہو جائے کہ نہ لے تو کوئی ذریعۂ معاش فراہم نہ ہو اور بنیادی ضروریات (کھانا، کپڑا اور مکان) کی تکمیل بھی ممکن نہ رہ سکے۔

۲ اسے غیر سودی قرض نہ ملتا ہو۔

۳ یہ قرض محض تعیش، آرام طلبی اور اپنا معاشی معیار بلند کرنے کے لیے نہ لیا جائے۔

ان شرائط کے ساتھ بقدرِ ضرورت وحاجت سودی قرض لینے کی اجازت ہوگی۔

ایسے حالات میں سودی قرض کا جواز قاعدہ فقہیہ "الضرورات تبیح المحظورات"[۱] سے ثابت ہوتا ہے، اگر ایسے حالات میں بھی سودی قرض کی اجازت نہ دی جائے تو انسان حرج وتنگی میں مبتلا ہو جائیگا جو دین حنیف کی سہولت بخشیوں کے خلاف ہے۔ علامہ ابن نجیم محتاج کیلئے سودی قرضے کا جواز ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح"[۲] ضرورت مند کے لیے سودی قرض لینا جائز ہے۔

سرکاری اور غیر سرکاری قرض کا فرق

یہ عام سودی قرضوں کا حکم ہے جس میں سرکاری بینک بھی داخل ہے۔ اس سلسلے میں بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ سرکاری قرضہ جات جن کا اصل مقصد خود معاشی فائدہ اٹھانا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ملک کی غربت دور کرنا اور لوگوں کی ضروریات کی تکمیل مقصود ہوتا ہے۔ عام حالات میں بھی ایسے قرضے لینے کی گنجائش ہو سکتی ہے، مولانا خالد سیف اللہ سرکاری اور غیر سرکاری قرضوں کے مابین فرق کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

سرکاری قرضہ جات جس کا اصل مقصود خود معاشی فائدہ اٹھانا نہیں ہوتا بلکہ ملک کا افلاس دور کرنا مقصود ہوتا ہے اور سود کے نام پر جس قدر نفع لیا جاتا ہے، بہت معمولی ہوتا ہے اس میں مزید سہولت ہے، عام حالات میں بھی ایسے قرضے لینے کی گنجائش ہے، گو کہ اسکو سود کا نام دے دیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو اس شعبے کے ملازمین اور عملہ کی اُجرت[۳]

---

[۱] الاشباہ، صفحہ ۱۲۱، [۲] بحوالہ بالا، صفحہ ۱۱۵، [۳] جدید فقہی مسائل، صفحہ ۲۵۱، جلد ۱۔

بھی محمول کر سکتے ہیں:

سوال ۷ کا جواب

ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے۔ اس کا خزانہ اور سرمایہ ایک ایسی دولت ہے جس سے انتفاع کا حق ہندوستانی عام شہریوں کی طرح یہاں کے مسلمانوں کو بھی حاصل ہے۔ اس لئے ترقیاتی اسکیموں، مکانات کی تعمیر، تجارت کی فروغ اور صنعت و حرفت کی ہمت افزائی نیز بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے اور بے کاروں کو باکار بنانے کے لیے جس قدر بھی رقم حکومت اپنے بجٹ میں رکھتی ہے ان میں ایک ہندوستانی مسلمان کا اسی طرح حق ہے۔ جس طرح ہندوستان کے دوسرے شہریوں کا، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ جب مسلمان اپنے اس حق کی تحصیل کے لیے آگے بڑھتا ہے تو حکومت جس نے اپنے مالیاتی نظام کی بنیاد سود پر رکھی ہے، اس کا یہ فیصلہ مسلمانوں کو اپنے جائز حق کی تحصیل سے روکتا ہے۔ ایسی صورت حال میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ:

مسلمانوں کو اپنے جائز حق کی تحصیل کے لیے بدرجۂ مجبوری سود دینا اور سود دے کر اپنا حق حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب راقم سطور کے نزدیک اثبات میں ہے، اور یہ کہنا درست ہے کہ اپنے جائز حق کی تحصیل کے لیے مسلمانوں کو اجازت ہے کہ وہ بدرجۂ مجبوری سود دے کر اپنا حق حکومت سے وصول کریں۔

شریعت اسلامی میں اس کی نظیر موجود ہے، شریعت کا عام اصول اور ضابطہ تو یہ ہے کہ "ماحرم اخذہ حرم اعطاءہ" یعنی جس چیز کا شرعاً لینا حرام ہے، شرعاً اس کا دینا بھی حرام ہے اس اصول کے تحت علماء نے لکھا ہے کہ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہے، لیکن ایسی صورت میں جبکہ اپنے جائز حق کا حصول بغیر رشوت دیئے ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں رشوت دینے کی فقہاء نے اجازت دی ہے۔ صاحب الاشباہ والنظائر علامہ ابن نجیم مصری قاعدہ فقہیہ "ماحرم اخذہ حرم اعطاءہ" کے ذیل میں "الرشوۃ لخوف علی مالہ او نفسہ" کا استثناء

لہ جدید فقہی مسائل، صفحہ ۲۵۱، جلد ۱

کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"مگر مال یا جان کے خوف سے رشوت دینے کے مسائل میں۔ لیکن یہ جواز دینے والے کے حق میں ہے۔ رشوت لینے والے کے حق میں ہر حال میں حرام ہے۔ بعض لوگوں کو اس فرق پر تنبہ نہ ہو سکا ہے۔ اسی طرح مناسب ہے کہ اس سے یہ صورت بھی مستثنیٰ ہو کہ کوئی محتاج شخص سود پر قرض حاصل کرلے کہ یہ بھی حرام نہیں ہے، جیسا کہ البحرالرائق میں اس کی تشریح کردی گئی ہے، لیکن قرض دینے والے کے لیے سود کی شرط پر قرض دینا حرام ہوگا۔"[1]

سوال ۸ کا جواب

اگر حکومت کسی قرضہ پر چھوٹ دیتی ہے اور اس پر سود بھی عائد کرتی ہے اور اس چھوٹ کا تناسب سود میں ادا کی جانے والی رقم سے کم یا اس کے مساوی ہے تو قرض کی یہ شکل شرعاً جائز ہے کیونکہ اس میں قرض میں لی ہوئی رقم سے زیادہ دینا نہیں پڑتا، گویا یہ حکومت کی طرف سے ایک قسم کی امداد ہے۔ استاد محترم مولانا مفتی محمد نظام الدین صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند نے بھی اس صورت میں سودی قرض کی اجازت دی ہے، ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر لون کسی مجبوری سے لیلے اور صورت وہی ہو جو سوال میں مذکور ہے کہ ڈھائی ہزار قرض لیا اور ساڑھے بارہ سو معاف ہو جانے کے بعد پھر سود لگا کر رقم واپس دی ہے اگر یہ کل ایسی کی رقم ڈھائی ہزار کے اندر ہی ہے جب تو شرعاً سود دینا لازم نہ آئے گا۔"[2]

سوال ۹ کا جواب

آج جب ہم دنیا کے نظام اور ممالک کے احوال پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ دنیا کا پورا نظام "سود" میں گھرا ہوا ہے، ہر کام کے لیے انسان کو بینک کا تعاون لینا پڑتا ہے بینکوں کے توسط کے بغیر نہ تو کوئی بڑی تجارت اور صنعت و حرفت ممکن ہے اور نہ ہی فریضہ حج کی ادائے گی، غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں سود ادا کئے بغیر چارہ نہیں۔ ان سب کو

---

[1] الاشباہ مع حموی صفحہ ۱۷۶۔ [2] نظام الفتاوی، صفحہ ۲۴۳، جلد ۱

قطعاً حرام اور قابل ترک قرار دینا کیا واقعی شریعت اسلامی کے "یسر" اور" دفع حرج" کے اصول اور شریعت کی سہولت بخشیوں کے مطابق ہوگا۔ اور کیا عملاً اس طریقہ کار کا ترک ممکن ہوگا؟ اور ہمیں اس ضمن میں اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر واقعی سب مسلمان تاجر، بیرونی تجارت سے دست بردار ہو جائیں تو آجکل کیا یہ ممکن ہے؟ کیونکہ جدید ترقیات اور ایجادات واختراعات کی وجہ سے دنیا گویا ایک بڑے مکان کا آنگن بن گئی ہے، اور دنیا کے سارے انسان مختلف اسباب ومصالح کی وجہ سے ایک کنبہ کے افراد کی طرح ہو گئے ہیں۔ اب کوئی ملک دوسرے ملک سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، کوئی قوم دوسری قوم سے الگ تھلک رہ کر بسا اوقات اپنی زندگی کی ابتدائی ضروریات کی تکمیل بھی نہیں کر سکتی۔ اس زمانہ میں عملاً دنیا کی حالت یہ ہے کہ ضروری اشیاء صرف جن پر مدارِ حیات ہے بعض ملکوں کو دوسرے ممالک فراہم کرتے ہیں (مثلاً اکثر عرب ممالک اپنی غذائی ضروریات تک میں دوسرے ممالک کے محتاج ہیں) اگر وہ فراہم نہ کریں تو اکثر لوگوں کے غذا کی نایابی کی وجہ سے بھوک سے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس طرح بیرونی تجارت سے کنارہ کشی ایک ہی فرد کی نہیں بلکہ پورے ملک اور قوم کی ہلاکت کا ذریعہ بن جائے گا۔ تو کیا ایسی صورت کو بھی "ضرورت" نہ کہا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ ایسی صورت کو یقیناً "ضرورت" کا درجہ حاصل ہے، اور اگر بینک کے توسط کے بغیر ایسی تجارت ممکن نہ ہو تو بھی تجارت ضروری ہوگی۔ اور بینک کا توسط اختیار کرنا "ضرورت" کی بنا پر جائز ہوگا۔ اور اس ضرورت کی وجہ سے سود دینے کی بھی گنجائش ہوگی، البتہ ایک مسلمان تاجر کو دیگر ممالک کو مال برآمد کرنے کی صورت میں بین الاقوامی تجارتی ضوابط کے تحت جو سود ملیگا اس کا حکم بھی عام سود کا ہوگا۔ اور اپنی ذات پر صرف کرنا درست نہ ہوگا۔ بلکہ فقراء مسلمین پر اس کا تصدق واجب ہوگا تفصیل ماقبل میں گذر چکی ہے تفصیل کے لیے دیکھیے مولانا برہان الدین کی تالیف "بینک" انشورنس اور سرکاری قرضے۔

سوال ۱۰ کا جواب:

بینک دو طرح کے ہیں، ایسے بینک جس کے مالک اشخاص وافراد ہوتے ہیں، دوسری سرکاری بینک جو حکومت کی ملک ہیں ان دونوں قسم کے بینکوں میں نوعیت کے لحاظ سے بڑا فرق ہے، اور دونوں کی حقیقت جدا جدا ہے۔ وہ بینک جس کے مالک اشخاص وافراد ہوتے ہیں ان کا مقصد بینکوں کے قیام سے خود معاشی فائدہ اٹھانا اور لوگوں کی دولت سمٹنا ہے۔ وہ افراد

ان بینکوں کے ذریعہ غریب مزدوروں، کاشتکاروں، اور قلیل المعاش افراد کا خون چوستے ہیں لوگوں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، اس طرح کے بینک قرض محض اس وجہ سے لوگوں کو دیتے ہیں تاکہ انھیں "سود" کے نام پر معقول رقم بغیر محنت ومشقت کے مل جائے۔ اس لیے اس طرح کے بینک "سود" سرکاری بینکوں کی بہ نسبت زیادہ عائد کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف سرکاری بینکوں کے قیام وتاسیس کا مقصد خود معاشی فائدہ اٹھانا نہیں ہوتا بلکہ ملک کی غربت وافلاس دور کرنا اور ملک وافراد کی تعمیر وترقی مقصود ہوتی ہے سودی قرض دے کر بے روزگاروں کو روزگار فراہم کیا جاتا ہے اور بے کار افراد کو باکار بنایا جاتا ہے، اور ملک کی صنعت وحرفت اور تجارت کو فروغ دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے سود کے نام پر جس قدر نفع لیا جاتا ہے وہ بہت معمولی ہوتا ہے۔ بلکہ بہت ساری اسکیموں کے تحت حکومت لوگوں کو قرض چھوٹ دے کر فراہم کرتی ہے اور اس پر سود بہت معمولی عائد کرتی ہے۔ جس کی ادائے گی اس چھوٹ سے ہوجاتی ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس طرح کے بینکوں کا مقصد خود معاشی فائدہ اٹھانا نہیں ہے اور جو سود لیا جاتا ہے اسے اس شعبے کے ملازمین اور عملہ کی اجرت پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے۔ اس کو بنیاد بنا کر بعض علماء نے ان دونوں قسموں کے بینکوں سے قرض لینے میں فرق کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر سرکاری بینکوں سے سودی قرض لینے کا جواز اسی وقت ہوگا۔ جبکہ آدمی اس کے لینے پر اس طرح مجبور ہو جائے کہ اگر نہ لے تو کوئی ذریعہ معاش فراہم نہ ہو اور اس کی بنیادی ضروریات کھانا، کپڑا اور مکان کی تکمیل بھی ممکن نہ رہ سکے اور اسے غیر سودی قرض نہ ملتا ہو تو اس طرح کی مجبوری میں اسے بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش ہوگی، اور سرکاری بینکوں سے عام حالات میں بھی ایسے قرض لینے کی گنجائش نکل سکتی ہے، مولانا خالد سیف اللہ کا رجحان اسی طرف ہے۔ حضرت مفتی نظام الدین صاحب نے بلاضرورت سرکاری بینکوں سے بھی سودی قرض لینے کی اجازت نہیں دی ہے اور اسے عام قرضوں سے زیادہ خطرناک بتایا ہے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

سودی قرض لینا خود بہت بڑا گناہ ہے۔ بغیر سخت مجبوری کے جائز نہیں خواہ کسی حکومت ہی سے لے بلکہ حکومت سے سودی قرض لینے میں اور بھی خطرات ہیں۔ اس لیے جہاں تک ہوسکے احتیاط واجتناب رکھے[1]۔ راقم الحروف بھی بلاضرورت حکومت سے قرض لینے کو جائز

---

[1] نظام الفتاوی صفحہ ۴۷۲، جلد ۱

نہیں سمجھتا۔

سوال ۱۱ کا جواب

اس صورت میں اجازت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ بلاضرورت سود کی ادائے گی کرنی پڑتی ہے۔ اور شریعت میں جس طرح سود لینا سخت گناہ ہے اسی طرح سود دینا بھی بڑا گناہ اور حرام ہے البتہ اسے مذکورہ کمپنیوں سے سودی قرض نہ لینے کی صورت میں کوئی ذریعہ معاش فراہم نہ ہو تو بقدر ضرورت اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ فقط

ہذا ما عندی واللہ تعالیٰ اعلم



سود کی حقیقتِ شرعی

از ــــــــــــــــــــ مولینا عبید اللہ کوثی اعظم گڈھ

سود کی حقیقت

مؤلف ہدایہ نے سود کی یہ تعریف کی ہے "ھُوَالْفَضْلُ الْمُسْتَحَقُّ لِاَحَدِ الْمُتَعَاقِدَیْنِ فِی الْمُعَاوَضَۃِ الْخَالِیُ عَنْ عِوَضٍ شُرِطَ فِیْہِ

مالی لین دین کے معاملات میں ایک فریق کی طرف سے پیش کیا جانے والا وہ قدر زائد جس کے مقابلہ میں دوسری جانب سے مال کا کوئی حصہ نہ ہو اور یہ قدر زائد معاملہ میں مشروط بھی ہو۔

سوالنامہ کے دوسرے مندرجات کے پیش نظر یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ غنایہ شرح ہدایہ نے فی محل مخصوص کی شرط بھی عائد کی ہے یعنی مالی لین دین میں قدر زائد اس وقت سود قرار دیا جائے گا جب وہ محل مخصوص ' (دارالاسلام) میں ہوا ہو۔

دارالحرب کے اعتبار سے سود کا حکم

دارالحرب میں غیر مسلم سے یہ معاملہ سود نہ ہوگا۔ اس مسئلہ کا تعلق دراصل عقود فاسدہ سے ہے جس کی بنیاد یہ آیت ہے ۔

فَاِنْ کَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّکُمْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ ۔

خطبہ صدارت ۱۳۴۶ھ علامہ انور شاہ کشمیری اجلاس جمیعۃ پشاور۔

متعدد احادیث سے بھی دارالحرب میں عقود فاسدہ کی یہ نوعیت واضح ہوتی ہے فرمایا۔

لَا رِبَا بَیْنَ اَھْلِ الْحَرْبِ وَالْاِسْلَامِ (کنوز الحقائق علی ہامش الجامع الصغیر ج ۲ صفحہ ۱۶۹)

مذکورہ حدیث مرسل ہے مگر امام طحاوی نے مشکل الآثار (باب الربا ج ۴ ص ۲۴۱) میں اسی مفہوم کی دوسری روایت نقل ہے جو مسند ہے۔

امام طحاوی نے مشکل الآثار میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے حضرت عباسؓ جو پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے اور مکہ میں مقیم تھے غیر مسلموں کے ساتھ سودی لین دین کیا کرتے تھے فتح مکہ کے موقع پر جب کہ یہ جگہ بھی دارالاسلام بن گئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سودی معاملات کے خاتمہ کا اعلان فرمایا، مدینہ طیبہ میں ۸ھ ہی میں سود کی حرمت کا حکم نازل ہو چکا تھا۔

سورۂ الم غلبت الروم کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو حضرت ابوبکرؓ نے مکہ میں غیر مسلموں سے رومیوں کے دوبارہ غلبہ پانے کی خوشخبری سنائی اس پر ان سے دو طرفہ شرط بھی لگ گئی رسول اکرمؐ نے مدت اور معاوضہ میں توسیع فرمائی، غزوہ بدر کے موقع پر وہ واقعہ پیش آیا جس کی قرآن مجید میں خبر دی گئی تھی، صلح حدیبیہ کے زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ نے ۱۰۰ اونٹ شرط کے مطابق حاصل کر لئے۔

دارالکفر اور دارالحرب صرف لفظی فرق ہے

امام مالک کے نزدیک دارالحرب سے اگر معاہدہ صلح ہو تو وہ اس کے غیر مسلموں کے ساتھ ربوی معاملات کے عدم جواز کے قائل ہیں ورنہ نہیں چنانچہ ان سے پوچھا گیا کہ مسلمان دارالحرب جائے تو اس کے اور حربی کے درمیان ربا ہوگا؟ انھوں نے پوچھا تمہارے اور ان کے درمیان صلح ہے؟ سائل نے جواب دیا نہیں، فرمایا تو اس صورت میں ربوی معاملات جائز ہوں گے (المدونۃ الکبریٰ)

لیکن امام ابو حنیفہ اور امام محمد ہر ایک دارالکفر کو دارالحرب ہی مانتے ہیں ان کے نزدیک صلح سے دارالکفر کے ساتھ، عقود فاسدہ کے جواز پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، چنانچہ شرح السیر الکبیر ج ۴ ص ۲۲۸) میں ہے:-

> صلح کی وجہ سے دارالحرب، دارالاسلام نہیں بن جاتا مسلمانوں کے لئے بھی دار الحرب (کے غیر مسلم) باشندوں کا مال ان کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہے کیونکہ اس میں غدر پایا جاتا ہے البتہ ان کی خوشی سے یہ معاملہ ہو تو یہ غدر نہ ہوگا اور ان سے لیا ہوا مال مباح ہوگا۔

سوال نمبر ۲ ہندوستان میں شاہ عبدالعزیز دہلوی (فتاویٰ عزیزیہ میں)

ان کے سات فتوے موجود ہیں) مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ نے غیر مسلموں کے ساتھ، ان کی رضامندی پر ربوی معاملات کو جائز قرار دیا ہے، مولینا گنگوہی کے فتوی کی متعدد نقلیں (فوٹو کاپیاں) مختلف افراد کے پاس موجود ہیں، مولانا محمد علی تھانوی اور علامہ انور شاہ کشمیری کی بھی یہی رائے تھی۔

فقہائے احناف نے اپنی کتابوں میں دو ہی دار بیان کئے ہیں دارالکفر اور دارالاسلام اور مولانا انور شاہ صاحب نے دارکفر کی دو قسمیں دارالامن اور دارالخوف بیان کی ہیں لیکن ربوی معاملات میں ان کے نزدیک دونوں کا حکم یکساں ہے (ملفوظات مولانا انور شاہ کشمیری ص ۱۱۹، ۱۲۰)

دارالاسلام کے دارالحرب بن جانے کے لئے صاحبین کے نزدیک صرف اقتدار کی منتقلی کافی ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک تین باتیں پائی جانا ضروری ہیں۔

۱۔ احکام کفر کا علی الاعلان جاری ہونا۔

۲۔ دارالحرب سے متصل ہونا۔

۳۔ اسلام کے دیئے ہوئے امان کا مسلمانوں اور ذمیوں سے اٹھ جانا۔

ہندوستان جس میں دستوری حیثیت سے مسلمان بھی شریک ہیں اور ان کو قانونا برابر کا حق دیا گیا ہے اس لئے دارالحرب کی جملہ شرطیں یہاں موجود نہیں، کیونکہ مسلمان بھی اس میں شریک حکومت ہیں، قانون سازی اور نفاذ قانون دونوں میں حصہ لینے کے مواقع ان کو حاصل ہیں اس کے ساتھ ہی وہ اقلیت میں ہیں، جمہوری طرز حکومت کی وجہ سے قانون سازی کی نوعیت مختلف ہے اور کثرت آراء سے قوانین بنائے جاتے ہیں اس لئے مسلم اقلیت کے احکام و مسائل کو پھر سے زیر بحث لانے اور ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ ایسے حالات میں بھی یہاں عقود فاسدہ کے جواز کا حکم دیا جانا انسب ہے۔ خواہ یہ دارالامن ہی کیوں نہ ہو جو سہولتیں میسر ہیں ان کی وجہ سے عقود فاسدہ کی نوعیت اور ان کے جواز کی ضرورت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سوال نمبر ۴ تا ۱۱ اس لئے سوالات نمبر ۴ سے نمبر ۱۱ تک کی تمام صورتوں میں غیر مسلموں سے، حکومتوں سے، ان کے بینکوں سے وہ سارے معاملات جائز ہوں گے جن کے بارے میں سوالات میں تفصیل دی گئی ہے۔

چنانچہ مفتی اعظم دیوبند مولانا عزیز الرحمٰن صاحب نے بینکوں سے سود لینے کے جواز کا فتوی دیا اور اجلاس جمعیۃ علماء سورت میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر علماء کی موجودگی، اتفاق سے

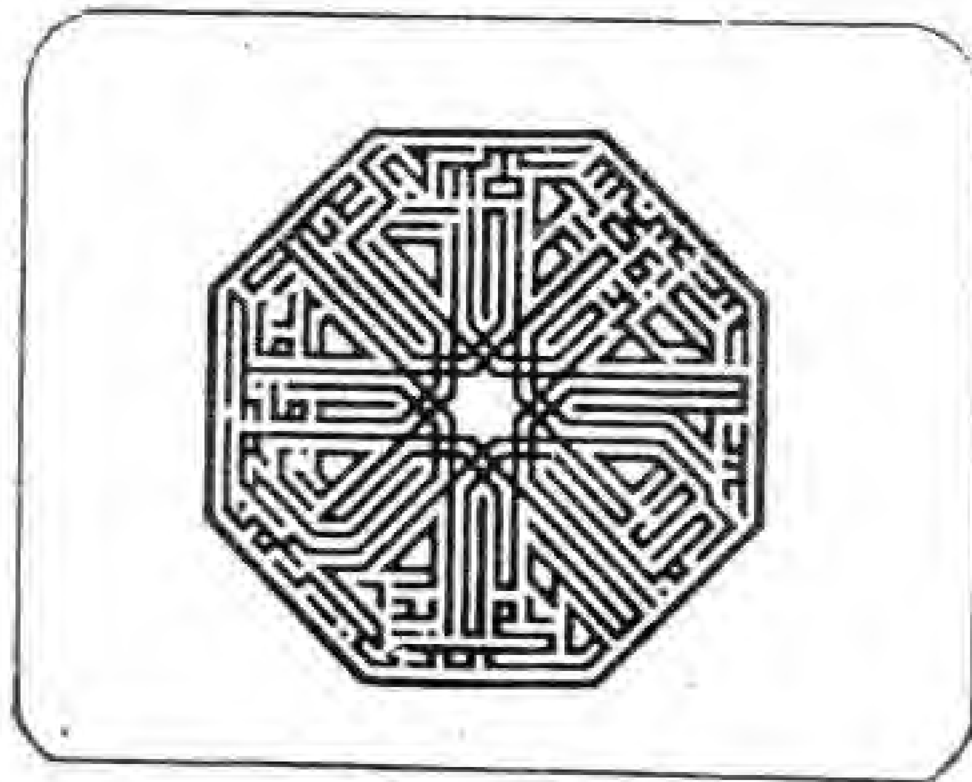
ہندوستان میں سودی لین دین کے جواز کا اعلان کیا گیا۔

سوال نمبر ۷ — استرداد حق بھی اپنی شرطوں کے ساتھ ایک عملی صورت ہے، دار الحرب میں قائلین جواز کا مسلک واضح ہے۔

سوال نمبر ۸ — قرض لے کر اس میں چھوٹ مل جاتی ہو، ادا کی ہوئی رقم مع سود اس کے مساوی ہو گو یہ حقیقت میں سود نہیں، صورت کا اعتبار نہیں۔

سوال نمبر ۹ — بین الاقوامی تجارت میں مذکورہ صورت، ضرورت شدیدہ کے ذیل میں آتی ہے اور الضرورات تبیح المحظورات، دفع ضرر اور مصالح کلیہ کا حصول بھی ضرورت شدیدہ ہے۔

سوال نمبر ۱۰ تا ۱۱ — حکومت یا افراد کے بینکوں میں، دار کے فرق سے حکم بدل جائے گا کمپنیوں کے بارے میں بھی مذکورہ اصل، مدار احکام ہے۔



سود کا مسئلہ

جواب (۱)

(۱) ——— مولانا محفوظ الرحمن قاسمی جامعہ مفتاح العلوم۔ مئو

ابن العربی نے احکام القرآن میں فرمایا: الربوا فی اللغۃ الزیادۃ والمراد بہ فی الآیۃ کل زیادۃ لا یقابلہا عوض۔ کہ ربٰوا کے معنی لغت میں زیادتی کے آتے ہیں اور آیت میں ربٰو سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلے میں کوئی مال نہ ہو بلکہ محض ادھار اور اس کی میعاد ہو۔

امام جصاص رازی احکام القرآن ص ۴۶۹ ج ۱ باب البیع میں ربوا کے معنی بیان فرماتے ہیں: ھوالقرض المشروط فیہ الاجل وزیادۃ مال علی المستقرض۔ کہ کسی میعاد کے لئے اس شرط پر قرض دیا جائے کہ قرض دار اصل مال سے کچھ زائد رقم ادا کرے گا۔ ربٰو ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل قرض جر نفعًا فھو ربًا۔ کہ ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل ہو ربوا ہے (جامع صغیر ماخوذ من معارف القرآن)

خلاصہ حقیقت سود۔ ایسے قرض پر روپیہ دینا جس پر نفع کے نام سے کچھ زیادتی وصول کی جائے (اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۱۴۳)

صاحب بحر الرائق ربوا کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لیس المراد مطلق الفضل بالاجماع فان فتح الاسواق فی سائر بلاد المسلمین للاستفضال والاسترباء وانما المراد فضل مخصوص وھو فضل بلا عوض فی معاوضۃ مال بمال ای فضل احد المتجانسین بالمعیار الشرعی ای الکیل والوزن (ماخوذ مجموعہ فتاوے ص ۳۵ ج ۲)

احکام القرآن میں امام جصاص رازی نے ربوا کی دو قسمیں بیان کی ہیں (۱) ایک بیع وشراء کے ذریعے (۲) دوسرے بغیر بیع وشراء کے ذریعہ۔

امام رازی نے بھی اپنی تفسیر میں ربوا کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں جن کے کلمات یہ ہیں

ایک معاملات بیع وشراء کے اندر ربوا' دوسرے ادھار معاملات کے اندر ربوا' زمانہ جاہلیت کا ربوا یہی ادھار معاملات کے اندر تھا یعنی قرض میں بحساب میعاد نفع لیا جاتا تھا۔

ابن جریر طبری آیت ربوا: یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا مابقی من الربوا کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ کسی ایک میعاد معین کے لئے قرض دے کر اس پر اصل راس المال سے زائد مقررہ زیادتی وصول کرنا اور اگر میعاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہ کر سکا تو مزید میعاد اس شرط پر بڑھا دینا کہ سود میں اضافہ کیا جائے۔ یہی جاہلیت میں جاری تھا۔

معاملات بیع وشراء کے اندر ربوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کرنے سے معلوم ہوا جو خاص اقسام بیع وشراء میں کمی زیادتی یا ادھار کا نام ہے اس کو عرب کے لوگ ربوا نہیں سمجھتے تھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ربوا کے مفہوم میں ان کو بھی داخل فرمایا وہ اشیاء جو منصوص علیہ ہیں سونا' چاندی' کھجور' گیہوں' جو اور نمک ہیں ان چھ چیزوں کی بیع وشراء میں یہ حکم نافذ کیا کہ جب ان کا تبادلہ ہم جنس سے کیا جائے تو دست بدست اور برابر سرابر ہونا چاہیئے کمی بیشی کی گئی یا ادھار کیا گیا تو وہ بھی ربوا ہے۔ اسی اصول کے تحت عرب میں معاملات کی چند صورتیں جو محاقلہ اور مزابنہ کے نام سے رائج تھیں ان کو ربوا میں شامل فرما کر اس معاملہ کے کرنے سے منع فرما دیا۔ جب آیت ربوا نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے اس کو چھوڑ دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قانونی خصومات میں نافذ کیا۔ جس سے ثابت ہو کہ ربوا الفضل یعنی ادھار دیکر میعاد کے عوض اس پر نفع لینا اصل ربوا کا مصداق ہے۔ اور اس میں کسی طرح کا کوئی ابہام اور اشتباہ نہیں۔ البتہ جن چیزوں کی بیع وشراء میں کمی زیادتی اور ادھار کو ربوا میں شامل کیا گیا اس میں یہ بات بھی قابل غور تھی کہ ربوا ان چھ چیزوں میں محدود ہے یا ان کے علاوہ اور اشیاء اس میں داخل ہیں اگر ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے۔ کن کن چیزوں کو داخل ربوا سمجھا جائے۔ یہی اشکال حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیش آیا جس کی بنیاد پر فرمایا:

ان آیۃ الربوا آخر ما نزل من القرآن وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قبض قبل ان یبینہ لنا فدعوا الربوا والریبۃ۔ یعنی آیت ربوا نزول کے اعتبار سے آخری آیت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی وضاحت کرنے سے قبل ہی وفات دے دیئے گئے ربوا کو چھوڑنا ہی ہے جس میں ربوا کا شبہ ہو اس کو بھی چھوڑنا چاہیئے۔

(احکام القرآن للجصاص الرازی ص۴۶۴)

ربوا کی اس قسم کے حرام ہونے پر احادیث متواترہ بھی وارد ہیں مگر پوری تفصیلات نہ ہونے کی وجہ سے اس میں صحابہ کرام کو اشکالات پیش آئے اور فقہاء کے مابین اختلافات ہوئے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اموال ربویہ میں قدر و جنس کے اتحاد کے وقت تفاضل و نسیہ دونوں حرام اور کسی ایک کے اختلاف کے وقت نسیہ حرام یعنی امام ابوحنیفہ نے علت قدر مع الجنس اخذ کیا۔ اور امام شافعیؒ نے علت جنس اور ثمینۃ اثمان میں اور طعم مطعومات میں اخذ کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ المحدث الدہلویؒ نے فرمایا کہ ربوا ایک حقیقی ہے اور ایک وہ ہے جو حکم ربوا ہے۔ حقیقی ربوا قرض پر زیادتی لینے کا نام ہے اور بحکم ربوا وہ ہے جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے کہ بعض خاص چیزوں کی بیع میں زیادتی لینے کا نام ربوا ہے اور ایک حدیث میں جو یہ ہے کہ الربوا فی النسیۃ کہ ربوا صرف ادھار میں ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ حقیقی اور مشہور ربوا جس کو عام طور پر ربوا سمجھا جاتا ہے وہ ادھار پر نفع لینے کا نام ہے اس کے سوا جتنی اقسام اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں وہ سب حکمی ربوا میں داخل ہیں۔ آج کل جو ربوا انسانی معیشت کا مدار سمجھا جاتا ہے اور مسئلہ سود میں زیر بحث ہے وہ یہی ربوا ہے جس کی حرمت قرآن اور چالیس احادیث میں وارد ہے اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

حقیقی ربوا (قرض پر زیادتی لینا) اور بحکم ربوا (جس کا ثبوت حدیث نبوی سے ہوا) دونوں قسمیں دارالحرب کے اندر دارالحرب میں موجود کچھ لوگوں کے لئے اور اس طرح کے دوسرے معاملات امام ابوحنیفہ اور امام محمد نے جائز قرار دیا ہے۔ جس کی تفصیل بشمول اقوال ائمہ مندرجہ ذیل ہے۔

جواب ۲ : سودی معاملات دارالاسلام میں کرنا مطلقاً یا دارالحرب میں مسلم اصلی یا ذمی یا اس حربی سے جس نے اسلام لانے کے بعد ہجرت کی اور پھر دارالحرب کی طرف لوٹ گیا ہو اس سے سود لینا یا دینا بالاتفاق حرام ہے اور دارالحرب میں کافر حربی مسلمان ہو کر دارالحرب میں رہتا ہو دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کی ہو اس سے سود لینا اسی طرح جمیع بیوع فاسدہ سے جس میں اس کی رضا ہو اس کا مال لینا جائز ہے (درمختار ص۱۔ بحوالہ تحذیر الاخوان) ولا بین حربی ومسلم مستأمن ولو بعقد فاسد او قمار ثمہ لان مالہ ثمہ مباح فیحل مالہ برضاہ مطلقاً بلا غدر خلافاً للثانی والثلثۃ وحکم من اسلم فی دار الحرب ولم یہاجر کحربی۔۔۔۔ احترز بالحربی من المسلم والذمی

وکذلک من المسلم الحربی اذا هاجرالینا ثم عاد الیهم فانه لیس للمسلم ان یرابی معہ اتفاقاً۔
دارالحرب میں جن مذکور افراد کے ساتھ سودی معاملات کرنے کی اجازت امام محمد اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہے اس جواز کے سلسلے میں اس بات کی تحقیق بھی ضروری ہے کہ یہ معاملات حقیقۃً سودی قرار دیئے جائیں گے یا صورۃً سودی معاملات ہوں گے اس سلسلے میں فتح القدیر میں: لاربوا بین المسلم والحربی کی علت لان مالھم مباح فی دارھم کے ضمن میں فرمایا: لایخفی ان ھذا التعلیل انما یقتضی حل مباشرة العقد اذا کانت الزیادة ینالھا المسلم والربوا اعم من ذلک اذیشمل ما اذا کان درھمان من جھة المسلم اوالکافر وجواب المسئلة بالحل عام فی الوجھین۔
یعنی دارالحرب میں حربی کا مال مسلم مستامن کے لئے غیر معصوم ہونے کی وجہ سے حلال ہے اور حلال ہونے کی علت چاہتی ہے کہ یہ سودی معاملہ بھی جائز ہے بشرطیکہ ملنے والی زیادتی مسلمان کے حق میں ہو۔ حالانکہ ربوا اس سے عام ہے کیونکہ جب دو درہم مسلم کی طرف سے یا کافر کی طرف ہوں ہر ایک کو شامل ہے اور مسئلے کا جواب حلت دونوں صورتوں کو شامل ہے۔ مذکورہ دونوں عبارتوں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دارالحرب میں سودی معاملات صورۃً سود ہوتے ہیں حقیقۃً سود نہیں ہوتے۔ بعض لوگوں نے حقیقۃً سود نہ ہونے کی یہ علت بیان کی ہے کہ دارالحرب میں حربی کا مال اور مال کے متقوم اور معصوم ہونے کی بنیاد دارالاسلام پر رکھا ہے۔
دوسری طرف لاربوا بین المسلم والحربی کی علت لان مالہ ثمہ مباح میں یہ مذکور ہے کہ: فلا یستلزم اباحة المال اباحة العقد یعنی مال کی حلت سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ عقد سودی نہ ہو کیونکہ مال کا حلال ہونا علیحدہ چیز ہے اور عقد کا جائز ہونا علیحدہ چیز ہے جس کی نظیر فقہ میں موجود ہے۔ مثلاً کوئی مقرض مستقرض سے اپنا دین نہ وصول کر سکے وہ یہ ہے کہ ایک حر (آزاد) کو اس کے ہاتھ بعوض ثمن مساوی دین کے بیع کر کے روپیہ پر قبضہ کر لے تو یہ معاملہ حرام ہوگا اور مال حلال نیز حربی اور مسلم کے مابین ہونے والے معاملات کے جواز کی کسی نے تشریح نہیں کی بلکہ مال کو صرف طیب کہا ہے۔ سیر کبیر میں ہے اذا دخل المسلم دارالحرب بامان فلا باس بان یاخذ اموالھم بطیب انفسھم بای وجہ کان لانہ انما اخذ المباح علی وجہ عری عن الغدر فیکون ذلک طیبا لہ کہ مسلمان جب امان لے کر دارالحرب میں داخل ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ ان کا مال لے ان کی مرضی سے جس طرح سے ہو

اس لئے کہ مباح چیز کا لینا اس طرح کہ جو غدر میں داخل نہ ہو طیب اور بہتر ہے اور اس کی تائید بھی اس بات سے ہوتی ہے کہ بیع فاسد میں مشتری بائع کی اجازت سے سامان پر قبضہ کرلے تو یہ سامان مشتری کی ملک میں ہو جاتا ہے یہ بیع فاسد حقیقۃً بیع ہوتی ہے۔ یعنی اس بیع کے سبب ثبوت ملک حاصل ہوتی ہے: اذا قبض المشتری المبیع فی البیع الفاسد بامر البائع وفی العقد عوضان کل واحد منہما مال ملک المبیع ولزمتہ قیمتہ کی علت میں تحریر ہے: ولنا انہ رکن البیع صدر من اہلہ مضافا الی محلہ فوجب القول بانعقادہ ولا خفاء فی الاہلیۃ والمحلیۃ ورکنہ مبادلۃ المال بالمال وفیہ الکلام (ھدایہ ص ۶۲ ج ۳) کہ رکن بیع ایجاب و قبول اس کے اہل (متعاقدین) سے صادر ہوا اور ایسے محل کی طرف مضاف ہے جس میں محل عقد ہونے کی صلاحیت ہے چنانچہ مبیع تو اس میں مال ہے ہی ثمن بھی من وجہٍ مال ہے اس معنیٰ کرکے خمر اور خنزیر کی طرف بعض لوگوں کی طبیعت کا میلان ہے صرف اتنی بات ہے کہ وہ متقوم مال نہیں تو لامحالہ اصل بیع منعقد مانا جائے گا اور نفس بیع کے ذریعہ ثبوت ملک حاصل ہوگی یہیں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ربوا کے تحقق کے لئے مال کا معصوم و متقوم ہونا جو لازمی تھا وہ اگر کسی وجہ سے مفقود ہو جائے تو اسے سودی معاملات سے خارج نہیں مانا جائے گا۔ جیسا کہ اس بیع فاسد کے معاملہ میں کہ شریعت نے خمر و خنزیر کی اہانت کا فیصلہ کیا اور وہ غیر متقوم ہوا لیکن بعض لوگوں کا میلان ہونے کی وجہ سے اسے مال متصور کیا گیا اسی طرح سے مسلمانوں کے اموال متقوم اور معصوم ہیں اور غیر مسلم کے اموال ان کے حق میں بھی متقوم اور معصوم ہیں اگرچہ مسلمانوں کے لئے جائز ڈھنگ سے ان کے اموال کو غیر متقوم اور غیر معصوم قرار دیا گیا اور یہ ضابطہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے المسلم ملتزم بحکم الاسلام حیث مایکون (سیر کبیر ص ۱۱۸ ج ۱) کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہو اسلامی احکام کا پابند ہوگا اور فتح القدیر کی عبارت انما یقتضی حل مباشرۃ العقد اذا کانت الزیادۃ للمسلم سے سودی معاملات کی کوئی دلیل نہیں بنتی اس لئے کہ اس عقد کا جواز اس شرط کے ساتھ موقوف ہے کہ زیادتی مسلمان کو حاصل ہو جس میں احتمال اباحت مال کا بھی ہے جیسا ہدایہ میں مذکور ہے کہ ان کا مال دارالحرب میں مباح ہے۔۔ تحذیر الاخوان میں ص ۶ پر مذکور ہے لا حاجۃ فیہ اما اولاً فلانہ لیس ھذا العنوان بخصوصہ منقولا عن المستحق واما ثانیا فلان معظم الفائدۃ فی ھذہ لیس لفظ حل المباشرۃ بل التقیید بکون الزیادۃ للمسلم فیحتمل التجوز فی لفظ حل المباشرۃ

حیث عبر بہ من اباحۃ المال کما فی الھدایۃ لان مالھم فی دارھم مباح۔
جواب (۳) دارالحرب میں سودی معاملات کا جواز امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے مذہب پر ہونے کی وجہ سے اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دار کتنے ہیں اور ان کے احکامات کیا ہیں۔
دار فقہاء کے نزدیک دارالاسلام اور دارالحرب میں منحصر ہے۔ عینی شرح ہدایہ کتاب السیر ج۲ ص۸۶۱ میں ہے قیل الدار عندنا دارالاسلام ودارالحرب۔
دارالاسلام: وہ ملک ہے جہاں حکومت کا مذہب اسلام ہو اور مسلمانوں کو کلی طور پر اقتدار حاصل ہو۔ قوانین میں ترمیم وتنسیخ کا اختیار رہو۔ شرح سیر کبیر ج۳ ص۲۰۲ میں ہے:
لان الدار انما تکون دارالاسلام باجراء احکام المسلمین فیھا۔ اور فتح القدیر ج۴ ص۳۱۱ میں ہے
وھذا لان دارالحرب تصیر دارالاسلام باجراء الاحکام وثبوت الامن للمقیم من المسلمین فیھا۔ ایسے ہی وہ ملک بھی دارالاسلام ہوگا جہاں مسلمانوں کو اقتدار کلی حاصل نہ ہو مثلاً امور خارجہ میں خود مختاری نہ ہو فوجی اختیارات حاصل نہ ہوں جزا وسزا کے قوانین بنانے کا مجاز بھی نہ ہو لیکن سماجی وعائلی مسائل میں خود مختار ہوں اور ان کا پرسنل لا بھی محفوظ ہو۔ ردالمحتار ج۲ ص۱۷۵ میں ہے کل مصر فیہ وال مسلم من جھۃ الکفار یجوز منہ اقامۃ الجمعۃ والاعیاد واخذ الخراج وتقلید القضاء وتزویج الایامی۔
دارالحرب: ایسا ملک جہاں اسلامی احکامات کا بالکلیہ نفاذ نہ ہو اور مسلمانوں کو امان لئے بغیر اس میں رہنے کا حق حاصل نہ ہو اور دارالحرب سے اس کی سرحدیں ملتی ہوں۔
لا یصیر دارالاسلام دارحرب الا بامور ثلثۃ باجراء احکام اھل الشرک وباتصالھا بدارالحرب وبان لا یبقی فیہ مسلم ولا ذمی آمنا بالامان الاول علی نفسہ۔ وقالا بشرط واحد لا غیر وھو اظہار حکم الکفر وھو القیاس ھندیہ رد المحتار۔ قولہ باجراء احکام اھل الشرک ای علی الاشتہار وان لا یحکم فیھا بحکم الاسلام ھندیہ وظاھرہ انہ لو اجریت احکام المسلمین واحکام اھل الشرک لا تکون دارالحرب۔
محققین کی اس تحقیق پر کہ ہندوستان نہ دارالحرب ہے اور نہ دارالاسلام بلکہ بین بین ہے اب اس بات کا تعین ضروری ہے کہ اس درمیانی دار کو کونسا دار کہا جائے کہ اس تحقیق سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ دارالحرب اور دارالاسلام کے علاوہ کوئی

اور دار ہے نظام الفتاوی ج۱ ص۲۰ میں دار کی تقسیم دارالحرب اور دارالاسلام کی تحقیق کے ضمن میں دار کی پانچ قسمیں بیان کی گئی ہیں (۱) دارالاسلام (۲) دارالحرب پھر دار کی بنیادی اصولی طور پر چار قسمیں بیان کی ہیں (۱) دار الحرب یا دار المحاربہ (۲) دار المعاہدہ والمسالمہ (۳) دار الامن (۴) دار الشر والفساد۔

اس تقسیم کی وجہ یہ بیان کی کہ دارالاسلام کا محاربہ دارالحرب سے ہوگا یا نہیں اگر ہوگا تو اس کا نام دار الحرب یا محاربہ ہوگا اگر نہ ہوگا تو دو حال سے خالی نہیں۔ آپس میں دونوں داروں اور ان کی حکومتوں میں معاہدہ ہوگا یا نہیں اگر ہوگا تو اس کو دار المعاہدہ یا دار المسالمہ کہیں گے اور اگر معاہدہ نہ ہوگا تو پھر دو حال سے خالی نہیں یا تو اس ملک کے باشندے اور اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون ومحفوظ ہوں گے یا مامون ومحفوظ نہ ہوں گے اگر مامون محفوظ رہتے ہوں گے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ملک حبشہ تھا تو اس ملک کو دار الامن کہا جائے گا۔ اگر اس ملک کے مسلم باشندے یا اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون ومحفوظ نہ رہتے ہوں تو اس ملک کو دار الشر والفساد کہا جائے گا جیسے فتح سے قبل مکہ مکرمہ۔

اس تقسیم سے ہندوستان یا اس طرح کے جمہوری ممالک اور ان کے قوانین کو دیکھا جائے تو دار کی دارالاسلام اور دارالحرب کے علاوہ جو قسمیں بیان کی گئی ہیں وہ بے سود نظر آتی ہیں ہندوستان کا دستور اور قانون دیکھا جائے مثلاً مسلمانوں کو سیاسی امور میں حصہ لینے کا مساوی حق اور باشندوں کی طرح ہے اور مذہب پر عمل کرنے تبلیغ احکام کی مکمل آزادی اور مسلم پرسنل لاء بھی محفوظ ہے اور ملک کی حفاظت اور اس کی ترقی میں برابر کا شریک سمجھنا اور امن وسکون سے رہنا جماعت کی کثرت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک شہری ہونے کی بنیاد پر ہے۔ یہی نہیں بلکہ ملک کے اہم عہدوں پر مسلمانوں کا تقرر یہ سب باتیں سامنے رکھتے ہوئے دار الحرب کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ دارالاسلام ہی ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا کیونکہ دارالاسلام کی جو تعریف کی گئی ہے کہ کل معرفیہ دال مسلم من جهة الكفار يجوز منه اقامة الجمعة والاعياد ولخذ الخراج الخ اس پر صادق آتی ہے۔

جواب (۴) سود کے متعلق قرآن وحدیث میں جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان کی روشنی میں بینک میں جمع شدہ رقوم پر سود لینا بھی حرام ہے۔ لیکن اس سود کو بینک میں

چھوڑ دیا جائے تو مسلمانوں ہی کے خلاف اس کا استعمال ہوتا ہے اس لئے حیلہ شرعی کے تحت اس کو نکال لے کر سرکار بہت سے محصول وصول کرتی ہے جو شریعت کی رو سے ظلم ہے یہ شخص یہ خیال کرے کہ غریب رعایا سے سرکار نے جو محصول خلاف شرع لیا ہے اسی کو میں سرکار سے وصول کر رہا ہوں اور وصول کرنے کے بعد فقراء و مساکین اور رفاہِ عام میں بلا نیت ثواب خرچ کردے جن سے سرکار نے بلا اذن شرع ٹیکس لیا تھا اس کے تصدق سے ربوا پر جو مواخذہ ہے ہو سکتا ہے کہ اس سے بچ جائے کل مال حصل بطریق محظور فسبیلہ التصدق۔

جواب ⑤ : ⑥ سود لینا اور دینا دونوں یکساں درجے میں حرام ہیں۔ قباحت و حرمت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں حدیث میں ہے لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ۔

اشباہ والنظائر ص۱۶۰ پر القاعدۃ الرابعۃ عشرۃ میں فرمایا: ما حرم اخذہ حرم اعطاءہ کالربوا کہ جس کا لینا حرام اس کا دینا بھی حرام جیسے ربوا۔

سود دینا غیر اسلامی ممالک میں کسی طرح جائز نہیں کیونکہ یہ اعانت علی المعصیہ ہے اور سودی قرض بھی لینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی البتہ ایسا شخص جس کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہ ہو اور سودی قرض لینے کے سوا کوئی سبیل نہ ہو مثلاً مزدوری کا کام بھی نہیں ملتا اور بزنس کے لئے بلا سود قرض بھی نہیں ملتا تو اس کے لئے بقدر ضرورت گنجائش دی جا سکتی ہے۔ وہ جلد از جلد اس سے نجات کی کوشش کرے۔ اشباہ والنظائر کی شرح میں فرماتے ہیں کہ وینبغی ان یستثنیٰ الاخذ بالربوا للمحتاج فانہ لا یحرم کما صرح بہ المصنف۔

جواب ⑦ ⑧ ⑨ ⑩ ⑪ سرکاری وغیر سرکاری بینکوں اور انفرادی و شخصی یا اجتماعی پبلک تنظیموں اور اداروں کی طرف سے امداد باہمی اور ترقی کے نام پر جاری منصوبے اور اسکیمیں اور اشیاء کی درآمد برآمد پر ایسے ٹیکس لگانا جو سوسائٹیوں کے چلانے میں معاون ثابت ہوں اسلامی اقتصادی نظام سے اگر متضاد اور مخالف ہوں لیکن یہ مخالفت منصوص علیہ اور غیر مجتہد فیہ مسائل میں نہ ہو تو کسی عادلانہ متبادل نظام کے قائم ہونے تک ان اسکیموں میں شریک ہونے کی اجازت ایسے ممالک میں دی جا سکتی ہے جو غیر اسلامی اقتدار کے زیر اثر ہوں لیکن ہندوستان میں آباد مسلم وغیر مسلم کے درمیان

سودی لین دین کی کوئی گنجائش نہیں دی جاسکتی مثلاً کاروبار یا تعمیر مکان کے لئے سودی قرض لینا یا لاٹری اور قمارہ میں شرکت کرنا ناجائز ہوگا کیونکہ یہ احکامات منصوص علیہ اور غیر مجتہد فیہ ہیں۔



ربوا کی شرعی حقیقت

انشا ——— مولانا محمد زید۔ جامعہ عربیہ ہتھورا۔ باندہ

جواب ۱ ۔ شریعت کی اصطلاح میں ربوٰا اس زیادتی کو کہتے ہیں جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو المراد کل زیادۃ لا یقابلها عوض[1]۔ فقہاء اس کی تعریف یوں فرماتے ہیں۔ وشرعا فضل مال بلا عوض فی معاوضۃ مال بمال بمعیار شرعی وھو الکیل او الوزن فی الجنس[2]۔ یعنی ربا ایسی زیادتی کو کہتے ہیں جو مال لین دین میں بغیر کسی عوض کے شرعی دائرہ کے اعتبار سے ہو۔

شریعت اسلامیہ میں ربا تین قسموں پر مشتمل ہے۔ ۱ وہ ربا جو جاہلیت عرب میں رائج تھا۔ ۲ مکیلی موزونی (یعنی ناپ تول کر بیچنے والی اشیاء) میں اتحاد جنس کی صورت میں زیادتی کا ربا۔ ۳ ربا کی دو علتوں میں سے ایک کے پائے جانے کی صورت میں نساء (ادھار) کا ربا[3]۔

جاہلیت عرب میں جو ربا جائز تھا اس کی صورت یہ تھی مدت معینہ کے لئے ادھار رقم دے کر باہم رضامندی کے ساتھ اس پر نفع لیتے اور جتنی مدت ادھار کی بڑھتی جاتی اتنا ہی سود بڑھاتے جاتے[4]

ربوا کی بقیہ دونوں قسموں سے اہل عرب ناواقف تھے اسلام نے آکر ان دونوں صورتوں کو بھی داخل فرمادیا جس کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔

ربوا کے حدود اور اس کا دائرہ

ربوٰ کا دائرہ محدود ہے، چند شرائط وعلل کے ساتھ جب وہ شرائط پائے جائیں گے تب تو ربوا کا

---

۱ احکام القرآن لابن العربی ص ۱۰۱ ج ۲۔ ۲ بدائع ص ۱۸۳ ج ۵ شامی ص ۱۷۷ ج ۴ بحر ص ۱۳۵ ج ۶۔ ۳ احکام القرآن الجصاص ص ۴۶۵ ج ۱
۴ طحاوی شریف ابواب الصرف۔ ابن جریر ص ۶۲ ج ۳۔ احکام القرآن ص ۴۶۵ ج ۱

تحقق ہوگا۔ ورنہ ایک شرط کے بھی فوت ہو جانے سے ربوٰا اپنے دائرہ سے خارج ہوجائے گا اور وہ شرائط و علل کتب فقہ میں مذکور ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے

① مال کی زیادتی ایسی ہو کہ اس کے مقابلہ میں کوئی عوض نہ ہو۔

② وہ زیادتی شرعی معیار کے تحت ہو یعنی کیل و وزن میں داخل ہو خواہ حقیقتاً خواہ حکماً۔

③ جن اشیاء میں لین دین ہو رہا ہے وہ سب متحد الجنس ہوں۔

④ نفس معاملہ میں وہ زیادتی مشروط ہو خواہ صراحۃً خواہ دلالۃً وعرفاً

⑤ زیادتی کی شرط متعاقدین (معاملہ کرنے والوں) میں سے کسی ایک کے لئے ہو زیادتی کی شرط اگر کسی ثالث کے لئے ہوگی تو ربوٰ نہ ہوگا البتہ شرط باطل ہوگی

⑥ زیادتی کی شرط مبادلات و معاوضات میں ہو تبرعات میں ربوٰ نہیں۔

⑦ متعاقدین کا مال ایسا ہو کہ شریعت نے ان کو معصوم قرار دیا ہو یعنی مباح المال نہ ہوں (جیسے کسی حربی کا مال)

⑧ متعاقدین کا مال ایسا ہو کہ شریعت نے ان کو معصوم ہونے کے ساتھ متقوم یعنی مضمون) بھی قرار دیا ہو۔

⑨ متعاقدین کا مال کسی ایک ہی عاقد کی ملکیت نہ ہو ورنہ ربوٰ نہ ہوگا جیسے سید و عبد کے مابین مذکورہ بالا شرائط ہی ربوٰ کا دائرہ ہیں اس دائرہ میں رہتے ہوئے ربوٰ کا تحقق ہوگا۔ ایک شرط کے فوت ہوجانے سے بھی ربوٰ اپنے دائرہ سے خارج ہو جائے گا۔ البتہ دوسری اور تیسری شرطوں میں سے صرف ایک کے پائے جانے سے ربوالنساء کا تحقق ہو جائے گا۔

یہ تمام شرائط بدائع اور شامی سے ماخوذ ہیں[1]۔

دارالحرب و دارالاسلام کی بحث

جواب :۔ دارالحرب، دارالاسلام کی تعریف اور اس میں امام صاحب و صاحبین کا اختلاف مشہور ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دارالحرب کے تحقق کی تین شرطیں ہیں ۱؎ غیر مسلمین کے احکام و قوانین کا نفاذ ہونا یعنی ان کا برسر اقتدار تسلط ہونا ۲؎ کسی دارالحرب سے اتصال ہونا یعنی درمیان میں

---

[1] بدائع ص ۱۸۳ ج ۵ شامی باب الربا ص ۱۷۶ ج ۴

کوئی اسلامی ملک حائل نہ ہو۔ ۳ کوئی مسلمان یا ذمی سابق امان کی بنا پر مامون نہ ہو۔

امام ابو یوسف و امام محمدؒ کے نزدیک صرف پہلی ہی شرط سے دارالحرب کا تحقق ہو جاتا ہے۔ یعنی کفار کا پورا تسلط ہونا خواہ وہ دارالحرب سے متصل ہو یا نہ ہو۔ سابق امان باقی ہو یا نہ ہو۔ یہ اختلاف اور تعریف فقہ کی تمام کتب معتبرہ میں مذکور ہے[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ "دارالحرب" کا مفہوم اور اس کی حقیقت بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ جہاں کفر کا بول بالا اور غیر مسلمین کا پورا تسلط ہو قطع نظر اس سے کہ امن و امان ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی فرمایا گیا ہے اس کی حقیقت علامات کی ہے اور علامات میں تغیر و تبدل و تخلف ہوا ہی کرتا ہے، ان علامات کو کبھی شرائط کے نام سے ذکر کر دیا جاتا ہے لیکن کسی شے کی حقیقت اور اس کے وجود و تحقق کے لئے علامات کی حیثیت معیار کی نہیں ہوتی کہ اس کے بغیر اس کا وجود ہی نہ ہو۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے باب جمعہ میں "مصر" و "قریہ کبیرہ" کی تعریف میں فقہاء نے مختلف تعبیرات اختیار فرمائی ہیں اور ان کو مصر کے وجود کے لئے شرط قرار دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی حیثیت صرف علامات کی ہے اسی وجہ سے ہر فقیہ اور مفتی نے اپنے زمانے کے اعتبار سے شرائط بیان کئے (کما حققہ التھانوی فی فتاواہ)

ورنہ ظاہر بات ہے کہ دارالحرب کے تحقق کے لئے امام صاحب کے بیان کردہ شرائط کے مطابق دارالحرب سے اتصال ہونا بھی ضروری ہے یعنی درمیان میں کوئی اسلامی ملک حائل نہ ہو اور یہ اس وجہ سے شرط لگائی گئی کہ اسلامی ملک مداخلت کر سکتا تھا اور دارالحرب سے اتصال کی بنا پر وہ دارالحرب اس کی حمایت کرے گا۔

لیکن آج حکومتوں کے دستور اور معمول کے مطابق کوئی حکومت دوسری حکومت کے معاملات میں دست درازی اور مداخلت نہیں کر سکتی جس کا حاصل یہ نکلا کہ جس علت کے پیش نظر امام صاحب نے یہ شرط ضروری قرار دی تھی اس زمانہ میں اب بے سود رہے گی اور اب اس کی ضرورت نہیں رہ جاتی لہٰذا اس زمانہ میں بالاتفاق یہ شرط ناقابل اعتبار ہونا چاہئے۔

احقر ناچیز کی ناقص رائے کے مطابق امام صاحب و صاحبین کے مابین دارالحرب کی بابت جو اختلاف مذکور ہے دراصل وہ اختلاف کوئی حقیقی اور واقعی اختلاف نہیں۔ "دارالحرب" کی اصل

---

[1] قاضی خاں علی الہامش ص ۵۸۳ ج ۳ شامی ص ۲۵۳ ج ۳ عالمگیری ص ۲۳۲ ج ۲ مجمع الانہر ص ۶۳۰ ج ۱ بدائع ص

حقیقت "غیر مسلم کا تسلط" ہو جاتا ہے۔ اس میں امام صاحب اور صاحبین دونوں متفق ہیں۔ البتہ امام صاحب نے مزید جن دو شرطوں کا اضافہ فرمایا ہے وہ اس وجہ سے کہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جب یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں تب ہی غیر مسلم کا تسلط ہوتا ہے اس لئے امام صاحب نے مغلوب ہونے کا ایک معیار مقرر فرما کر اپنے زمانہ کے اعتبار سے احتیاطاً بطورِ علامت کے ایسی دو شرطوں کا اضافہ فرمادیا جن سے صاحبین نے سکوت فرمایا ورنہ اصلاً امام صاحب و صاحبین کا کوئی حقیقی اختلاف نہیں اس کی تائید ذیل کی تصریحات سے ہوتی ہے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں

"صاحبین اور امام صاحب کا اس میں اتفاق ہے کہ دارالاسلام جب مغلوب کفار ہو جائے گا تو دارالحرب ہو جائے گا۔ مگر خلاف اس میں ہے کہ مغلوب ہونے کو کس قدر قبضہ کفار کافی ہے ——— امام صاحب نے دو قید احتیاطاً زائد کی ہے کہ غلبہ کا تمام ہونا ان پر موقوف ہے۔[1]

حکیم الامت حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں

"شرعی اصطلاح میں دارالحرب کی تعریف یہ ہے کہ جہاں پورا تسلط غیر مسلم کا ہو تعریف تو یہی ہے آگے جو کچھ فقہاء نے لکھا ہے وہ امارات ہیں اور ہندوستان میں غیر مسلم کا پورا تسلط ہونا ظاہر ہے۔"[1]

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی تحریر فرماتے ہیں

"امام صاحب نے اظہار احکام شرک ——— کے علاوہ باقی جو دو شرطیں اور مقرر کی ہیں در حقیقت اسی استیلا یا قہر و غلبہ اہلِ شرک کی علامتیں ہیں۔ نہ کہ مستقل کوئی جداگانہ چیزیں۔ اس تجزیہ کے بعد یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ امام صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ دراصل اسی چیز کی توضیح و تشریح ہے جسے صاحبین نے ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے۔[2]

دارالکفر کے اقسام

اصلاً دار کی صرف دو ہی قسمیں ہیں دارالاسلام، دارالحرب، دارالحرب کا دوسرا نام دارالکفر بھی ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

---

[1] تحذیر الاخوان صـ ۱ ملفوظات اشرفیہ صـ ۴۳ مطبوعہ پاکستان و حسن العزیز ج ۴

[2] برہان اگست ۱۹۶۵ء دارالاسلام اور دارالحرب صـ ۳۰

غور وفکر وفقہاء کے کلام اور حالات پر نظر رکھتے ہوئے دارالکفر کی چار قسمیں سمجھ میں آتی ہیں
(۱) دارالامن (۲) دارالخوف (۳) داربین الامن والخوف (۴) دارالشر والمحاربۃ

(۱) دارالامن ایسے دارالکفر کو کہتے ہیں جہاں مسلمان امن وامان کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوں، ان کی جانیں اور مال محفوظ ہوں۔ وہ اسلامی احکام کے مطابق زندگی گذارنے میں آزاد ہوں (اگرچہ غیر مسلم کا تسلط ہو) خواہ اس بنا پر کہ وہ ایک دستوری جمہوری حکومت ہے یا مصالحت وسالمیت کی بنا پر۔

(۲) دارالخوف ایسے دارالکفر کو کہتے ہیں جہاں کے مسلمان ان کی جانیں اور مال محفوظ نہ ہوں ہر وقت خوف خطرہ غالب ہو، شر وفساد ہوتا رہتا ہو اس وجہ سے کہ حکام غیر مسلمین ہیں اور ان کا تسلط ہے۔

(۳) دار بین الامن والخوف ایسے دارالکفر کو کہتے ہیں جہاں امن بھی ہو خوف بھی ہو، کسی علاقہ میں امن تو کسی علاقہ میں خوف، کسی زمانہ میں امن وامان اور عنقریب زمانہ میں فساد وطغیان قہر غلبہ نہ مسلمانوں کا نہ غیر مسلموں کا کبھی ان کا کبھی ان کا، کبھی یہ غالب وہ مغلوب کبھی وہ غالب یہ مغلوب، تسلط پورے طور سے نہ ان کا نہ اُن کا۔

(۴) دارالشر والمحاربۃ ایسے دارالکفر کو کہتے ہیں جہاں عملی طور سے شر وفساد، جنگ وجدال قتل جہاد کی فضا بنی ہوئی ہے (اقسام بالا کا ثبوت)

دارالکفر کی مذکورہ بالا چاروں قسمیں محض فرضی نہیں ہیں بلکہ شریعت میں ان کی اصل موجود ہے جن میں سے بعض کا ذکر فقہاء نے بھی کیا ہے۔

ابتداء عہد اسلام میں جب کہ کفار مکہ حلقہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیتے، ہر طرح کے مظالم ڈھاتے اور ان کی جانیں اور مال بے خوف وخطر نہ تھیں ایسی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کر جانے کا حکم فرمایا۔ حبشہ کا بادشاہ بھی غیر مسلم تھا اور وہاں بھی پورا تسلط غیر مسلم ہی کا تھا لیکن شاہ حبشہ نے مسلمانوں کو امن وامان اور عزت کے ساتھ پناہ دی جس کی تفصیل کتب سیر میں موجود ہے[1]

حبشہ کی جانب ہجرت کر جانے سے قبل مسلمان جس حالت میں مکہ میں زندگی بسر کرتے تھے وہ ان کے حق میں دارالخوف تھا کیونکہ وہاں وہ امن وامان کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے

---

[1] البدایۃ والنھایۃ ۶۶ و ۶۷ ج ۳

ہر وقت خوف وخطرہ غالب تھا۔

اور حبشہ ہجرت کر جانے کے بعد خود حبشہ ان کے حق میں دارالامن تھا کیونکہ وہاں وہ مامون تھے اگرچہ دارالکفر وہ بھی تھا۔

تیسری قسم بین الامن والخوف ہے، اس کا تذکرہ بھی کتب حدیث وفقہ میں کسی نہ کسی درجہ میں ملتا ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے مشہور قصہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر شرائط طے ہوجانے اور صلح کی تکمیل کے بعد ابوبصیر ابوجندل نامی صحابی نے اسلام لے آنے کے بعد ایک جگہ پڑاؤ ڈالا ــــــ اس کے بعد جو شخص بھی حلقہ اسلام میں داخل ہوتا، اسی زمرہ میں شامل ہوجاتا رفتہ رفتہ ایک اچھی خاصی جماعت تیار ہوگئی۔ ان حضرات کا کام یہ تھا کہ خود کو خطرہ میں ڈال کر جان پر کھیل جاتے۔ قریش کا کوئی بھی قافلہ وہاں سے گذرتا وہ ان پر حملہ آور ہوتے، ان کی جان مارتے اور ان کا مال لے لیتے۔ تفصیل واقعہ کتب حدیث وسیر میں مذکور ہے[۱]۔

ان کی یہ صورت حال بین الامن والخوف کی تھی وہ دوسروں کو مار کر ان کا مال سلب کرتے لیکن خود بھی خائف رہتے کہ کہیں خود ان کی جان سے نہ کھیلا جائے۔

فقہاء کے کلام میں بھی ایسے دار کا تذکرہ ملتا ہے جہاں غلبہ نہ مسلم کا ہو نہ کفار کا اس لحاظ سے نہ وہ دارالاسلام ہو نہ دارالکفر بلکہ اس کی حالت بین بین کی سی ہو۔ "بحر مالح" کی بابت قاری الہدایہ نے یہی تصریح فرمائی ہے کہ نہ وہ دارالاسلام ہے نہ دارالحرب کیونکہ غلبہ کسی فریق کو نہیں۔

فی الشرنبلالیۃ سئل قاری الہدایۃ عن البحر المالح من دار الحرب او الاسلام

اجاب بانہ لیس من احد الفریقین لانہ لا قہر لاحد علیہ[۲]

چوتھی قسم دارالشر والمحاربہ کی ہے اس کی تفصیل کی حاجت نہیں، یہ تو ہر شخص کے نزدیک مسلم ہوگی۔

دارالکفر کے احکام

پہلی قسم دارالامن کا حکم :- اگرچہ یہ دارالکفر کی قسم ہے لیکن احکام کے لحاظ سے دارالاسلام میں

---

[۱] مشکوٰۃ شریف باب الصلح ص ۳۵۳ ج ۲ [۲] در المنتقی علی حاشی مجمع الانہر ص ۶۵۹ ج ۱

لاحق ہے جو معاملات فاسدہ دارالحرب میں حربی سے جائز ہوتے ہیں وہ دارالامن میں جائز نہ ہوں گے مسلمان مہاجرین حبشہ کے حق میں حبشہ دارالامن تھا لیکن کہیں اس کا ثبوت نہیں ملا کہ مسلمانوں نے اہلِ حبشہ سے سودی معاملہ یا عقودِ فاسدہ کو مال حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہو۔

محقق تھانویؒ فرماتے ہیں:

" دارالحرب کے معنی دارالکفر کے ہیں لیکن پھر اس دار کی دو قسمیں ہیں ایک دارالامن دوسرے دارالخوف۔ دارالخوف وہ ہے جہاں مسلمان خوفناک ہوں اور دارالامن وہ ہے جہاں مسلمان خوفناک نہ ہوں۔ دارالامن میں بہت احکام مثل دارالاسلام کے ہوتے ہیں[1]"

دوسری قسم دارالخوف کا حکم :- دارالخوف احکام کے لحاظ سے دارالحرب کے مانند ہے جو احکام دارالحرب کے ہیں وہی اس کے بھی ہیں۔ البتہ حرب و قتال کے لئے جو شرائط ہیں ان شرائط کے بغیر قتال و جہاد کی اجازت نہ ہوگی۔ ہاں دفاعی تدابیر کے تحت ہر ممکن اور جائز صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ نیز اسلامی احکام فرائض، شعائر، پر عمل کرنا ناممکن ہو جائے تو ہجرت بھی لازم ہو جائے گی عبادات عیدین جمعہ وغیرہ کی ادائیگی اس طریقہ کے مطابق لازم ہو گی جس کو فقہاء نے ذکر فرمایا ہے لیکن اس کے علاوہ معاملات کے حق میں دارالخوف دارالحرب ہی کے حکم میں ہوگا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اسلام لانے کے بعد بھی اہلِ مکہ سے سودی معاملات فرمایا کرتے تھے۔

یہ واضح رہے کہ سود کی حرمت مکی زندگی میں بھی ہو چکی تھی۔ اہلِ کتاب کی بابت واخذھم الربوٰ وقد نھوا عنہ فرمایا گیا ہے اور شرائع من قبلنا بہر حال حجت ہیں جب تک کہ اس کے خلاف کا حکم نہ ہو، اور یہ آیت مکی ہے اس سے معلوم ہوا کہ سود کی حرمت مکہ میں بھی تھی۔

لیکن اس کے باوجود حضرت عباس رضی اللہ عنہ مکہ میں جو کہ اس وقت دارالحرب (دارالخوف) تھا اہلِ مکہ سے جو کہ حربی تھے سودی معاملات فرمایا کرتے تھے۔ البتہ فتح مکہ کے بعد جب یہ مکہ دارالاسلام بن گیا، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر مکہ میں بھی سودی معاملات

---

[1] ملفوظات اشرفیہ ص ۳۴ حسن العزیز ج ۴ ص ۱۳۴ الافاضات ج ۲ ص ۱۹۱

کے عدم جواز کا حکم سنا دیا کیونکہ اب مکہ دار الاسلام بن چکا تھا لیکن مکہ کے علاوہ دیگر غیر مفتوحہ علاقے طائف وغیرہ اب بھی دار الحرب تھے اس لئے وہاں اب بھی سودی معاملات جائز تھے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر جبکہ یہ علاقے بھی مفتوح ہو کر دار الاسلام بن گئے اس وقت پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمومی انداز میں سودی معاملات کو ناجائز فرما دیا۔

مزید تفصیلات ودلائل، اعتراضات وجوابات کے لئے ملاحظہ ہو اعلاء السنن ج ۱۴۔ باب الربوٰ بین الحربی والمسلم فی دار الحرب نیز مشکل الآثار للطحاوی ج ۴۔

دار بین الامن والخوف کا حکم:۔ تیسری قسم بین الامن والخوف جہاں غلبہ کسی فریق کا نہ ہو اور جہاں امن وخوف دونوں حالتیں پائی جاتی ہوں، فقہاء کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا دار بھی دار الحرب کے حکم میں شامل ہے۔ ایسے دار کی مثال ماقبل میں "بحر مالح" سے گذر چکی ہے کہ وہ نہ دار الحرب ہے نہ دار الاسلام لیکن فقہاء فرماتے ہیں کہ باعتبار احکام کے وہ دار الحرب سے ملحق ہے۔

ان البحر المالح ملحق بدار الحرب[1]۔

قال فی النھر وینبغی ان یکون مالیس بدار حرب ولا اسلام ملحقا بدار الحرب کالبحر المالح لانہ لا قھر لاحد علیہ[2]۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں کی جماعت، گذرنے والے قریش کے قافلوں کو لوٹ لیا کرتی تھی۔ کیونکہ ان حربیوں کا مال غیر معصوم تھا اور باہم معاہدہ ان حضرات سے ہوا نہیں تھا اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس پر نکیر نہیں فرمائی۔ یہ بھی دلیل ہے اس بات کی کہ جب حالت بین بین کی ہو، غلبہ کسی کا نہ ہو اور صورت حال خوف وامن کے درمیان کی ہو، ایسی حالت کا حکم بھی دار الحرب کے حکم کی طرح ہوگا۔

دار الشر والمحاربہ:۔ کا حکم ظاہر ہے اس کی تفصیل کی حاجت نہیں، مزید کلام جواب۵ میں آرہا ہے۔

---

[1] در المنتقی علی حاشیہ مجمع الانہر ص ۶۳۵ [2] شامی، باب نکاح الکافر ص ۲۷۳

"تنبیہ" مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سودی معاملات اور عقودِ فاسدہ کے لئے دارالشر والفساد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ دارالخوف وبین الامن والخوف کا بھی دارالشر والفساد کا سا حکم ہے نیز فقہاء نے جس پر موقع کلام فرمایا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ محاربہ کے بغیر بھی دارالحرب میں سودی لین دین جائز ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا مکہ والوں سے سودی معاملہ کرنا ایسے حالات میں بھی منقول ہے جبکہ شر و محاربہ کی حالت نہ تھی (اعلاء السنن) میری ناقص معلومات کے مطابق محاربہ اور شر و فساد کی شرط کسی فقیہ نے بھی نہیں ذکر کی بلکہ اس کے خلاف پر دوسری عبارات ناطق ہیں۔ کما فی المبسوط وغیرہ۔ واللہ اعلم

ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام

"دارالاسلام و دارالحرب" کی گذشتہ تفصیل و تقسیم کے بعد یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ موجودہ حالت میں ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام۔ اگر دارالحرب ہے تو کون سی قسم ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے جہاں دستوری حکومت قائم ہے اور ہر ملت و مذہب کو قانوناً مساوی حقوق حاصل ہیں۔

لیکن موجودہ حالات میں ہم دیکھتے ہیں مسلمانوں کی جانیں اور ان کا مال کسی علاقہ میں پورے طور سے مامون نہیں۔ اسلام و مسلمان کے خلاف ایک نہیں کئی ایک تنظیمیں ہیں۔ جن کی پوری کوشش یہی ہے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کو نابید کر دیا جائے۔ جہاں کہیں مسلمان مال و دولت و تعداد کے اعتبار سے غالب ہیں وہاں ان کو مغلوب کرنے کی بھرپور اسکیم کے تحت کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں اور جن علاقوں میں نہیں ہوتے وہ اس وجہ سے نہیں کہ مسلمان وہاں ہر طرح سے مامون ہوں بلکہ اس وجہ سے کہ فسادات ہونے میں خود غیر مسلموں کا نقصان زیادہ ہوگا۔ فتنہ و فساد کا بازار گرم ہونے کے بعد پولس اور پی اے سی کا جو رویہ و کردار ہوتا ہے وہ سب پر عیاں ہے۔

مساجد کو شہید کرنے، مدارس کو مسمار کرنے، مسلمانوں کے خون سے گلیاں بہانے اور ان کی نعشوں سے پل بنانے کی نئی نئی اسکیمیں اور کوششیں برابر جاری رہتی ہیں۔

کیا ایسے حالات میں بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستانی مسلمان پورے طور سے ملمون (مامون) ہیں؟ اور ہندوستان دارالامن یا دارالاسلام ہے۔

کیا ہندوستان کی موجودہ حالت مسلمانوں کے حق میں حبشہ کے مشابہ ہے۔؟
بندہ ناچیز کے نزدیک ہندوستان موجودہ حالت میں دارالحرب ہے۔ کیونکہ کفار کا تسلط ہے اور دارالحرب کے اقسامِ اربعہ میں سے دارالخوف میں شامل ہے جہاں سے کہ مسلمانوں کو خوف وخطر رہتا ہو۔

ورنہ علی سبیل التنزل قسم ثالث "بین الامن والخوف" میں تو بہرحال داخل ہے کیونکہ غلبہ و تسلط یقیناً یہاں مسلمانوں کا نہیں۔ اور خوف وامن کی حالت باربار پیدا ہوتی رہتی ہے اور دونوں ہی صورتوں میں احکام دارالحرب کے جاری ہوں گے جس کی تفصیل ماقبل میں گذر چکی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

دارالحرب میں سودی معاملات کا حکم

جوابؒ:۔ اس مسئلہ میں علماء وفقہاء کا اختلاف ہے۔
حضرت امام ابوحنیفہؒ، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری، امام محمد کا مسلک یہ ہے کہ دارالحرب میں حربیوں سے سودی معاملات کے ذریعہ مال حاصل کرنا جائز ہے۔
امام ابویوسف اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ تعالیٰ عدم جواز کے قائل ہیں۔ مسالک ومذاہب کی تفصیل وادلہ کتب فقہ میں مذکور ہے[1]
فریق اول کی دلیل یہ ہے کہ کافر حربی کا مال مباح ہے کیونکہ وہ غیر معصوم اور ناقابل ضمان ہے، اسی لئے استیلاء کی صورت میں ملکیت تامہ حاصل ہوجاتی ہے گویا بذاتِ خود کافرِ حربی کا مال مباح ہے۔ البتہ مستامن مسلم جب امن لے کر دارالحرب میں داخل ہوگا ایسی صورت میں حربی کی مرضی کے بغیر اس کے مال پر قابض ہونا درست نہیں کیونکہ یہ غدر اور خیانت ہے۔ البتہ حربی کی رضامندی اور اجازت کے بعد کسی بھی طرح اور کسی بھی صورت سے اس کا مال حاصل کرنا درست ہے گویا حصول مال کے لئے اس کی رضامندی شرط ہے اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کی کوئی بھی صورت اختیار کرنا درست ہے حتی کہ وہ معاملات جو صورۃً عقود فاسدہ یا حدود ربوٰ میں داخل ہوں ان کے ذریعہ بھی اس کی مرضی حاصل کرکے مال لینا جائز ہوگا۔ کیونکہ اس وقت یہاں پر عقود فاسدہ یا سودی معاملہ کا حقیقۃً وجود ہی نہیں بلکہ سودی معاملہ کی ایک صورت ہے۔ بالفاظ دیگر حربی کی رضامندی

---

[1] اعلاء السنن ج۱۴ ص۳۳۲ فتح القدیر ج۶ ص۱۷۸ بحرالرائق ج۶ ص۱۳۸ شامی باب الربوٰ

حاصل کرنے کی ایک تدبیر ہے ورنہ حقیقی سود ہرگز مقصود نہیں۔
کہنے کا حاصل یہ ہے کہ حربی کا مال حاصل کرنے میں نفسِ عقد کو کوئی دخل نہیں مال حاصل کرنا تو بطور استیلاء کے ہے اور استیلاء کا جواز مستامن کے لئے اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ حربی کی دلی رضامندی بھی شامل ہو جس کے لئے یہ تدبیر اختیار کی گئی ہے ورنہ اگر حربی سے محض عقد اور معاملہ کی بنا پر سود کا جواز ہوتا تو دارالاسلام میں بھی اسے جائز ہونا چاہئے حالانکہ دارالاسلام میں حربی سے بھی سودی معاملہ کے ذریعہ مال حاصل کرنا جائز نہیں کیونکہ یہاں پر آکر حربی کا مال بھی امان کی وجہ سے معصوم، محترم، قابلِ ضمان ہوگیا۔ استیلاء کے بعد بھی ملکیت حاصل نہ ہوگی۔ اب اگر یہاں سودی معاملہ کے ذریعہ مال حاصل کرے گا تو محض معاملہ اور نفس عقد ہی کو دخل ہوگا نہ کہ استیلا کو اس لئے ناجائز ہے۔
ما قبل میں جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے یہ سب خلاصہ ہے فقہاء کرام کے بیان کا صرف چند عبارتیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) قال فی المبسوط:۔ وهذا لان مال الحربي مباح ولكن المسلم بالاستيمان ضمن لهم ان لايخونهم وان لا ياخذ منهم شيئاً الا بطيبة انفسهم فهو يتحرز عن الغدر بهذه الاسباب ثم يتملك المال عليهم بالاخذ لابهذه الاسباب وهذا ان فعل المسلم يجب حمله على احسن الوجوه واحسن الوجوه ما قلنا۔[1]

(۲) المستامن منع من تملکه من غير رضاه لما فيه من الغدر والخيانة فاذا بذله باختياره ورضاه فقد زال هذا المعنى فكان الاخذ استيلاء على مال مباح غير مملوك وانه مشروع مفيد للملك ——— وبه تبين ان العقد ههنا ليس بتملك بل هو تحصيل شرط التملك وهو الرضا لان ملك الحربي لا يزول بدونه ——— فالملك للمسلم يثبت بالاخذ والاستيلاء لا بالعقد فلا يتحقق الربا لانه اسم لفضل يستفاد بالعقد۔[2]

(۳) وهذا لان المستامن فيهم انما يتمكن من اخذ مالهم بطيب انفسهم و عليه يبنى ابوحنيفه حكم عقد الربا فيما بينه وبين الحربي واما فيما سوى ذالك

---

[1] مبسوط ص ۵۹ ج ۱۴ [2] بدائع ص ۱۹۲ ج ۵

فالمعاملة فی دار الحرب ودار الاسلام سواء فی حق المسلم لانه ملتزم حکم الاسلام حیث ما یکون۔[1]

۴ ولیس العقد من المسلم خدعة لتحصیل رضا الحربی به والفتوی علی جواز خداع الکفار من اهل الحرب کیف ما امکن الا ان یکون فیه نقض عهد او امان[2]۔

حضرت حکیم الامت تھانوی امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی دلیل بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں

"(امام ابوحنیفہؒ) ادلۂ شرعیہ سے ربوٰ کی حرمت کے لئے مالِ محترم کی قید لگاتے ہیں اور مالِ محترم سے مراد وہ مال ہے جو غیر مباح ہو۔ اس سے زیادہ آسان تعبیر مالِ محترم کی یہ ہے کہ جس مال میں بغیر عقدِ صحیح کے تصرف جائز نہ ہو وہ مالِ محترم ہے پس ایسا مال تو مومن یا ذمی کا ہے باقی حربی کا مال صرف بوجہ عارضی عہد کے محترم ہوجاتا ہے ورنہ فی نفسہ محترم نہیں کیونکہ مال کے اندر احترام صاحب مال کے احترام کی وجہ سے آتا ہے اور کافر غیر ذمی محترم نہیں۔ جب احترام نہیں تو اس میں ربوٰ بھی نہیں[3]۔"

ایک شبہ کا جواب

ماقبل میں جو کچھ بھی عرض کیا گیا اس سے وہ شبہ بھی حل ہوگیا کہ المسلم ملتزم احکام الاسلام حیث ما یکون یعنی مسلمان اسلامی احکام کا پابند ہے خواہ کہیں بھی ہو دار الحرب یا دار الاسلام میں۔

یا یہ کہ آیت ربوٰ قرآن پاک میں عام ہے، احادیث و آثار اور قیاس سے اس میں دار الاسلام کی تخصیص و تقیید اور دار الحرب میں حربی کا استثنا کرنا کیسے جائز ہوگا۔

جواب ظاہر ہے کہ دار الحرب میں عقودِ فاسدہ یا سودی معاملہ کو مسلمان کے حق میں جائز نہیں قرار دیا جارہا ہے بلکہ یہ کہا جارہا ہے کہ صورۃً ربوٰ کا معاملہ کرکے حربی کی رضامندی حاصل کرنا جائز ہے اور اس میں ربوٰ کا تحقق نہیں ہوگا کیونکہ یہ حقیقی ربوٰ نہیں بلکہ ربوٰ کی صورت ہے اور یہی مطلب ہے حدیث لاربوا بین الحربی والمسلم فی الحرب یعنی ربوٰ کا تحقق ہی نہیں ہوتا۔

آیت ربوٰ عام ہے ہر زمان و مکان اور ہر شخص کے حق میں اور اخبار و آثار اور قیاس سے ہم تخصیص نہیں کرتے اور نہ ہی تخصیص و تقیید لازم آتی ہے۔

---

[1] شرح السیر صفحہ ۱۳۰/۴ [2] اعلاء السنن صفحہ ۳۷۴/۱۴ [3] افاضات الیومیہ صفحہ ۱۳۲/۱

کیونکہ ربٰوٰ کی حرمت عام ہے جبکہ ربٰو کا تحقق ہو جائے نہ کہ تحقق ربٰو سے پہلے۔ رہی یہ بات کہ دار الحرب میں حربی سے ربٰو کا تحقق ہوگا یا نہیں آیۃ ربٰو اس سے ساکت ہے۔ احادیث و آثار اور قیاس کا مطلب اور اس کا مقتضٰی یہ ہرگز نہیں کہ تحقق ربٰو کے بعد بھی دار الحرب میں سود جائز ہے بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ دار الحرب میں حربی سے ربٰو کا تحقق ہی نہیں ہوتا جس کی تفصیل ماقبل میں گذر چکی ہے۔

صورۃ ربٰو حقیقت ربٰو کو مستلزم نہیں

اب صرف اتنی بات رہ باقی ہے کہ حربی کا مال اگرچہ غیر معصوم غیر محترم ہے اس لئے مباح ہے۔ اس کی رضامندی کے بعد استیلاء کے ذریعہ مالک بننا درست ہے۔ لیکن کیا اس مباح کے حصول اور اس کی رضامندی کو حاصل کرنے کا ذریعہ کسی ناجائز معاملہ کو بنایا جا سکتا ہے۔

روایات و آثار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقد ربا جب اپنی حقیقت سے خالی ہو تو محض صورۃ ربٰو سے حقیقی ربا لازم نہیں آتا اور نہ ہی شبہ ربٰو پیدا ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنے غلام سے صورۃ سود کا معاملہ کیا کرتے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ان کو دیکھ کر منع فرمایا اور کہا کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ کے رسول نے اس طرح معاملہ کرنے سے منع فرمایا ہے؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں لیکن غلام اور آقا کے درمیان ربٰو متحقق ہی نہیں ہوتا۔ کان ابن عباس یبیع من غلمانہ النخل السنتین والثلاث فبعث الیہ جابر بن عبد اللہ اما علمت نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ھذا؟۔ فقال ابن عباس بلی ولکن لیس بین العبد وبین سیدہ ربوٰ[1]

کان لا یری بینہ وبین غلامہ ربا اخرجہ الامام الشافعی فی سندہ[2]

مذکورہ بالا روایات سے واضح طور سے معلوم ہوا کہ محض صورۃ ربٰو سے حقیقت ربٰو یا شبہ ربٰو کا شبہ کرنا درست نہیں۔ شبہ ربٰو حرام ضرور ہے لیکن جب واقعی شبہ متحقق ہو جائے محض صورۃ ربٰو سے شبہ ربٰو لازم نہیں آتا۔ اس لئے ضرورت کے وقت حربی کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے صورۃً سودی معاملہ کرنا بغیر کسی کراہت کے بلا شبہ جائز ہے واللہ اعلم[3]

---

[1] المحلی ج ۹ ص ۳۱۵ [2] مسند شافعی ص ۲۴۳ [3] کذا فی اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۳۴۴

حلت عقد و حلت مال سے متعلق نصوص صریحہ

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حربی کا مال تو درست ہے لیکن اس مال کے استعمال کے لئے صورۃ سودی معاملہ کرنا درست نہیں اور حلت مال حلت عقد کو مستلزم نہیں اور نہ ہی فقہاء نے اس کے جواز کی صراحت کی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ نصوص صریحہ عبارات فقہیہ سے حلت مال و علت عقد دونوں کے جواز کی صاف تصریح موجود ہے چند نصوص ملاحظ ہوں۔

(۱) عن ابراھیم النخعی قال لاباءس بالدینار بالدینارین فی دار الحرب بین المسلمین وبین اھل الحرب[۱]

(۲) عن مکحول ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا ربوٰ بین اھل الحرب واظنہ قال وبین اھل الاسلام[۲]

موخر الذکر روایت کی بابت کہا جاتا ہے کہ یہ مرسل ہے اور مرسل غیر مقبول ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں مرسل روایت بھی خصوصًا مکحول جیسے ثقہ راوی کی مقبول ہوتی ہے[۳]۔ نیز کسی امام کا کسی حدیث کو مستدل بنانا خود حدیث کی توثیق کی علامت ہوا کرتی ہے۔ بعض حضرات نے اس حدیث کی توجیہہ کرتے ہوئے متن حدیث میں لفظ "لا" کو لانہی فرمایا ہے۔ لیکن فقہاء محدثین میں کسی نے اس کا یہ مطلب نہیں سمجھا اور فقہاء نے لانفی کے طور سے ہی اس کو ذکر فرمایا ہے نیز لقاعدہ الحدیث یفسر بعضہ بعضا حدیث اول لاباءس کی وجہ سے اس کو لانہی پر محمول کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اعلاء السنن ج ۱۴۔

(۳) قد بینا الربوٰ یجوز بین المسلم والحربی فی دار الحرب[۴]

(۴) اذا دخل مسلم دار الحرب تاجراً فباع حربیاً درھماً بدرھمین ــــ یجوز عند ابی حنیفۃ ومحمد[۵]

مذکورہ بالا عبارات میں بھی سودی معاملہ کے جواز کی صاف تصریح موجود ہے۔

---

[۱] مشکل الآثار ص ۲۴۵ ج ۲ [۲] بیہقی و درایۃ ص ۱۸۸ [۳] فتح القدیر ص ۱۸۸ ج ۳ [۴] شرح السیر ص ۲۲۱ ج ۳ [۵] بدائع ص ۱۹۲ ج ۵

جواز کی شرط اور استیمان کی قید

زیر بحث مسئلہ میں جہاں کہیں فقہاء نے تذکرہ فرمایا ہے وہاں استیمان کی بھی قید لگائی ہے۔ یعنی دارالحرب میں حربی سے سودی معاملہ اگر مستامن کرے تب تو جواز ہوگا ورنہ نہیں۔ اور مستامن اس کو کہتے ہیں جو دارالاسلام سے دارالحرب میں امن لے کر آیا ہو۔ اس لحاظ سے ہندوستانی مسلمان چونکہ مستامن نہیں ہیں کیونکہ کسی دارالاسلام سے امن لے کر یہاں نہیں آئے۔ لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں یہاں کے حربیوں سے سودی معاملہ کا جواز بھی نہ ہونا چاہئے۔

لیکن فقہاء کی تصریحات میں ادنیٰ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ استیمان کی قید مقصود بالذات نہیں اور اس کی حیثیت شرط کی نہیں کہ اس کی تفویت سے اصل حکم فوت ہوجائے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مستامن کی قید صرف اس واسطے ہے کہ دارالحرب میں جاکر غدر و خیانت و سرقہ کا ارتکاب لازم نہ آئے۔[1]

وانما یفترق المستامن من غیر المستامن فی حرمة الغدر بالامان۔ والمستامن انما هو مامور بارضاء اهل الحرب فیما یاخذه من اموالهم بای وجه کان۔[2]

ان الاستیمان لم یزد شیئاً سوی تحریم الغدر بهم فاباحة اموالهم له علی حالها کما کانت قبل الاستیمان۔[3]

ان سب عبارات سے معلوم ہوا کہ استیمان کی قید صرف اس واسطے ہے تاکہ غدر خیانت لازم نہ آئے لیکن ہندوستان جیسے ملک میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بغیر استیمان کے بھی حربی کی رضا حاصل ہوجاتی ہے اور اصل باشندہ ہونے کی وجہ سے ان کو استیمان کی ضرورت نہیں یعنی جو بات استیمان کے بعد حاصل ہوتی وہ ان کو پہلے سے حاصل ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زندگی میں مکہ میں رہتے ہوئے بھی حربیوں سے سودی معاملات کیا کرتے تھے اور ظاہر بات ہے کہ باشندہ ہونے کی وجہ سے ان کے لئے استیمان کی کوئی حاجت نہ تھی۔ واللہ اعلم۔

الترجیح بین القولین

زیر بحث مسئلہ "سودی دارالحرب" اختلافی مسئلہ ہے طرفین ایک طرف ہیں قاضی ابویوسف

لہ اعلاء السنن ص ۳۵۳ ۔ ۲ ایضاً ص ... ۳ اعلاء السنن ص ...

دوسری جانب، فقہ حنفی کی تمام کتب معتبرہ کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہار احناف کے نزدیک راجح اور معتمد و مفتی بہ قول طرفین ہی کا ہے۔ فقہ کے دیگر مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی آسان ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ دلائل سے قطع نظر مقلدین احناف کے لئے صرف اتنی بات کافی ہو سکتی ہے کہ اس مسئلہ میں امام صاحب و امام محمد ایک طرف ہیں اور دوسری جانب قاضی ابو یوسف صاحب ہیں اور بعد کے مجتہدین اور اصحاب تخریج نے طرفین ہی کے قول کو اپنایا ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق طبقات فقہار میں سے کسی طبقہ کے فقہار نے امام ابو یوسفؒ کے قول کو ترجیح نہیں دی۔ بلکہ کتب فقہ کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ طبقۂ علیا او رصف اول کے تمام علمار احناف طرفین ہی کے قول کو راجح سمجھتے ہیں۔

امام ابوجعفر طحاوی، ابن الہمام، شمس الائمہ سرخسی جو طبقات ثالثہ میں شمار کئے جاتے ہیں اس کے علاوہ علامہ کاسانی صاحب بدائع، صاحب بحر علامہ ابن نجیم، صاحب ہدایہ وغیرہ تمام فقہار محققین و محدثین احناف نے طرفین کے ہی قول کو ترجیح دی ہے[۱]

ہمارے فقہار احناف کا دستور ہے کہ (علاوہ قاضیخاں و ملتقی الابحر کے) جب کسی اختلافی مسئلہ کا ذکر فرماتے ہیں ان کے نزدیک جو قول محقق، راجح، معتمد، مفتیٰ بہ ہوتا ہے اس کی دلیل کو موخر بیان کرتے ہیں[۲] اور کتب فقہ میں دیکھا جائے تو ہر کتاب میں طرفین ہی کے قول کو موخر اور ترجیح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے[۳]

امام ابن ہمام دوسرے مقام پر فرماتے ہیں وتاخیر دلیلهما بحسب عادة المصنف ظاهر فی اختیاره قولهما[۴]

اس کے علاوہ احناف کے تین طبقوں میں سے سب سے پہلے طبقہ کی کتاب "مبسوط" ہے۔ فقہ حنفی میں جس کو معیاری حیثیت حاصل ہے اور اختلاف اقوال و ادلہ کی بناپر ترجیح و تعدیل میں جس کو معیار کا درجہ دے کر اس کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں اگر کسی قول کو ترجیح دے دی جائے تو اس کے خلاف نہ تو عمل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی فتویٰ دینے کی گنجائش ہے۔ اسی کتاب "مبسوط" کے اندر دلائل کی روشنی میں طرفین ہی کے قول کی ترجیح بیان کی گئی ہے۔ قال العلامة الطرسوسی مبسوط السرخسی لایعمل بمایخالفه ولایرکن الا الیه ولایفتی ولایعول الا علیه[۵]

---

[۱] مشکل الآثار ص۲۲۳ ج۲ مبسوط ص۱۹ ج۴ سیر کبیر ص۲۲۳ ج۳ [۲] رسم المفتی ص۵ [۳] بدائع ص۱۹۲ ج۵ بحر ص۱۳۶ ج۴ ہدایہ مع فتح ص۱۴۹ ج۴ مجمع الانہر ص۹۰ ج۲ [۴] فتح القدیر ص۴۹ ج۴ [۵] رسم المفتی ص۵

حاصل کلام یہ کہ ہمارے تمام فقہاء نے سلفاً و خلفاً طرفین ہی کے قول کو راجح فرمایا ہے جب یہ بات محقق ہے کہ اصحاب تخریج، اہل ترجیح مجتہدین فی المذہب نے طرفین ہی کے قول کو ترجیح دی ہے تو اب اس کے بعد اصول افتاء کے پیش نظر فقہاء کی تصریح کے مطابق دوسرے قول یعنی امام ابویوسفؒ کے مسلک پر فتویٰ دینے اور فیصلہ کرنے کی گنجائش نہیں سمجھ میں آتی۔

(۱) وفی فتاوی العلامۃ ابن الشلبی لیس للقاضی ولا للمفتی العدول عن قول الامام الا اذا صرح احد من المشائخ بان الفتوی علی قول غیرہ فلیس للقاضی ان یحکم بقول غیر ابی حنیفۃ فی مسئلۃ لم یرجح فیہا قول غیرہ ورجحوا فیہا دلیل ابی حنیفۃ علی دلیلہ فان حکم فیہا فحکمہ غیر ماض لیس لہ غیر الانتقاض (رسم المفتی ص۴۲)

ولما انقطع المفتی المجتہد فی زماننا ولم یبق الا المقلد المحض وجب علینا اتباع التفصیل فنفتی اولا بقول الامام ثم وثم مالم نر المجتہدین فی المذاہب صححوا خلافہ لقوۃ دلیلہ ـــــ وان لم نعلم من این قال۔

(۲) المجتہدین لم یفقدوا حتی نظروا فی المختلف ورجحوا وصححوا الی ان قال فعلینا اتباع الراجح والعمل بہ کمالوا فتوفی حیاتہم (رسم المفتی ص۴۳)

مذکورہ بالا تصریحات اور آداب افتاء کے پیش نظر طرفین کے قول سے عدول کر قاضی ابویوسف کے قول کو اختیار کرنے کی گنجائش نظر نہیں آتی اور یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ متاخرین فقہاء میں سے بھی کسی فقیہ نے امام ابویوسفؒ کے قول کو ترجیح نہیں دی۔

اکابر علماء کا رجحان

البتہ اکابر علماء کے اس میں مختلف نظریات ہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب، مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی، مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی نے طرفین ہی کے قول کو اختیار فرمایا ہے جیسا کہ ان کے فتاویٰ سے ظاہر ہے۔

حضرت تھانوی کے کلام میں تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن بعد کی تحریرات و فتاویٰ اور تفسیر بیان القرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عدم جواز یعنی امام ابویوسف کے قول کو راجح قرار دیتے ہیں۔
لیکن مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی فرماتے ہیں کہ محقق تھانویؒ نے محض احتیاط و تقویٰ کی بنیاد پر امام ابویوسفؒ کے قول کی ترجیح فرمائی ہے اور اس ترجیح کے دلائل ذکر فرماتے ہیں لیکن

بنیاد احتیاط و تقویٰ ہے[1] حضرت تھانویؒ کے بعض ملفوظات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے رسالہ تحذیر الاخوان جو ان کی آخری تحریر ہے اس سے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے اخیر میں فرماتے ہیں کہ میں نے تو احتیاط کو لیا ہے[2] ایک جگہ فرماتے ہیں "مجبوری اور اشد ضرورت میں ان لوگوں کے قول پر عمل کرے جو ربوٰ فی دارالحرب کے قائل ہیں۔ (دعوت عبدیت ص ۱۵۱ ج ۱۹)

موجودہ اکابر علماء دیوبند میں سے حضرت اقدس مفتی محمود صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں۔

"ہندوستان کے متعلق علماء کی آراء مختلف ہیں۔ دونوں طرف اہل تحقیق ہیں، ہر جانب دلائل موجود ہیں، بندہ کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا، گنجائش ہر جانب ہے اختلاف کی وجہ سے اجتناب بالیقین احوط ہے[3]"

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں

"دونوں طرف اہل تحقیق ہیں لہٰذا سود لینے میں بھی گنجائش ہے اختلاف کی وجہ سے نہ لینا احوط ہے[4]"

یہ واضح رہے کہ اگرچہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے یہ فتاویٰ ابتداء زمانہ کے ہیں لیکن یہ فتاویٰ بالکل اخیر اور عنقریب زمانہ میں حضرت مفتی صاحب کی نظر ثانی اور سماعت کے بعد شائع ہوئے ہیں جن پر مفتی صاحب نے کوئی کلام نہیں فرمایا اور جن پر کوئی حاشیہ درج نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی حضرت مفتی صاحب کی وہی رائے ہے جو اوپر درج ہوئی۔ واللہ اعلم۔

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ قطعاً ہر جگہ سود لینا جائز فرماتے ہیں، ایسی حالت میں جانب احتیاط سود کا نہ لینا ہے[5]"

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں "انگریزی بینک سے سود لینے کے متعلق بھی علماء محققین کا فتویٰ بنظر احتیاط اسی پر ہے کہ جائز نہیں ہے۔"

"وعیدوں کے اطلاق کو دیکھتے ہوئے احتیاط اس میں ہے کہ جمہور علماء امت کے قول پر عمل

---

[1] اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۳۷۲ فتاویٰ عزیزی پاکستانی ص ۳۸۵ فتاویٰ عبدالحی ص ۳۸۳ [2] حسن العزیز ج ۴ ص ۳۴۲ ملفوظات اشرفیہ ص ۱۶۸

[3] فتاویٰ محمودیہ ج ۴ ص ۴۹۵ [4] فتاویٰ محمودیہ ج ۴ ص ۴۳۶ [5] فتاویٰ دارالعلوم قدیم ج ۶ ص ۳۸۸

کیا جائے ۔۔۔۔ احتیاط یہی ہے کہ ناجائز قرار دیا جائے[1]۔

مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب، مولانا عبدالحی صاحب، مولانا ظفر احمد صاحب دارالحرب میں سود کے جواز کے قائل ہیں اور یہی ان کا فتویٰ ہے۔ البتہ اکابر علماء دیوبند بربناء احتیاط و تقویٰ فتویٰ یہی دیتے ہیں کہ درست نہیں جس کا حاصل یہ نکلا اصل فتویٰ کے اعتبار سے جواز ہے محض احتیاط کی وجہ سے عدمِ جواز کا مسئلہ بتلایا جاتا ہے ورنہ گنجائش ہے، البتہ بعض اکابر مطلقاً عدمِ جواز کے قائل ہیں[2]۔

قائلین عدمِ جواز کے نزدیک جواز کی صورت

جو حضرات بینک کے سود کو ناجائز فرماتے ہیں خواہ اس بنا پر کہ ہندوستان دارالحرب نہیں یا اس بنا پر کہ دارالحرب میں سود لینا جائز نہیں، ان حضرات کے نزدیک بھی بعض شرعی حیلے سے سود لینے اور دینے کی گنجائش ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں

"مگر ایک حیلہ شرعی ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی خیال کرے کہ سرکار بہت سے محصول (ٹیکس) اپنی رعایا سے لیتی ہے کہ ہماری شریعت میں اس کا لینا جائز نہیں گو قانون انگریزی سے وہ خلاف نہیں ہیں مگر شرع محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ظلم ہے اور ناجائز ہے اور مستحق رد ہے۔

سو یہ شخص یوں خیال کرے کہ جو غریب رعایا سے سرکار نے محصول خلافِ شرع لیا ہے اس کو میں سرکار سے مسترد کراتا ہوں اور پھر اس کو وصول کر کے انھیں لوگوں پر تقسیم کر دے جن سے سرکار نے بلا اذنِ شرع لیا تھا ایسی نیت میں شاید حق تعالیٰ مواخذہ نہ فرمائیں۔"

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

جس قدر روپیہ گورنمنٹ آپ سے بذریعہ ٹیکس وصول کرتی ہے اسی قدر روپیہ آپ گورنمنٹی بینک یا دوسرے محکمات سرکاری سے جس طرح ممکن ہو وصول کر سکتے ہیں

---

[1] فتاویٰ دارالعلوم قدیم ص۲۶۲ ج۶ وص۱۲۲ [2] فتاویٰ رشیدیہ ص۱۲۲ وص۴۵۱

گورنمنٹ اس کا نام سود رکھے یا کچھ اور آپ اپنا جائز مطالبہ وصول کرنے کی نیت سے لیں تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں اور آپ کے حق میں سود نہ ہوگا ایسے مواقع میں فقہاء رحمہم اللہ نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اپنے حق کی مقدار چوری یا غصب کرکے بھی اگر کوئی شخص اپنے مدعیوں سے وصول کرلے تو جائز ہے[1]

حضرت مفتی محمود صاحب دامت برکاتہم اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں ۔

"سرکاری بینک سرکاری محکمہ سے حاصل شدہ سود کی رقم غیر واجبی ٹیکس میں ادا کرنا بھی درست ہے بلکہ صدقہ سے مقدم ہے[2]"

مذکورہ بالا فتاویٰ سے معلوم ہوا کہ قائلین عدم جواز کے نزدیک بھی سرکاری بینکوں سے ہر شخص کے لئے سود لینا جائز ہے ۔ اگر سرکار نے خود اس سے ظالمانہ ٹیکس دواجب الردلیا ہے تب تو اپنے حق کو وصول کرنے کی نیت سے لینا درست ہے ورنہ دوسرے مسلمان بھائیوں کا حق وصول کرنے کی نیت سے لینا درست ہے ۔ پھر لے کر غرباء میں تقسیم کردے

اسی طرح ظالمانہ ٹیکسوں یا رشوت میں وہ سود دینا بھی درست ہے جو خود حکومت سے دیا تھا ۔ واللہ اعلم ۔

دارالحرب میں سود دینے کا حکم

جواب ۵ (شق اول) دارالحرب میں حربیوں سے جس طرح سود لینا جائز ہے اسی طرح سود دینا بھی جائز ہے بشرطیکہ اس میں بھی مسلمان کا نفع ہو۔

دلائل و آثار کے عموم کا مقتضیٰ یہ ہے کہ لینے دینے میں کوئی فرق نہ ہو چنانچہ مبسوط سرخسی میں ہے ۔

"ویستوی ان کان المسلم اخذ الدرهمین بالدرهم، او الدرهم بالدرهمین لانه طیب نفس الکافر بما اعطاه قل ذلك او كثر[3]" امام ابن ہمام فتح القدیر میں فرماتے ہیں ۔

"والربا اعم ذلك يشمل ما اذا كان الدرهمان من جهة المسلم او من جهة الكافر وجواب المسئلة بالحل عام فی الوجهین[4]"

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب بھی یہی فرماتے ہیں کہ کفار سے سود لینا اور دینا دونوں جائز ہے[5]

---

[1] فتاویٰ دارالعلوم قدیم [illegible] [2] فتاویٰ محمودیہ [illegible] [3] مبسوط [illegible] [4] فتح القدیر [illegible] [5] فتاویٰ عزیزی [illegible]

مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے[1]

لیکن ابن ہمام نے فتح القدیر میں اپنے اساتذہ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ "ان مراد ھم بالحل الربا والقمار اذا حصلت الزیادۃ للمسلم نظراً الی العلۃ وان کان اطلاق الجواب خلافہ"[2] اسی کو علامہ شامیؒ نے بھی نقل فرمایا ہے۔ یعنی حلت ربا کا حکم اسی وقت ہے جبکہ زیادتی مسلمان کو حاصل ہو فقہاء کی یہی مراد ہے اگرچہ الفاظ عام ہیں لیکن مبسوط کی گذشتہ عبارت میں صاف تصریح ہے کہ لینا دینا دونوں جائز ہے۔

دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ مبسوط کی عبارت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حربی کافر کے ساتھ احسان کرکے قلیل کے عوض کثیر مال دے دیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر دو لاکھ روپیہ (بعد میں) دے کر نقد ایک لاکھ روپیہ لے کر بیع کرنے میں مسلمان کا نفع ہو تو یہ درست ہے کیونکہ اس میں بھی نفع اور زیادتی درحقیقت مسلمان ہی کو حاصل ہے کیونکہ عاجل (النقد) آجل (ادھار) کے مقابلہ میں بہرحال بہتر ہوتا ہے لہٰذا ابن ہمام اور علامہ شامی ہی کی تعلیل کے پیش نظر یہ سود جائز ہونا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

خلاصہ یہ کہ سود لینے کی طرح سود دینے کی بھی گنجائش ہے بشرطیکہ اس میں نفع مسلمان ہی کا ہو۔

(شق ثانی کا جواب) حکومت کے قوانین کی بنا پر بے شک واقعی کچھ ایسی مجبوریاں پیش آجاتی ہیں جس کی بنا پر سود دینا جائز ہے۔ مثلاً انکم ٹیکس سے بچنے کی خاطر سودی قرض (محض دکھلاوے کے لئے) لینا ناگزیر ہوتا ہے تاکہ ظالمانہ ٹیکس سے نجات رہے اور ظلم وضرر سے بچنے کے لئے سودی قرض لے کر اس پر سود دینا جائز ہونا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

سودی رقم کا مصرف اور سرکاری غیر سرکاری بینکوں کا فرق

بینکوں میں جمع شدہ رقوم پر جو سود ملتا ہے اس کا لینا شرعاً درست ہے اور اگر ظن غالب ہو کہ نہ لینے کی صورت میں یہ رقم ناجائز امور میں یقیناً خرچ ہوگی ایسی صورت میں سودی رقم نکالنا واجب ہے۔

---

[1] اعلاء السنن ص۳۵۳ ج۱۴ [2] فتح القدیر ص۱۹۵ ج۶ [3] ہکذا استفاد من اعلاء السنن ص۳۵۳ ج۱۴

لے لینے کے بعد اس کو اپنے مصرف میں لانا درست ہے کیونکہ یہ حربی کا مال ہے اور اگرچہ بینک والے وہی سود دیتے ہیں جو دوسروں سے وصول کرتے ہیں جس میں مسلمان بھی شامل ہیں لیکن یہ توجیہ چل سکتی ہے مسلمان جو سود لیتے ہیں وہ وہ ہے جو غیر مسلم سے لیا گیا ہے اس لئے گنجائش ہے۔ لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ غربا رفقراء کو (ثواب کی نیت سے بھی) صدقہ کر دے اور یہ صدقہ کا حکم وجوبی نہ ہوگا۔

قائلین عدم جواز کے نزدیک غیر واجبی ٹیکسوں میں اس کا صرف کرنا مقدم ہے۔ خود استعمال کرنے کی گنجائش نہیں۔ غربا رفقراء پر ثواب کی نیت سے صدقہ کرنا بھی اس کا مصرف ہے۔

اس مسئلہ میں سرکاری غیر سرکاری بینکوں میں کوئی فرق نہیں مدارِ حکم حربی وغیر حربی ہونا ہے اگر حربیوں کا سود دیا جاتا ہو تو جائز ہے خواہ سرکاری بینک ہوں یا غیر سرکاری۔ اور اگر صرف مسلمانوں سے لیا ہوا سود دیا جاتا ہو تو ناجائز ہے اور اگر دونوں سے لیا جاتا ہو تو گنجائش ہے اور اگر خود اپنی طرف سے بینک والے دیتے ہوں اور وہ غیر مسلم ہوں تب بھی جائز ہے البتہ اگر مسلمان بینک اپنے پاس سے سود دیں تو ناجائز ہے۔

سودی قرض لینے کا حکم

جواب ۷: سودی قرض لینے کی یقیناً گنجائش ہے اگرچہ بعد میں سود دینا پڑے کیونکہ دار الحرب میں سود لینا دینا دونوں جائز ہیں[۲] دینے کی شرط یہ ہے کہ اس میں بھی نفع مسلمان کا ہو۔ والحکم یدار مع علتہ، مسئلہ کی تفصیل ماقبل میں گذر چکی ہے۔

(۸) حکومت کی ترقیاتی اسکیموں کے تحت سودی قرض لینا

حکومت کی ترقیاتی اسکیموں کے تحت جو سودی قرضے تقسیم کئے جاتے ہیں اس کا لینا جائز ہے بلکہ بدرجہ اولیٰ جائز ہے کیونکہ ہندوستانی باشندہ ہونے کی حیثیت سے ترقیاتی اسکیموں میں اس کا بھی حصہ ہے۔ اس لحاظ سے عام سودی قرضوں سے اس کی حیثیت کچھ مختلف ہے قائلین عدم جواز کے نزدیک بھی گنجائش ہونا چاہئے کیونکہ اس کی حیثیت عام سودی قرضوں سے

---

[۱] فتاوی محمودیہ ج ۴ ص ۳۰۳ [۲] مبسوط ج ۱۴ ص ۵۹

مختلف ہے۔ باشندہ ہونے کی حیثیت سے ترقیاتی اسکیموں میں حصہ ملنا ہمارا حق ہے اور حق والے کو حق نہ ملنا ظلم وضرر ہے لہٰذا استحصال حق کے لئے دفع ظلم وضرر کی خاطر رشوت کی طرح اس کو بھی جائز ہونا چاہئے۔ واللہ اعلم

ایک خاص صورت کا حکم

جواب ۸:۔ یہ صورت بلاشبہ جائز ہے کیونکہ حربی سے عقود فاسدہ کے ذریعہ نفع حاصل کرنا جائز ہے اور قائلین عدم جواز کے نزدیک اس کی دو جہتیں ہیں ایک تو عملی طور سے سودی لین دین دوسرے نفس عقد۔ مذکورہ صورت میں عملی طور سے سودی لین دین نہیں اس لئے یہ قرض حلال ہے لیکن ابتداءً نفس عقد سود کا تھا اس لئے یہ عقد ناجائز ہے اور حرمت عقد سے حرمت مال لازم نہیں آتا[1]۔ حاصل کلام یہ کہ فریق ثانی کے نزدیک قرض لینا جائز نفس عقد ناجائز۔

بین الاقوامی تجارتی ضوابط کے تحت سودی لین دین

جواب ۹:۔ بین الاقوامی تجارتی ضوابط کے تحت جو سودی معاملات ہوتے ہیں وہ جائز ہیں۔ اگر حربی ملک سے ہے تو جائز ہے کیونکہ رضا حاصل ہے اور اگر غیر حربی ملک سے ہے تو دفعاً للحرج جائز ہے کیونکہ ایک ملک دوسرے ملک سے الگ تھلگ رہ کر سخت حرج اور تنگی کا شکار ہو جائے گا جواز ضرور ہے لیکن اس فاسد اور باطل رواج کو ختم کرنے کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر مجموعی حیثیت سے عائد ہوتی ہے۔

شخصی اور سرکاری بینکوں کا فرق

جواب ۱۰:۔ سرکاری بینک ہوں یا اشخاصی دونوں میں کوئی فرق نہیں مدار حکم حربی وغیر حربی ہونا ہے۔ اگر معاملہ حربیوں سے ہے تو جواز ہوگا ورنہ نہیں مسئلہ کی تفصیل جواب[2] میں گذر چکی۔

انکم ٹیکس سے بچنے اور قیمتی اشیاء خریدنے کے لئے رشوت وسود دینے کا حکم

جواب :۔ یہ صورت بلاشبہ جائز ہے کیونکہ اس میں مسلمان کا نفع نیز دفع ضرر ہے۔ قائلین

---

[1] امداد الفتاوی ج۳ ص۱۵۱ [2] بینک انشورنس اور سرکاری قرضے ص۲۲

عدم جواز کے نزدیک بھی گنجائش ہونا چاہئے کیونکہ تجارت کے ذریعہ ترقی کرنا کسی قسم کا کوئی مال ٹرک وغیرہ خریدنا۔ یہ ہمارے لئے حلال ہے اور ہم کو اس کا حق حاصل ہے۔ ہم جب اس حق کو حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں تو ٹیکس وغیرہ کے سارے قضیے کھڑے ہو جاتے ہیں تو اگرچہ یہ صورت اضطرار کی نہیں لیکن ظلم ضرور ہے جس میں کھلا ہوا ہمارا ضرر ہے اس لئے ظلم و ضرر سے بچنے کے لئے اس طرح کی صورتیں بھی جائز ہونی چاہئے۔ واللہ اعلم۔



ہندوستان میں سود کا مسئلہ

از ——— مولانا مطیع الرحمٰن رضوی مدرسہ قادریہ بدایوں

قرآن میں ربا کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے احل اللہ البیع وحرم الربوا۔ مگر لفظ ربا اپنے معنی مراد کے اعتبار سے مجمل ہے جس کی تعریف نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حدیث پاک الحنطۃ بالحنطۃ والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح والذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ مثلاً بمثل یداً بید والفضل ربوا سے فرمائی ہے۔

مگر سوال یہ کہ سود کا وجود وتحقق حدیث پاک میں مذکور صرف انہیں چھ چیزوں میں محصور ہے یا دوسری چیزوں میں بھی ہو سکتا ہے؟ ——— اس سلسلے میں احادیث نبویہ میں کوئی صراحت نہیں ملتی حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا خرج النبی علیہ السلام عنا ولم یبین لنا ابواب الربوا (نور الانوار) ——— نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے اور ربا کے ابواب کی پوری وضاحت نہیں فرمائی۔

مگر ائمہ کرام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ سود کا وجود وتحقق انہیں چھ چیزوں میں محصور نہیں۔ کیونکہ اس کا وجود وتحقق معلول بہ علت ہے تو جہاں جہاں یہ علت متحقق ہو گی سود کا وجود وتحقق ہو گا لیکن اس کی علت کیا ہے اس کی صراحت بھی حدیث پاک میں نہیں اس لئے اس کی علت کے سلسلہ میں ائمہ کرام کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ امام شافعی نے اپنے اجتہاد سے کسی چیز کو علت قرار دیا ہے تو امام مالک نے اپنے اجتہاد سے کسی چیز کو۔

سود چونکہ دو طرح کا ہوتا ہے (۱) ربا الفضل (۲) ربا النسیئۃ ——— تو امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلی قسم کے سود کی علت قدر اور جنس کے مجموعہ کو ——— اور ——— دوسری قسم کے سود کی علت قدر اور جنس میں سے ہر ایک کو انفراداً قرار دیا ہے فالعلۃ عندنا الکیل والوزن مع الجنس فحرمۃ ربوا الفضل بالوصفین وحرمۃ النساء باحدھما (ہدایہ مع الفتح ص ۳۱۹ ج ۵) ———

قدر سے مراد یہ ہے کہ وہ چیزیں ناپ تول سے فروخت ہوتی ہوں جیسے سونا، چاندی دھان، گیہوں وغیرہ ــــــ جنس سے مراد یہ ہے کہ ان چیزوں کے نام اور مقصد ایک ہوں جیسے دھان، گیہوں وغیرہ کے اقسام (شامی ص ــ)

اسی طرح شرائط کے سلسلہ میں بھی اختلاف ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک سود کے وجود و تحقق کی ایک شرط یہ ہے کہ نفس عقد میں زیادتی ـ یا ـ ادھار کی بات لفظاً یا عرفاً ہو اگر نفس عقد میں زیادتی یا ادھار کی بات نہ ہو اور ادائگی میں کچھ زیادہ کر دیا جائے یا تاخیر ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ شرط فیہ ای فی العقد (فتح القدیر ج۶) اعلم ان ذکر النسا للاحتراز عن التعجیل لان القبض...... لا یشترط...... فانما یشترط فیہ التعیین دون التقابض (ردالمحتار ج۴ ص۱۸۹)

ایک شرط یہ بھی ہے کہ عاقدین میں غلامی اور آقائی کا رشتہ نہ ہو۔

ایک شرط یہ بھی ہے کہ جس چیز کی خرید و فروخت ہو رہی ہے عاقدین میں اس چیز کے اندر شرکت عنان نہ ہو۔

ایک شرط یہ بھی ہے کہ عاقدین میں شرکت مفاوضہ نہ ہو۔

یونہی ایک شرط یہ بھی ہے کہ بدلین معصوم اور قابل ضمان ہوں۔ ومن شرائط الربوا عصمة البدلین وکونہما مضمونین بلا اختلاف (شامی ج۴ ص۱۸۸) ــــــ اگر بدلین معصوم اور قابل ضمان نہ ہوں تو قدری و جنسی چیزوں کے نفس عقد ہی میں زیادتی یا ادھار کی بات ہونے کے باوجود بھی شرط کے فقدان کی وجہ سے ادافات الشرط فات المشروط کے تحت سود کا تحقق نہ ہوگا اور ادھار یا زیادتی جائز ہوگی خواہ عاقدین میں غلامی و آقائی کا رشتہ اور شرکت عنان و شرکت مفاوضہ نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جو شخص دارالحرب میں مسلمان ہوا اور ابھی دارالاسلام نہیں آیا کہ مسلمانوں پر اس کے حفظ و منع کی ذمہ داری ہو ــــــ تو ان کا مال چونکہ معصوم و قابل ضمان نہیں اس لئے اس مسلمان شخص سے قدری و جنسی چیزوں کے تبادلہ میں نفس عقد کے اندر ادھار یا زیادتی کی شرط لگا دینے کے باوجود بھی سود نہیں ہوگا۔ حکم من اسلم فی دارالحرب ولم یہاجر کحربی فللمسلم ربوا معہ خلافاً لہما لان مالہ غیر معصوم (درر الحکام ج۲ ص۱۱۸) وحکم من اسلم فی دارالحرب ولم یہاجر کالحربی عند ابی حنیفة لان مالہ غیر معصوم عندہ فیجوز للمسلم الربوا معہ (بحرالرائق ج۶ ص۱۳۷)

میری مذکورہ بالا معروضات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سود کی کوئی ایسی حقیقت شرعیہ نہیں ہو سکتی جو سارے جزئیات و مواد کو تمام ائمہ کرام کے نزدیک شامل ہو ــــــ ہو سکتا ہے

کہ کسی صورت میں احناف کے نزدیک سود ہو اور شوافع کے نزدیک نہ ہو۔ یا شوافع کے نزدیک سود ہو اور احناف کے نزدیک نہ ہو ـــــــ اسی طرح مالکی اور حنبلی حضرات کا معاملہ ہے۔ مثلاً لوہا کو لوہا کے عوض فروخت کرنے میں کمی زیادتی ہو تو احناف کے نزدیک سود ہے اور شوافع کے نزدیک نہیں کالجص والحدید لا یجوز عندنا لوجود القدر والجنس وعنده یجوز لعدم الطعم والثمنية (هدایہ مع الفتح ص۲۸۹ ج۵) ـــــــ

البتہ ہر ایک امام کے مذہب کے مطابق سود کی الگ الگ جامع تعریف کی جاسکتی ہے اور اس کا دائرہ بتایا جاسکتا ہے۔ مثلاً امام اعظمؒ کے مسلک کے مطابق اس کی جامع ومانع تعریف یہ ہوگی کہ مخصوص شرائط کے ساتھ (جن میں سے ایک اہم شرط بدلین کا معصوم وقابل ضمان ہونا بھی ہے) قدری وجنسی چیزوں کے تبادل میں زیادتی یا ادھار کو سود کہتے ہیں۔ فضل احد المتجانسین علی الآخر بالمعيار الشرعی ای الكيل والوزن (بحرالرائق ج۶ ص۱۳۶) ـــــــ ان وجدا حرم الفضل والنساء فلم یجز بیع قفیز بر بقفیزین منه متساویا او احدهما نساء (درمختار) قوله ای کبیع قفیز بر بقفیزین منه حالا (شامی ج۴ ص۱۸۰) القدر والجنس فعند اجتماعهما يحرم التفاضل والنساء وبا حدهما منفردا يحرم النساء ويحل التفاضل (فتح القدیر ج۵ ص۲۷۵)

۲:- صورۃً سودی معاملات کو حقیقۃً سود قرار دینے میں دارالحرب یا دارالاسلام کی کوئی تخصیص نہیں جن صورتوں میں سود کی علّت اپنے شرائط کے ساتھ متحقق ہوگی ان صورتوں میں حقیقۃً سود کا وجود وتحقق ہوجائے گا۔ خواہ دارالحرب میں ہو یا دارالاسلام میں ـــــــ اسی طرح جن صورتوں میں سود کی علت اپنے شرائط کے ساتھ متحقق نہ ہوگی۔ ان صورتوں میں حقیقۃً سود کا وجود وتحقق نہیں ہوگا، خواہ دارالاسلام میں ہو یا دارالحرب میں۔

درالحکام اور بحرالرائق کے حوالوں سے یہ ثابت کرچکا ہوں کہ کوئی شخص دارالحرب میں مسلمان ہوا تو ان سے صورۃً سودی معاملات حقیقۃً سود نہیں ـــــــ لیکن اگر دارالاسلام سے دو مسلمان امان لے کر دارالحرب جائیں تو ان کے وہاں آپس میں وہ معاملات جائز نہیں حقیقۃً سود ہیں۔ فلو هاجر الينا ثم عاد اليهم فلا ربوا اتفاقا (درمختار) ای لا یجوز الربوا معه فهو نفی بمعنى النهی كما فی قوله تعالیٰ فلا رفث ولا فسوق فافهم (ردالمحتار ج۴ ص۱۸۸) ـــــــ

رہا یہ سوال کہ حدیث پاک سے لے کر فقہاء کرام کی عبارات تک میں صورۃً سودی معاملات سے حقیقۃً سود ہونے کی نفی جہاں جہاں کی گئی ہے ہر جگہ دارالحرب کی قید لگی ہوئی ہے تو پھر دارالاسلام

میں ان سودی معاملات سے حقیقۃً سود ہونے کی نفی کیسے درست ہوگی نیز ان تمام حضرات نے متفقہ طور پر دارالحرب کی قید کیوں لگائی۔

تو عرض کروں گا کہ حدیث پاک اور ارشادات فقہاء میں دارالحرب کے قید کے بعد فقہاء کرام کی تعلیل وتفریعات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دارالحرب کی قید تخصیصی واحترازی نہیں بلکہ زائد واتفاقی ہے کیونکہ جو حکم معلول بہ علّت ہو وہ حکم علّت کے ساتھ دائر ہوتا ہے یعنی جہاں جہاں وہ علّت پائی جاتی ہے حکم بھی پایا جاتا ہے۔ اور جہاں جہاں علّت مفقود ہوجاتی ہے وہاں حکم بھی مفقود ہوجاتا ہے۔ اب اگر اس حکم میں کوئی قید بھی ہو تو وہ قید تخصیصی واحترازی نہیں بلکہ زائد ہوتی ہے جیسے آیت کریمہ لاتاکلوا الربوٰا اضعافا مضعفۃ سود کا حکم معلول بہ علّت ہے یعنی رباکی علّت کا اپنے شرائط کے ساتھ پایا جانا۔ تو چاہے وہ علّت دونا دون کی صورت میں پائی جائے یا کسی اور صورت میں سود کا حکم بہرحال ہوگا۔ یہ نہیں کہ دونا دون کی صورت میں ہو تو سود ہے اور اس سے کم وبیش ہوجائے تو سود نہ رہے اس لئے دونا دون کی قید اتفاقی ہوئی۔ وانما قیدبہ اجراء علی عادتھم والا فھو حرام مطلقا غیر مقید بمثل ھذا القید (تفسیرات احمدیہ ص۱۳۳)

مگر زائد کا یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ بے فائدہ ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حکم کا مدار اس قید پر نہیں کہ اس کے ختم ہونے سے حکم ختم ہوجائے ——— اب رہی یہ بات کہ پھر اس قید سے فائدہ کیا ہوا؟ ——— تو عرض کروں گا کہ عرب میں چونکہ دونا دون ہی سود کھانے کا رواج تھا۔ تو قرآن کریم نے ان کے اس مذموم فعل پر خصوصیت کے ساتھ پابندی لگائی اور ان کو تنبیہ کی کہ تمہارا یہ فعل قطعًا اسلامی اصول کے خلاف ہے۔

اسی طرح مسلمان اور حربی کے مابین کاروبار میں چونکہ شرط (مال کا معصوم وقابل ضمان ہونا) کے فقدان کی وجہ سے سود کی علّت نہیں پائی جاتی تو سود کا تحقق بھی نہیں ہوگا۔ اب خواہ یہ فقدان دارالحرب میں ہو یا دارالاسلام میں سود کا تحقق بہرحال نہیں ہوگا اور قید زائد واتفاقی ہوگی۔

مگر یہاں بھی اتفاقی کا مطلب یہ نہیں کہ معاذ اللہ بے فائدہ ہے بلکہ اس دور میں حربی چونکہ دارالاسلام میں بغیر امان لئے آنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کیونکہ یہاں ان کی جان ومال ہر وقت خطرہ میں ہوتی۔ لانہ لو دخل دارنا بلا امان کان وما معہ فیئا (ردالمحتار ص۲۳۵ ج۳) تو حربی کے ساتھ کاروبار کی یہی صورت تھی کہ مسلمان امان لے کر ان کے ملک میں جائے اس لئے دارالحرب کی قید لگا کر اس بات سے آگاہ کر دیا گیا کہ حربیوں کا مال صرف اسی صورت میں جائز

مباح نہیں ہے کہ وہ امان لئے بغیر دارالاسلام میں آجائیں۔ بلکہ تم بھی امان لے کر وہاں جاؤ تو بھی جائز ومباح ہے۔ ہاں اس صورت میں دھوکہ وفریب نہ کرنا کیونکہ یہ اسلامی شان کے خلاف ہے یجوز لہ اخذ مال بغیر طیبۃ نفسہ فاذا اخذ علی ھذا الوجہ بطیبۃ نفسہ کان اولی بالجواز اذا دخل الیھم بامان فاموالھم مباحۃ فی الاصل الا انہ حظر الامان قد حظر علیہ الامان ان لا یاخذ مالہ الا بطیبۃ نفسہ (جوہرۃ نیرۃ ج۲ ص۲۱۹)

بہرحال دارالحرب ہو یا دارالاسلام مسلمان اگر حربیوں سے ان کا مال دھوکہ وفریب دیئے بغیر لے لیں تو سود اور حرام نہیں جائز مباح ہے یہی وجہ ہے کہ امام احمد رضا بریلوی نے ارشاد فرمایا ہے۔ تحقیق المقام علی ما یظہر للعبد الضعیف غفر اللہ تعالیٰ لہ ان مال الحربی مباح مطلقا فی الدارین لا یحظر الا لاجل الغدر الخ

رہا شبہ یہ کہ قرآن واحادیث میں سود کی حرمت مطلقاً ہے جس میں مال حربی وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں تو المطلق یجری علی اطلاقہ کے تحت مال حربی کو بھی شامل ہونا چاہئے۔ خبر واحد اور فقہاء کی تعلیل سے اس مطلق کو مقید کرکے مال حربی کو خارج قرار دینا کیسے درست ہوگا؟

تو عرض کروں گا کہ آیات واحادیث میں لفظ ربا سے مطلق مال کی زیادتی مراد نہیں بلکہ مال محظور کی زیادتی مراد ہے جس میں حربی کا مال داخل ہی نہیں کہ ان کو خارج کرنے کی بات پیدا ہو۔

وقد یقال لو سلم حجیتہ فالزیادۃ بخبر الواحد لا تجوز واثبات قید زائد علی المطلق من نحو لا تاکلوا الربوا ونحوہ ھو الزیادۃ فلا یجوز ویدفع بالقطع بان المطلقات مراد بمحلھا المال المحظور لحق مالکہ ومال الحربی لیس محظورا الا لتوقی الغدر (فتح القدیر ج۵ ص۳۰)

۳ :۔ دارالحرب۔ کفار کے اس ملک کو کہتے ہیں جہاں کبھی مسلمانوں کا قبضہ ہوکر اسلام کے احکام جاری نہ ہوئے ہوں۔ یا کبھی مسلمانوں کا قبضہ ہوکر اسلام کے احکام جاری ہوئے تھے تو اب اسلام کے احکام بالکلیہ روک کر کفر کے احکام جاری کر دیئے گئے ہوں۔ اور اس ملک اور کسی دارالحرب کے درمیان کوئی اسلامی ملک نہ ہو نیز وہاں کوئی مسلمان یا ذمی شخص اپنے پہلے امان پر باقی نہ ہو۔

دارالاسلام وہ ملک ہے جس میں اسلامی سلطنت ہو یا اب اسلامی سلطنت نہیں ہے تو اسلام کے احکام بالکلیہ رک کر کفر کے احکام جاری نہیں ہو گئے ہیں ۔یا۔ اسلام کے احکام تو بالکلیہ رک گئے ہیں۔ مگر وہ ملک دارالحرب سے متصل نہیں ہے ۔یا۔ دارالحرب سے

متصل بھی ہے تو کوئی مسلمان یا ذمی شخص اپنے پہلے امان پر وہاں باقی ہے۔

وفی الدرر دار الحرب تصیر دار الاسلام باجراء احکام الاسلام فیہا کاقامۃ الجمعۃ والاعیاد وان بقی فیہا کافر اصلی ولم یتصل بدار الاسلام بان کان بینہ وبین دار الاسلام مصر آخر لاھل الحرب ویعکس ای یصیر دار الاسلام دار الحرب بامور ثلثۃ باجراء احکام الشرک فیہا ولاتصالہا بدار الحرب بحیث لا یکون بینہما مصر للمسلمین وان لا یبقی فیہا مسلم او ذمی آمنا بالامان الاول علی نفسہ ھذا عند الامام (مجمع الانہر ص۵۱۲ ج۱) ...... لا تصیر دار الاسلام دار حرب الا بامور ثلثۃ باجراء احکام اھل الشرک واتصالہا بدار الحرب وبان لا یبقی فیہا مسلم او ذمی آمنا بالامان الاول علی نفسہ ودار الحرب تصیر دار الاسلام باجراء احکام اھل الاسلام فیہا کجمعۃ وعید وان بقی فیہا کافر اصلی وان لم تتصل بدار الاسلام در والمنتقی (درمختار) قولہ لا تصیر دار الاسلام دار حرب الخ ای بان یغلب اھل الحرب علی دار من دورنا وارتد اھل مصر وغلبوا واجروا احکام الکفر او نقض اھل الذمۃ وتغلبوا علی دارھم ففی کل من ھذہ الصور لا تصیر دار حرب الا بھذہ الشروط الثلثۃ .... وفی شرح الدرر للبحار قال بعض المتاخرین اذا تحققت تلک الامور الثلثۃ فی مصر المسلمین ثم حصل لاھلہ الامان و نصب فیہا قاض مسلم ینفذ احکام المسلمین عادا لی دار الاسلام ...... قولہ باجراء احکام اھل الشرک ای علی الاشتہار وان لا یحکم فیہا بحکم اھل الاسلام ھندیہ وظاھرہ انہ لو اجریت احکام المسلمین واحکام اھل الشرک لا تکون دار حرب قولہ باتصالہا بدار الحرب بان لا یتخلل بینہما بلدۃ من بلاد الاسلام ھندیہ وظاھرہ ان البحر لیس فاصلا بل قدمنا فی باب استعلاء الکفار ان بحر الملح ملحق بدار الحرب خلافا لما فی فتاوی قاری الھدایۃ قلت وبھذا ظہر ما فی جبل تیم اللہ المسمی بجبل الدروز وبعض البلاد التابعۃ لہ کلہا دار اسلام لانہا وان کانت لہا حکام دروز او نصاری ولہم قضاۃ علی دینہم وبعضہم یعلنون بشتم الاسلام والمسلمین لکنہم تحت حکم ولاۃ امورنا وبلاد الاسلام محیطۃ ببلادھم من کل جانب واذا اراد ولی الامر تنفیذ احکامنا فیہم نفذھا .... ذکر فی اول جامع الفصولین کل مصر فیہ وال مسلم من جہۃ الکفار یجوز منہ اقامۃ الجمعۃ واخذ الخراج وتقلید القضاء وتزویج الایامی لاستیلاء المسلم علیہم واما طاعۃ الکفرۃ فہی موادعۃ ومخادعۃ واما فی بلاد علیہا ولاۃ کفار فیجوز للمسلمین

اقامۃ الجمعۃ والاعیاد ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین ویجب علیھم طلب وال مسلم اھ وقدمنا نحوہ فی باب الجمعۃ عن البزازیۃ (رد المحتار ج۳ ص۲۵۳) ——— فی معراج الدرایۃ عن المبسوط البلاد التی فی ایدی الکفار بلاد الاسلام لا بلاد الحرب لانھم لم یظھروا فیھا حکم الکفر بل القضاۃ والولاۃ مسلمون ویطیعونھم عن ضرورۃ اوبدونھا (ایضا ج۱ ص۵۳۰)

دارالاسلام اور دارالحرب کی تعریفات سے ظاہر ہے کہ دونوں ایسی ضدیں ہیں کہ ایک کے ارتفاع سے دوسرے کا تحقق ہوجاتا ہے اور تحقق سے ارتفاع تولا محالہ جو ملک دارالاسلام ہوگا وہ ملک اس وقت دارالکفر (دارالحرب) نہیں ہوسکتا اور جو ملک دارالحرب ہوگا وہ ملک اس وقت دارالاسلام نہیں ہوسکتا ——— یونہی یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ کوئی ملک کسی وقت دارالاسلام اور دارالحرب کچھ نہ ہو۔

ہاں فقہاء کرام کی عبارتوں میں دارالاسلام اور دارالحرب کے علاوہ دارالامان اور دارالبغاۃ کے اطلاقات بھی آئے ہیں۔ لیکن غور کرنے سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ دارالامن یا دارالبغاۃ دار کی مستقل قسمیں نہیں بلکہ دارالحرب اور دارالاسلام ہی کی ذیلی قسمیں ہیں۔ مسلمان امان لے کر دارالحرب جائے تو وہ دارالحرب ہی اس کے لئے دارالامان ہے۔ اسی طرح اسلامی ملک کے جس حصہ میں کچھ لوگ سلطان اسلام سے بغاوت کرجائیں وہ حصہ دارالبغاۃ ہے مگر اس کے باوجود وہاں بالاتفاق اقامت جمعہ وعیدین فرض اور ادائیگی صحیح ہے۔ حالانکہ اس کے لئے بالاجماع دارالاسلام ہونا شرط ہے۔ کسی کے نزدیک بھی دارالحرب میں یہ چیزیں درست نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ دارالبغاۃ دارالاسلام ہی کی ایک ذیلی قسم ہے۔

دارالاسلام کی تعریف اور اقامت جمعہ وعیدین کے لئے دارالاسلام کی شرط جان لینے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہندوستان موجودہ حالات میں بھی دارالاسلام ہی ہے دارالحرب نہیں۔ چنانچہ صدہا سال سے مسلمان یہاں اقامت جمعہ وعیدین فرض وصحیح جان کر ادا کرتے ہیں۔ مذہب ومسلک کے بے شمار اختلافات کے باوجود آج تک کسی نے اس کو غلط نہیں بتایا۔

(۴) ۱۔ خالص مسلمانوں کے بینکوں یا ان کے اشتراک سے قائم شدہ بینکوں میں جمع کردہ اصل رقم پر زیادتی ملتی ہو تو وہ سود ہے ——— رہے وہ بینک جو خالص

غیرمسلموں کے ہیں یا ایسے ممالک کے زیر حکومت ہیں جن پر غیر مسلموں کا قبضہ ہے جیسے ہندوستان۔ تو ایسے بینکوں سے ملنے والی اضافی رقم کے سود ہونے نہ ہونے میں تفصیل ہے کیونکہ غیر مسلموں کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) ذمی (۲) مستامن (۳) حربی ———

ذمی کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے ان پر جزیہ مقرر کر کے ان کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہو اور ان کو اپنی مملکت میں رہنے کا اختیار دے دیا ہو۔

مستامن کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے ان کی حفاظت کا ذمہ لے کر ایک سال سے کم مدت کے لئے اپنی مملکت میں رہنے کا اختیار دیا ہو۔ لا یتمکن حربی مستامن فینا سنۃ (درمختار مع شامی ص۲۴۹ ج۳)

حربی کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو مسلمانوں نے ان پر جزیہ مقرر کیا ہو اور نہ ہی مخصوص مدت کے لئے امان دیا ہو۔ بہ لفظ دیگر جو غیر مسلم ذمی یا مستامن نہ ہو وہ حربی ہے۔ چاہے دار الحرب میں رہتا ہو یا دار الاسلام میں۔

ذمی چونکہ مسلمانوں کو جزیہ ادا کرتا ہے اس لئے ان کا مال بھی حکماً معصوم ہے۔ فلھم ما للمسلمین و علیھم ما علی المسلمین لقول علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ انما بذل الجزیۃ لیکون دماءھم کدمائنا واموالھم کاموالنا

مستامن کو چونکہ مسلمان امان کا عہد و پیمان دے دیتے ہیں اس لئے ان کا مال بھی ذمیوں کی طرح حکماً معصوم ہو جاتا ہے۔ وحاصلہ ان المستامن فی دارنا قبل ان یصیر ذمیا حکمہ کحکم الذی (ردالمحتار ص۲۴۹ ج۳)

جب ذمی اور مستامن کے مال حکماً معصوم ہوئے اور ان کے مال کا حکم بھی مسلمانوں کے مال کی طرح ہو گیا تو جس طرح قدری و جنسی چیزوں میں مسلمانوں سے زیادتی یا ادھار حرام و سود ہے اسی طرح ذمیوں اور مستامنوں سے بھی سود اور حرام ہے۔ فلا یحل لمسلم فی دارنا ان یعقد مع المستامن الا ما یحل من العقود مع المسلمین ولا یجوز ان یوخذ منہ شیئا لا یلزمہ شرعا (شامی ص۲۴۹ ج۳)

رہے حربی تو ان کے مال و دولت کے معصوم ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ لہٰذا خلق لکم ما فی الارض جمیعا کے تحت جائز و مباح ہیں۔

لہٰذا ذمی اور مستامن کے بینکوں سے یا ان کے اشتراک سے قائم شدہ بینکوں سے

جو اضافی رقم ملے وہ سود ہے اور خالص حربیوں کے بینک سے جو اضافی رقم ملے وہ سود نہیں چاہے بینک سرکاری ہوں یا غیر سرکاری

اب ہندوستان میں نہ تو مسلمانوں کی حکومت ہے کہ یہاں کے غیر مسلمین ان کو جزیہ دیتے ہوں جس سے وہ ذمی ہوسکیں اور نہ ہی مسلمانوں کا غلبہ ہے کہ غیر مسلم ان سے امان لے کر ایک مخصوص مدت تک کے لئے رہتے ہوں جس سے وہ مستامن ہوسکیں۔ تو یہاں کے غیر مسلمین بلاشبہ حربی ہوئے۔ بلکہ مسلمانوں کے دورِ حکومت سے ہی حربی ہیں۔ جیسا کہ ملاّ حضرت احمد جیون علیہ الرحمہ نے بھی اپنی مایۂ ناز تصنیف تفسیرات احمدیہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ ان هم الا حربیون وما یعقلها الا العالمون

ہندوستان کی حکومت میں چونکہ سارا عمل دخل غیر مسلموں ہی کا ہے قانون سازی اور اس میں ترمیم و تنسیخ کا حق عملاً انہیں کو سپریم کورٹ سے لے کر پارلیمنٹ تک ان کے قبضہ میں، حتی کہ ارکانِ پارلیمنٹ کو منتخب کرنے کا حق بھی انہیں کو۔ مسلمان اگر ان سے الگ ہوکر صرف اپنے نمائندوں کا انتخاب کریں تو شاید دو تین سے زائد منتخب نہ ہوں، حکومت قائم کرنا تو بڑی بات ہے ـــــــــ رہا مسلمانوں کا حکومت میں شریک ہونا یا ووٹ کا استعمال کرنا تو یہ ضرورت یا موادعۃ و مخادعۃ کے طریقے پر ہے۔ جیسا کہ علاّمہ شامی نے جامع الفصولین وغیرہ کے حوالے سے فرمایا ہے۔ ویطیعونهم من ضرورة او بدونها ـــــ واما طاعة الكفرة موادعة ومخادعة

اس لئے یہاں کی حکومت غیر مسلموں ہی کی حکومت ہے اور حکومت کے املاک غیر مسلموں کے املاک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملکی مصالح کے علاوہ خالص ہندوانہ مذہبی مصالح میں حکومت کے املاک کا استعمال عام ہے۔ سرکاری دفاتر اور حکومت کی زمینوں پر مندروں کی تعمیر کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ تو یہاں کی حکومت اور غیر مسلموں کے مال و دولت فی نفسہٖ معصوم و قابلِ ضمان نہیں زیادہ سے زیادہ معاہدہ اور عقد امان کی وجہ سے محظور ہوں گے لان مالهم مباح وبعقد الامان لم یصر معصوماً الا انه التزم الا تتعرض لهم بغدر ولا لما فی ایدیهم (بحر الرائق ج۹ ص۱۲۶)

اس لئے ہندوستانی حکومت یا یہاں کے عام غیر مسلموں سے سودی معاملات کر کے اضافی رقم لینا حقیقۃً سود اور حرام نہیں بلکہ دھوکہ اور فریب کے بغیر جس طرح بھی مل جائے

سے لینا جائز اور مباح ہے۔ علامہ شامی نے سیر کبیر اور اس کی شرح کے حوالے فرمایا ہے فلا باس بان یاخذ منہم اموالہم بطیب انفسہم بای وجہ کان لانہ انما اخذ المباح علی وجہ عری عن الغدر فیکون ذلک طیبا لہ والاسیر والمستامن سواء حتی لو باعہم درہما بدرہمین او باعہم بدراہم اواخذ مالا منہم بطریق القمار فذلک کلہ طیب لہ مخلصا (ج ۳ ص ۲۴۹)

رہا یہ کہ دستوری طور پر ملک کے وسائل آمدنی سے ایک مسلمان کو بھی منتفع ہونے کا اتنا ہی حق ہے جس قدر کسی غیر مسلم کو نیز یہ کہ سرکاری بینکوں میں مسلمانوں کا حصہ بھی مختلف ٹیکسوں اور محاصل کے ذریعہ جمع ہے تو حکومت کے املاک و جائداد کو مطلقاً غیر مسلموں کے املاک و جائداد کس طرح قرار دے دیا جائے۔

عرض کروں گا کہ عملی زندگی کے بالمقابل کاغذی دستور کا کوئی اعتبار نہیں نیز یہ کہ یہ دستوری انتفاع کا حق بھی ہمیں حکومت ہی نے دے رکھا ہے۔ ورنہ عملاً تو ہم اس حق سے بھی محروم کر دئے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب کوئی مسلمان امان لے کر دار الحرب جائے تو اسے بھی وہاں کے وسائل آمدنی سے انتفاع کا کچھ نہ کچھ حق ضرور مل جاتا ہے۔ دنیا کی ساری مباح چیزوں سے مسلمانوں کو انتفاع کا حق ہے۔ مگر اس سے دنیا کی ساری چیزیں جن سے انتفاع کا حق ہے ملکیت میں نہیں آئیں گی۔ کوئی ہمیں اپنی مملوکہ شے سے بطور اباحت انتفاع کا حق دے تو اس کی وہ مملوکہ شے اس کی ملکیت سے نکل کر ہمارے ملک میں نہیں آجائے گی کیونکہ محض حق انتفاع ملک کی علامت نہیں وہ بھی اس صورت میں جبکہ لبقاء عین کے ساتھ حق انتفاع ہو۔ اپنی ملک میں آدمی جب چاہے جس طرح چاہے تصرف کرسکتا ہے اپنی ملک آدمی کسی کو زبردستی دینے پر مجبور نہیں ہوتا۔ البتہ مختلف ٹیکسوں اور محاصل کے ذریعہ حکومت کے خزانے میں جاتی ہے وہ یقیناً پہلے مسلمانوں کی ملک ہوتی ہے جسے حکومت جبر وغصب کے طور پر لیتی ہے۔ اور دوسری رقموں کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دیتی ہے کہ امتیاز نہیں ہوسکتا۔ تو استہلاک ہوا اور استہلاک کی صورت میں مغصوب منہ کی ملکیت زائل ہوجاتی ہے ــــــ اور غاصب اس کا مالک ہوجاتا ہے۔ ہاں اس کے ذمہ ضمان واجب ہوتا ہے۔ الغاصب اذا خلط المغصوب بمال نفسہ خلطا ممازجۃ خلط لا یمکن التمیز بینہما بالقسمۃ وخلط یمکن التمیز بینہما بالقسمۃ فما لا یمکن التمیز بینہما بالقسمۃ فالخالط ضامن ولا حق للمالک فی المغلوط بالاجماع وان امکن التمیز بینہما بالقسمۃ کخلط الجنس بالجنس مثل الحنطۃ بالحنطۃ واللبن باللبن کذلک ابی حنیفہ رحمۃ اللہ تعالی علیہ۔

(ہندیہ ج۵ ص۱۳۲) زال ملک المغصوب منہ و ملکہا الغاصب (عامۃ کتب فقہ)

تو ثابت ہوا ہندوستانی حکومت کے املاک میں بطور ملکیت مسلمانوں کا حصہ نہیں — اس لئے یہاں کے سرکاری بینکوں یا غیر مسلموں کے پرائیوٹ بینکوں سے جو اضافی رقم ملے وہ حقیقۃ سود نہیں لہٰذا جن صورتوں سے حاصل شدہ رقم حقیقۃ سود نہیں ہے ان صورتوں سے حاصل شدہ رقم کو ہر جائز کام میں صرف کر سکتے ہیں اور جن صورتوں سے حاصل شدہ رقم سود ہے ان صورتوں سے حاصل ہونے والی رقم کو لینا جائز نہیں۔ اگر لے لی گئی ہو تو واپس کر دینا ضروری ہے۔

(۵) :- سود لینے اور دینے کے حکم میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا بقولہ تعالیٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان فقہ کا مسلمہ ضابطہ ہے ماحرم اخذہ حرم اعطاءہ ہاں ضرورت واحتیاج شرعی ہو تو دینا گناہ نہیں۔ یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباہ والنظائر ص۱۲۹)

(۶) :- ضرورت وحاجت شرعیہ کی بنیاد پر سودی قرض لینے کی شرعاً گنجائش ہے جیسا کہ اشباہ ونظائر کے حوالہ سے میں نے عرض کیا۔ ضرورت وحاجت شرعیہ کا تحقق اس وقت ہوگا جب مثلاً سودی قرض لئے بغیر گذر اوقات کا ذریعہ نہ ہو۔ یا۔ واقعۃ عزت وآبرو کی بن آئے نہ یہ کہ خوامخواہ جھوٹی عزت بنائے رکھنے کو ذلت ورسوائی کا نام دے دیں۔

(۷) :- حکومت ہند ترقیاتی اسکیموں، مکانات کی تعمیر، صنعت وحرفت کی ہمت افزائی، نیز بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے جو قرض سودی قرضہ کے نام سے تقسیم کرتی ہے، اس کے جواز کے لئے فاضل سائل نے حکومت کے املاک میں مسلمانوں کے جس "حق" کی نشاندہی کی ہے اور صورۃ رشوت پر قیاس کا نکتہ پیش فرمایا ہے اس کی وضاحت نہیں فرمائی ہے کہ اس "حق" سے ان کی مراد حق بطور ملک ہے یا بطور اباحت یا بطور ضمان۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ حکومت کے املاک میں مسلمانوں کا حق بطور ملک — نہیں ہے جیسا کہ میں جواب ۱ کے تحت عرض کر چکا ہوں لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانوں کا حق بطور ملک ہے تو صرف قرض لینے والے ہی کا حق بطور ملک نہیں تمام مسلمان کا حق بطور ملک ہوگا جس سے بدلین معصوم ومضمون بالاتلاف ہوں گے اس لئے اس صورت میں اضافی رقم دینے کی شرط پر قرض لینا حرام اور حقیقۃ سودی معاملہ ہوگا۔ جس کو صورۃ رشوت پر قیاس کر کے جائز نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ حقیقۃ سود کی حرمت منصوص ہے اور قیاس سے وہی حکم

ثابت کیا جا سکتا ہے جو منصوص نہ ہو۔

اسی طرح مسلمانوں کا حق بطورِ اباحت ہو تو اس صورت میں بھی اس کے جواز کے لئے صورۃً رشوت پر قیاس نہیں ہو سکتا کیونکہ رشوت صوری بھی ضرر و نقصان سے بچنے کی خاطر جائز ہے تحصیل اباحت منفعت کے لئے نہیں۔ اباحت کی صورت میں اضافی رقم دینا اگرچہ حقیقۃً سود نہیں مگر اپنے مال کا زیاں اور کفار کو فائدہ پہونچانا ہے اس لئے وہ بھی ممنوع ہوگا۔ فی شرح اللباب ویحرم اخذ الاجرۃ ممن یدخل البیت اویقصد زیارۃ مقام ابراهیم علیہ الصلوۃ والسلام بلا خلاف بین علماء الاسلام وائمۃ الانام کما صرح بہ فی البحر وغیرہ اھ وقد صرحوا بان ما حرم اخذہ حرم دفعہ الا لضرورۃ ولا ضرورۃ ھھنا لان دخول البیت لیس من مناسک الحج اھ (رد المحتار بحوالہ جمل النص فی اماکن الرخص ص۲۰۰)

ہاں مسلمانوں کا حق بطور ضمان ہو تو میں جواب ۷ کے تحت عرض کر چکا ہوں کہ مال مغصوب دوسرے کے مال میں غیر ممتاز طور پر مل جائے تو غاصب اس کا مالک ہو جاتا ہے اور مغصوب منہ کا حق ضمان سے متعلق ہو جاتا ہے اس لئے اس صورت میں اس کے حصول کے لئے دی جانے والی رقم درحقیقت رشوت صوری ہوگی۔ اور رشوت کی اس رقم کے ساتھ ساتھ مال مغصوب کے مساوی مالیت کی اصل رقم لے کر واپس نہ کرنا بھی اس حیثیت سے جائز ہوگا۔ الغرض یہ حق بطورِ اباحت ہو تو مطلق اور بطور ضمان ہو تو مقدار مغصوب کی وصولی کے لئے مخصوص حد تک لازمی رشوت دینے کے علاوہ دوسری صورتوں میں حکومت سے صورۃً سودی معاملات کرکے اضافی رقم دینا اس وقت جائز ہوگا جب ظن غالب ملحق بالیقین ہو جائے کہ اس صورت میں جتنی اضافی رقم ادا کرنی ہوگی اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی رقم اس سے زائد ہوگی کیونکہ حقیقۃً تو یہ سود ہے نہیں البتہ بظاہر اپنے مال کا نقصان اور غیر مسلموں کو فائدہ پہونچانا ہے جو درست نہیں مگر جب کم فائدہ دے کر زیادہ حاصل کرنے کا ظن غالب ہے تو ممانعت مرتفع ہونی چاہئے۔

(۸) :۔ ظاہر ہے کہ جب چھوٹ کا تناسب اضافی رقم کے مساوی ہو تو صرف کہنے ہی کے لئے یہ اضافی رقم ہوئی ورنہ حکومت اسی مقدار میں رقم وصول کرے گی جو اس نے دی ہے تو اس میں سود کا شائبہ کیا رہا۔ ہاں اسے سود کہنا اور سمجھنا غلط ہے۔

(۹) :۔ شرائط، احکام اور انواع کے اعتبار سے تجارت کی بے شمار صورتیں ہیں، اس لئے جب تک کسی مخصوص صورت کی نشاندہی اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ نہیں ہو پاتی یہ نہیں

بتایا جا سکتا کہ وہ تجارت صحیح بھی ہے یا نہیں۔ اگر صحیح ہے تو اس کی درآمد پر جو اضافی رقم سود کے نام سے دی جاتی ہے یا برآمد پر جو اضافی رقم ملتی ہے وہ حقیقۃً سود ہے یا نہیں۔

(۱۰)؛۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ سود کے تحقق کی علت جن صورتوں میں بھی پائی جائے گی ان صورتوں میں اس جہت سے حکماً کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اور جن صورتوں میں سود کے تحقق کی علت نہ پائی جائے ان صورتوں میں حکماً کوئی فرق نہیں ہوگا۔ البتہ کسی اور جہت سے جواز یا ممانعت ہو تو دوسری بات ہے۔ اس میں بینک کے سرکاری یا غیر سرکاری ہونے کا کوئی دخل نہیں۔

(۱۱) ؛۔ جب یہ باتیں ثابت ہوگئیں کہ صورتاً سودی معاملات سے حقیقۃً سود ہونے کی نفی کے سلسلہ میں دارالحرب کی قید اتفاقی ہے۔ ہندوستان کے غیر مسلم حربی ہیں ان کا مال معصوم وقابل ضمان نہیں بلکہ مباح ہے۔ مسلمان فریب وغدر کے علاوہ جس صورت سے بھی لیں جائز ہے۔ تو وہ افراد یا کمپنیاں جو صنعت وحرفت اور تجارت کے لئے سرمایہ فراہم کرتی ہیں اگر صرف غیر مسلموں سے لین دین اور کاروبار کریں تو جائز ہے بلکہ اگر مسلمانوں سے بھی اس طرح کاروبار کریں کہ تین لاکھ روپے میں کسی کو ٹرک خرید کر دیتا ہے اور چھ سال میں ان سے قسط وار چھ لاکھ روپے وصول کرتا ہے تو اسے ٹرک خرید کر دیتے وقت ہی ٹرک کی قیمت چھ لاکھ روپے طے کر لی جائے اور سالانہ یا ماہانہ ادائیگی کے لئے جو قسط طے کرنا ہو طے کرلے۔ ہاں قسط متعین نہیں کی اور ادائیگی کے لئے چھ سال کا وقت دے دیا تو اگر تین سال میں ادا کر دے تو ساڑھے چار لاکھ روپے ہی کا مستحق ہوگا۔ قضی المدیون الدین الموجل قبل الحلول لایاخذ من المرابحۃ التی جرت بینھما الا بقدر مامضی من الایام اھ ملتقطا (ردالمحتار ج۵ ص۱۶۰)۔ والتعجیل جائز وما التنجیم الا نوع من التعجیل (کفل الفقیہ ص۱۹۲) اب اس صورت میں یہ اضافی رقم سود نہیں ہوگی بلکہ ٹرک کی قیمت ہے۔ اگرچہ قانونی دشواریوں یا کسی اور مصلحت کے پیش نظر کاغذات میں اسے سود یا کچھ اور لکھنا پڑے۔

یوں ہی وہ حضرات یا کمپنیاں جو صنعت وحرفت اور تجارت کے لئے سرمایہ فراہم کرتی ہیں غیر مسلموں کی ہوں تو ان سے بھی اسی طرح طے کرایا جا سکتا ہے لیکن اگر وہ اس کے لئے تیار نہ ہوں اور سود کے نام پر ہی وصول کرنے کے لئے مصر ہوں تو اس صورت میں اگر ظن غالب یہ ہو کہ سود کے نام پر جو اضافی رقم دی جائے گی اس ٹرک کے ذریعہ حاصل ہونے والی رقم اس سے زیادہ ہوگی تو جائز ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ دی جانے والی اضافی رقم حقیقۃً سود تو بہرحال نہیں ہے۔ البتہ بظاہر غیر مسلم کو فائدہ پہونچانا ہے جس کے جواب کے لئے ہم اپنی معروضات پہلے ہی پیش کر چکے ہیں۔

ربوا کی حقیقت

از ــــــــــــ مولانا عبد الرحیم قاسمی بھوپال

ربوا کی حقیقت اور دائرہ کار

دورِ جاہلی کے غیر متمدن عرب تجار ہوں یا عصرِ حاضر کے ترقی یافتہ سرمایہ دار، انفرادی سودخوری کے حامی ہوں یا اشتمالی و اشتراکی بنکار، سبھی اسلامی نظام سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں، کوئی اندھا دھند کارروائی کرکے ربوٰ کو مثلِ بیع قرار دیتا ہے کوئی ربا القرآن اور ربا الحدیث کو خلط ملط کرکے التباس واشتباہ کی بھول بھلیوں میں انسانیت کو گم کرنا چاہتا ہے، کوئی ربا کو استہلاک واستغلاک کے مختلف خانوں میں بانٹ کر سودخوری کے چور دروازے کھول رہا ہے، حالانکہ قرآن حکیم حلتِ بیع اور حرمتِ ربوٰ کو دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرکے صاف طور پر بیان کرتا ہے ایثار پیشہ صالح معاشرہ کی تشکیل کے لئے قلوب کو ہموار کرتا ہے حکمت و موعظت سے سخت دلوں کو موم کرکے رضاکارانہ سود کو چھوڑنے کے لئے تیار کرتا ہے، آخرت کے ہولناک انجام سے ہوشیار کرتا ہے، عیش طلبی و خودغرضی میں مخمور و مدہوش انسانوں کو للکارتا اور ہٹ دھرمی و کٹ حجتی کرنے والوں کو پھٹکارتا ہے اور خدائی جنگ کا چیلنج دیتا ہے۔

حالانکہ آیاتِ ربوٰ کے شانِ نزول طرزِ بیان اور فصیح زبان سے ربوٰ کا مفہوم یہ واضح ہوکر سامنے آتا ہے کہ قرض دینے والا اپنے دیئے ہوئے منافع سے بلا عوض جو متعین شرح وصول کرتا ہے وہ سود ہے۔ قرض کے مقصد یا قرضدار کی نوعیت بدلنے سے ربوٰ کی حقیقت نہیں بدلتی۔ قرضدار غریب و نادار ہو یا امیر و تاجر اس کو انفرادی ضرورت کے لئے قرض درکار ہو یا اجتماعی کاروبار کے لئے رفاہی اسکیم چلانا مقصود ہو یا فلاحی منصوبہ بروئے کار لانا ہو بہرکیف صلب عقد میں علتِ ربوٰ متحقق ہونے کی بنا پر یہ معاملہ سود کے دائرہ میں آجائے گا

اس ترقی یافتہ دور میں سود مختلف روپ بدل بدل کر سامنے آرہا ہے لیکن ترجمان القرآن شارع اسلام خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تفسیر وتعبیر اور تشریح وتوضیح. کل قرض جر منفعۃ فھو ربا کی روشنی میں فقہائے کرام اس کو آسانی سے پہچان لیتے ہیں چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تجارتی سود کے مجوزین کی گرفت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں ربٰو کی مخالفت کا ذکر ایک جگہ نہیں مختلف سورتوں کی سات آٹھ آیتوں میں اور چالیس سے زیادہ احادیث میں مختلف عنوانوں سے اس کی حرمت بیان کی گئی ہے ان میں سے کسی ایک جگہ کسی ایک لفظ میں بھی اس کا اشارہ موجود نہیں کہ یہ حرمت صرف اس ربٰو کی ہے جو شخصی اغراض کے لئے لیا دیا جاتا تھا تجارتی سود اس سے مستثنیٰ ہے. پھر کسی کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے حکم میں سے کسی چیز کو محض اپنے خیال سے مستثنیٰ کر دے یا عام ارشاد کو خاص کر دے یا مطلق کو بلا کسی دلیل شرعی کے مقید ومحدود کر دے یہ کھلی تحریف قرآن ہے[۳۶] اس کے علاوہ تاریخی طور سے مسئلہ ربٰو پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ خیال بھی غلط ہے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں ربٰو کی صرف یہی صورت رائج تھی کہ کوئی غریب آدمی اپنی شخصی مشکلات کے حل کے لئے سود پر قرض کا معاملہ کرے تجارت کے لئے سود پر روپیہ لینے دینے کا رواج نہ تھا بلکہ آیات ربٰو کا شان نزول دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حرمت ربٰو کا اصل نزول تجارتی سود کے بارے میں ہوا ہے چونکہ عرب اور بالخصوص قریش تجارت پیشہ حضرات تھے اور عام طور پر تجارتی اغراض کے لئے سود کا لین دین کرتے تھے (مسئلہ سود ص۳۲)

بینکوں کے سود پر ضرب لگاتے ہوئے شیخ محمد ابوزھرہ فرماتے ہیں وربا القرآن ھو الربا الذی تسیر علیہ المصارف ویتعامل بہ الناس فھو حرام لا شک فیہ (بحوث فی الربا ص۲۳) شیخ محمد علی الصابونی آیات ربٰو کی تفسیر کرتے ہوئے زیب قرطاس فرماتے ہیں کہ وھذا النوع من الربا ھو المستعمل الآن فی البنوک والمصارف العالمیۃ (روائع البیان تفسیر آیات احکام ج۱ ص۳۹۲)

مجوزین کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہندوستان دار الحرب ہے اس لئے یہاں سود لینا جائز ہے حالانکہ دار الحرب کی تعریف اور اس کی اقسام کو پیش نظر رکھا جائے تو سود کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا دار الحرب وہ ملک ہے جس میں بلا خوف وخطر احکام کفر جاری ہوں البتہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سابق دار الاسلام کے دار الحرب بننے کے لئے مزید دو شرطوں کا اضافہ کرتے ہیں اول یہ کہ وہ ملک دار الحرب کے متصل ہو جائے درمیان میں کوئی دار الاسلام باقی

نہ رہے دوم یہ کہ اسلامی حکومت کے دئے ہوئے امان پر کوئی مسلمان اور ذمی مامون باقی نہ رہ سکے گویا حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ دارالاسلام بننے کے لئے تو صرف اسلام کی فرمانروائی کو کافی قرار دیا ہے اس کے بالمقابل دارالحرب بننے کے لئے اہلِ کفر کی حکمرانی و عملداری مکمل ہونے کی دو علامتوں کو شرط قرار دے کر کفار کا اقتدار کامل ہونے سے پہلے اس کا اعتبار نہیں کیا اس میں الاسلام یعلو ولا یعلیٰ کا اظہار ہے لیکن امام اعظمؒ کی ان تینوں شرطوں کو ذکر کرکے علامہ شامی نے لکھا ہے واما فی بلاد علیھا ولاۃ الکفر فیجوز للمسلمین اقامۃ الجمع والاعیاد (ردالمحتار ج۳ ص۲۲۲) اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ و عیدین کا قائم ہونا دارالحرب ہونے سے مانع نہیں دورِ حاضر کی لادینی حکومت اور مسلم اقلیت کی جمہوریت میں خواہ آبادی کے تناسب میں مسلمانوں کو نمائندگی دی جائے یا مشترکہ ووٹنگ کے ذریعہ حکومت بنائی جائے ان میں سے ہر صورت کی حکومت لازمی طور پر دارالحرب کا مصداق ہوگی اور ان کے بنائے ہوئے توانین ہی ملک میں نافذ ہوں گے یہ تمہید ذہن نشیں کرکے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کو اس فتوے پر دادِ تحسین دیجئے موصوف تحریر فرماتے ہیں ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کے مکمل تسلط اور اسلامی حکومت کے آثار کالعدم ہو جانے کے بعد ہندوستان کا دارالحرب ہونا جمہور علماء ہند کے نزدیک محقق ہو چکا تھا فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہٗ کا مستقل رسالہ اس موضوع پر شائع ہو چکا ہے اور ظاہر ہے کہ تقسیم ملک کے بعد جو انقلاب آیا اس میں بھی وہ حصہ جو ہندو اکثریت کے اقتدار میں رہا اس کے احکام انگریزی عہد سے کچھ مختلف نہیں ہو سکتے اس لئے موجودہ ہندوستان کا دارالحرب ہونا واضح ہے (اسلام کا نظام اراضی ص۱۸۱) دارالحرب کی حکومت سے امیر المومنین ناجنگ معاہدہ کرلیں تو وہ ملک دارالعہد بن جاتا ہے دارالعہد بننے کے لئے امیر المومنین کا ہونا اور دارالاسلام کا بھی ہونا ضروری ہے اور اس وقت ہندوستان کے مسلمان انتشار کا شکار ہیں اور کوئی با اختیار امیر نہیں لہٰذا ہندوستان دارالعہد نہیں ہو سکتا۔ البتہ تقسیم ملک کے وقت ہندستان کی سکونت اختیار کرنے والے یا پاکستان سے آکر ہندوستان میں آباد ہونے والے مسلمانوں کو قانون ساز اسمبلی نے جو مذہبی آزادی اور دستوری حقوق دئے ہیں ان کی روشنی میں ہندوستان کو دارالامن کہا جا سکتا ہے اس معاہدہ کی پاسداری ہی عدالت کی جانبداری کو توازن سے بدلنے اور مسلم پرسنل لا کی پامالی میں بریک لگانے پر حکومت کو مجبور کرتی ہے اور فرقہ وارانہ فسادات دارالامن ہونے سے مانع نہیں کیونکہ

دستوری حقوق کی بنیاد پر پولیس میں مؤثر مسلم نمائندگی کے ذریعہ پولیس کی درندگی اور اکثریت کی جارحیت کو ختم کیا جاسکتا ہے. لیکن اس کے باوجود سود کی حلت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ حلت ربٰو کی علت مال کا مباح ہونا ہے اور مالِ مباح پر تسلط و استیلاء سے ہی ملکیت مستفاد ہوتی ہے ہدایہ میں ہے ولان مالهم مباح فی دارهم فبای طریق اخذه المسلم اخذ مالا مباحا اذا لم یکن فیه غدر (ہدایہ آخرین ۸۵) اور اصول شریعت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی جان مال مباح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ امیر المومنین کی طرف سے پیش کردہ دعوتِ اسلام کو کفار رد کردیں اور صلح بالجزیہ کی دعوت قبول کرنے سے بھی انکار کردیں اس کے بغیر ان جان مال مباح نہیں ہوں گے اور بطور سود بھی ان کے مال پر قبضہ ناجائز ہوگا.

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب مدظلہ نے اسی حقیقت کو ظاہر فرمایا ہے کہ حرمتِ ربٰو کی آیات مطلق ہیں کسی ملک و زمان کی قید سے مقید نہیں احادیث میں اگر کچھ استثنائی صورتیں ملتی ہیں تو وہ صرف دار الکفر کی بعض صورتوں میں ملتی ہیں مثلاً دار الکفر کا دار الشر والفساد یا دار المحاربہ اور المطلق یجری علی اطلاقہ مسلم ضابطہ ہے (نظام الفتاویٰ ج ۲ ص ۲۵۶) لہٰذا ہندوستان کے حربیوں سے براہِ راست اور بینک کی معرفت ہر صورت میں سود کا لین دین منع ہے. سود کا لینا اور دینا دونوں کا برابر گناہ ہے امام مسلم نے اپنی جامع صحیح میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے اور کھلانے والے اور لکھنے والے اور دونوں گواہوں پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ یہ سب برابر ہیں اس حدیث شریف میں شارعِ اسلام حضور علیہ السلام نے ان کو برابر کے گنہگار قرار دیا ہے لہٰذا فقہاء کرام اور مفتیان ہند نے ایسے معاملات کو بھی ناجائز کہا ہے جن میں مسلمانوں کی طرف سے اہل الحرب کو سود دینا لازم آئے ملاحظہ ہو فتاویٰ رشیدیہ کامل ص ۴۴۳ فتاویٰ محمودیہ ص ۲۹۴-۲۹ ج ۸ فتاویٰ رحیمیہ ص ۱۹۹ ج ۲۔

شریعت نے حاجت اور ضرورت کی اضطراری حالت میں بقدرِ ضرورت حرام چیزوں کے استعمال کی اجازت دی ہے مخمصہ کی حالت اور موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا شخص جو حلال مال کے ذریعہ قوت لایموت بھی حاصل نہ کرسکے اور غیر سودی قرض بھی نہ پاسکے تو فقہاء کرام نے ضرورت کے بقدر سودی قرض لے کر استعمال کرنے کی اس کو اجازت دی ہے (بحوث فی الربا ص ۲۶ فتاویٰ رحیمیہ ص ۱۴۳ ج ۳) اس کے علاوہ فقر و فاقہ کی شدت اور سخت حاجت کے وقت بھی سودی قرض سے کام چلانے کی اجازت دی گئی ہے (بینک انشورنس اور سودی قرضے ص ۱۳۰)

اور علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباہ) یہ شخصی ضرورت کا عارضی حل ہے اجتماعی افلاس سے خلاصی حاصل کرنے کے لئے غیر سودی بنکاری کو جاری کرنا ضروری ہے کیونکہ اسلام کا اقتصادی نظام ہی ہر خاص و عام کو درحقیقت آرام دینے والا ہے اور تمام انسانوں کو خوشحال و فارغ البال بنانے والا ہے جس پر مسلمانوں کا ایک ہزار سالہ اقتدار گواہ ہے اور اب تو سودی بنکاری کی ناکامی اور معاشرہ کی پریشانی کا تجربہ کرنے والے دورِ حاضر کے ترقی یافتہ حیران انسان بھی اسلام کے اس فطری نظام کو اختیار کر رہے ہیں۔ چنانچہ ماضی قریب میں کویت، متحدہ عرب امارات، اردن، سوڈان، پاکستان نے نفع و نقصان میں حصہ داری کے اصول پر بینکوں کو قائم کیا ہے حکومت سعودی عرب اور "بینک ترقیاتی بین الاقوامی" کی حوصلہ افزائی سے ۱۹۷۵ء میں جدہ میں اسلامی ترقیاتی بینک کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ہندوستان میں بلاسودی بینک اور بیت المال قائم کرکے ہی کنگال معاشرہ کو خوشحال بنایا جا سکتا ہے۔ فی الحال ہندوستان میں بعض ترقیاتی منصوبوں اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بینکیں ایسے قرضے دیتی ہیں جن پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی تو وہ معاملے سود کے دائرہ میں شرعًا داخل نہیں ہوں گے مثلاً ممتاز عالم دین حضرت مولانا برہان الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اگر حکومت سے یا کسی ادارہ یا فرد سے نقد رقم کے بجائے آلات (ٹریکٹر وغیرہ) یا آلاتِ صنعت (مشین وغیرہ) یا مکان یا اشیاء خوردنی وغیرہ قرض لی جائیں اور ان کی ادائیگی روپے کی شکل میں ہو (یا کسی اور چیز کے ذریعہ ہو مگر اس جنس کی نہ ہو) خواہ ادائیگی یکمشت ہو یا بالاقساط ہو تو اس طرح کا لین دین جائز ہوگا خواہ نقد قیمت کی ادائیگی کے مقابلہ قرض میں زیادہ قیمت دینی پڑے خواہ حکومت یا ادارہ اس زیادہ کو سود کا نام ہی دے اور حکومت کے رجسٹروں میں وہ اضافہ سود کے نام سے ہی درج کیا جائے تو یہ بھی صورت جائز ہوگی کیونکہ اس میں ربوٰ کی تعریف اور اس کی شرعی حقیقت نہیں پائی جاتی کہ محض نام سے کوئی حکم نہیں لگتا (بینک انشورنس اور سرکاری قرضے ص۱۳۱) اسی طرح انتظامی ضروریات کے لئے قرض پر محکمہ سود کے نام سے جو رقم وصول کرتا ہے اس کے متعلق نظام الفتاویٰ میں ہے کہ اس زائد رقم کو سود کا نام دینا شرعًا ضروری نہ ہوگا بلکہ انتظامی اخراجات کی فیس بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ محکمہ چونکہ مسلم نہیں اس لئے وہ شرعی اصطلاحی الفاظ بولنے کا نہ تو پابند ہے اور نہ اس کا پابند کہا جا سکتا ہے۔ مزید ایک اور مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ بیعہ

بسا اوقات محکمہ اپنے دیئے ہوئے سرمایہ پر کچھ چھوٹ بھی دیتا ہے مثلاً مجموعی دینگی محکمہ کی پچاس ہزار ہے مگر وہ پانچ ہزار کی چھوٹ اور معافی دے کر صرف پینتالیس ہزار قرار دے کر اسی میں قسطیں اور سود سب متعین کرتا ہے اس صورت میں اگر کل ادائیگی مع سود کے محکمہ کی کل دینگی مجموعہ کے اندر رہے تو سود کا نہ ہونا بالکل ظاہر اور یقینی ہوگا (نظام الفتاوی ص۲۶۳ ج ۲)

بینک سرکاری ہو یا پرائیویٹ اور اندرون ملک تجارت کرنے پر سود لیا جارہا ہو یا غیر ممالک سے درآمد برآمد پر سود لازم کیا گیا ہو یہ سودی معاملہ بہرحال حرام ہے اگر ضرورت و حاجت کی حالت ہو تو شرعاً اجازت ہے ورنہ دل میں سخت نفرت اور بچنے کی تدبیر و سعی کے ساتھ بینکوں کو سود دے کر توبہ واستغفار کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں سرکاری و غیر سرکاری ہر قسم کے بینکوں میں رقم رکھنا اعانت علی المعصیت ہے ناواقفیت یا حفاظت سے قاصر ہونے یا قانونی مجبوری کی بنا پر اگر بینک میں رقم جمع کرنا پڑے تو اس کا سود بینک میں چھوڑنا جائز نہیں ورنہ اسلام کے خلاف استعمال کیا جائے گا اس کو بینک سے حاصل کرکے بغیر نیت ثواب صرف اپنے اوپر سے وبال ٹالنے کے لئے کسی غریب نادار کو دے دینا اولیٰ ہے رفاہِ عام کے کام میں لگانے اور حکومت کے غیر شرعی ٹیکسوں کو بھی اس سے چکانے کی اجازت ہے۔ عالمگیری میں ہے وما اوجف المسلمون علیہ من اموال اهل الحرب بغير قتال تصرف فى مصالح المسلمين (فتاویٰ عالمگیری ص۲۳۲ ج ۲) (فتاویٰ رحیمیہ ص۲۶۳)

واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب

مباحثات

کاروائی
دوسرا فقہی سیمینار منعقدہ ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء
بمقام ہمدرد نگر۔ نئی دہلی

پہلی نشست ۸ دسمبر ۴ ½ بجے شام ، زیرِ صدارت: مولانا محمد رفیع عثمانی پاکستان

سب سے پہلے قاری بشیر احمد راشد الامینی نے سورہ فاتحہ کی تلاوت کی۔ اس کے بعد حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام القاسمی نے کاروائی کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا: "اس دوسرے فقہی سیمینار کے مبارک موقع پر آپ سب حضرات کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ ملک کے مختلف اور دور دراز حصوں سے علما، فقہا اور دانشوروں کا یہاں تشریف لانا میرے لئے بیحد باعثِ مسرت ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت ہمارے درمیان ایک ایسی بزرگ اور قابل احترام شخصیت بھی موجود ہے، جس کے سماجی، ملی، علمی اور دینی خدمات سے آپ سب بہ خوبی آشنا ہیں اور جن کی محنت کا ایک ثمرہ یہ سیمینار ہال بھی ہے، جس میں ہم اور آپ بیٹھ کر اس فقہی سیمینار کا آغاز کر رہے ہیں۔ میری مراد جناب حکیم عبدالحمید صاحب سے ہے۔ میری گزارش ہے کہ حکیم صاحب یہاں ڈائس پر تشریف لائیں۔

غیر منقسم ہندوستان کی علمی اور فقہی تاریخ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو اس عہد میں تفقہ اور جدید مسائل سے واقفیت کے لحاظ سے ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ حضرت کو دارالعلوم دیوبند کے مفتی اور پھر پاکستان کے مفتی اعظم کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل رہی ہے۔ حضرت کا علم و تفقہ اُن کے فرزندوں میں منتقل ہوا، جنھوں نے اس علمی اور فقہی روایت کو برقرار رکھا۔ حضرت کے ان لائق فرزندوں میں سے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب ہماری دعوت کے باوجود بعض وجوہ سے یہاں تشریف نہ لاسکے، جس کا ہمیں افسوس ہے۔ لیکن دوسری طرف ہمارے

لئے یہ نہایت مسرت بخش امر ہے کہ حضرت کے دوسرے صاحب زادے اور مشہور عالم وفقیہ حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ ہماری دعوت پر تشریف لائے اور ہمارے درمیان رونق افروز ہیں۔

علم، تحقیق اور تفقہ کے لحاظ سے ایک اور ممتاز اور عظیم شخصیت ڈاکٹر جمال الدین عطیہ بھی ہمارے درمیان رونق افروز ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اصولِ فقہ کے زبردست عالم اور مشہور فقہی اور تحقیقی عربی مجلہ "المسلم المعاصر" کے چیف ایڈیٹر ہیں اور آپ کی تصنیفات میں "التنظیر الفقهی" کو خاص شہرت حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہو کہ ڈاکٹر صاحب نے ان علمی خدمات کے ذریعے ان علوم کو جنھیں جدید علوم کہا جاتا ہے، کلمہ پڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کے لئے نہایت سہل اور واضح ترین اسلوب اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے فقہ کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے اور اسلاف کے علمی اور فقہی کارناموں کو آثارِ قدیمہ سمجھنے یا سمجھانے کے بجائے زندگی کے واقعات و حوادث سے مربوط دکھانے کا خوش گوار فریضہ انجام دیا ہے۔ اور یہ خوشی کی بات ہے کہ یہ کام مختلف جگہوں پر مختلف انداز سے انجام پا رہا ہے۔"

ان ابتدائی کلمات کے بعد قاضی صاحب نے ڈاکٹر منظور عالم، چیرمین انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز کو خطبۂ استقبالیہ پیش کرنے کے لئے دعوت دی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کہتے ہوئے اپنا مطبوعہ خطبہ پیش کیا کہ اس میں جن حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور جن سے آج ملت دوچار ہے، اُمید کہ آپ حضرات انھیں سمجھ کر ملت کو ان سے نکالنے کی کامیاب سعی کریں گے۔

ڈاکٹر منظور عالم صاحب کے خطبۂ استقبالیہ کے بعد اسلامک فقہ اکیڈمی کے جنرل سکریٹری حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی نے عرضِ داعی کے عنوان سے بہ حیثیت داعی مطبوعہ تحریر کی شکل میں چند معروضات پیش کیں۔

قاضی صاحب کے بعد مہمانِ خصوصی جناب ڈاکٹر جمال الدین عطیہ قاہرہ نے عربی میں اپنا بصیرت افروز کلیدی خطبہ پیش کیا جس میں فقہ، اصولِ فقہ اور اجتہاد پر گفتگو کرتے ہوئے اس پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا کہ علماء اور فقہا کو نئے دور کے نئے حالات و انقلابات کو سمجھنے اور پھر اُن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ملت کے نئے پیش آمدہ مسائل و مشکلات کا صحیح اسلامی حل نکالنے میں کسی طرح غفلت یا بے اعتنائی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ بہ صورتِ دیگر، تغیراتِ زمانہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے دینی اور دین بیزاری کی ذمے داری کسی نہ کسی حد تک علماء اور فقہا پر بھی عائد ہوگی۔

ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کا یہ پُرمغز اور فکر انگیز مقالہ قریباً سوا پانچ بجے تک جاری رہا جس کے بعد نمازِ مغرب کی ادائیگی کے لئے اجلاس موقوف کر دیا گیا۔ نمازِ مغرب اور چائے کے وقفے کے بعد اجلاس پھر شروع ہوا اور داعیٔ سمینار قاضی مجاہد الاسلام صاحب نے صدرِ جلسہ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب پاکستان کو دعوت دی کہ وہ اپنے صدارتی خطاب سے نوازیں اور کہا کہ حضرت کا یہ صدارتی خطبہ اس اختتامی اجلاس کا آخری پروگرام ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے اپنے مفید اور نہایت قیمتی اور بصیرت افروز صدارتی خطاب میں فرمایا کہ ہندوستان میں اسلامک فقہ اکیڈمی کا قیام نہ صرف اُن ممالک کے لئے ایک قابلِ تقلید قدم ہے، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، بلکہ یہ ادارہ اسلامی ممالک اور خود پاکستان کے لئے بھی انشاء اللہ مشعلِ راہ ہوگا۔ آپ نے کہا کہ زندگی کے مختلف میدانوں میں جس قدر اور جتنی تیزی سے انقلابات آرہے ہیں، اُن کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اب اجتہادِ مطلق کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ آپ نے اجتماعی اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ کام کبھی بند نہیں ہوا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم بلکہ صحابہ کے زمانے سے ماضی قریب تک اجتماعی اجتہاد کا یہ عمل مختلف صورتوں میں مسلسل انجام پاتا رہا ہے۔ اور آج بھی اس کے ذریعے ہم نئے مسائل و مشکلات کا حل نکال سکتے ہیں۔ آپنے کہا کہ اجتماعی اجتہاد کا کام پاکستان میں بھی چل رہا ہے اور یہ ضروری ہے ہندوستان اور پاکستان میں اس میدان میں کام کرنے والوں کے درمیان ربط برقرار رہے اور ایک دوسرے کے علم و تحقیق سے استفادے کا سلسلہ جاری رہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ کے صدارتی خطاب کے بعد اُنہی کی دعا پر سمینار کا یہ اختتامی اجلاس شب کے تقریباً ۸ بجے اختتام پذیر ہوا۔

پہلی نشست : ۹ دسمبر ۸۹ء، ۹ بجے صبح

زیرِ صدارت : مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند

پہلی نشست کا آغاز مولانا ظفیر احمد صاحب کی تلاوت سے ہوا جنھوں نے پارہ ۳ رکوع ۶ کی آیات (الذین یأکلون الربوا) کی تلاوت کی۔ اس کے بعد قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی نے پہلی نشست کے پروگراموں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں پہلے زیرِ بحث موضوع سے متعلق چند مقالات اور بعض مقالات کے خلاصے پیش کئے جائیں گے اور پھر ان پر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوگا۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے جناب شمس پیرزادہ صاحب کو اپنا مقالہ

پیش کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ شمس پیرزادہ صاحب نے اپنا مقالہ پیش کیا جس میں سرکاری قوانین اور فقہی نقطے سے ہمہ جہت جائزہ لیا گیا تھا۔

اس کے بعد قاضی صاحب نے فرمایا! جناب شمس پیرزادہ صاحب نے بہت اچھا مقالہ سُنایا اور تجویز بھی پیش کی لیکن مشکل یہ ہے کہ اب تو معاشرے میں مردوں کا مہر مقرر رہتا ہے اور وہ بھی اُدھار نہیں بلکہ نقد اور نقد بھی نہیں بلکہ پیشگی، اس لئے عورتیں کس طرح سونا چاندی سے اپنے مہر کا معاملہ کر سکیں گی!

پھر قاضی صاحب نے ڈاکٹر عبدالحسیب کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ کے ایڈوائزر ہیں۔ اس سے پہلے آپ ریزروبینک آف انڈیا کے ایگزیکیٹیو ڈائرکٹر رہ چکے ہیں، سینٹرل بینک عراق اور ریزرو بینک یمنی کے بھی ایڈوائزر ہیں۔ اس طرح کے موضوعات پر کئی کتابیں اور مقالات لکھ چکے ہیں۔ آپ کی شخصیت بے حد اہم ہے۔ اور آپ کی تشریف آوری پر ہمیں بے انتہا مسرت ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کے خطاب سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوگا۔

تعارف کے بعد ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب نے اپنے معلوماتی خطاب میں فرمایا کہ میرے ذہن میں اب تک یہ امر صاف نہیں کہ کرنسی سے متعلق جو مسئلے پیدا ہوتے ہیں، اُن پر کس نقطۂ نظر سے بحث ہوگی۔ ہندوستان میں اس وقت چالیس ہزار کروڑ سے زیادہ کرنسیاں ہیں، جن میں تمام چھوٹے بڑے کرنسی نوٹ شامل ہیں۔ کرنسی، ہندوستان میں Money کا بہت چھوٹا سا حصہ ہے۔ منی Money وہ چیز ہے جو ہر قسم کے تبادلوں کا ذریعہ بن سکے۔ کرنسی بھی منی ہے اور بینک کے ڈپازٹس 'Deposits' بھی منی ہیں۔ کرنسی سے بھی زیادہ اہم اصلاً ہندوستان اور دوسرے ممالک میں ڈپازٹس ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہی موضوع بحث ہونا چاہیے۔

کرنسی میں بظاہر سود معلوم نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں اس کے اجرا کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ دنیا میں کسی زمانے میں کرنسی کے اجرا کے لئے اس کے مساوی سونا ہونا ضروری تھا۔ لیکن یہ سلسلہ ۱۹۲۲ء میں ختم ہوگیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ سونے اور کرنسی میں سو فیصدی کا تعلق تو تھا لیکن کاروبار کے لئے اس کا استعمال مشکل بلکہ بسا اوقات محال سا ہوگیا تھا۔ کیونکہ کرنسی کی ضرورت کسی ملک کو اپنی ضروریات اور ترقی کے لئے ہوتی ہے۔ کرنسی سے زیادہ منی کی ضرورت ہے۔ سونا کے بعد ڈالر معیار بنا، لیکن ۱۹۷۳ء میں یہ بھی ختم ہوگیا۔

ہندوستان کی موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں چالیس پینتالیس ہزار کروڑ کی کرنسی ہے اور اس کے مقابلے میں صرف ایک سو پندرہ کروڑ سونا ہے۔ کسی حد تک یہ صحیح ہے کہ کرنسی اور سونے کا تعلق اگر باقی رہتا

توسونے کی قیمت اتنی نہ بڑھتی جتنی آج بڑھ گئی ہے۔ کرنسی money کا صرف ایک حصہ ہے۔ ریزرو بینک آج دس گرام سونے کا دام باسٹھ روپے لگاتا ہے، اس بینک کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اسے قانوناً یہ حق نہیں ہے کہ وہ حکومت کو قرض دینے سے انکار کردے۔ حکومت اگر قرض طلب کرے اور سونا نہ بھی ہو، تب بھی اسے کرنسی جاری کرنا پڑتا ہے۔ کرنسی کے اجراء کے پیچھے روز اوّل سے ہی سود ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اگر منی اور کرنسی کا تقابل کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت یہاں کرنسی محض ۳۰/۳۵ فیصد ہے۔ ہندوستان میں ہم ہر موقع پر سود استعمال کرتے ہیں اور اس کے بغیر ہم جی بھی نہیں سکتے۔ اور قانوناً ہم اس کی خلاف ورزی نہیں کرسکتے۔

قاضی صاحب: ڈاکٹر صاحب! آپ نے منی اور کرنسی دو لفظ استعمال کئے۔ تو سوال یہ ہے کہ Money کی ٹیکنیکل پوزیشن کیا ہے؟ یا بالفاظ دیگر کرنسی اور Money میں کیا فرق ہے؟

ڈاکٹر عبدالحسیب: Money اصطلاحاً اس چیز کو کہتے ہیں جو ذریعہ تبادلہ بن سکے۔ اور اس کی ایک قسم کرنسی بھی ہے Money کی بنیادی طور پر تین خصوصیات ہوتی ہیں: ایک یہ کہ وہ ذریعہ تبادلہ ہے، دوسرے وہ Store of value یعنی مخزن یا قابل ذخار ہے اور تیسرے وہ بین الاقوامی ذریعہ تبادلہ ہے۔

عبدالاحد ازہری: ڈاکٹر صاحب! میں یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ ابھی آپ نے کہا کہ کرنسی کا تعلق سونا سے تقریباً ختم ہوگیا ہے، تو اس صورت میں ایک ملک کی کرنسی کا دوسرے ملک کی کرنسی سے کس بنیاد پر تبادلہ ہوتا ہے؟

ڈاکٹر عبدالحسیب: تبادلہ دراصل کرنسی کی قوت خرید کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اور چونکہ ڈالر کا ویلیو اور اس کا Purchasing Power یعنی قوت خرید آپ کے ہندوستانی روپے سے زیادہ ہے، اس لئے ہندوستانی روپے کے مقابلے میں ڈالر کا ریٹ زیادہ ملتا ہے اسے یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ کسی بھی کرنسی کے ویلیو کے زیادہ ہونے کی وجہ یا تو یہ ہوتی کہ اس کی قوت خرید اور Purchasing Power زیادہ ہوتی ہے، یا لوگ سمجھتے ہیں کہ آئندہ ایسا ہوگا یا یہ کہ اس کا سرکولیشن زیادہ ہوتا ہے۔

مولانا اعجاز الاسلام صاحب: میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ سونے کی قیمت جو گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، تو وہ کس طرح اور کیوں، اور کیا اسباب ہوتے ہیں۔

قاضی صاحب : ابھی جو ڈاکٹر صاحب نے ایک سوال کے جواب میں یہ وضاحت کی کرنسی نوٹ کی کرنسی کی قیمت میں اضافے یا کمی کی تین وجوہات ہیں اور پھر ان کی تفصیل بیان کی تو کیا یہ جواب کافی نہیں ہے؟

مولانا معاذ الاسلام صاحب: جی ہاں کافی ہے۔

مفتی انور علی صاحب : ڈاکٹر صاحب سے اس کی وضاحت چاہوں گا کہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۸۹ء کے ایک نوٹ میں کیا فرق ہے؟

عبدالحسیب صاحب : اس سلسلے میں کوئی تفصیلی اعداد و شمار تو فی الوقت پیش نہیں کر سکتا، لیکن فرق کا ایک اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں ایک روپے کی جو قوت خرید تھی وہ اب ۱۹۸۹ء میں صرف ۱۲ پیسے کی ہو کر رہ گئی ہے۔

مفتی انور علی صاحب: میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس فرق کا لین دین پر کیا اثر پڑے گا؟ یعنی ۱۹۶۵ء کا اگر بقیہ کسی پر ہو تو ۱۹۸۹ء میں اس کی ادائیگی کی کیا شکل ہوگی؟

قاضی صاحب : آپ سرکاری قانون پوچھ رہے ہیں یا شرعی نقطہ نظر جاننا چاہتے ہیں؟

مفتی انور علی صاحب: قانون جاننا چاہتا ہوں۔

قاضی صاحب : قانون تو ایسا ہی ہے اور شرعی نقطہ نظر آپ بتائیں گے۔

مولانا مصطفےٰ مفتاحی : میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کرنسی کے پیچھے ابتداءً ہی سود کس طرح ہو جاتا ہے؟

قاضی صاحب : ڈاکٹر صاحب نے جو تفصیل بیان کی وہ شاید آپ کے ذہن میں ہوگی۔ انھوں نے فرمایا کہ ابتداءً سرکار بینک سے قرض لیتی ہے اور پھر اس قرض پر بینک کو سود ادا کرتی ہے۔ اس طرح کرنسی کی ابتدا ہی سے اس میں سود شامل ہو جاتا ہے۔

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی : جس طرح پچھلے زمانے میں سونے اور چاندی کی کرنسیاں رائج تھیں۔ اسی طرح آج بھی اگر سونے اور چاندی کی کرنسی رائج رہتی تو کیا پھر بھی قیمتوں میں اضافہ یا کمی کا عمل جاری رہتا؟

ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب : پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر آج صرف سونے اور چاندی کے سکے رہتے اور یہ کاغذی نوٹ اور کرنسیاں نہ ہوتیں تب بھی ان کی قیمتوں میں کمی اور اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کا رجحان ختم نہ ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ قیمتوں میں اضافے کی وہ شرح نہ رہتی جو کرنسیوں کی صورت میں اب

موجود ہے تاہم بالکلیہ قیمتوں میں اضافے کا رجحان ختم نہ ہوتا اور سونے اور چاندی کے سکوں کی صورت میں بھی جاری رہتا کیونکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا اضافے کے اور بہت سے اسباب ہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ اگر سونے اور چاندی کے سکے رہتے تو آج ترقی ممکن نہیں تھی جواب دنیا میں نظر آرہی ہے کیونکہ اس صورت میں ایک حد تک قیمتوں میں اضافہ تو رک جاتا مگر Authorities کے ہاتھ بھی بندھ جاتے اور نتیجتاً تمام ترقیاتی پروگرام متاثر ہوتے۔

قاضی صاحب: اس کی فقہی زبان میں وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ کرنسیوں کا سونے اور چاندی سے مربوط نہ ہونا قیمتوں میں اضافے کے متعدد اسباب میں سے ایک سبب ہے اور صرف کسی ایک سبب کے نہ پائے جانے کی وجہ سے مسبّب کا نہ پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ اس لئے اگر سونے اور چاندی کا سکہ ہوتا، تب بھی قیمتوں میں اضافے کا رجحان جاری رہتا ــــ جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے، جو شمس پیرزادہ صاحب نے اپنے مقالے میں پیش کیا اور جس میں بتایا گیا کہ اس اضافے کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے دیت کی مقدار میں اضافہ کردیا تھا۔

مولانا برہان الدین سنبھلی: بین الاقوامی قرضوں کی کیا صورت ہوتی ہے اور ان میں کیا معیار ملحوظ رکھا جاتا ہے؟

ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب: بین الاقوامی قرضوں کی معاہدے کی نوعیتوں کے اختلاف کے مطابق مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اور ان کے معیار بھی مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ ہر ملک اپنی صواب دید کے مطابق معاہدہ کرتا ہے کہ کس کرنسی میں وہ قرض کے لین دین کا معاملہ کرے گا اور اسی کے مطابق قرض کی صورت اور اُس کے معیار کا تعین ہوتا ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی: ریزرو بینک آف انڈیا اور گورنمنٹ کے درمیان کیا تعلق ہے۔؟

ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب: ریزرو بینک آف انڈیا ایک خودمختار ادارہ ہے مگر اس کے کچھ اختیارات حکومت کے تابع ہے حکومت قرض لینا چاہے تو یہ بینک انکار نہیں کرسکتا۔ چاہے اس کے پاس سونا چاندی نہ ہو۔ اسے ہر حالت میں نوٹ چھاپ کر دینا ہوگا۔

نسیم احمد غلفر پوری: کیا وعدہ کے مطابق حکومت نوٹ کے بدلے میں سونا چاندی دے گی؟

ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب: جی ہاں! دس روپے لیکر آپ جائیں گے تو دس روپے کا دوسرا نوٹ دیدیگی۔

اسرارعالم صاحب : حکومت کے اقتصادی اقدامات کا روپیہ کی قیمت پر کیا اثر مرتب ہوگا ؟

ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب : ریونیو بجٹ سے حکومت کو آمدنی ہوتی ہے اور تنخواہ، دفاع وغیرہ پر خرچ ہوتی ہے، خرچ زیادہ ہے۔ اور آمدنی کم ہے۔ مجبوراً حکومت قرض لیتی ہے، پھر ظاہر ہے کہ اس کا اثر قیمت پر پڑتا ہے۔

مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری : روپے کی قیمت اس وقت ۱۲ پیسے کیسے ہے ؟ کمی کا نقطۂ آغاز کیا ہے ؟

قاضی صاحب : یہ ایک تناسب ہے، کسی وقت ایک روپے کی جو چیز ملتی تھی اب اتنی نہیں ملتی۔

ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب : یہ کہنا مشکل ہے کہ روپے کی قیمت میں کمی کب شروع ہوئی۔ مختلف جنگوں اور دیگر اسباب سے اخراجات زیادہ ہونے لگے جس کی وجہ سے کمی ہونی شروع ہوگئی۔

ہندوستان میں طے کیا گیا ہے کہ محض زراعت ترقی کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ انڈسٹری وغیرہ بنانی چاہیے کہ اس سے ترقی زیادہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس سے اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔

مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری : تو کیا سونا معیار نہیں رہا ؟

ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب : گولڈ اور منی کا تعلق دھیان میں رکھئے۔ جب جب ضرورت پڑتی ہے اور سونا کافی نہیں ہوتا ہے تب تب قیمت بڑھنے لگتی ہے۔

مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری : سوال یہ ہے کہ کیا پورے ملک میں ایک سو پندرہ کروڑ ہی سونا ہے ؟

ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب : نہیں، یہ صرف ریزرو بینک کے پاس جمع شدہ سونے کا تذکرہ ہوا۔ ورنہ پورے ملک میں اس سے زیادہ ہے۔ فرانس میں ہندوستان سے بھی زیادہ ہے۔

اس کے بعد مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی صدر مدرس دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد نے نوٹ کی شرعی حیثیت سے اپنا مقالہ سنایا۔ مقالہ چونکہ طویل تھا۔ اس لئے مقالہ کے ضروری حصے کے سنانے پر اکتفار کیا۔ پھر مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نے اپنا مقالہ سنایا۔ اس کے بعد جناب مولانا خلیل الرحمن صاحب اعظمی عمری، مولانا جمیل احمد نذیری مبارکپور مفتی محمد زید صاحب باندہ اور مولانا عبداللہ طارق صاحب دہلی نے بالترتیب اپنا اپنا مقالہ سنایا۔ حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب بجنوری نے اپنا مقالہ لکھکر بھیج دیا تھا۔ لیکن جب ان کو مقالہ سنانے کی دعوت دی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ ”ہم نے جو کچھ لکھا تھا ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب کے بیان کردہ معلومات کے مطابق اس میں کچھ تبدیلی ہوگئی ہے۔ تبدیلی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب

کے قول کے مطابق موجودہ نوٹ سے ہم بازار سے کوئی چیز خرید تو سکتے ہیں لیکن اس کے عوض گورنمنٹ سے مال نہیں لے سکتے۔ گورنمنٹ کے نزدیک نوٹ نوٹ ہی ہے۔ جبکہ عرف عام کے اعتبار سے نوٹ ایک مال ہو گیا ہے۔ انہی دو نکتوں پر نوٹ کی شرعی حیثیت پر غور کرنا چاہیے۔ میرے نقطۂ نظر میں تبدیلی ہو گئی ہے۔ میں اس پر پھر غور کروں گا۔ اس لئے میرا مقالہ سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنا مقالہ نہیں سنایا۔

مفتی عزیز الرحمن صاحب بجنوری کے بعد مفتی عبد الرحمن صاحب مدرسہ امینیہ دلی کو مقالہ سنانے کی دعوت دی گئی لیکن انہوں نے بھی یہ کہہ کر مقالہ نہیں سنایا کہ ڈاکٹر عبد الحبیب صاحب کی وضاحت کے بعد میرے خیال میں تغیر ہو گیا ہے۔ اب از سر نو غور کرنا ہوگا۔ مقالہ سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر اس کے بعد مفتی انور علی صاحب مئو، مولانا انیس الرحمن صاحب قاسمی، معاون قاضی امارت شرعیہ پٹنہ مولانا عتیق احمد بستوی، ندوہ لکھنؤ، مفتی حبیب الرحمن صاحب خیرآبادی، دار العلوم دیوبند اور مولانا زبیر احمد قاسمی شیخ الحدیث سبیل اسلام، حیدر آباد نے اپنا اپنا مقالہ سنایا۔ اس طرح یہ اجلاس ۱۲½ بجے دن میں بحسن و خوبی اختتام کو پہنچا۔

دوسری نشست ۹ر دسمبر ۱۹۸۹ء ۴ بجے شام

قاضی صاحب نے اجلاس کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:۔

آپ حضرات نے نوٹ کے مسئلہ پر صبح سے بہت اچھے مقالات سنے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ بعض اور مقالات پڑھے نہ جا سکے۔ کل سے آج تک متعدد فضلاء نے یہ بات کہی ہے کہ جو مسائل عہد نبوت میں، عہد صحابہ میں یا اس سے قریب ترین زمانے میں پیدا نہ ہوئے تھے۔ انہیں حل کرنا علماء کی ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ صحابہ کے زمانہ میں یا تابعین کے زمانہ میں جو مسائل پیدا ہوئے۔ اور انہیں حل نہ کیا جا سکا۔ تو لوگوں نے لا ادری کہا۔ لیکن اس کے ناقابل حل ہونے کا کسی نے عذر نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ نصوص محدود اور مسائل لامحدود ہیں۔ اس لحاظ سے کتاب و سنت کی روشنی میں ان کا حل کرنا ضروری ہے مسائل میں نظری اور فکری اختلاف علماء کے درمیان کوئی عیب نہیں ہے۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ دہلوی نے عقد الجید میں لکھا ہے کہ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک مخطوطہ کے کسی موشدہ لفظ کے بارے میں اس کے سیاق و سباق کی روشنی میں کوئی شخص کوئی لفظ بتاتا ہے، اور دوسرا کچھ اور۔

بہر حال میں ڈاکٹر عبد الحبیب صاحب کو زحمت دینا چاہتا ہوں کہ وہ چند مزید سوالات کی

وضاحت فرمائیں۔ سوالات ان کو میں نے دیدئے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب : پہلا سوال یہ ہے کہ قیمت اور قدر کیا ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں آپس میں متضاد ہیں۔ قیمت بڑھتی ہے تو قدر کم ہوجاتی ہے اور قدر بڑھتی ہے تو قیمت کم ہوجاتی ہے۔ قیمت سے مراد عمومی قیمتوں کی سطح ہے اور قدر سے مراد نوٹ کی اپنی مالیت ہے۔ قیمتوں میں اضافہ تھوک بازار کے حساب سے ہوتا ہے۔

دوسرا سوال : یہ ہے کہ گولڈ اسٹینڈرڈ اور سلور اسٹینڈرڈ ہو تو کرنسی کس طرح جاری ہوگی اور موجودہ سسٹم میں کرنسی کس طرح جاری ہوگی۔

جواب میں سب سے پہلے یہ سمجھئے کہ خواہ گولڈ اسٹینڈرڈ ہو یا چاندی اسٹینڈرڈ ہو یا دونوں کو ملا کر ہو یا کوئی اور دھات ہو سب کا مقصد ایک ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کے مختلف ایکسچینج کے درمیان مشابہت پیدا ہوجائے۔ فرق زیادہ نہ رہے۔ مختلف ملکوں کے ایکسچینج کی قیمتیں فکسڈ ہوجائیں۔ جب قیمتیں زیادہ ہوتی ہیں تو سونا باہر جانے لگتا ہے اور جب کم ہونے لگتی ہیں تو باہر سے ملک میں آنے لگتا ہے اسی وجہ سے گولڈ اسٹینڈرڈ سب سے زیادہ اس وقت گرتا ہے جب جنگ ہوتی ہے۔

سونا اور چاندی دونوں ملا کر معیار ہو تو نقصان ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں لوگ اس چیز کو لیتے ہیں جس میں ان کا فائدہ ہو۔ جنگ عظیم اوّل کے وقت اس کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ ناکام رہی۔ دنیا میں اس وقت دونوں ملا کر معیار نہیں ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ کرنسی کس طرح جاری ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کرنسی جاری کرنے میں سونا چاندی ڈپازٹ ہونا ضروری نہیں ہے۔ حکومت کو جب ضرورت ہوتی ہے تو ریزرو بینک نوٹ جاری کردیتا ہے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ منی کس طرح کم اور زیادہ ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے تین عامل ہیں۔

(۱) ایک عامل تو یہ ہے کہ گورنمنٹ اپنی ضرورت پر نوٹ طبع کراتی ہے۔

(۲) دوسرا عامل اکسپورٹ کا زیادہ ہونا ہے۔ اکسپورٹ زیادہ ہوتا ہے تو سپلائی بڑھتی ہے

اور امپورٹ سپلائی کم ہوتی ہے اور جب امپورٹ سپلائی کم ہوتی ہے تو منی کم ہو جاتی ہے۔

(۳) تیسرا عامل بینکوں سے دئے جانے والے قرضے ہیں۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ کرنسی کی قیمت کم یا زیادہ ہو تو کیا کیا جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا ایک طریقہ تو سُود ہے۔ ریزرو بینک سے جس شرح سود پر قرض لیتے ہیں تو وہ شرح بنیادی ہوتی ہے۔ قیمت جب بڑھنے لگتی ہے تو ریزرو بینک شرح سود بڑھا دیتا ہے جب شرح سود بڑھتی ہے تو مانگ کم ہوتی ہے تو قیمت کم ہونے لگتی ہے۔

چھٹا سوال یہ ہے کہ کرنسی کا اندرون ملک اور بیرون ملک کیا اثر ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ڈالر کے مقابلہ میں روپے کی قیمت کم ہوتی جارہی ہے جرمن میں ۱½ فیصد سالانہ بڑھ رہا ہے۔ جاپان میں صفر ہے۔

سانواں سوال یہ ہے کہ ورلڈ بینک کا کیا اثر پڑتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ورلڈ بینک کا اثر طویل المدت بھی ہوتا ہے اور قلیل المدت بھی۔ انٹرنیشنل بینک (اور میرا خیال ہے کہ ورلڈ بینک کے بجائے انٹرنیشنل بینک کہنا چاہیے) جب قرض دیتا ہے تو کبھی شارٹ ٹرم پر دیتا ہے۔ یہ بے روزگاری کے بڑھنے کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی لانگ ٹرم پر دیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ترقیات ہوتی ہیں۔

آٹھواں سوال یہ ہے کہ نیشنل انکم اور منی سپلائی کیا ہے۔؟

جواب یہ ہے کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ گرچہ ان میں ایک طرح تعلق بھی ہے؟

نواں سوال یہ ہے کہ منی میں کس طرح تبدیلی آتی ہے؟

جواب یہ ہے کہ منی میں تبدیلی گورنمنٹ کی پالیسیوں سے بھی آتی ہے۔ اور بینک ریٹ سے بھی۔ ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب کے بعد ڈاکٹر جمال الدین عطیہ صاحب قاہرہ نے عربی زبان میں مفصل تقریر فرمائی۔ (جو افسوس ہے کہ نقل نہیں کی جاسکی)

تیسری نشست ۹ دسمبر بعد نماز مغرب

زیر صدارت مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

نشست کا آغاز فرماتے ہوئے قاضی صاحب نے کہا کہ ماہرین معاشیات کے بیانات کے مطابق نوٹ شروع میں سند کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب اس کی حیثیت ثمن کی ہو گئی ہے۔ اور ثمنیت بھی حکومت کی اجازت پر منحصر ہے۔ اجازت کے بعد کاغذ کا محض ایک پرزہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ بھیجے گئے سوالات کے مطابق آپ حضرات مختصر گفتگو کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔

ڈاکٹر فضل الرحمن گنوری : کرنسی نوٹ کو اگر نقد کی حیثیت دیدی جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اگر اس کو اشاریہ سے وابستہ کر دیا جائے تو اس کی وجہ سے جہالت مفضی الی النزاع پیدا ہوگی۔ کیونکہ اس صورت میں قرضدار اور قرض خواہ دونوں کو معلوم نہ ہوسکے گا کہ وہ کیا لین دین کر رہے ہیں دیون مؤخرہ کی ادائیگی بھی اگر اشاریہ سے مربوط ہو تو یہی جہالت وہاں بھی فساد برپا کرے گی مہر کے معاملہ میں یہ آسانی کیا جاسکتا ہے کہ روپے کے بجائے سونے اور چاندی سے مقرر کیا جائے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ آج کل جو ننانوے فیصد کریڈٹ پر کاروبار ہوتا ہے تو اس کی ادائیگی کی کیا شکل ہوگی۔ اشاریہ سے مربوط کرنا میرے نزدیک گویا ربا کا دروازہ کھول دینا ہوگا۔ زکوۃ کی ادائیگی بھی مشکل ہوگی، مان لیجئے ۱½ لاکھ کی قیمت گھٹ کر ایک لاکھ رہ گئی تو زکوۃ کی ادائیگی کس رقم پر ہوگی؟

جناب عبیداللہ صاحب کوثی : میرا خیال ہے کہ نوٹ کو ثمن اصطلاحی قرار دینا چاہیے۔ گرچہ ڈاکٹر جمال الدین عطیہ اور ڈاکٹر عبدالحسیب کے مطابق نوٹوں کا سونے اور چاندی سے تعلق نہ رہا۔ تاہم یہ معاملہ گورنمنٹ کا ہے۔ ویسے اصلا قرآن میں ذہب و فضہ کو ہی ثمن کہا گیا ہے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب نے بھی اسے ثمن اصطلاحی کہا ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی : نہیں۔ بلکہ مال متقوم کہا ہے۔ میرے پاس ان کی کتاب موجود ہے۔

جناب عبیداللہ صاحب کوثی : انہوں نے متاع کہا ہے۔ اور متاع بھی متقوم ——— اور متاع متقوم ثمن اصطلاحی بن سکتا ہے۔

قاضی صاحب : آپ نے سہ ماہی بحث و نظر کے شمارہ نمبر ۳ کا مضمون پڑھکر سنایا، جس پر مولانا احمد رضا خان صاحب کی کتاب کا اقتباس درج تھا۔

مولانا عتیق احمد صاحب بستوی : کیا مولانا احمد رضا خاں کے قول کے مطابق کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے۔

مولانا عبید اللہ صاحب کوثی : جائز ہے۔

مفتی نسیم احمد صاحب مظفر پوری : بعض اکابر کے نزدیک نوٹ سند ہے اور بعض کے نزدیک ثمن عرفی ہے' مقالات سے اب تو ظاہر ہے کہ تمام مفتیان متفق ہیں کہ ثمن عرفی اور اصطلاحی ہے۔
جب نوٹ کو ثمن مان لیا گیا تو سونا چاندی سے معاملہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سونا چاندی کو معیار بنا کر اس کی مالیت کے بقدر ادائے گی کرنا عدل کے خلاف ہوگا البتہ اگر ابتداءً ہی چاندی سونا طے کر لیا جائے تو درست ہوگا۔

مفتی جنید عالم صاحب قاسمی : میں ڈاکٹر گنوری صاحب سے متفق ہوں، نوٹ کی حیثیت سند کی نہیں ثمن اصطلاحی کی ہے۔ اسے جبکہ اصطلاحی مان لیا گیا تو دیون مؤخرہ میں ادائے گی کے وقت مالیت کے تناسب سے اضافہ غلط ہوگا۔ کیونکہ اس سے فساد کا ہونا غالب اور یقینی ہے۔ جو سد ذرائع کے اصول کے پیش نظر ممنوع ہے۔

مفتی محمد آدم صاحب بھروچ : میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب گنوری اور مفتی جنید عالم صاحب کے خیالات سے متفق ہوں۔ مزید یہ عرض ہے کہ قرض کے سلسلہ میں متفق علیہ یہ جزئیہ لکھا ہوا ہے کہ کسی نے ایک کلو گیہوں لیا۔ لینے کے وقت قیمت ۵ روپے تھی لیکن واپسی کے وقت ۲ روپے رہ گئی۔ تو اسے کسی نے ظلم نہیں کہا ہے۔
میرا خیال ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جس مماثلت کا اعتبار کیا گیا ہے وہ ظاہری ہے۔ مالیت کی مماثلت مراد نہیں ہے۔
قرض کے سلسلہ میں تخمینی اندازہ لگانا، شرط لگانا

صحیح نہیں۔ اشاریہ سے مربوط کرنے کی صورت میں تخمینی مماثلت ہو گی۔ یقینی نہیں ہو گی۔ اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد نے بھی اشاریہ کو نادرست کہا ہے، اور جدہ کے ایک ادارہ نے بھی اسے غلط بتایا ہے۔

جو قرض پیسوں سے طے ہوا ہو۔ اس کی ادائے گی اگر قیمت سے کی جائے گی تو میرا خیال ہے کہ سود ہو گا چاہے جو بھی معیار مقرر ہو۔

مولانا عبید اللہ اسعدی باندہ: دیون مؤخرہ کے سلسلہ میں عرض ہے کہ جب صاحب حق نے خود ہی اپنا حق ساقط کر دیا۔ جیسے عورت نے اگر اپنے مہر مثلی میں سے کم کر دیا تو یہ معتبر ہو گا تو دیون مؤخرہ میں مالیت کے تناسب سے عدم ادائے گی ظلم ہے یہ صحیح نہیں ہے۔

جن حضرات نے عیب کا تذکرہ کیا ہے کہ مالیت کی کمی عیب ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا ہر عیب موجب ضمان ہے؟ موجب ضمان وہی عیب ہے جس میں امین کی طرف سے تعدی پائی جائے مثلاً صاحب حق مطالبہ کرے اور امین ٹال دے اور پھر امانت ضائع ہو جائے تو یہ عیب ہے اس صورت میں تو بتدریج سود کی طرف بڑھیں گے۔ پھر یکمشت ادائے گی ہو تو معاملہ آسان ہے مگر بار بار ادائے گی میں حساب مشکل ہے، مولانا عتیق احمد بستوی نے جو کچھ لکھا ہے کہ اگر قرضدار وقت سے ادائے گی کو موخر کر دے تو تناسب کی رعایت لازم ہے۔ اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد مولانا نے اپنے مقالہ کا آخری حصہ پڑھ کر سنایا۔

مولانا عبد اللہ صاحب طارق دہلی: اپنے حق سے دستبرداری لاعلمی کی بنا پر ہے، قصداً اور رضاءً

نہیں ہے۔

قاضی صاحب :۔۔۔۔۔۔ اتنی بات تو لوگ جانتے ہیں کہ جس رقم سے کبھی دس من چاول خرید لیتے تھے۔ اب کم خرید پاتے ہیں۔ قرض شریعت کی نگاہ میں صلہ ہے۔ شریعت کے مزاج میں تبدیلی نہیں کرنی چاہیے۔ ہمدردی اور غمگساری کا جو مزاج ہے وہ گھٹنے نہیں دینا چاہیے۔

مولانا عبداللہ صاحب طارق: باخبری کے ساتھ نیکی کرنا زیادہ اچھا ہے بے خبری کے ساتھ نیکی کرنے سے۔

مولانا ابوالحسن صاحب بھڑوچ: آج کے حالات میں عرف کا لحاظ اور قانون کو دیکھتے ہوئے نوٹ کو ثمن مان لینا چاہیے۔ اور ثمن کے سارے احکام اس سے وابستہ کر دینا چاہیے۔

دیون مؤخرہ میں مالیت کے تناسب سے ادائے گی شریعت کی نگاہ میں درست نہیں۔

اشاریہ محض تخمینہ ہے۔ اس کا انضباط مشکل ہے۔ محض تخمین کی بنیاد پر جو قیمت طے ہوگی۔ اگر ہم اس کا لحاظ کریں گے تو یہ شریعت میں اضافہ ہوگا۔ اور ربوا کے دروازے کو کھولنے کے مترادف ہوگا۔

شریعت میں مثلیت کا اعتبار ہے۔ قیمت کا نہیں۔ اس لئے مہر ہو یا دیون مؤخرہ۔ جو بھی رقم ہو اتنا ہی دینا ہوگا۔ اشاریہ سے مربوط کرنا قطعاً غلط ہوگا۔

قاضی صاحب :۔۔۔۔۔۔ یہ بات قابل غور ہے کہ شریعت میں مثلیت سے مراد محض مثلیت ظاہری ہے ؟ میں مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری سے درخواست کروں گا کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس کی وضاحت فرمائیں۔ گیہوں کی جو مثال دی گئی ہے۔ اس میں اس بات کو بھی نگاہ میں رکھئے کہ گیہوں بذات خود مطلوب ہے۔ کہ وہ بعینہ استعمال میں آتا ہے۔ کرنسی بذات خود مطلوب نہیں ہے،

ڈاکٹر جمال الدین عطیہ : ــــ (افسوس ہے کہ تقریر نوٹ نہیں ہوسکی)۔

قاضی صاحب : ــــ قرض کی حیثیت شریعت میں صلہ کی ہے۔ لیکن مہر کے معاملہ میں ہمارے ملک میں ظلم ہوتا ہے۔ مرکزی دارالقضاء پھلواری شریف میں مہر کے ایسے بھی معاملات آئے کہ برسوں پہلے پانچ تولہ روپیے طے ہوئے تھے، اب اس کی ادائے گی کیسے ہو؟ اشاریہ سے مربوط کرنے کا فیصلہ کریں یا نہ کریں مگر یہ تو ضرور بتائیں کہ اس کی ادائے گی کس طرح ہو۔؟

مولانا عبداللہ طارق : ــــ میرے خیال میں حکومت کے اشاریہ سے ادائے گی غلط نہ ہوگی۔

مولانا عبیداللہ کوٹی : ــــ نوٹ سے مراد کیا ہے؟ کیا قوت خرید مقصود تھی۔؟

قاضی صاحب : ــــ کیا ہم لوگ مسلمانوں سے یہ سفارش کریں کہ وہ اپنے اپنے معاشرہ میں سونا چاندی سے مہر طے کریں۔

متفقہ آواز : ــــ مناسب ہوگا۔

مولانا عبداللہ طارق : ــــ کرنسی میں اصل مقصود قوت خرید ہے۔

قاضی صاحب : ــــ یہ تو وہی اشاریہ ہوا۔

مولانا عبیداللہ کوٹی صاحب :
اور
مولانا عبداللہ طارق صاحب :
} ہاں اشاریہ۔

ڈاکٹر گنوری صاحب : ــــ قرض دینے والا اگر قرض نہ دیتا۔ بلکہ اپنے پاس اپنی رقم رکھے رہتا

تو کیا اس کی رقم زر کمی نہ ہوتی، کیا وجہ ہے کہ دوسرے کو دینے کی صورت میں اپنی رقم کی کمی کو پورا کراتا ہے۔

یہ سب سرمایہ دارانہ نظام کا نتیجہ ہے، تنخواہوں میں اضافہ ہوتا ہے تو قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ جب تک اس پورے نظام کو تہ و بالا نہ کر دیا جائے گا، عدل قائم نہ ہوگا۔

کم مدت اور زیادہ مدت کی جو بات کہی گئی ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کم اور زیادہ کا معیار کیا ہے۔

ڈاکٹر جمال الدین صاحب عطیہ نے کہا ہے کہ یورپ میں اشاریہ کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ آپ کو کیا پریشانی ہے؟

میں کہتا ہوں کہ ہمیں یورپ کو نہیں دیکھنا ہے وہاں تو اور بھی کچھ ہوتا ہے۔ جو شریعت میں جائز نہیں ہے۔

نصوص پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تفاوت کے انضباط کے لئے کوئی حقیقی معیار نہ ہو تو وہاں مثلیت ظاہری کو دیکھا جاتا ہے، دلیل حضرت بلال کا اچھے کھجور کو ردی کھجور سے بدلنا ہے۔

جہاں انضباط کے لئے حقیقی معیار موجود ہو وہاں قیمت کا اعتبار ہوتا ہے۔ جیسے ڈھال ہے یہاں میار ہے۔ یہاں قیمت کا اعتبار ہوگا۔ یا جیسے دیت کے معاملہ میں اونٹ ہے یہاں میار ہے۔ یہاں قیمت کا اعتبار ہوگا۔

اشاریہ کے تعلق مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ قیمتوں میں کمی بیشی کیا خلافت راشدہ خلافت بنو امیہ اور خلافت عباسیہ میں نہیں ہوئی؟ اگر ہوئی تو کیا وجہ ہے کہ اس دور کے تمام علماء اور فقہاء نے اس مسئلہ کو نظر انداز کر دیا۔ جبکہ یہ مسئلہ صرف نظر کے لائق نہیں تھا۔

مولانا جمیل احمد نذیری: سو سال پہلے ایک تولہ چاندی کے عوض میں جو سامان ملتا تھا کیا آج بھی اسی مقدار میں وہ سامان مل سکتا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سونا چاندی کی قیمت بھی گھٹ گئی۔ لیکن درحقیقت یہ ہے کہ نہ نوٹوں کی قیمت گھٹتی ہے اور نہ سونا

چاندی کی۔ اصل یہ ہے کہ سامان کی قیمت بڑھتی ہے۔ طلب سے قیمت چڑھ جاتی ہے۔ ان حالات میں اشاریہ سے کس طرح مربوط کیا جائے گا۔

مہر میں طے شدہ نوٹ میں کیا قوت خرید مراد ہوتی ہے۔؟ اگر ہوتی ہے تو یہی سوال سونا اور چاندی میں ہے؟ تو کیا سونا چاندی میں بھی مالیت کا اعتبار کر کے زیادہ دلایا جائے گا؟

حکومت کا جو اشاریہ مالیت سے متعلق ہوتا ہے۔ اس کا تعلق سونا اور چاندی سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اشیاء سے ہوتا ہے۔ جب کرنسی نوٹ ثمن عرفی ہے۔ اور سند ہونا محض نمائشی ہے تو حکومت کو پابند کرنا کہ وہ مؤخر مطالبوں کی ادائے گی اشاریہ سے کرے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔

فلوس نافقہ پر قیاس کرتے ہوئے بعض حضرات نے مالیت کا اعتبار کیا ہے اس پر اشکال یہ ہے کہ اس طرح کی کوئی مثال ملتی ہے کہ فلوس نافقہ کی ادائے گی میں مالیت کو ملحوظ رکھا گیا ہو؟

مفتی محمد زید صاحب: اور مولانا عبید اللہ صاحب کونی: جی ہاں! اس طرح کی تصریحات موجود ہیں۔

طاہر بیگ صاحب: ثمن کا چار مقصد ہے۔

(۱) ذریعۂ مبادلہ ہے۔

(۲) پیمانہ قدر ہے۔ اسلام پیمانہ کو بدلنے سے منع کرتا ہے۔ سونا ثمن حقیقی بھی ہے۔ اور اس کی اپنی حیثیت بھی ہے۔ جب ہم اس کو ثمن بنائیں گے تو اس بات کو ملحوظ رکھیں گے کہ اس کی ثمنیت اور اپنی ذاتی حیثیت دونوں میں توازن رہے۔ جب وہ ثمن ہے اور ثمن پیمانہ ہے۔ تو اسے ایک حالت پر رکھنا

ضروری ہوگا۔

جب حکومت کا فریضہ ہوگا کہ وہ ثمن کا اجراء کرے تو اس کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ وہ اس کے پیمانہ ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھے ——— عام افراد پر یہ ذمہ داری نہیں ہوگی۔

اگر اس کی ثمنیت کو طے کرنے کی ذمہ داری ہم اپنے سر لیتے ہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اس کو اشاریہ سے مربوط کریں۔ دوسری یہ کہ سونا چاندی سے مربوط کریں۔ دونوں صورتوں میں پریشانیاں ہیں۔

(تیسرا اور چوتھا مقصد انھوں نے بیان نہیں کیا)

مفتی انور علی صاحب اعظمی: دیون مؤخرہ کی ادائے گی میں دو طرح کی باتیں سامنے آئیں۔ میرا خیال ہے کہ سونے اور چاندی کے ساتھ جوڑنے میں لینے والے کو تو فائدہ ہوگا۔ مگر دینے والے کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

جناب سید امین الحسن صاحب رضوی: روپے کی قوت خرید فی نفسہ کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز اشیاء کی قیمت ہے۔

ڈاکٹر کے جی منشی صاحب گجرات: ڈاکٹر صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار انگریزی زبان میں اور ترجمانی کے فرائض جناب طاہر بیگ نے انجام دئے۔ انھوں نے کہا۔

ثمن دراصل اشیاء کی قدر ناپنے کا معیار ہے۔ اس لئے ثمن کی اس کی اپنی قدر متعین رہنی چاہیے۔ لیکن مغربی اقتصادی نظام کے تحت ثمن کی قدر گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اسے مستحکم رکھنے کو مغربی ماہرین معاشیات اصولی اہمیت نہیں دیتے۔ اسلام کا نقطۂ نظر واضح ہے۔ اسلام ثمن کی قدر کو متعین اور مستحکم رکھنا چاہتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر مفید ہے۔ اس سے بہت سارے معاشی مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔

قیمت اور قدر میں کافی فرق ہے۔ قیمتوں کے اشاریہ کے ذریعہ ثمن میں قدر کی تبدیلی کو ناپا جاتا ہے۔ اگر قیمتیں چڑھتی ہیں تو ثمن کی قدر میں گراوٹ آتی ہے۔

قدر بھی دو طرح کی ہوتی ہے ۔ قدر افادہ' اور قدر مبادلہ۔
کسی شے سے کتنا افادہ ہوتا ہے ۔ یہ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہیں تو اس کو قدر افادہ کہتے ہیں اور جب یہ دیکھتے ہیں کہ کسی شے کے بدلہ میں کوئی دوسری شے کتنی مقدار میں دستیاب ہو گی تو اسے قدر مبادلہ کہتے ہیں۔

ثمن کی زیادتی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معیشت مالی طور سے بہت طاقتور ہے ۔ اور نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ بذات خود قوتِ پیدائش رکھتا ہے۔

مولانا انیس الرحمن صاحب قاسمی: اموال ربویہ کی تعیین نصوص میں آئی ہے ۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث دعوا الربوا والریبة اور کل قرض جر نفعا فهو ربوا سامنے رکھنی چاہیئے ۔ اور احتیاط ملحوظ رہنی چاہیئے۔ دیون مؤخرہ کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے متعلق فقہاء کی جو عبارتیں مثال میں پیش کی گئی ہیں ان کا تعلق ربوا سے ہے ان کو اثمان کی بحث میں نہیں لانا چاہیئے ۔ سد ذرائع کو بھی ربوا کے باب میں ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

مولانا محمد مصطفےٰ صاحب مفتاحی: یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ محض اشیاء کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی ہیں اور نوٹ کی قیمت علی حالہ رہتی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ نوٹ کی بھی قیمت بڑھتی رہتی ہے حکومتوں کے اعلانات تو ہم لوگ سنتے رہتے ہیں ۔ کہ فلاں حکومت نے اپنی کرنسی میں کمی کر دی ۔ اور فلاں کی بڑھی ۔

سوال ۵ میں جس خطرے کے پیش نظر مہر میں سونا یا چاندی متقرر کرنے کی رائے دی جا رہی ہے ۔ اگر سونا چاندی کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہوا تو پھر کیا ہو گا ؟

قاضی صاحب نے مرکزی دارالقضاء کے تعلق سے جو فرمایا کہ ان کے سامنے ایسے بھی مقدمات آئے ہیں کہ بہت پہلے کبھی مہر کی

مخصوص رقم طے ہوئی۔ اور بروقت ادائے گی عمل میں نہیں آئی۔ اب اسے ادا کرنا ہے تو کس حساب سے ادا کیا جائے جبکہ روپے کی مالیت اب وہ نہیں رہی جو مہر کے تعین کے وقت تھی۔

اس سلسلہ میں مجھے یہ کہنا ہے کہ مہر کے تعین کے وقت سکہ رائج الوقت کے الفاظ کہے جاتے ہیں اگر یہ الفاظ نہ بھی کہے جائیں تو عرفاً یہی مراد ہوتے ہیں۔ سکہ اور نوٹ کا چلن اگر بند نہ ہوا تو اتنا ہی روپیہ ادا کرایا جائے جتنا طے ہوا تھا۔ اور اگر بند ہو گیا ہو تو اس کی مالیت کے تناسب سے ادا کرایا جائے۔

مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری: حضرت قاضی صاحب نے مثلیت کی وضاحت مجھ سے وابستہ کر دی ہے۔ عرض ہے کہ مثلیت دو طرح کی ہوتی ہے۔ صوری اور معنوی۔ پھر ان کی دو قسمیں ہیں ناقص اور کامل ——— کامل کو اعدل کہا گیا ہے۔

شریعت نے مال کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، اموال ربویہ اور اموال غیر ربویہ۔ اموال ربویہ میں مثل صوری کو ملحوظ رکھا ہے۔ ردی اور عمدہ کھجور کو ایک قیمت پر رکھا ہے۔ جید ھا و ردیھا کے الفاظ بتاتے ہیں۔ یہاں صورت مثلی معتبر ہے۔ اور مثل معنوی سے صرف نظر کر لیا گیا ہے۔

اموال ربویہ سے ہٹ کر اموال غیر ربویہ میں فقہاء نے مثل معنوی کا اعتبار کیا ہے۔ فقہاء نے جانوروں کو ذوات القیم میں بیان کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کی قیمت کا لحاظ کیا جائے گا۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی: میں گنگوہی صاحب سے متفق ہوں۔ نوٹ ثمن عرفی ہے۔ اور عرف کا تعلق حکومت سے ہے اس کو ذہن میں رکھا جائے کہ حکومت کے فیصلہ کے نتیجے میں یہ عرف ہے۔

اس طرح ۸ ½ بجے شب میں یہ اجلاس بحسن و خوبی ختم ہوا۔

نشست اول :- ۱۰ دسمبر ۹ بجے صبح
زیر صدارت :- حضرت مولانا مقتدی احسن صاحب ازہری
تلاوت کلام پاک :- قاری ارشد صاحب

قاضی صاحب :- اس وقت جو مسئلہ درپیش ہے اس کی خاص اہمیت ہے۔ سوالنامہ کی ترتیب میں بعض اہم مسائل زیر بحث آگئے ہیں۔ خوشی ہے کہ حضرات علماء نے محنت سے مقالات تیار کئے ہیں مسئلہ کا جو نیا رُخ ہے مستقبل میں اس کا اچھا اثر پڑے گا۔

کہہ سکتے ہیں کہ بالکل اجتہادی طور پر چند فیصلے کرنے ہیں۔ ایک ہے اجتہاد مصطلح، اور ایک ہے بدلتے ہوئے حالات میں نیا حکم دینا۔ دونوں میں فرق ہے۔ دو اصول اکثر کتابوں میں مذکور ہیں سلف سے عدول کرتے ہوئے جب مسئلہ بیان کیا جاتا ہے تو عبارت یوں ملتی ہے :- "لو کانوا فی هذا الزمان لقالوا بما قلنا" کوئی شک نہیں کہ احکام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو ابدی جن پر حالات اور زمانہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دوسرے وہ احکام ہیں جن پر حالات کا اثر پڑتا ہے۔ عادات، حالات، زمانہ کے تقاضوں اور عرف پر مبنی ہوتے ہیں۔ جب عادات و حالات اور زمانہ کے تقاضوں میں تغیر پیدا ہو جائے تو تغیر سے پہلے جو حالات تھے انہی احکام پر تغیر کے بعد بھی اصرار کرنا تفقہ سے جوڑ نہیں کھاتا۔

فقیہ جس طرح سرچشمہ علوم شریعت سے تعلق رکھتا ہے اسی طرح وہ وقت کا بھی نباض ہوتا ہے۔ حضرت امام محمدؒ بازار میں گھومتے تھے اور لوگوں کے حالات معلوم کرتے تھے۔

وہ احکام جو حالات پر مرتب ہوتے ہیں ہر حالت میں انہی پر اصرار کرنا صحیح نہ ہوگا۔ میری حیثیت نہیں کہ میں کہہ سکوں لیکن امام قرافی کہتے ہیں کہ یہ اجتہاد نہیں ہے بلکہ حالات کے تغیر کی صورت

میں تطبیق ہے۔ اس لئے علماء مسئلہ نسخ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ایجاد حکم نہیں ہے بلکہ کشفِ حکم ہے۔

آج سیاسی انقلابات اور مسلمانوں کے زوال کی بنیاد پر صورتحال کچھ ایسی ہے کہ مسلمان ملکوں کو چھوڑتے گئے اور وہاں کچھ مسلمان بھی رہ گئے۔ بعض ممالک ایسے ہیں جن پر مسلمانوں کا اقتدار تو ہے لیکن اسلام کا پتہ نہیں۔ بعض ممالک ایسے ہیں کہ جہاں اسلام کے احکام کچھ ہیں اور کچھ نہیں ہیں، خلافت اور شعرائیت کا وہاں پتہ ہی نہیں، کہیں ہم صاحب اقتدار ہیں اور کہیں نہیں ہیں، کہیں ہم اکثریت میں ہیں اور کہیں اقلیت میں۔

جہاں اقلیت میں ہیں وہاں دو شکلیں ہیں۔ ایک شکل تو یہ ہے کہ وہاں مسلمان مرعوب ہیں جیسے نیپال، دوسری شکل یہ ہے کہ مسلمان وہاں مرعوب نہیں ہیں جیسے جمہوری ممالک۔ جو ممالک جمہوری ہیں ان میں مسلمان مسلمان ہونے کی حیثیت سے شریک نہیں ہیں بلکہ عام شہری کی حیثیت سے شریک ہیں۔ بعض ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے شریک ہیں۔ ہمیں ان تمام ممالک پر نگاہ رکھ کر شریعت کے احکام کو تلاش کرنا ہے۔

پولیٹیکل سائنس میں ہمارا بڑا حصہ ہے لیکن ہم نے اب اسے غیروں کے لئے چھوڑ دیا ہے کہ وہ جیسی چاہیں اس کی تشریح کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب لوگوں کے سامنے اسلام کا جو تصور ہے وہ محض ایک مذہب کا تصور ہے۔ صحیح جامع نظامِ حیات کا تصور نہیں ہے۔

آج ضرورت ہے کہ علماء کرام بیٹھیں اور اس کی تشریح کریں۔ اور نئی نسل کو تربیت دیں۔ آج جو مختلف قسم کے دستور اور نظام حکومت ہے اس کا جائزہ لیں اور شریعت کی روشنی میں اسے

جانچیں اور اس کا حکم معلوم کریں ۔

جدید ماہرین سیاست اور علماء دونوں مل کر پولیٹیکل زبان میں اسے مرتب کریں تو بڑا کام ہوگا ۔

خوشی ہے کہ اکثر مقالات میں دارالاسلام اور دارالحرب کا حصہ نہیں ہے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ حصہ اب صحیح ہے ؟ آج اس مسئلہ کا فائنل حل نہیں نکال سکیں گے ۔ انشاء اللہ آئندہ سیمینار میں کوشش کریں گے ، آج کمیٹی بنے گی جو سوالات کو منقسم اور مرتب کرے گی ۔ ضرورت محسوس ہوگی تو بیرونی ممالک کے علماء کرام کے پاس اسے بھیجے گی ۔

آپ نے بنیاد ڈالی ہے ، آغاز کیا ہے آئندہ اس پر تعمیر ہوگی ۔ اللہ تعالیٰ تاسیس پر آپ حضرات کو اجر عطا فرمائے ۔

بہرحال پہلا سوال یہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی حقیقت کیا ہے ؟

قاضی صاحب کے اس سوال کے پیش کرنے کے بعد اس موضوع سے متعلق مقالات کا دور شروع ہوا اور بالترتیب مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دیوبند ، مولانا مطیع الرحمٰن صاحب رضوی بدایوں ، مولانا عبید اللہ صاحب اسعدی باندہ ، مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی حیدرآباد ، جناب شمس پیرزادہ صاحب ، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب عمری عمرآباد ، مولانا سعود عالم صاحب قاسمی علی گڑھ نے اپنا اپنا مقالہ سنایا ۔

اس کے بعد سید امین الحسن صاحب رضوی اور مفتی نظام الدین صاحب دیوبند کی ایک تحریر قاضی صاحب نے پڑھ کر سنائی ۔ پھر اس کے بعد قاضی صاحب نے کمیٹی کی تشکیل کی اجازت دی اور تمام شرکاء نے بھی اجازت دی ؛

اس کے بعد قاضی صاحب نے دوسرا سوال پیش کیا کہ دارالحرب

میں سود جائز ہے یا ناجائز؟ پھر اس مسئلہ سے متعلق مقالات سنانے کا دور شروع ہوا۔ مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب مئو، مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی جونپور، اور مفتی محمد زید صاحب باندہ نے اپنا اپنا مقالہ سُنایا۔ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری کو بھی مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی لیکن وہ ہال میں تشریف فرما نہ تھے۔

قاضی صاحب :- دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ دارالحرب میں سودی معاملات درست ہیں۔ جو لوگ جواز کے قائل ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ اہلِ حرب کے اموال مالِ غیر معصوم غیر متقوم ہیں۔ وہ ربوا کو ربوا سمجھ کر جائز نہیں کہتے بلکہ اس کو ربوا ہی نہیں سمجھتے۔

دوسرا پہلو یہ سامنے آیا کہ دارالحرب ہو یا دارالاسلام دونوں میں سودی معاملات جائز نہیں ہیں۔ اس بحث کا دار و مدار دراصل اس بات پر ہے کہ کسی ملک کے باشندوں کے مال کو احکام شرع کی روشنی میں وہاں کے قانون کے مطابق تحفظ حاصل ہے یا نہیں؟

اگر ایک شخص قتل کا مجرم ہے تو اس پر اس کی جان کی حفاظت کا قانون لاگو نہیں ہوتا۔ اس کا خون ہدر رہے۔ وہ قانونی تحفظ سے خارج ہے۔

فرض کر لیجئے کہ کوئی ڈاکو ہے۔ لوٹ کے مال سے ذخیرہ جمع کر رکھا ہے اب اگر قاضی اس کے مال کو ضبط کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس کا مال ہدر ہوگا اس کو وہ تحفظ حاصل نہ ہوگا جو کسی شخص کو اس کی ذاتی پراپرٹی پر حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح برسر جنگ ممالک سے جو مال حاصل ہو وہ معصوم نہیں۔ قانونی اور شرعی طور پر ایسے ممالک کے اموال کو تحفظ حاصل نہیں۔

ہندوستان کے معاملہ پر غور کریں کہ کیا فقہاء اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ مسلمانوں کے لئے یہاں کے غیر مسلموں کی جان و مال ازروئے شرع حلال ہیں اور ان کو قانونی تحفظ

حاصل نہیں ہے۔ اسی لئے دو باتیں کہی جاتی ہیں۔ غیر مسلموں کی جان یا مال کوئی مسلمان لے لے تو سوچنا یہ ہے کہ وہ مسلمان از روئے شرع گنہگار ہوگا یا نہیں؟ اور از روئے قانون اس پر ضمان ہوگا یا نہیں؟ میرا خیال ہے کہ حلال کہنا مشکل ہے اور از روئے قانون اس اس کی اجازت ہے۔

ہمارے یہاں جس طرح سودی نظام رائج ہے۔ سود رگ رگ میں ہے۔ مسلمان مجبور ہے کہ وہ معاملات بھی کرے جن میں کسی نہ کسی طرح سود پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کا مسلمان اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود اس معاملہ میں غیر معمولی حدتک حساس ہے وہ علماء سے پوچھتا ہے کہ کس معاملہ میں سود ہے اور کس میں نہیں؟ یہ سوال اسلام سے تعلق کی علامت ہے۔ علماء کا فریضہ ہے کہ وہ غور کریں اور مسلمانوں کو بتائیں کہ کن حالات میں اس کی گنجائش ہے۔ اور کن حالات میں نہیں ہے۔ یہی سیمنار کا موضوع ہے۔

کیا ہندوستان میں ممکن ہے کہ ہم ایسا غیر سودی نظام قائم، کریں جس سے یہاں کے مسلمان اپنی ضروریات سہولت کے ساتھ کسی بھی درجہ میں پوری کرسکیں۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ غیر مسلم بھائیوں کا ایک کمزور طبقہ جو بینکنگ کے سودی نظام کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اس کو بھی مسلمانوں کے غیر سودی نظام سے اگر فائدہ پہنچا ہے تو وہ بہت راحت محسوس کرتا ہے۔

اگر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے نظام سے غیر مسلموں کو فائدہ پہنچتا ہے تو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو سود سے حفاظت ملتی ہے بلکہ غیر مسلموں میں بھی اسلام کی دعوت پہنچتی ہے۔

ملک کے مختلف حصوں میں مسلمانوں نے ایسا نظام قائم کرنے کی کوششیں کیں لیکن منظم نہ ہوسکیں۔ آپ محسوس کرینگے

کہ ہر جگہ اس کی ایک لہر ہے لیکن تنظیم اور یکسانیت نہیں ہے۔ اگر آپ کوئی ایسا نظام دے سکیں جس میں تنظیم، یکسانیت اور شریعت سے ہم آہنگی ہو تو بڑا کام ہوگا لیکن یہ محنت طلب کام ہے۔ اس پہلو سے ملک میں جو کام ہو رہا ہے اس کا جائزہ لینا ہے کہ وہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؛ عملی ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ اس کی افادیت کیا ہے؛

مجھے بہت خوشی ہے کہ محترم مفتی محمد رفیع صاحب نے بتایا کہ اس موضوع پر پاکستان میں اچھا خاصا کام ہوا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ پاکستان سے اس کی رپورٹ بھجوائیں گے، اس سے ہمیں روشنی ملے گی۔

مجھے خوشی ہے کہ اس سیمینار میں ڈاکٹر ممتاز صاحب بنگلور تشریف فرما ہیں، میں ان کا شکر گذار ہوں۔ انہوں نے بنگلور میں غیر سودی ادارہ قائم کیا ہے، میں گذارش کروں گا کہ وہ ہمیں اپنے تجربات سے مستفید اور روشناس کرائیں۔

ڈاکٹر ممتاز احمد صاحب بنگلور:- پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ غیر سودی نظام کا ادارہ قائم کرنے کے لئے اسلام آباد میں اجتماع ہوا تھا، میں بھی شریک تھا۔ ایسا نظام قائم کرنے کے لئے میرا بھی جی چاہتا تھا لیکن طریقہ معلوم نہ تھا۔ وہاں مجھ کو بہت سا لٹریچر ملا جس سے قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ پھر بنگلور کو مرکز قرار دے کر میں نے ایک ادارہ نان بینکنگ کوآپریشن کے نام سے قائم کیا۔ اس کو ریزرو بینک کا پرمیشن حاصل ہے۔ چار صوبوں میں اس کی شاخیں ہیں بنگلور، حیدرآباد، مدراس میں تو اس کی شاخیں ہیں ہی، اب ہم لوگ بمبئی میں بھی قائم کر رہے ہیں۔ شروع میں سرمایہ تقریباً ۳ لاکھ تھا اب ۴ کروڑ ہو چکا ہے۔ ہم لوگ اس ادارہ کو شرعی اعتبار سے آگے بڑھا رہے ہیں، تین سالوں سے نفع پر چل رہا ہے، ہمارے یہاں شرعی بورڈ ہے جب تک بورڈ واضح

فیصلہ نہیں دے دیتا، ہم لوگ عمل نہیں کرتے۔ ڈیڑھ سال قبل ہم نے عالمی اجتماع کیا تھا۔ مصر، دوبئی، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، ملیشیا، وغیرہ سے نمائندے آئے تھے۔ ہم اس کے ذریعہ اسکول، اسپتال وغیرہ کی اعانت کرتے ہیں۔ مصر کے نمائندے نے کہا کہ بنگلور کا ادارہ صحیح معنی میں اسلامی ادارہ ہے، مغربی نظام ہماری رگوں میں پیوست ہوگیا ہے جبکہ اسلام اور مغربی نظام دونوں بالکل الگ ہیں۔ اجتماع میں شریک غیر مسلموں کو مخاطب کرکے انہوں نے کہا کہ اسلام کے نام سے مت گھبرائیے۔ اسلام ایک نظام ہے، آپ آزمائیے اور دیکھئے، انشاء اللہ آپ بہت سی الجھنوں سے بچ جائیں گے۔

بنگلور کا ادارہ ابھی ابتداء میں ہے۔ ابھی اس میں خامیاں بھی ہیں، ممکن ہے کہ ۱۵ ر ۲۰ ر برس کے بعد خامیوں سے پاک نظام ہم دے سکیں۔ غلطی ہونے سے آپ ڈریں نہیں، بچہ جب چلتا ہے تو گرتا بھی ہے پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ پوری طرح اپنے پاؤں پر چلنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب فریدی:- ضروری ہے کہ ہم اس ملک میں غیر سودی نظام کی تشکیل کریں ملک میں جو کوششیں ہو رہی ہیں ان میں ایک کمی ہے ہمیں سارے پہلوؤں پر غور کرنا ہے۔

سوچنا ہے کہ ایسے ادارے کے اخراجات کس طرح پورے ہوں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ ایسا فنڈ قائم کیا جائے جس سے انڈسٹری بنا سکیں یا تجارت کر سکیں۔ ہندوستان کے قوانین میں ایسے کام کی نسبتاً زیادہ گنجائش ہے۔

لیکن اگر محض قرضوں کے لین دین یا امداد و اعانت کے لئے ادارہ قائم کرنا چاہیں تو اسے PURE BANKING کہتے ہیں۔ یہ وسیع فیلڈ ہے۔ اس میں کچھ سیاسی اور غیر سیاسی دقتیں بھی ہیں۔

اسلامی مالیاتی نظام ایک دعوت بھی ہے اور عمل بھی۔

اسلام نے محض دعوت نہیں دی ہے بلکہ عملی طور پر کرکے دکھایا بھی ہے۔

ہمیں غیر مسلموں پر بھی واضح کرنا چاہئے کہ یہ اقتصادی نظام دنیا میں عدل قائم کرتا ہے اور غیر مسلموں کی ہمدردی کرنے والا ہے۔

یہ ٹھیک نہیں کہ آدھا تو اسلام لیا جائے اور آدھا غیر اسلام لیا جائے۔ خالص اسلامی بنیاد پر قائم کئے بغیر ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ڈاکٹر کے، جی منشی (بزبان انگریزی) اور ترجمہ طاہر بیگ: بینکنگ ——— مالیاتی نظام کا ایک حصہ ہے۔ اس میں سرمایہ جمع کرکے لوگوں کو قرض دیئے جاتے ہیں اور قرض کے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بینکنگ قائم کرنے میں بہت سی دشواریاں ہیں۔ سروِسیز بینکنگ کے بجائے ڈیولپمنٹ بینکنگ کو ترجیح دینی چاہئے اور یکساں طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ یہ ضروری ہے کہ جو لوگ اسے چلائیں وہ اس کے ماہرین ہوں۔ ایسا نظام مسلم ممالک میں بھی قبول عام حاصل کر رہا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم عوام کو اس کی ترغیب دیں۔ نیز تجارت کو بڑھانے کی ترغیب بھی ہمارے پروگرام میں شامل ہونا چاہئے۔ بہرحال ہمیں ادارہ بنانا چاہئے اور خوب سوچ سمجھ کر بنانا چاہئے۔

ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب بمبئی: بینکنگ کے سلسلہ میں ہمیں ان باتوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے:-

۱۔ مقصد کیا ہے؟
۲۔ ذرائع کیا ہیں؟
۳۔ مجبوریاں کیا ہیں؟
۴۔ ملکی قوانین کے حدود میں ہم کس طرح کام کریں۔

انفرادی طور سے جو کام ہو رہا ہے وہ صحیح ہے البتہ اس میں یکجہتی اور تنظیم ہونی چاہئے۔

ہم مسلمانوں کی موجودہ حالت یہ ہے کہ ملک کا بڑا حصہ بیحد غریب ہے تقریباً ۴۰ فیصد لوگوں کو روٹی نہیں ملتی۔ ہم اپنی آبادی کے تناسب کو دیکھیں تو تعجب نہ ہوگا کہ ۶۰ فیصد ہوں ہمارے اندر تعلیم کی کمی ہے۔ ہم غریب ہیں لیکن ایسا نہیں کہ سبھی غریب ہوں۔ ملک میں مسلمان انڈسٹری اور تجارت میں آگے بھی ہیں۔ ملک میں غریبی کو دور کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ہمیں چاہئے کہ ہم اس میں تعاون کریں۔ بنیادی ذریعہ — INVESTMENT ہے، یہ ہونا بہت ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ یہ وسائل سے ہوگا اور وسائل کے لئے بچت ہونا چاہئے اب سوال یہ ہے کہ سود لئے بغیر ہم اس مقصد کو کیسے حاصل کریں؟

موجودہ حالات ایسے ہیں کہ قانون کے حدود میں رہ کر نفع لیتے ہوئے ایسا نظام چلانا مشکل ہے۔ کسی بھی بینکنگ نظام میں نفع ہونا چاہئے۔ رجسٹریشن کرانا ضروری ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ چلانے والے ماہرین ہونے چاہئیں لیکن ماہر سستا نہیں آتا، کم سے کم دس ہزار روپیہ ماہوار لیتا ہے زیادہ تو ۲۵/۳۰/ ہزار تک لیتا ہے۔ میرے خیال میں اکاؤنٹنگ سسٹم مفید ہے۔

کچھ سوسائٹیوں کے پاس فاضل رقم ہے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟

کسی بھی ملک میں بینکنگ کا نظام پیچیدہ ہے۔ ہم ایسا مرکز قائم کریں اور پھر اس کی شاخیں ہوں۔ اس طرح جو بھی سوسائٹی ہو وہ مرکز سے وابستہ ہوجائے۔ مرکز اپنے ماتحت

شاخوں کی تنظیم کرے گا اور کام کرنے والوں کی صلاحیت کی بھی اور کارکردگی کی بھی جانچ کرے گا۔

اسلامی نظام کی بنیاد عدل پر ہے۔ عدل کا مطلب صرف یہ نہیں کہ سود نہ لیا جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ دینے والے اور لینے والے کے ساتھ انصاف ہو۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اس پر بھی غور کریں۔

اسی کے ساتھ یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

دوسری نشست :- ۱۰ ردسمبر ۸۹ء بعد نماز مغرب

قاضی صاحب نے ڈاکٹر جمال الدین صاحب عطیہ سے بینکنگ سسٹم پر اظہارِ خیال کے لئے گذارش کی۔ اور انہوں نے عربی میں خطاب فرمایا۔ خطاب کے بعد قاضی صاحب نے اردو میں ان کی ترجمانی کے فرائض انجام دیئے۔

ڈاکٹر جمال الدین عطیہ :- آپ نے جن مسائل کو چھیڑا ہے ان کی آج ضرورت ہے۔ امید ہے کہ علماء حل پیش کریں گے۔

بینک کے دو کام ہیں۔ ایک خدمت، اور دوسرا سرمایہ کاری معاشرہ میں بنیادی طور پر دو طبقے ہیں۔ ایک کے پاس ضرورت سے زائد دولت ہے اور دوسرے کے پاس دولت نہیں ہے۔ لیکن ہنر، محنت اور افرادی قوت ہے۔ فاضل سرمایہ کے ارتکاز اور ہنر و محنت کی تضیع سے بہتر یہ ہے کہ فاضل سرمایہ ہنرمندوں کے ہاتھوں میں جائے تاکہ وہ اس پر محنت کرکے مزید پیداوار حاصل کرسکیں۔ شریعت میں مضاربت اور شرکت کی بنیاد غالباً یہی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ غالباً بینک بھی یہی کام کرتا ہے۔ بینک دراصل دونوں طبقوں کے درمیان واسطہ ہے۔

بینک کی حیثیت وکیل کی ہے۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ اس کی حیثیت مال والے کے لئے مضارب کی ہے اور لینے والے کے لئے رب المال کی ہے۔ ہمیں اس پورے معاملہ کو مرکب شکل میں دیکھنا چاہئے۔ اور جو ہیئتِ ترکیبی ہے اس پر بحیثیت مجموعی غور کرنا چاہئے۔ کسی خاص جزئیہ کو لینے اور کسی کو چھوڑ دینے سے مسئلہ اور زیادہ اُلجھ جائے گا۔

عالمِ اسلام ہی میں نہیں بلکہ یورپی ممالک میں بھی یہ مسئلہ نیا ہے۔ حکومت جو ٹیکس لگاتی ہے اس میں کون سا ٹیکس ظلم ہے اور کون سا نہیں ؛ یہ طے کرنا دشوار امر ہے اگر آپ سب کو ظلم کہیں گے تو معاشرہ کے جن لوگوں میں تھوڑی بھی خود غرضی ہوگی وہ سب کو حلال کرلیں گے۔

اپنے شہریوں پر حکومت جو ٹیکس لگاتی ہے اور آپ اسے ظلم کہہ کر ٹیکس کی ادائیگی سے بچیں گے تو سوچئے کہ حکومت سے آپ کو جو سہولتیں ملتی ہیں آپ انہیں کس طرح حاصل کرسکیں گے۔ یہ کہنا کہ حکومت کے ٹیکس کی رقم سود سے ادا کردی جائے صحیح نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مالِ طیب کے بجائے مال حرام دینا ہوگا جو درست نہیں۔

ہاں ! سود اگر آپ کسی کو دیدیں گے تو اس پر آپ کو ثواب نہ ملے گا۔ لیکن امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ثواب دے گا۔ اللہ تعالیٰ کو آپ نے ثواب دینے سے کیوں روک دیا ہے۔

قاضی صاحب :۔ قاضی صاحب نے مداخلت کی اور کہا کہ علماء نے یہ نہیں کہا ہے کہ ثواب نہیں ملے گا۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ ثواب کی نیت نہیں کرنا ہے۔ یہ ترک نہیں ہے بلکہ کف ہے۔ کف پر اجر

مل سکتا ہے ۔

ڈاکٹر جمال الدین صاحب عطیہ :۔ بین الاقوامی تجارت میں ایسا ہے کہ آپ نے ایک آرڈر بک کیا ۔ پھر ادائیگی کے لئے بینک کو واسطہ بنایا ، تو یہاں تک ٹھیک ہے لیکن بینک درمیان کے ایام کا سود لے گا ۔ میں کہتا ہوں کہ جس دن غیر ملکی بینک میں معاملہ ہو اسی دن وہ یہاں کے بینک کو ٹیلی گرام کر دے تاکہ اسی دن یہاں بغیر سود کے حساب صاف ہو جائے ۔

جو معاملات صرف کے ہوتے ہیں ، اور جو معاملات اجارہ سے متعلق ہیں ، ان پر اسی حیثیت سے غور کرنا چاہئے ۔

کرنٹ اکاؤنٹ میں نفع نہیں ملتا ۔ سیونگ اور فکسڈ ڈپازٹ پر مزید رقم ملتی ہے ۔ بینک جن لوگوں سے سرمایہ لیتا ہے ، ان کو نفع کم دیتا ہے اور خود نفع زیادہ لیتا ہے ۔ اس طرح باقی روپے شیئر ہولڈروں کے حصہ میں چلے جاتے ہیں ۔

بینک میں بلاشبہ حرام چیزیں بھی ہیں ۔ لیکن اتنا کہہ کر نکل جانا کافی نہیں ہے ۔ ہمیں جائز متبادل طریقہ تلاش کرنا چاہئے ۔

لوگوں کی ضرورتوں اور خدمتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا ، تو آپ کو چاہئے کہ آپ جائز متبادل طریقہ ڈھونڈیں ۔ اس سلسلہ میں عرب دنیا میں بینکنگ سسٹم پر جو کام ہوا ہے اسے بھی آپ ضرور پیش نظر رکھیں ۔

ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے بعد بین الاقوامی تجارت اور سود کے موضوع پر ایک رپورٹ پڑھی گئی ۔ اس رپورٹ میں یہ بات کہی گئی تھی کہ اس مسئلہ پر دوبارہ غور کیا جائے ۔ اس کیلئے ایک کمیٹی کے حوالہ سوالات کی تیاری کی ذمہ داری سپرد کی گئی ۔ اس طرح یہ اجلاس ۸ بجے شب میں اختتام کو پہنچا ۔

۱۱ر دسمبر ۱۰½ بجے صبح
زیر صدارت :۔ ڈاکٹر جمال الدین عطیہ، قاہرہ

مفتی محمد زید صاحب باندہ نے تلاوت فرمائی۔ پھر ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب گنوری نے ملک کے موجودہ حالات میں جان و مال کے بیمہ سے متعلق ایک تحریر پڑھ کر سنائی پھر انشورنس کے موضوع پر ڈاکٹر جمال الدین عطیہ نے خطاب کیا عطیہ صاحب کی ترجمانی گنوری صاحب نے کی۔

ڈاکٹر جمال الدین عطیہ :۔ عوام کی پریشانیوں میں اعانت کرنا دراصل حکومت کا کام ہے لیکن اسلامی حکومت نہیں ہے۔ انشورنس پرانی چیز ہے۔ ابوزہرہ عدم جواز اور ڈاکٹر مصطفےٰ الزرقاء جواز کے قائل تھے مجلس تحقیقات شرعیہ کا جو فیصلہ ابھی گنوری صاحب نے سنایا وہ موجودہ حالات میں درست ہے۔

مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی :۔ صرف جان کے بیمہ میں اختلاف ہے۔ باقی چیزوں سے متفق ہوں۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی :۔ بیمہ کمپنی حادثہ نہ ہونے اور موت نہ آنے کی ضمانت نہیں دیتی۔ ڈاکٹر جمال الدین عطیہ صاحب کے قول کے مطابق بیمہ کی ابتداء تعاون کے جذبہ سے ہوئی تھی۔ یہی چیز ترقی کر کے تجارتی بیمہ بن گئی۔ مقصد یہ تھا کہ جو لوگ حادثات سے متاثر ہوں اُن کی امداد کی جائے۔

ایک پہلو فقہاء کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اس کا بنیادی نظام اسلام کے عادلانہ اور منصفانہ نظام کے خلاف ہے۔ بیمہ کمپنی ہماری ضرورت کے مطابق ہماری امداد نہیں کرتی بلکہ ہماری آمدنی کے مطابق کرتی ہے اس میں سود اور انشورنس ایک ہی طرح کی چیزیں ہیں۔

اگر وقت سے پہلے مرگئے تو آپ کو فائدہ ہوگا۔ لیکن خوش قسمتی سے زندہ رہے تو بیمہ کے ذریعہ آپ سے زیادہ کمرشیل کمپنیوں کو فائدہ ہوگا۔

جن لوگوں نے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ ان کے سامنے قمار کا پہلو ہے۔ یہ فتویٰ غلط ہے، میں نہیں کہتا کہ آپ جواز یا عدم جواز کا فتویٰ دیں یہ حقیقت ہے کہ جو تجارتی بیمہ کمپنیاں کام کرتی ہیں ان کی آمدنی سود پر مبنی ہیں۔ ایک پہلو ضرورت ہے۔ اس پہلو سے میری ذاتی رائے ہے کہ مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنو کا فیصلہ صحیح ہے۔ مال واسباب کا بیمہ درست ہے۔ جان کے بیمہ کے لئے مسلمان چاہیں تو اجتماعی طور پر نظم کرسکتے ہیں۔ بلا شبہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں پریشانیاں ہیں اور بعض مسائل پیچیدہ ہیں۔

مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی :- اکسیڈنٹ کی تلافی حکومت کرتی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ جرم کرنے والا کوئی اور ہے اور تاوان دینے والا کوئی اور —— یہ بات شریعت میں نہیں ہے۔ بیمہ کرانے والا کبھی غیر شرعی وارث کا نام لکھوا دیتا ہے اور یہ رقم اسی غیر وارث کو ملتی ہے۔

ڈاکٹر فریدی صاحب :- شرعی اصولوں کے تحت آپ جس شخص کو نامزد کریں گے تو رقم اسی کو ملے گی۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی :- غیر وارث کے لئے وصیت کرنا جائز ہے۔

مولانا عبید اللہ صاحب کوٹی :- حکومت حفاظت کی رقم دیتی ہے، ضمان نہیں دیتی۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی :- یہ کفالت بالضمان ہے۔ اس میں کیا حرج ہے؟

مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی :- حادثہ ہونا نہ ہونا موہوم ہے، پھر کفالت کس بات کی؟

مفتی اشفاق احمد اعظم گڈھ :- بیمہ کا مقصود ضمان نہیں ہے۔ لیکن طریقہ کار میں ضمان لازم آتا ہے۔ اس لئے یہ بات صحیح ہے کہ جنایت کوئی کرتا ہے

اور تاوان کوئی ادا کرتا ہے۔ بیمہ کمپنی اصول انسانیت اور صلۂ رحمی کے خلاف ہے اس کی بنا سود پر ہے۔

قاضی صاحب :- بیمہ کمپنی کا جو مقصد ہے وہ امر آخر ہے۔ کیوں نہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بیمہ کمپنی کفیل بالضمان ہے۔ مسئلہ کی صرف اتنی تشخیص کر لی جائے کہ کفالت بالمجہول جائز ہے یا نہیں؟

یہ جو کہا گیا کہ جرم کوئی کرے اور تاوان کوئی اور ادا کرے تو کیا شریعت میں اس کی نظیر نہیں ہے۔ میرے خیال میں عاقلہ اس کی نظیر ہے۔

مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی :- بیمہ کمپنی بالعوض کفیل ہو رہی ہے اور عوض میں مال لے رہی ہے۔ جو مال لے گی وہ بھی ربوی ہے اور جو دے گی وہ بھی ربوی ہے۔ کبھی زیادہ دیتی ہے اور کبھی کم۔

قاضی صاحب :- کم نہیں دیتی۔ ہم ڈاکٹر عبد الحسیب صاحب سے وضاحت چاہیں گے۔

ڈاکٹر عبد الحسیب صاحب اور ڈاکٹر فریدی صاحب :- کم بھی دیتا ہے۔

مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی :- بہرحال جو مال لیتی ہے اور جو مال دیتی ہے وہ ربوی ہے۔ ان سب کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے۔

مولانا عتیق احمد صاحب بستوی :- میرا خیال ہے کہ اس بحث میں جانے کے بجائے اس امر پر غور کرنا چاہئے کہ بیمہ میں جو محذورات ہیں ان کے باوجود ہندوستان کے موجودہ حالات میں بیمہ کی گنجائش ہے یا نہیں ہے؟ ایک ہے فساد اور ایک ہے عام طور پر ہونے والا حادثہ۔ میرا خیال ہے فساد میں تباہ ہونے والوں کو بیمہ کی گنجائش دینی چاہئے۔ باقی یونہی جان و مال کے بیمہ کرانے والوں کو اجازت نہیں دینی چاہئے بلکہ ان کو ملنے والی رقم کے مصرف پر

بھی غور کرنا ہوگا کہ کہاں خرچ ہو۔

قاضی صاحب :- فساد اور حادثاتی موت سے متعلق کیا کوئی الگ اسکیم ہوتی ہے؟

ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب :- میرے خیال میں فساد کے لئے عام طور پر بیمہ نہیں ہوتا لیکن اگر خواہش کی جائے گی تو ایسا بھی ہوتا ہے۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی :- تحقیقات شرعیہ نے جو فیصلہ کیا ہے اس میں مال کے بیمہ کا فیصلہ تو صحیح ہے لیکن جان کے سلسلہ میں تخمینی معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گنوری صاحب :- مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنو کا فیصلہ ڈاکٹر صاحب نے پھر پڑھ کر سنایا۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی :- یہ دیکھئے کہ فرق کیا ہے یا نہیں کیا ہے ؟

ڈاکٹر فریدی صاحب :- میں نے عرض کیا تھا کہ اس میں قمار کی شکل نہیں ہے۔ قمار اس لئے نہیں ہے کہ اس پر غور کریں کہ بیمہ ــــ کمپنی کرتی ہے۔ بیمہ کمپنی یہ نہیں کہتی کہ آپ کے ساتھ حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ بلکہ پورے گروپ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں حادثہ کی شرح یہ ہے، یہی حال موت کے بارے میں ہے۔ مان لیجئے کہ ماضی میں شرح اموات کچھ رہی ہے۔ ماضی میں شرح اموات جو بھی رہی ہو آئندہ اگر حالات یہی رہے تو یہی شرح رہے گی۔

قاضی صاحب :- کاروبار اور موت کی شرح کا اندازہ کر کے مستقبل کی شرح کا تخمینہ لگاتے ہیں۔ اور اس کو بنیاد بنا کر معاملہ کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میری موت ہو جائے، اگر میری گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو جائے تو اتنا دیا جائے گا۔ لفظ "اگر" کے ساتھ جو بات کہی جائے وہ واقع بھی ہو سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی ہے اور اس خطرے کے ضامن ہونے کا وہ ہم سے پیسے لیتے ہیں۔ سوچئے کہ اس شکل پر قمار کی مذکورہ تعریف صادق آتی ہے ؟

ڈاکٹر فریدی صاحب :- جس اندازہ کو آپ قمار دے رہے ہیں۔ اسی اندازے پر ساری منصوبہ بندی کام کررہی ہے۔ اندازے کو قمار قرار نہیں دیا جاسکتا۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی :- وہ ہم سے پیسے لیتے ہیں۔

ڈاکٹر فریدی صاحب :- پالیسی کی ایک خاص حد مقرر ہوتی ہے۔ اس حد کو اگر آپ نے پورا کردیا تو پوری رقم ملے گی۔ اور اگر اس کو پورا نہ کیا تو آپ کی جمع کردہ رقم ملے گی۔ میری رائے میں یہ قمار نہیں ہے۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی :- کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ نہیں ملے گا۔

ڈاکٹر فریدی صاحب :- معاہدہ ہوتا ہے۔ اور معاہدہ کا ہونا آپ کو معلوم رہتا ہے اس کے مطابق رقم ضبط بھی ہوتی ہے۔

مفتی رفیع صاحب عثمانی :- خلاصہ یہ ہوا کہ اگر یوں ہوا — تو پوری — یوں ہوا — تو کم — یوں ہوا — تو زیادہ — رقم ملے گی۔ یہی قمار ہے۔

مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری :- غیر اسلامی عناصر نے پوری دنیا میں بیمہ کی جو شکلیں رائج کر رکھی ہیں شریعت میں ان کا کیا حکم ہے ؟ ذہن میں رکھئے کہ غیر اسلامی لوگوں کی رائج کردہ یہ شکلیں شریعت کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے غور یہ کرنا ہے کہ اسلام میں بیمہ کی جائز شکل کیا ہے ؟

یہ بھی سوچنا ہے کہ بیمہ دنیا کی ضرورت ہے یا نہیں ہے ؟ اگر ہے تو سوچئے کہ اسلام اسکے لئے کونسا طریقہ تجویز کرتا ہے۔ موجودہ بیمہ کی شکلوں پر کیوں غور ہورہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔

ماضی اور حال میں نمایاں تغیر آگیا ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں علاج کا طریقہ مفردات تھا، اب مرکبات ہے۔ دونوں طریقوں کے خواص الگ الگ ہیں۔ فقہ میں مفرد و مرکب معاملات کی نظیر موجود ہے۔ شرکت، مضاربت، بیع وغیرہ

ملاکر مرکب تیار کرنا ہے ؟ یا کیا کرنا ہے ؟ یہ سوچئے اور اس کا حکم معلوم کیجئے۔

اسلامی بینک کے مسئلہ ہی سے پوری دنیا پریشان ہے بہرحال یہ سوچنا ہے کہ اسلامی انشورنس کی صورت کیا ہے۔

جناب امین الحسن صاحب رضوی :- موجودہ حالات میں غور کریں کہ کیا جائز ہے ؟

مولانا جمیل احمد صاحب نذیری :- یہ فرض کرکے چلئے کہ یہ ناجائز ہے۔ لیکن کیا موجودہ حالات میں جائز ہے ؟

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بمبئی :- تو کیا فساد کا مسئلہ اس سے حل ہو جائے گا ؟

قاضی صاحب :- آپ حضرات اب تک انشورنس کے مسئلہ کی بات کرتے آرہے ہیں ہر ایک کی رائے اور مخالف کی رائے کو سننا بھر انگیز کرنا اچھی علامت ہے۔ میں نے بعض بزرگوں کو دیکھا ہے کہ اپنے سے بہت کم چھوٹے لوگوں کی تقریروں کی مجلس میں پابندی سے بیٹھا کرتے۔

حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ چھوٹے چھوٹے لوگوں کی تقریروں میں بیٹھے رہتے۔ میں کہتا کہ حضرت چلئے۔ تو فرماتے کہ ان تقریروں میں کبھی کبھی ایسے نکات ملتے ہیں کہ جو بڑے پتے کے ہوتے ہیں۔ میں ان کو اپنے طور پر ڈھال لیتا ہوں۔

ایک دوسرے کے خیال سننے سے فائدہ ہی ہوتا ہے، نقصان تو ہوتا نہیں۔ ابھی جو بحث ہوئی ہے اس کا مقصد حلت و حرمت کا فیصلہ کرنا نہیں ہے۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ ہندوستان کے حالات روز بروز بگڑتے جارہے ہیں۔ اسی طرح کے حالات میں ۱۹۶۵ء میں لکھنؤ میں بیٹھ کر بعض بزرگوں نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ یہ دیکھنا ہے کہ آج کے حالات میں اس فیصلہ کی توثیق کی جاسکتی ہے یا نہیں ؟ مقصد صرف اتنا ہے کہ موجودہ حالات کو حاجت یا ضرورت کے منزلہ میں مان کر

انشورنس کو اصلاً ناجائز ماننے کے باوجود اس کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں ؟

دونوں خیالات کے حضرات اپنا اپنا ایک نوٹ لکھ کر عنایت فرمائیں۔ اس مسئلہ پر اب آئندہ غور کیا جائے گا۔

اس کے بعد قاضی صاحب نے تجاویز کے مسودات پڑھ کر سنائے۔ سود سے متعلق تجویز سن کر مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی نے یہ کہا کہ :

مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی :- عذر کی حالت میں سودی قرض لینے کے جواز کی بنیاد اگر محض اشباہ کی عبارت پر ہے اور اصحاب تخریج میں سے کسی کی رائے نہیں ہے۔ نیز ہندوستان کے ہمارے اکابر کی تائید حاصل نہیں ہے تو میرا خیال ہے کہ اتنے بڑے مسئلہ کا مدار محض اشباہ کی عبارت پر رکھنا صحیح نہ ہوگا۔

قاضی صاحب :- صرف اشباہ و نظائر میں نہیں۔ بلکہ تمام کتب فقہ میں موجود ہے۔ یہ بحث اصلاً فتح القدیر میں ہے۔ اس حد تک گنجائش کہ ایسی حالت شدیدہ میں جو بمنزلہ ضرورت ہو علماء کے درمیان مسلّم ہے۔ میں امام احمدؒ کے الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے علم کے مطابق اس مسئلہ میں کسی عالم کا اختلاف نہیں ہے۔

مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی :- پاکستان کے سارے علماء جواز کے قائل ہیں۔

قاضی صاحب :- وہاں حاجت نہیں، یہاں حاجت ہے۔ دونوں ملکوں کے حالات میں فرق ہے۔

مفتی حبیب اللہ قاسمی :- فتاویٰ محمودیہ میں بھی یہ جزئیہ موجود ہے جس میں اور بھی اکابر کے اقوال درج ہیں۔

قاضی صاحب :- بین الاقوامی تجارت میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں اس پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی صاحب ہمیں مزید معلومات

مرتب کرکے عنایت کریں گے۔

(اس کے بعد سیمینار کی طرف سے ایک سوالنامہ شرکاء کے درمیان تقسیم کیا گیا)۔

مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی:- اس سیمینار میں شرکت سے مجھے بیحد مسرت حاصل ہوئی ہے۔ اس سے قبل مجھے اندازہ نہ تھا کہ ہندوستان میں نوجوان علماء اتنی بڑی تعداد میں جدید مسائل کو اتنی محنت سے حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چند صدیوں سے ہندوستان کو مرکزیت حاصل ہے۔ اس شرکت سے یہ احساس ہوا کہ یہ مرکزیت اب بھی برقرار ہے۔ خطرہ ہو رہا تھا کہ یہ مرکزیت کہیں اور منتقل نہ ہو جائے۔ اس سیمینار میں شرکت کے بعد مجھے اب یہ خطرہ نہیں رہا۔

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کے ذمہ دار ڈاکٹر منظور عالم اور ان کے رفقاء نے جس انہماک سے اس عظیم کام میں حصہ لیا ہے اور خدمت کی ہے۔ قابل صد ستائش اور لائق شکر ہے۔ محترم جناب حکیم عبدالحمید صاحب کے کے بھی ہم شکر گذار ہیں کہ انہوں نے پرسکون ماحول میں ہمیں اس تحقیقی کام کا موقعہ فراہم کیا۔

دورِ جدید کے یہ مسائل ہمارے لئے چیلنج ہیں۔ اس سیمینار کا مقصد اس چیلنج کو قبول کرنا ہے۔ یہ کام اس قدر مشکل ہے کہ حضرت والد صاحبؒ کے بقول خط مستقیم کو خطِ منحنی پر منطبق کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ خصوصًا سود کے معاملہ میں کہ اس کی حرمت پر قرآن نے اتنی شدت سے وضاحت کی ہے کہ اتنی شدت سے کسی اور گناہ کی نہیں کی ہے۔ اس لئے اس میں صرف ظنیات پر مدار نہیں رکھنا چاہئے۔ نہایت غور و خوض کی ضرورت ہے۔ میری

رائے ہے کہ آپ غیر سودی بینک کاری کے سلسلہ میں کوشش فرمائیں۔ سودی معاملات میں ملک میں بھی اور بیرونِ ملک بھی مشکلات ہیں۔ ہندوستان کے بارے میں علماء اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ دارالحرب ہونے کی بناء پر یہاں سود لینا دینا درست نہیں ہے۔

ہمیں شریعت کے مزاج و مسائل کو توڑ مروڑ کر حالات کے موافق نہیں بنانا ہے۔ بلکہ اس کی واقعی گنجائش سے فائدہ اٹھانا ہے۔ یہاں کے اصحاب ثروت وصنعت اور ارباب تجارت ایسے ادارے قائم کریں جو بلا سودی قرضے فراہم کر سکیں۔ صدر ضیاء الحق مرحوم نے پاکستان میں اسی طرح کا کارپوریشن قائم کیا تھا۔

قاضی صاحب :- مجھے فخر ہے کہ ہندوستان کے علماء نے کسی لمحہ حکومت کے یا کسی اور کے دباؤ کو قبول نہیں کیا ہے اور مداہنت نہیں کی ہے۔ یہ الزام تو دیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے تشدد کیا ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ مسائل کے اظہار میں نرمی برتی ہے۔

یہاں کے علماء چاہے عوام میں مطعون کیوں نہ ہوئے ہوں اور حکومت کی نگاہ میں معتوب کیوں نہ ہوئے ہوں لیکن انہوں نے ہمیشہ اپنے فریضہ کو ادا کیا ہے۔

ایمرجنسی کے وقت میں حکومت اپنی پوری قوت و قہرمانی کے ساتھ اور فروخت شدہ لوگ مسلمانوں کو ان کے موقف سے ہٹانا چاہتے تھے۔ لیکن علماء نے ہٹنا گوارا نہیں کیا۔

ہمارے ملک میں جو آزادئ فکر ہے وہ باعثِ فخر ہے۔ بند کمروں میں نہیں ہم کھلی مجلسوں میں کہتے رہے ہیں اور انشاء اللہ

کرتے رہیں گے۔

آخیر میں جناب امین صاحب عثمانی نے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔ پھر جناب ڈاکٹر جمال الدین عطیہ صاحب نے انسٹی ٹیوٹ کی میزبانی، جذبہ تعاون اور حسن انتظام کا شکریہ ادا کیا اور یہ کہا کہ مجھے امید ہے کہ ہم آئندہ بھی اسی طرح مل کر بیٹھنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد حضرت مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی نے پُراثر دعا فرمائی۔ انہی کی دعا پر یہ سیمینار چوتھے روز دن میں ایک بجکر ۳ منٹ پر بحسن وخوبی ختم ہوا۔

دوسرے فقہی سیمینار کے اہم فیصلے

> مورخہ ۸ تا ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء کو مجمع الفقہ الاسلامی الہند کی دعوت پر دوسرا فقہی سیمینار ہمدرد کنونشن سنٹر نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اور پوری بحث و تمحیص کے بعد چند مسائل پر فیصلے کئے گئے اور چند مسائل پر مزید تحقیق کے لئے آخری فیصلہ ملتوی رکھا گیا۔ یہ اہم اور تاریخی فیصلے ذیل میں محفوظ کئے جا رہے ہیں۔ ——— مدیر

۱۔ اعضاء کی پیوندکاری

اعضاء کی پیوندکاری کے مسئلہ پر پہلے فقہی سیمینار منعقدہ یکم ۲، ۳ اپریل ۱۹۸۹ء میں سیر حاصل بحث کی گئی۔ اس مسئلہ پر پیش کئے گئے مقالات اور مباحثے تفصیل کے ساتھ مجلہ "بحث و نظر" فقہی سیمینار نمبر میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس سیمینار میں چند امور پر اتفاق کیا گیا۔ اور باقی ماندہ امور کے بارے میں آخری فیصلہ تک پہونچنے کے لئے ایک سب کمیٹی کو سیمینار کے مباحثوں کی روشنی میں سوالات مرتب کر کے علماء و فقہاء کی خدمت میں ارسال کرنے کا کام سونپا گیا۔ اس کمیٹی نے اس موضوع پر نیا سوالنامہ تیار کیا جو علماء و فقہاء کی خدمت میں بھیجا گیا اور ان کے جوابات حاصل کئے گئے۔

ان تمام مباحث اور جوابات پر غور کرنے کے بعد ہم دستخط کنندگان ذیل مندرجہ ذیل امور پر اتفاق کا اظہار کرتے ہیں۔

(۱) کسی انسان کا کوئی عضو ناکارہ ہو چکا ہو، اور اس عضو کے عمل کو آئندہ جاری رکھنے کے لئے کسی متبادل کی ضرورت ہو تو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے۔

(الف) غیر حیوانی اجزاء کا استعمال۔
(ب) ایسے جانوروں کے اعضاء کا استعمال جن کا کھانا شرعاً جائز ہے اور بطریقہ شرعی ذبح کئے گئے ہوں۔
(ج) جان کی ہلاکت یا عضو کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ ہو اور اس مطلوبہ عضو کا بدل صرف ایسے جانوروں میں ہی مل سکتا ہے جن کا کھانا حرام ہے یا حلال تو ہے لیکن بطریق شرعی ذبح نہیں کئے گئے ہیں، تو ایسی صورت میں ان غیر ماکول اللحم یا ماکول اللحم مگر غیر مذبوح جانوروں کے اعضاء کا استعمال جائز ہے۔
اور اگر جان یا عضو کی ہلاکت کا شدید خطرہ نہ ہو تو خنزیر کے اجزاء کا استعمال جائز نہیں۔
(۲) اسی طرح ایک انسان کے جسم کا ایک حصہ اسی انسان کے جسم میں بوقت حاجت استعمال کیا جانا جائز ہے۔
(۳) اعضاء انسانی کا فروخت کرنا حرام ہے۔
(۴) اگر کوئی مریض ایسی حالت کو پہنچ جائے کہ اس کا کوئی عضو اس طرح بے کار ہو کر رہ گیا ہے کہ اگر اس عضو کی جگہ دوسرا عضو اس کے جسم میں پیوند نہیں کیا جائے تو قوی خطرہ ہے کہ اس کی جان چلی جائے گی۔ اور سوائے انسانی عضو کے کوئی دوسرا متبادل اس کمی کو پورا نہیں کرسکتا۔ اور ماہر قابل اعتماد اطباء کو یقین ہے کہ سوائے عضو انسانی کی پیوند کاری کے کوئی راستہ اس کی جان بچانے کا نہیں ہے۔ اور عضو انسانی کی پیوند کاری کی صورت میں ماہر اطباء کو ظن غالب ہے کہ اس کی جان بچ جائے گی اور متبادل عضو انسانی اس مریض کے لیے فراہم ہے، تو ایسی ضرورت، مجبوری اور بے کسی کے عالم میں عضو انسانی کی پیوند کاری کرا کر اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنا مریض کے لیے مباح ہوگا۔
(۵) اگر کوئی تندرست شخص ماہر اطباء کی رائے کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ اگر اس کے دو گردوں میں سے ایک گردہ نکال لیا جائے تو بظاہر حال اس کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ اور وہ اپنے رشتہ دار مریض کو اس حال میں دیکھتا ہے کہ اس کا خراب گردہ اگر نہیں بدلا گیا تو بظاہر حال اس کی موت یقینی ہے، اور اس کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے، تو ایسی حالت میں اس کے لیے جائز ہوگا کہ وہ بلا قیمت اپنا ایک گردہ اس مریض کو دے کر اس کی جان بچا لے۔
(۶) اگر کسی شخص نے یہ ہدایت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اعضاء پیوند کاری کے لیے استعمال کیے جائیں، جسے عرف عام میں وصیت کہا جاتا ہے، از روئے شرع سے اصطلاحی طور پر

وصیت نہیں کہا جا سکتا اور ایسی وصیت اور خواہش شرعاً قابل اعتبار نہیں۔

۱۔ (حضرت مولانا) مفتی ظفیر الدین صاحب۔ مفتی دار العلوم دیوبند

۲۔ (حضرت مولانا) حبیب الرحمن خیرآبادی " " " "

۳۔ " " محمد رفیع عثمانی مفتی وصدر دار العلوم کراچی (پاکستان)

۴۔ " " مفتی سعید احمد پالنپوری، استاذ حدیث دار العلوم دیوبند

۵۔ " " عبدالرحمن صاحب، مفتی مدرسہ امینیہ، دھلی

۶۔ " " مجیب اللہ ندوی، جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ۔

۷۔ " " محمد آدم پالنپوری، مفتی جامعہ نذیریہ کاکوسی ضلع مہسانہ، شمالی گجرات۔

۸۔ " " انور علی اعظمی مفتی دار العلوم مئو

۹۔ " " محفوظ الرحمن صاحب مفتی جامعہ مفتاح العلوم مئو

۱۰۔ " " جمیل احمد نذیری مفتی وناظم جامعہ عربیہ احیاء العلوم، مبارک پور

۱۱۔ " " خلیل الرحمن اعظمی عمری ناظم جامعہ عربیہ دار السلام، عمرآباد (تمل ناڈو)

۱۲۔ " " محمد ایوب ندوی جامعہ اسلامیہ بھٹکل (کرناٹک)

۱۳۔ " " زبیر احمد قاسمی شیخ الحدیث دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

۱۴۔ " " خالد سیف اللہ رحمانی، صدر مدرس " " " "

۱۵۔ " " محمد عبید اللہ اسعدی، استاذ حدیث جامعہ عربیہ، ہتھوڑا، باندہ

۱۶۔ " " ضیاء الدین اصلاحی، ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ

۱۷۔ " " محمد عبداللہ طارق دھلی

۱۸۔ " " محمد اسعد قاسمی دار العلوم الاسلامیہ بستی (یوپی)

۱۹۔ " " معاذ الاسلام صاحب، استاذ مدرسہ امدادیہ مرادآباد (یوپی)

۲۰۔ " " محمد مصطفےٰ مفتاحی مفتی دار العلوم راجستھان

۲۱۔ " " عبدالاحد ازہری قاضی شریعت دار القضاء مالیگاؤں (مہاراشٹر)

۲۲۔ " " سراج احمد صاحب مفتی مدرسہ معہد ملت " "

۲۳۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب	شیخ الحدیث دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ
۲۴۔ " " عتیق احمد بستوی	استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۲۵۔ " " محمد انیس الرحمن قاسمی	معاون قاضی شریعت امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ
۲۶۔ " " محمد مسعود عالم قاسمی	ناظم دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۷۔ (ڈاکٹر) فضل الرحمان گنوری	پروفیسر شعبہ دینیات و سابق دین فیکلٹی دینیات
۲۸۔ (حضرت مولانا) نسیم احمد قاسمی	گول بازار، سرہا (نیپال)
۲۹۔ " " عزیز الرحمن فتحپوری	مفتی دارالعلوم امدادیہ، بمبئی ۳
۳۰۔ " " فضیل الرحمن ہلال عثمانی	مفتی جامعہ دارالسلام، مالیر کوٹلہ (پنجاب)
۳۱۔ " " نسیم احمد قاسمی مظفرپوری	"بحث و نظر" پھلواری شریف، پٹنہ
۳۲۔ " " محمد زید صاحب	استاذ و مفتی جامعہ عربیہ ہتھوڑا، باندہ (یوپی)
۳۳۔ " " محمد جنید عالم ندوی قاسمی	مفتی دارالافتاء امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ
۳۴۔ " " حبیب اللہ قاسمی	مفتی و استاذ حدیث مدرسہ ریاض العلوم گورینی، جون پور
۳۵۔ " " مجاہد الاسلام قاسمی	قاضی شریعت دارالقضاء مرکزی امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ پھلواری شریف پٹنہ

و سکریٹری جنرل
اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

نوٹ:۔ مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دفعہ ۴، ۵ سے اتفاق نہیں ہے۔

۲۔ پگڑی کا مسئلہ

پہلے فقہی سیمینار منعقدہ ۱ر تا ۳ر اپریل ۱۹۸۹ء میں پگڑی کے مسئلہ کے سلسلہ میں مختلف رائیں سامنے آئی تھیں ان کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے مستند علماء اور مفتیان عظام کی خدمت میں پانچ سوالات بھیجے گئے تھے، ان کے جوابات کی روشنی میں درج ذیل تجاویز پر اتفاق پایا گیا:

(۱) مالک مکان زرِ ضمانت ڈپوزٹ کے نام سے کرایہ دار سے جو پیشگی رقم وصول کرتا ہے بہتر ہے کہ اس کو بعینہٖ محفوظ رکھا جائے اگر مالک اس کو خرچ کر دے تو وہ اس بات کا ضامن ہوگا کہ کرایہ داری کی مدت ختم ہوتے ہی وہ رقم کرایہ دار کو فوراً واپس کر دے۔

(۲) اگر کوئی مکان یا دکان کرایہ پر دیا جائے اور مالک مکان مروجہ پگڑی کے نام پر اصل ماہوار کرایہ کے علاوہ بھی نقد رقم کرایہ دار سے وصول کرے تو سمجھا جائے گا کہ مالک مکان نے بحیثیت مالک اپنے مکان کو کرایہ دار سے واپس لینے کے حق سے دست برداری کا عوض وصول کر لیا ہے اور یہ رقم اس کے لئے اس حق کے عوض ہونے کی بنیاد پر جائز ہوگی۔ آئندہ اگر مالک مکان کرایہ دار سے مکان واپس لینا چاہے تو کرایہ دار کو حق ہوگا کہ وہ مکان خالی کرنے کا عوض جس پر ہر دو فریق راضی ہو جائیں مالک مکان سے وصول کرے اور اس صورت میں کرایہ دار دوسرے کرایہ دار کے حق میں باہمی طے شدہ رقم کے عوض اپنے اس حق سے جو اس نے اصل مالک سے عوض دے کر حاصل کیا تھا دست بردار ہو سکتا ہے۔

(۳) مالک مکان نے پگڑی لیے بغیر مکان کرایہ پر دیا اور اجارہ کی مدت اصل معاہدہ میں مقرر نہیں کی گئی ہو تو اس صورت میں مالک مکان کو حق ہوگا کہ جب چاہے مکان خالی کرا لے۔ البتہ مالک مکان کو چاہئے کہ خالی کرانے کی نوٹس اور خالی کرنے کی تاریخ کے درمیان ایسی مہلت دے جو مقامی حالات کے پیش نظر مناسب ہو اور جس میں مالک اور کرایہ دار کو کوئی خاص ضرر لاحق نہ ہو اور کرایہ دار کو بھی چاہئے کہ اس مناسب مہلت میں مکان خالی کر دے۔

(۴) جو مکان یا دکان بغیر پگڑی لیے کرایہ پر دی گئی ہو، مالک مکان کو مکان واپس کرتے وقت کرایہ دینے کے لیے اس سے پگڑی طلب کرنا جائز نہ ہوگا۔

(۵) سیمینار مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ اپنے معاملات میں شریعت کا خاص خیال رکھیں، شریعت چاہتی ہے کہ کسی بھی معاہدہ کے بارے میں معاہدہ کے ہر دو فریق تمام ضروری متعلق امور کو وضاحت اور صراحت کے ساتھ باہم طے کر لیں تاکہ آئندہ کوئی نزاع پیدا نہ ہو اور فریقین ضرر سے محفوظ رہیں۔ اس سلسلہ میں سیمینار خصوصیت سے یہ سفارش کرتا ہے کہ کرایہ داری کا معاملہ طے کرتے وقت مدت کا تعین کر لیا جائے اور اگر مالک مکان عوض لے کر ہمیشہ کے لیے اپنے خالی کرانے کے حق سے دست بردار ہونا چاہتا ہے تو فریقین صراحۃً آپس میں طے کر لیں۔

۳۔ کرنسی نوٹ کا مسئلہ

موجودہ دور میں سونا چاندی ذریعہ تبادلہ نہیں رہا اور کاغذی نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں سونے چاندی کی جگہ لے لی ہے، حکومت کے قوانین بھی کاغذی نوٹوں کو مکمل طور پر ثمن کی حیثیت دیتے ہیں اور بحیثیت ثمن نوٹوں کو قبول کرنا لازم قرار دیتے ہیں۔ غرضیکہ کاغذی نوٹوں کی حیثیت عرف اور رواج میں زر قانونی کی ہوگئی ہے۔ کرنسی کے اس ہمہ گیر رواج نے جو شرعی اور فقہی مسائل پیدا کیے ہیں ان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے اور غور وخوض کرنے کے بعد شرکاء سیمینار درج ذیل نکات پر متفق ہوئے۔

(۱) کرنسی نوٹ سند وحوالہ نہیں ہے بلکہ ثمن ہے، اور اسلامی شریعت کی نظر میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زر اصطلاحی وقانونی کی ہے۔

(۲) عصر حاضر میں نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں مکمل طور پر زر خلقی (سونا، چاندی) کی جگہ لے لی ہے۔ اور باہمی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے اس لیے کرنسی نوٹ بھی احکام میں ثمن حقیقی کے مشابہ ہے، لہٰذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی وبیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے، نہ ادھار۔

(۳) دو ملکوں کی کرنسیاں دو اجناس ہیں، اس لیے ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ حسب رضائے فریقین جائز ہے۔

(۴) کرنسی نوٹوں پر زکوٰۃ لازم ہے۔

(۵) نوٹوں میں زکوٰۃ کا نصاب، چاندی کے نصاب کی قیمت کے مساوی ہوگا۔

(۶) مؤخر مطالبات کے سلسلے میں کرنسی نوٹوں کی قوت خرید اور قدر وقیمت میں ہونے والے اتار چڑھاؤ کا احکام شرعیہ میں اعتبار کیا جائے یا نہیں۔

اس مسئلہ میں شرکاء سیمینار کے درمیان دو نقطہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ کمیٹی کی رائے میں اس مسئلہ کے بارے میں کوئی فیصلہ آئندہ مزید غور وفکر کے بعد کیا جائے گا۔

(۷) اس اجلاس کا احساس ہے کہ مہر کی تعیین سونے اور چاندی کے ذریعہ عمل میں آئے تاکہ پوری طرح عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے اور سکوں کی قوت خرید میں کمی کی وجہ سے ان کو نقصان نہ پہونچے۔

۴ — تجارتی سود اور اسلامی شریعت

سود کے سلسلے میں بحث، مباحثہ اور غور و فکر کے بعد اس ایوان کی متفقہ رائے حسب ذیل قائم ہوئی۔
سود خواہ ذاتی مصارف کے قرضوں پر لیا دیا جائے یا تجارتی و کاروباری قرضوں پر، شریعت اسلامیہ کی نظر میں بہرحال حرام ہے۔ یہ سمجھنا کہ سود کی حرمت کا اطلاق تجارتی و کاروباری قرضوں پر نہیں ہوتا قطعاً غلط ہے۔ نیز یہ خیال کہ تجارتی و کاروباری قرضوں کا وجود زمانہ نزول قرآن میں نہیں پایا جاتا اس لیے حرمتِ ربوا کا اطلاق ان پر نہیں ہوگا، کسی طرح درست نہیں۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ تجارتی و کاروباری مقاصد کے لیے سودی لین دین عرب جاہلیت نیز ان قوموں میں جن سے جاہلی عربوں کے تجارتی روابط تھے، رائج اور شائع تھے، چنانچہ تجارتی و کاروباری مقاصد کے لیے سودی لین دین تحریم ربوا کا اولین مورد ہے۔ اس کے علاوہ بالفرض اگر تجارتی و کاروباری مقاصد کے لیے سودی لین دین کا وجود زمانۂ نزولِ قرآن میں نہ بھی پایا جاتا تب بھی مستقل شرعی دلائل دونوں قسم کے قرضوں (ذاتی و شخصی اور تجارتی و کاروباری) پر اضافے یعنی سود کی حرمت کے بارے میں قائم ہیں۔ قرآن و سنت، اجماع و قیاس اور امت محمدیہ کا عمل متوارث سب یہی بتلاتے ہیں کہ حرمتِ ربوا کے بارے میں اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا کہ قرض لینے دینے کا مقصد اور محرک کیا ہے؟

سود کی حرمت پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا کہ شرح سود کم ہے یا زیادہ، مناسب حد تک کم ہے یا مناسب حد تک زیادہ، شریعت اسلامیہ میں اس بات کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ شرح سود اگر مناسب حد تک کم ہے تو سودی لین دین جائز ہو، اور اگر نامناسب حد تک زیادہ ہے تو ناجائز۔ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا، دونوں صورتیں بہرحال حرام ہیں۔ دلائل شرعیہ اس طرح کی کسی تفریق کی اجازت نہیں دیتے۔

۵ — دارالاسلام - دارالحرب اور مختلف ممالک کی حیثیت کا تعین

دارالحرب میں عقود فاسدہ کے جواز یا یہ کہ دارالحرب میں سود کے ثبوت کی ضروری شرط اموال کا معصوم ہونا موجود نہیں، اس لیے دارالحرب میں سود کا تحقق ہی نہیں ہوتا، اور آیا ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں،

اور یہ کہ ہندوستانی جمہوریہ دارالکفر ہوتے ہوئے بھی ان ممالک کی فہرست میں آتا ہے یا نہیں جن میں اموال معصوم نہیں رہتے، یہ اور اس طرح کے دیگر سوالات پر سیمینار میں غور کیا گیا اور مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔ اگرچہ سیمینار میں عام رجحان یہ رہا کہ ہندوستان جیسے ملکوں میں سودی کاروبار کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا، لیکن پھر بھی مقالات اور مباحث میں آنے والے مختلف نقاط نظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سیمینار اسلامک فقہ اکیڈمی سے ایسی کمیٹی تشکیل کیے جانے کی سفارش کرتا ہے، جس میں محقق علماء و فقہاء کے علاوہ ماہرین علم سیاست، دستوری قوانین اور بین الاقوامی تعلقات سے متعلق قوانین کے ماہرین کو شریک کیا جائے یہ کمیٹی اس کا جائزہ لے کہ اسلام کی دستوری ہدایات اور اسلامی قانون بین الممالک کی روشنی میں آج کے مختلف نظام ہائے حکومت کو کتنی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اور ان کے علٰحدہ علٰحدہ کیا حکم ہوں گے، اس سلسلے میں دو ممالک کے باہمی تعلقات اور ان میں سے ایک کے لیے دوسرے کی حیثیت اور ساتھ ہی خود اس ملک میں بسنے والی مسلم آبادی کی اپنے ہم وطنوں اور اپنے ملک کی حکومت کے ساتھ تعلقات کی قانونی نوعیت شرع اسلامی کی روشنی میں کیا ہونی چاہئے۔

یہی کمیٹی اس پر بھی غور کرے کہ کیا کچھ ایسے حالات بھی پیش آسکتے ہیں جن میں معاملات ربویہ اور عقود فاسدہ مسلمانوں کے لیے غیر مسلموں کے ساتھ جائز قرار دیئے جائیں ۔

۲۔ غیر سودی بینک کاری کے لئے پروجکٹ کی تیاری

دوسرا فقہی سیمینار، سودی معاملات سے متعلق غور و فکر کے ذیل میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ غیر سودی بینک کاری اور مقامی سطح پر ایسی سوسائٹیز کا قیام جو غیر سودی بنیادوں اور جائز شرعی عقود و معاملات کی بنیاد پر سرمایہ کاری اور امداد فراہم کرنے کا کام مفید ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ان کاموں کی انجام دہی کے لیے ایسے نظام سامنے ہوں، جو شرع سے متصادم نہ ہوں، اس وقت ملک میں ایسی مختلف کوششیں جاری ہیں لیکن ان کوششوں میں باہم تنظیم اور یکسانیت کا فقدان ہے۔ یہ سیمینار ضروری سمجھتا ہے کہ جدید بینکنگ کے اصولوں اور شریعت کے احکام کو سامنے رکھتے ہوئے غیر سودی بینک کاری کا ایک جامع منصوبہ (PROJECT) تیار کیا جائے جو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو سود کی حرمت سے بچائے اور ان کو معاشی استحکام بخشے، بلکہ دیگر پسماندہ اور کمزور انسانی طبقات کو بھی سہارا دے سکے، جو امت رحمۃ للعالمین کا فریضہ ہے۔

اس سلسلہ میں یہ سیمینار اسلامک فقہ اکیڈمی سے ایسے خاکہ اور منصوبہ (PROJECT) کی تیاری کے لیے علماء و فقہاء نیز بینکنگ اور معاشیات کے ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی سفارش کرتا ہے۔

۷۔۔۔۔ سود سے متعلق مسائل

دوسرے فقہی سیمینار منعقدہ مورخہ ۸ تا ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء میں سودی قرض سے متعلق سوالات زیر بحث آئے۔ احکام شرع، قواعد فقہ اور نظائر، نیز زمانہ کے حالات و مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل امور پر اتفاق کیا گیا:۔

۱۔۔۔۔ ربوا (سود) قطعی حرام ہے، اور جس طرح سود لینا حرام ہے، اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے۔

۲۔۔۔۔ سود ادا کرنے کی حرمت بذات خود نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ سود خواری کا ذریعہ ہے، اس لیے بعض خاص حالات میں عذر کی بنیاد پر سود ادا کرکے قرض لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ کون سا عذر معتبر ہے اور کون سا نہیں اور کون سی حاجت قابل لحاظ ہے اور کون سی حاجت قابل لحاظ نہیں۔ اس سلسلہ میں معتمد اصحاب افتاء کے مشورہ پر عمل کیا جائے۔

۳۔۔۔۔ ہندوستان میں بعض سرکاری قرضے ایسے ہیں، جس میں سرکار کی طرف سے چھوٹ (SUBSIDY) دی جاتی ہے۔ اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے۔ اگر سود کے نام سے لی جانے والی یہ اضافی رقم چھوٹ (SUBSIDY) کے مساوی ہو، یا اس سے کم ہو، تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں۔

۴۔۔۔۔ ہندوستان میں حکومت جب اراضی مملوکہ کو اکوائر کرتی ہے (یعنی بحکم سرکاری وہ اراضی مفاد عامہ کے لیے جبراً خریدی جاتی ہیں) اور حکومت اس کی قیمت مالکان اراضی کو اپنے ضابطوں کے پیش نظر اپنی منشاء کے مطابق ادا کرتی ہے۔ مالکان اراضی سرکاری حکم کے خلاف عدالتوں سے رجوع کرتے ہیں، عدالتیں عادلانہ قیمت کا تعین کرتی ہیں اور مالکان اراضی کو اکوزیشن کی تاریخ سے بذریعہ فیصلہ عدالت اس قیمت کے علاوہ اضافی رقم بھی سود کے نام سے دلاتی ہیں۔ سیمینار کی رائے میں یہ اضافی رقم سود نہیں بلکہ قیمت کا جزء ہے جس کا لینا اور اپنے مصرف میں خرچ کرنا جائز ہے۔

۵۔۔۔۔ سرکاری بینکوں سے ملنے والے ترقیاتی قرضوں اور ان میں ادا کیے جانے والے سود کے مسئلہ پر ہندوستان کے مخصوص پس منظر میں غور کرکے کسی فیصلہ تک پہونچنے کے لیے یہ سیمینار اسلامک فقہ اکیڈمی سے

علما، ومتخصصین کی ایک کمیٹی کی تشکیل کی سفارش کرتا ہے، جو مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر کسی نتیجہ تک پہونچے۔

"بینک انٹرسٹ" کے سود ہونے پر شرکا سیمینار کا اتفاق ہے، انٹرسٹ کی رقم بینک سے نکالی جائے یا چھوڑ دی جائے؟ نکال لی جائے تو کس مصرف میں خرچ کی جائے؟ اس سلسلہ میں درج ذیل امور طے پائے۔

(۱) بینکوں سے ملنے والی سود کی رقم کو بینکوں میں نہ چھوڑا جائے بلکہ اسے نکال کر مندرجہ ذیل مصارف میں خرچ کیا جانا چاہئے۔

(۲) بینک کے سود کی رقم کو بلا نیت ثواب فقراء ومساکین پر خرچ کردیا جائے اس پر تمام ارکان کا اتفاق ہے۔

(۳) سود کی رقم کو مساجد اور اس کے متعلقات پر خرچ نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) اکثر شرکا سیمینار کی یہ رائے ہے کہ اس رقم کو صدقات واجبہ کے مصارف کے علاوہ رفاہ عام کے کاموں پر بھی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ بعض حضرات کی رائے میں اس کے مصرف کو فقراء ومساکین تک محدود رکھنا چاہئے ::

اسمائے گرامی شرکاء سمینار

۱	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب	حیدرآباد
۲	مولانا زبیر احمد قاسمی صاحب	حیدرآباد
۳	مولانا رضوان قاسمی صاحب	حیدرآباد
۴	مولانا ولی رحمانی صاحب	مونگیر
۵	مولانا جنید عالم قاسمی صاحب	پٹنہ
۶	مولانا نسیم احمد قاسمی صاحب	پٹنہ
۷	مولانا انیس الرحمن قاسمی صاحب	پٹنہ
۸	مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب	پٹنہ
۹	مولانا نورالحق رحمانی صاحب	پٹنہ
۱۰	مولانا سلیم احمد صاحب	پٹنہ
۱۱	مولانا جعفر علی رحمانی صاحب	دہلی
۱۲	مولانا عبداللہ طارق صاحب	دہلی
۱۳	مولانا عبدالرحمن صاحب	دہلی
۱۴	ڈاکٹر محمد منظور عالم صاحب	دہلی
۱۵	مولانا مسرور احمد صاحب	دہلی
۱۶	جناب سید امین الحسن رضوی صاحب	دہلی
۱۷	جناب عبدالرشید صاحب	دہلی
۱۸	جناب منظور احمد صاحب	دہلی
۱۹	جناب اسرار احمد صاحب	دہلی

۲۰	مولانا شبیر فلاحی صاحب	دہلی
۲۱	جناب مقبول احمد سراج صاحب	دہلی
۲۲	جناب سید اوصاف علی صاحب	دہلی
۲۳	جناب نور محمد جادنی	ہریانہ
۲۴	مولانا بشیر احمد راشد الامینی صاحب	ہریانہ
۲۵	مفتی فضیل الرحمٰن عثمانی صاحب	مالیرکوٹلہ
۲۶	مولانا محمد آدم پالنپوری صاحب	گجرات
۲۷	مولانا ابوالحسن علی صاحب	بھروچ
۲۸	ڈاکٹر کے. جی. منشی صاحب	احمد آباد
۲۹	مولانا ایوب ندوی صاحب	بھٹکل
۳۰	ڈاکٹر ممتاز صاحب	بنگلور
۳۱	جناب ابراہیم خلیل اللہ صاحب	بنگلور
۳۲	مولانا عزیز الرحمٰن صاحب	بمبئی
۳۳	مولانا عبد الاحد ازہری صاحب	مالیگاؤں
۳۴	جناب شمس پیرزادہ صاحب	بمبئی
۳۵	ڈاکٹر عبد الحبیب صاحب	بمبئی
۳۶	مولانا عبد العلیم صاحب	بمبئی
۳۷	مولانا سراج احمد علی صاحب	مالیگاؤں
۳۸	مولانا عبد الرحیم صاحب	بھوپال
۳۹	مولانا محمد مصطفےٰ مفتاحی	چورو. راجستھان
۴۰	مولانا خلیل الرحمٰن صاحب	عمر آباد
۴۱	مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب	اعظم گڑھ
۴۲	مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب	اعظم گڑھ
۴۳	مولانا جمیل احمد نذیری صاحب	اعظم گڑھ
۴۴	مفتی انور علی اعظمی صاحب	مئوناتھ بھنجن

۴۵	مولانا عبداللہ کونی صاحب	اعظم گڑھ
۴۶	ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی صاحب	اعظم گڑھ
۴۷	مولانا محمد مسعود عالم قاسمی صاحب	علیگڑھ
۴۸	ڈاکٹر فضل الرحمن گنوری صاحب	علیگڑھ
۴۹	ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی صاحب	علیگڑھ
۵۰	مولانا مطیع الرحمن صاحب	بدیوں
۵۱	مفتی عزیز الرحمن صاحب	بجنور
۵۱	مولانا سلمان ندوی صاحب	لکھنؤ
۵۳	مفتی محمد برہان الدین سنبھلی صاحب	لکھنؤ
۵۴	مولانا عتیق احمد بستوی صاحب	لکھنؤ
۵۵	مولانا محفوظ الرحمن صاحب	مئو
۵۶	مولانا معاذ الاسلام صاحب	مرادآباد
۵۷	مفتی محمد ظفیر الدین صاحب	دیوبند
۵۸	مفتی حبیب الرحمن صاحب خیرآبادی	دیوبند
۵۹	مولانا سید احمد پالنپوری صاحب	دیوبند
۶۰	مفتی حبیب اللہ قاسمی صاحب	جونپور
۶۱	ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری صاحب	بنارس
۶۲	مولانا محمد زید صاحب	باندہ
۶۳	مولانا محمد اسعد قاسمی صاحب	بستی
۶۴	مولانا عبیداللہ اسعدی صاحب	باندہ
۶۵	جناب عبدالرحمن صاحب	بنارس
۶۶	جناب طاہر بیگ صاحب	علیگڑھ
۶۷	مولانا رفیع احمد عثمانی صاحب	کراچی
۶۸	ڈاکٹر جمال الدین عطیہ صاحب	قاہرہ
۶۹	مولانا عبدالباسط صاحب	ریاض
۷۰	نسیم احمد قاسمی صاحب	نیپال